خطباتِ حکیم الامت

حکیم الامت مجدد الملت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی
کی موثر اور انقلاب آفریں تقریروں کا اہم مجموعہ

تدبیر و توکل
منادی کی پکار
توکل
اجابت دعاء کے صحیح معنی
الفاظ کی تاثیر جداگانہ ہے
پریشان حال کی شفاء
علماء کے لئے عمل کی ضرورت
دین و دنیا کے کاموں کے چلانے کی آسانی
قرض
شکر
شکر کی تحقیق
متنبہ رہنا اگر اب بھی نہ جاگے تو
صحبت کے فوائد

زمزم بکڈپو دیوبند

خطباتِ حکیم الامت جلد ۱۱

تدبیر و توکل

از

حکیم الامت مجدد الملت حضرۃ مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ

تسہیلِ عنوانات : حضرت مولانا محمد عظیم صاحب فیض آبادی مدظلہ العالی

ناشر

زمزم بک ڈپو دیوبند

تفصیلات

نام کتاب	:	خطبات حکیم الامت جلد ۱۱
از	:	حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ
تسہیلِ عنوانات	:	حضرت مولانا محمد عظیم صاحب فیض آبادی مدظلہ العالی
صفحات	:	۴۱۶
تعدادِ اشاعت	:	۱۱۰۰
تاریخ اشاعت	:	اکتوبر ۲۰۰۶ء
باہتمام	:	اسعد الواجدی
قیمت	:	

ناشر

زمزم بک ڈپو دیوبند

ترتیب مواعظ

اجابة الداعی	يٰقَوْمَنَآ اَجِيْبُوْا دَاعِيَ اللّٰهِ وَاٰمِنُوْا بِهٖ يَغْفِرْ لَكُمْ مِّنْ
منادی کی پکار	ذُنُوْبِكُمْ وَيُجِرْكُمْ مِّنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ ۝
التوکل توکل	فَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِيْنَ ۝
الاصابہ فی	وَاِذَا سَاَلَكَ عِبَادِيْ عَنِّيْ فَاِنِّيْ قَرِيْبٌ ؕ اُجِيْبُ
معنی الاجابہ	دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ فَلْيَسْتَجِيْبُوْا لِيْ وَلْيُؤْمِنُوْا بِيْ
اجابت کے صحیح معنی	لَعَلَّهُمْ يَرْشُدُوْنَ ۝
الفصل والانفصال...	لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا ؕ لَهَا مَا كَسَبَتْ
الفاظ کی تاثیر جداگانہ ہے	وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ ؕ
شفاء العیّ پریشان حال کی شفاء	اِنَّمَا شِفَاءُ الْعِيِّ السُّؤَالُ
العمل للعلماء	اِنَّهُمْ كَانُوْا يُسٰرِعُوْنَ فِي الْخَيْرٰتِ وَيَدْعُوْنَنَا
علماء کے لئے عمل ضروری	رَغَبًا وَّرَهَبًا ؕ وَكَانُوْا لَنَا خٰشِعِيْنَ ۝
التیسیر للتسییر	وَتَحْمِلُ اَثْقَالَكُمْ اِلٰى بَلَدٍ لَّمْ تَكُوْنُوْا بٰلِغِيْهِ اِلَّا
دین ودنیا کے کاموں کے چلانے میں آسانی	بِشِقِّ الْاَنْفُسِ ؕ اِنَّ رَبَّكُمْ لَرَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ۝
القرض	اِنْ تُقْرِضُوا اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا يُّضٰعِفْهُ لَكُمْ
قرض	وَيَغْفِرْ لَكُمْ ؕ وَاللّٰهُ شَكُوْرٌ حَلِيْمٌ ۝
الشکر شکر	اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّكُلِّ صَبَّارٍ شَكُوْرٍ ۝
تحقیق الشکر شکر کی تحقیق	اِعْمَلُوْٓا اٰلَ دَاوٗدَ شُكْرًا ؕ وَقَلِيْلٌ مِّنْ عِبَادِيَ الشَّكُوْرُ ۝
التنبہ	وَلَقَدْ اَرْسَلْنَآ اِلٰٓى اُمَمٍ مِّنْ قَبْلِكَ فَاَخَذْنٰهُمْ بِالْبَاْسَآءِ
متنبہ رہنا	وَالضَّرَّآءِ لَعَلَّهُمْ يَتَضَرَّعُوْنَ ۝
فوائد الصحبة	وَاصْبِرْ نَفْسَكَ مَعَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ
صحبت کے فوائد	وَالْعَشِيِّ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ

فہرست مضامین

الاصابة فی معنی الاجابة

اجابة الداعی تمہید منادی کی پکار

شان نزول:

یہ ایک آیت ہے سورۂ احقاف کی اور یہ قول نقل کیا گیا ہے بعض جنوں سے جس کا قصہ شان نزول سے معلوم ہوتا ہے اور یہ آیت مکی ہے ہجرت سے قبل یہ واقعہ ہوا ہے کہ حضرت ﷺ صبح کی نماز پڑھ رہے تھے۔ آپ ﷺ نے جو قرآن شروع کیا تو ادھر سے جن گزر رہے تھے انہوں نے اس کو سنا اور چلے گئے۔ مگر اس دفعہ مکالمت (بات چیت کرنے) سے مشرف نہیں ہوئے۔ ہاں دوسری بار مکالمت سے بھی مشرف ہوئے۔ اس دفعہ صرف قرآن سن کر لوٹ گئے اور اپنی قوم کے پاس جا کر قرآن کی تعریف کی اور اس پر ایمان لانے کی رغبت دلائی۔ سو اس موقعہ کی یہ ایک آیت ہے اور ان جنوں کا مقولہ ہے جو انہوں نے اپنی قوم سے جا کر کہا ہے گو ظاہر میں یہ جنوں کا مقولہ ہے۔ لیکن اگر غور کر کے دیکھا جائے تو یہ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے کیونکہ یہ بات طے شدہ ہے کہ جس بات کو نقل کر کے اس پر حق تعالیٰ انکار نہ فرمائیں تو وہ درحقیقت انہیں کا فرمان ہوتا ہے کیونکہ جب نقل کر کے انکار نہیں کیا تو اس کو صحیح سمجھا تو ایسا ہوا جیسے مفتی فتویٰ لکھے اور کوئی دوسرا لکھ دے الجواب صحیح (جواب درست ہے) تو وہ فتویٰ اس مصدق کا بھی ہے۔ خاص کر ایسی حالت میں جبکہ فتویٰ لکھنے والا ایک نو آموز شاگرد ہو اور اصل میں یہاں یہی مثال ہے کہ فتویٰ لکھنے والا ہو ایک نو آموز شاگرد اور مصدق (تصدیق کرنے والا) ہو استاد کیونکہ پہلی صورت میں جہاں مفتی شاگرد مصدق (تصدیق کرنے والا) استاد نہیں ہے وہاں تو بعض دفعہ اصل مجیب (جواب لکھنے والا) زیادہ ہوتا ہے مصدق سے مگر اس صورت کہ مفتی نو آموز شاگرد ہے۔ جواب دینے والا اصل میں کچھ نہیں کیونکہ وہ خود اس میں متردد ہے۔ استاد کو اس لئے دکھلاتا ہے تاکہ اس کی صحت پہ اطمینان ہو جائے تو جب اس نے استاد کو دکھلایا اور استاد نے اس پر صاد بنا دیا تو اب اس کو اطمینان ہو گیا تو وہ حقیقت میں استاد کا مضمون ہے کیونکہ جو شان کا یہ مضمون اب استاد کے صاد ہونے پر ہو گیا ہے پہلے اس شان کا نہ تھا کیونکہ اب حجت ہے اور اس سے پہلے حجت نہ تھا تو جب حجیت کی حیثیت سے دیکھا جاوے گا تو وہ فتویٰ استاد کا کہا جاوے گا نہ کہ شاگرد کا تو۔ اس طرح جب حق

سبحانہ وتعالٰی کسی کا کلام نقل فرماویں خاص کر ایسے کا کلام جو کہ فی نفسہٖ حجت نہ ہو جیسے کسی غیر نبی کا کلام اور نقل کر کے پھر اس کی تصدیق فرماویں تو وہ کلام حقیقت میں حق تعالٰی ہی کا کہا جاویگا۔ اور کسی کلام کو نقل فرما کر سکوت کرنا یہ اس کی تصدیق ہی کرنا ہے کیونکہ یہ بات غیر ممکن ہے کہ خدا و رسول صلی اللہ علیہ وسلم کسی کے غلط کلام کو نقل کر کے سکوت کریں ہم میں تو دب جانے کا احتمال ہے کہ ضرر کے خوف سے غلط بات پر سکوت کریں گے مگر خدا اور رسول علیہ السلام میں تو یہ احتمال ہو ہی نہیں سکتا۔ خاص کر خدائے تعالٰی میں کیونکہ ظاہر ہے کہ ان کو کوئی کیا ضرر پہنچا سکتا ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بشر ہیں لیکن حق تعالٰی نے فرمادیا ہے یَخْشَوْنَہٗ وَلَا یَخْشَوْنَ اَحَدًا اِلَّا اللّٰہ (کہ وہ احکام کے پہنچانے میں) بس خدا تعالٰی سے ڈرتے ہیں کسی اور سے اندیشہ نہیں کرتے قرآن میں دیکھئے اور تواریخ میں بھی کہ کوئی نبی کسی سفاک (خوان ریز قتل کرنے والا) کے سامنے بھی لچکے ہیں۔

انبیاء علیہم السلام کی دلیری:

انبیاء علیہم السلام اتنے دلیر ہوتے تھے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو فرمایا گیا کہ فرعون کو ذرا نرمی سے کہنا۔ یعنی اس قدر صاف اور دلیر تھے کہ اگر یہ ارشاد نہ ہوتا تو جانے کیا اکھاڑ پچھاڑ کر آتے اور نرمی سے کہنے میں ضرور فائدہ ہوتا ہے گو خاص اس کو نہ ہو مگر دوسروں کو تو یقیناً ہوتا ہے۔ نیز اس میں یہ حجت باقی نہیں رہتی کہ مجھے سوچنے کا موقع نہ دیا اور خدا کو یہ منظور ہے لِئَلَّا یَکُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَی اللّٰہِ حُجَّۃٌ بَعْدَ الرُّسُلِ ۔(تاکہ لوگوں کے پاس اللہ تعالٰی کے سامنے ان پیغمبروں کے آنے کے بعد کوئی عذر باقی نہ رہے) نرمی سے بات کرنے میں یہ مصالح ہوتے ہیں اس لئے یہ فرمایا تھا کہ نرم باتیں کرنا۔ غرض اس سے یہ معلوم ہوا کہ انبیاء کس قدر صاف اور نڈر ہوتے تھے۔ حتیٰ کہ بعض انبیاء کو قتل کی نوبت آئی۔ انہوں نے قتل ہونا گوارا کیا۔ مگر کسی احکام کو نہ چھپایا۔ حالانکہ اوروں کے لئے اجازت بھی ہے کہ ایسی حالت میں چھپالیں۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے الا من اُکْرِہَ وَقَلْبُہٗ مُطْمَئِنٌّ بِالْاِیْمَانِ یعنی جو شخص کہ کلمۂ کفر پر مجبور کیا جاوے اور قلب اس کا ایمان کے ساتھ مطمئن ہو تو وہ اس عہدے سے مستثنیٰ ہے۔ حضرت عمارؓ کو ایک ایسا واقعہ پیش آیا تھا اس وقت یہ آیت نازل ہوئی تھی۔ بس اس وقت سے اس کی اجازت ہوگئی کہ ایسی حالت میں ایمان کو چھپالیں۔ سو امت کو تو اس کی اجازت دیدی گئی۔ گو واجب نہیں کیا گیا۔ لیکن انبیاء کو ایسی حالت

میں بھی اجازت نہیں کہ حکم کو چھپائیں۔ چنانچہ ارشاد ہے یخشونہ ولا یخشون احدا الا اللہ (تبلیغ احکام میں) وہ صرف خدا تعالیٰ سے ڈرتے ہیں اور کسی سے نہیں ڈرتے تاکہ ڈر کی وجہ سے تبلیغ میں کچھ کوتاہی کرنے کا شبہ ہو سکے اور تبلیغ کی قید ترجمہ میں اس لئے لگائی کہ یہ مقتضائے مقام ہے نہ اس لئے کہ غیر تبلیغ میں ڈرتے ہیں کیونکہ انبیاء کسی وقت میں بھی کسی سے نہیں ڈرتے معمولی اوقات میں بھی ان کو اندیشہ نہیں ہوتا چنانچہ واقعات سے یہ بات معلوم ہو سکتی ہے۔

جناب رسول ﷺ کی شجاعت:

حضور ﷺ کو طرح طرح کے واقعات پیش آئے مگر ذرا بھی نہیں گھبرائے۔ چنانچہ ایک سفر میں حضور ﷺ کو یہ واقعہ پیش آیا کہ دوپہر کو آرام فرمانے کیلئے ایک درخت کے نیچے لیٹ گئے صحابہ آپ سے ذرا فاصلہ پر تھے اتفاق سے ایک کافر ادھر سے گزر رہا تھا۔ اس نے اس موقع کو بہت ہی غنیمت سمجھا کہ حضور ﷺ تنہا سو رہے ہیں اور تلوار لٹکی ہوئی ہے۔ بس اس وقت جو ہو سکے کر لینا چاہئے۔ مگر اس کو یہ اندیشہ ہوا کہ اگر حضور ﷺ کی آنکھ کھل گئی۔ اور تلوار پر حضور ﷺ نے قبضہ کر لیا تو سخت مشکل ہوگی پھر اپنی ہی جان بچانی دشوار ہوگی۔ اس لئے اس نے پہلے آپ کی تلوار پر قبضہ کر لیا پھر حضور ﷺ کو جگایا۔ اور کہا من یمنعک منی اب آپ کو مجھ سے کون بچا دے گا یہ ایسا وقت تھا کہ شجاع سے شجاع آدمی بھی گھبرا جاتا کیونکہ اول تو ننگی تلوار سر پر دیکھ کر آدمی ویسے ہی بدحواس ہو جاتا ہے خاص کر جب نیند سے جاگ کر ایسا واقعہ ہو وہ وقت کتنا وحشت کا ہوتا ہے مگر آپ پر ذرا بھی وحشت کا اثر نہیں آیا اور آپ نے بالکل بے دھڑک جواب میں فرمایا کہ اللہ یعنی اللہ تعالیٰ بچاویں گے کیونکہ آپ کو تو پورا بھروسہ تھا خدا تعالیٰ پر ہم تو اسباب کو دیکھتے ہیں۔ اور آپ کی نظر تھی مسبب پر پھر آپ کو اس سے کس طرح خوف ہو سکتا تھا۔

عقل در اسباب می دارد نظر
عشق میگوید مسبب را نگر

یعنی عقل تو اسباب پر نظر رکھتی لیکن عشق مسبب کو دیکھتا ہے:

اس کی ایسی مثال ہے کہ گنوار آدمی تو انجن کو دیکھتا ہے اور جاننے والا انجن کو نہیں دیکھتا وہ ڈرائیور کو دیکھتا ہے۔ اب اگر ڈرائیور کہہ دے کہ تم فلاں جگہ آ کر لین پر ٹھہر جاؤ میں انجن کو روک دوں گا۔ تو اس شخص کو لین پر ٹھہر جانے میں کچھ خوف نہ ہوگا۔ اسی طرح انبیاء علیہم السلام چونکہ

مسبب کو دیکھتے ہیں اس لئے ان کو دوسروں سے نہ فکر ہوتی ہے نہ تردد نہ اندیشہ اب یہ بات کہ جب ان کو کسی سے ڈر نہیں ہے تو پھر اپنی حفاظت کیوں کرتے ہیں جیسا کہ حدیثوں میں ہے کہ آپ جنگ میں زرہ پہن کر تشریف لے جاتے تھے تو سمجھ لو کہ جو سبب ہے نہ ڈرنے کا وہی سبب ہے حفاظت اور تدبیر کا وہ جیسے حق تعالیٰ کے وعدے کو سچا سمجھتے ہیں ان کے حکم کو بھی واجب العمل سمجھتے ہیں۔ جب ان کا حکم ہوا کہ زرہ پہن کر تشریف لے جایئے۔ تو زرہ پہن لی۔ تو اس کی یہ وجہ نہ تھی کہ آپ کی نظر اسباب پر تھی بلکہ حق تعالیٰ نے چونکہ تدبیر کو مشروع کیا ہے۔ اس لئے آپ تدبیر کی رعایت فرماتے تھے۔ خلاصہ یہ ہے کہ جیسے حق تعالیٰ کا یہ وعدہ ہے کہ کوئی کچھ نہ کر سکے گا آپ اندیشہ نہ کریں، اسی طرح یہ بھی حق سبحانہٗ تعالیٰ کا حکم ہے کہ اپنی حفاظت کیلئے تدابیر اختیار کریں تو انبیاء تدبیر مشروع محض اس لئے کرتے ہیں کہ وہ خدا تعالیٰ کا حکم ہے اور انبیاء کی تو بڑی شان ہے اس کو تو اولیاء بھی سمجھتے ہیں۔ اسباب کے اختیار کرنے میں ان کی بھی یہی نیت ہوتی ہے۔ بلکہ غلبہ حال سے اگر کوئی اسباب کو چھوڑ بھی دیتا ہے تو غیب سے اس کی اصلاح ہوتی ہے۔

حضرت شاہ ولی اللہ صاحب دہلویؒ کو تین باتوں کا حکم:

چنانچہ شاہ ولی اللہ صاحب نے فیوض الحرمین میں لکھا ہے۔ کہ مجھ کو تین باتوں پر مجبور کیا گیا تو جو طبعاً مجھ پر گراں تھیں۔ مگر حکم مقدم ہے طبع پر ایک تمسک بالاسباب (یعنی اسباب کو اختیار کرنا) دوسرے عدم خروج عن المذاہب الاربعہ (مذاہب اربعہ یعنی حنفی، شافعی، مالکی حنبلی سے خارج نہ ہونا) تیسرے حضرت علی کرم اللہ وجہہ پر شیخین کی تفضیل (ابوبکر و عمرؓ کو حضرت علی کرم اللہ وجہہ پر فضیلت دینا) اور حکمت اس میں یہ ہے کہ اسباب اختیار کرنے میں ایک تو شان افتقار (احتیاج) کہ ہم حق تعالیٰ کے اس درجہ محتاج ہیں کہ ان کے مقرر کئے ہوئے اسباب سے بھی بے نیاز نہیں ہیں دوسرے اس میں پردہ داری ہے کہ عوام کو خبر نہیں ہوتی کہ متوکل ہیں۔ اسباب کا اختیار کرنا توکل میں پردہ ہے۔ عوام سمجھتے ہیں کہ کیا متوکل ہیں نوکری کر رکھی ہے۔ مباشرت اسباب میں دو مصلحتیں تو یہی ہیں اور ان کے علاوہ اور خدا جانے کیا کیا مصلحتیں ہوں گی۔ پس اسباب کو ہرگز ترک نہ کرنا چاہئے۔ حضرت علیؓ کا قصہ ہے کہ آپ سے ایک ملحد نے پوچھا کہ کیا آپ کا یہ عقیدہ ہے کہ بے وقت موت نہیں آتی آپ نے فرمایا کہ ہاں۔ اس نے کہا کہ جب آپ کا عقیدہ ہے تو

پھر چھت کے اوپرسے کود یئے آپ نے فرمایا کہ خدا کی جانچ کرنا بھی بے ادبی ہے۔ یہ تو خدا کی جانچ ہے۔ ہاں البتہ اگر اتفاق سے گر پڑیں گے تو گرتے وقت یہ عقیدہ لے کر چلیں گے کہ اگر اس وقت موت نہیں تو ہم مر نہیں سکتے۔ سو حضرت علیؓ کے اس جواب سے بھی معلوم ہوا کہ تدبیر کی مزاحمت کرنا ٹھیک نہیں تدبیر ہو اور اس کے ساتھ توکل ہو۔

گر توکل مے کنی در کار کن کسب کن پس تکیہ بر جبار کن

(اگر توکل کرو تو کام کے اندر توکل کرو یعنی کسب اور کام کرو۔ اور ان کے اثر بخشنے میں اللہ تعالیٰ پر اعتماد کرو)

حتیٰ کہ جو تارک اسباب ہیں ان کیلئے بھی مطلق ترک کرنے کی اجازت نہیں ہے بلکہ اس میں تفصیل کی ہے بعض اسباب کے ترک کی اجازت ہے اور بعض کی نہیں مثلاً امام غزالیؒ نے لکھا ہے کہ جو ترک اسباب کرے اس کو دروازہ بالکل بند کر کے بیٹھنا جائز نہیں اگر ایسا کرے گا تو گناہگار ہوگا ۔ پس دروازہ بند کرنا متوکل کیلئے بھی نا جائز ہے دروازہ تو کھلا رہے ہاں کواڑوں پر نظر نہ ہو۔ نظر صرف حق تعالیٰ پر ہو۔ لیکن ان دونوں باتوں کا جمع کرنا یہ بہت دشوار ہر شخص کا کام نہیں ہے۔

بر کفِ جامِ شریعت بر کفِ سندانِ عشق ہر ہوسناکے نداند جام و سنداں باختن

(شریعت اور عشق دونوں کے مقتضی پر عمل کرنا ہر ہوسناک کا کام نہیں)

مباشرت اسباب (اسباب میں لگ جانا) کا حکم انسان کے واسطے تو ہے ہی خدا نے تو یہاں تک اس کی رعایت کی ہے کہ جانور جو کھاتے ہیں ان کو بھی اسباب ہی کے واسطے دیا جاتا ہے۔ چنانچہ حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ اگر تم خدا پر نظر کرو تو تم کو ایسا رزق ملے کہ جیسے پرندوں کو ملتا ہے تغدو خماصا وتروح بطانا صبح کو بھوکے جاتے ہیں اور شام کو چھکے ہوئے آتے ہیں محققین نے لکھا ہے کہ تدبیر کی طرف یہاں بھی اشارہ ہے کہ گھونسلہ سے نکلنا ان کیلئے بھی شرط ہے تو جب رزق جانوروں کو بھی تدبیر ہی کے واسطے دیا جاتا ہے۔ تو خیال فرمایئے تدبیر کو کون باطل کر سکتا ہے ۔ آخر وہ بھی تو سرکاراوزار ہے، پھر اس کو معطل کرنے کی کب اجازت ہو سکتی ہے۔ پس جب توکل بھی حق تعالیٰ کی نعمت ہے اور تدبیر بھی تو دونوں کو جمع کرنا چاہئے۔ اب یہ بات کہ کس طرح سے جمع ہو۔ یہ ہر ایک کیلئے جدا ہے جیسی کسی میں قابلیت ہوگی اس کے موافق اس کو اسباب اختیار کرنے کا حکم ہوگا۔ متوکل کے لئے اس کے مناسب اور اہل اسباب کیلئے ان کے موافق مگر اسباب ہوں

ضرور بلا اسباب کے کام نہیں چل سکتا۔ ہاں کسی سے کرامت یا معجزے کے طور پر بلا اسباب ہی کے کوئی کام ہو جاوے تو دوسری بات ہے مگر وہ معمول نہیں ہو سکتا۔ زیادہ اسباب نہ ہو تو اتنا ہی ہو کہ کواڑ کھول دے۔ مگر آمد رفت والوں پر نگاہ نہ ہو اسکی ایسی مثال ہے کہ تنخواہ دیتی تو ہے سرکار مگر ملتی ہے خزانچی کے ہاتھ سے تو نظر سرکار پر ہوگی خزانچی پر نہ ہوگی کیونکہ وہ تو محض محکوم ہے اپنے اختیار سے کسی کو کچھ نہیں دے سکتا۔ اب اگر کوئی حاکم خزانچی کو روک دے تو تنخواہ مل چکی۔ بس تنخواہ دینے والی سرکار ہے اور خزانچی محض واسطہ ہے لہٰذا خزانچی سے نہ بعید ہونا جائز نہ اس پر نظر کرنا جائز۔ نظر اسی دینے والے ہی پر کرو۔ غرض اسباب کی رعایت تو سب کیلئے ضروری ہے۔ البتہ اس کے درجات متفاوت (جدا) ہیں اہل اسباب کے لئے اور درجہ کے اسباب ہیں۔ اور متوکل کیلئے اور درجے کے اسباب ہیں تو اسباب اور تدابیر چونکہ مشروع ہیں۔

حضور علیہ الصلوۃ والسلام کی جامعیت:

اس وجہ سے حضور ﷺ جنگ میں زرہ پہنتے تھے۔ لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ آپ کو اندیشہ تھا یا اسباب پر نظر تھی سو آپ توکل اور تدبیر دونوں کو جمع فرماتے تھے اور واقعی تدبیر کو کس طرح چھوڑا جا سکتا ہے۔ یہ تو خدا تعالیٰ کی طرف سے خوان لگا ہے۔ اس میں توکل بھی ہے تدبیر بھی ہے قسم قسم کی نعمتیں اس میں موجود ہیں۔ پس سب ہی سے متمتع ہونا چاہئے۔ یہ نہیں کہ ایک کو لے کر دوسری کو چھوڑ دیں۔

دیکھو اگر کوئی حاکم ہماری دعوت کرے اور چار طرح کے کھانے دستر خوان پر لگائے اور ہم ان میں سے بعض کھائیں اور بعض نہ کھائیں تو اس پر ضرور عتاب ہوگا۔ ایک بزرگ کی حکایت لکھی ہے کہ روٹی کھا رہے تھے اس میں ایک ٹکڑا جلا ہوا تھا۔ اس کو اٹھا کر انہوں نے علیحدہ رکھ دیا۔ فوراً آواز آئی کہ کیوں صاحب کیا یہ فضول ہی بنا ہے۔ تمام آسمانوں کو چکر ہوا فرشتوں کو چکر ہوا۔ کرۂ ہوا کو حرکت ہوئی۔ تب یہ بنا آپ کے نزدیک یہ فضول ہی ہے۔ یہ آواز سن کر وہ بزرگ ڈر گئے اور اس جلے ہوئے ٹکڑے کو بھی کھا لیا۔ مگر اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ جلے ہوئے ٹکڑے بھی کھایا کرو کیونکہ ہم کو اجازت دی ہے کہ جو مضر ہو اس کو نہ کھائیں۔ بلکہ یہ مطلب ہے کہ اس کو حقیر نہ سمجھو، غرض یہ کہ اس کا تو اختیار ہے کہ جو مضر ہو اس کو نہ کھاؤ۔ لیکن حقیر سمجھ کر نہ چھوڑو۔

جیسے کہ اگر کسی کے ہاتھ کا ٹکڑا گر جاتا ہے تو اس کو یہ سمجھ کر چھوڑ دیتے ہیں اگر ہم اس کو کھالیں گے تو لوگ ہم کو ندیدہ کہیں گے لوگوں کے ندیدہ سمجھنے کی پرواہ نہ کرنی چاہئے بلکہ یوں سمجھو کہ ہاں ہم ندیدہ ہیں۔ جب حق تعالیٰ ہی کو یہ پسند ہے کہ ہم ان کی نعمتوں کے ندیدہ ہوں پھر ہم کیوں ندیدہ نہ ہوں۔

چوں طمع خواہد زمن سلطان دیں　　خاک بر فرق قناعت بعد ازیں

(یعنی جب حق تعالیٰ ہی ہم سے طمع خواہاں ہوں تو پھر قناعت پر خاک ڈالنی چاہئے)

اور جو چیز تم کو مضر ہو اس کو بھی اگر چھوڑ دو تو یوں سمجھو کہ یہ تو فی نفسہٖ ہی بڑی نعمت ہے لیکن ہم اس کے متحمل نہیں ہیں یہ دقیق ادب ہے۔

حکایت حضرت خواجہ بہاؤالدین نقشبندیؒ:

مجھے ایک حکایت یاد آئی، خواجہ بہاء الدین نقشبندیؒ کی کہ آپ کی نظر سے یہ حدیث گزری کہ حضور ﷺ جو کی روٹی کھاتے تھے اور بغیر چھانے ہوئے۔ بس یہ طریقہ تھا کہ آٹے میں پھونک مار کر بھوسی اڑا دی جو رہ گیا اس کی روٹیاں پکالیں۔ حضور ﷺ کے چھاننے کا طریقہ نہ تھا۔ جب آپ نے یہ حدیث دیکھی تو خدام سے فرمایا کہ سنت یہ ہے کہ جو کا آٹا بے چھنا ہو۔ یہ چھاننا خلاف سنت ہے۔ بس آج سے چھانا نہ جاوے۔ چنانچہ آپ کے حکم کے بموجب ایسا ہی کیا گیا اور بے چھنے جو کے آٹے کی روٹی پکائی گئی۔ مگر اس کو جو کھایا تو سب کے پیٹ میں درد ہو گیا۔ اب وقت ہے امتحان کا کوئی بے ادب تو یہ کہتا کہ اچھا اتباع سنت کیا۔ جس سے تکلیف ہوئی مگر وہ لوگ نہایت مودب تھے کہنے لگے کہ درحقیقت ہم نے بے ادبی کی کہ حضور ﷺ کے ساتھ برابری کا دعویٰ کیا کہ ہر عمل میں کمال حاصل کرنا چاہا اور ہم نے کامل اتباع سنت کا دعویٰ کیا ابھی ہم اس قابل نہیں۔ ہم ضعیف ہیں ہم کو رخصت پر عمل کرنا چاہئے۔ پس آٹا تو جو ہی کا ہو لیکن چھنا ہوا ہو، ہم کو حضور ﷺ سے ایک درجہ نیچے رہنا چاہئے سبحان اللہ کیا احترام ہے۔ اب مسلمانوں سے یہ بات کم ہوتی چلی جاتی ہے اور یہ تو دقیق ادب تھا اب تو بہت موٹے موٹے موقع پر استخفاف (خفیف جاننا) کرتے ہیں، اور تحقیر کرتے ہیں۔

خلاصہ یہ کہ خواجہ بہاؤالدین نقشبندؒ نے یہ ادب کیا کہ سنت میں کسی طرح کی کمی نہیں نکالی بلکہ خود اپنے اندر ضعف سمجھا۔

خلوت میں نیت:

مجھے صوفیہ کا اس کے مناسب ایک لطیفہ نہایت پسند آیا کہ وہ کہتے کہ اگر کوئی خلوت اختیار کرے تو اس میں دوسروں کے ضرر سے بچنے کی نیت نہ کرے۔ بلکہ یہ نیت رکھے کہ میں اپنے شر سے خلقت کو بچاتا ہوں اپنے کو سانپ سمجھ کر بھٹ میں رکھے اور واقعی اگر غور کر کے دیکھا جاوے تو ہم سے دوسروں کو زیادہ تکلیف پہنچتی ہے۔ کیونکہ خدا تعالیٰ نے تو دشمن کو دوست بنانے کا نسخہ بتایا ہے۔ کہ اِدْفَعْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ فَاِذَا الَّذِیْ بَیْنَکَ وَبَیْنَهٗ عَدَاوَةٌ کَاَنَّهٗ وَلِیٌّ حَمِیْمٌ برائی کو ایسے طریقہ سے رو کرو جو کہ عمدہ ہے۔ یعنی نرمی سے پس یکا یک کہ وہ شخص کہ تمہارے اور اس کے درمیان عداوت تھی ایسا ہو جاوے گا کہ مخلص دوست ہے۔ تو جب ایسا نہیں ہوا اور پھر بھی وہ تمہارا دشمن ہی رہا۔ تو معلوم ہوا کہ ہم سے اس کو کوئی صدمہ پہنچا ہے یا آئندہ کسی ضرر کا اندیشہ ہے۔ بہر حال سبب اس کی عداوت کا جو ہے وہ ہم سے ضرر پہنچا ہے خواہ وہ ضرر بالفعل (یعنی اسی وقت) ہو یا بالقوہ (آئندہ) پس ثابت ہوا کہ زیادہ تکلیف ہم ہی سے دوسروں کو پہنچی ہے۔ تو جب یہ بات واقع کے مطابق ہے تو سمجھ لے کہ میں چونکہ صاحب شر ہوں اس واسطے خلوت اختیار کرتا ہوں تا کہ مخلوق میرے شر سے مامون ہو جاوے۔ خلاصہ یہ کہ نقص اپنے اندر سمجھے نہ دوسروں میں تو جیسے صوفیہ کی یہ تعلیم ہے۔ اسی طرح خواجہ بہاؤ الدینؒ نے یہ نہیں کہا کہ سنت میں کوئی کمی ہے بلکہ اپنے کو ضعیف اور غیر متحمل فرمایا پس اسی طرح ہم کو بھی مضر چیز کے چھوڑنے میں بھی نیت کرنی چاہئے۔ کہ ہم ضعیف ہیں۔ بہر حال ایسی شے کے ترک کی اجازت تو ہوئی خواہ تم میں تضرر (نقصان پانا) کا مادہ زیادہ ہو یا اس میں اضرار کا مادہ ہو۔ باقی محض شان اور تفاخر کے لئے کسی چیز کا چھوڑ دینا یہ سمجھ کر کہ یہ تہذیب کے خلاف ہے جائز نہیں۔ چنانچہ بعضے لوگ اس خیال سے انگلیاں نہیں چاٹتے کہ یہ خلاف تہذیب ہے حالانکہ یہ سنت ہے۔ تو ایسا سمجھنا نرا تکبر ہے۔ پس اس خیال سے کسی چیز کا چھوڑنا ہرگز جائز نہیں ہے، ہاں اگر مضر ہو تو چھوڑ دو اور اگر چھوڑنے میں کوئی ادب کی نیت نہ ہو تو مضر ہی ہونے کی نیت سہی ہم لوگوں کیلئے یہ بھی کافی ہے اور بڑے لوگوں کی حالت دوسری ہے۔ ان کو ہر بات میں ادب کی رعایت لازم ہوتی ہے۔ اگر ان سے ذرا بھی کوتاہی ہوتی ہے تو اس پر مواخذہ ہوتا ہے۔ غرض یہ مضمون تو استطرادا بیان ہو گیا۔ میں یہ بیان کر رہا تھا کہ ان بزرگ پر جلے ہوئے ٹکڑے

چھوڑنے پر عتاب ہوا۔ پس وہ اس سے کب خوش ہوں گے کہ تدبیر جوان کیلئے ایک بڑی بھاری نعمت ہے اس کو بالکل چھوڑ دیا جاوے۔ اور یہ اس وجہ سے ہے کہ تدبیر حق تعالیٰ نے مشروع کی ہے ہر کام کے اندر تدبیر کی رعایت رکھی ہے، حتیٰ کہ معجزات بھی جو کہ بلا اسباب ہوتے ہیں اکثر صورتاً ان کا بھی اقتران (ملنا نزدیک ہونا) اسباب ہی سے ہوتا ہے۔ گو وہ اسباب موثر نہیں ہوتے مگر اقتران ان کے ساتھ ضرور ہوتا ہے۔ چنانچہ حدیثوں میں موجود ہے کہ حضرت جابرؓ نے حضور ﷺ کی دعوت کی انہوں نے غزوہ خندق میں دیکھا تھا کہ حضور ﷺ کو کچھ بھوک لگی ہے۔ بس وہ جا کر اپنی بیوی سے کھانا پکانے کو کہہ آئے۔ اور آ کر حضور ﷺ سے عرض کیا کہ میں نے آپ کیلئے کچھ کھانا تیار کرایا ہے تشریف لے چلئے، آپ ؐ نے صحابہؓ سے فرمایا کہ جابرؓ نے دعوت کی ہے ان کے یہاں کھانے کیلئے یہ سن کر جابرؓ بہت گھبرائے۔ کیونکہ انہوں نے کھانا تھوڑا ہی تیار کرایا تھا۔ اور آ کر بیوی سے کہا کہ حضور ﷺ مع صحابہؓ کے تشریف لا رہے ہیں۔ اور کھانا تھوڑا، اب کیا کرنا چاہئے۔ بیوی نے کہا تم گھبراؤ نہیں حضور ﷺ کو ہماری حالت خوب معلوم ہے۔ آپ نے کچھ سمجھ کر ہی صحابہ کو ساتھ لیا ہوگا۔ غرض آپ تشریف لائے اور اپنا لعاب دہن آٹے میں اور ہنڈیا میں ڈال دیا پھر فرمایا اب پکانا شروع کر دو غرض روٹیاں پکتی گئیں اور سب لوگ کھاتے گئے حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ تمام آدمی کھانا کھا چکے اور جتنا کھانا تھا اس میں کچھ بھی کمی نہیں آئی۔ یہ معجزہ ہے لیکن اس میں بھی یہ بات دیکھنے کی ہے کہ حضور ﷺ اگر دعا فرماتے کہ ویسے ہی روٹیاں پیدا کر دے تو کیوں قبول نہ ہوتی ضرور ہوتی، چنانچہ حضرت عیسیٰؑ نے دعا کی تھی رَبَّنَآ اَنْزِلْ عَلَيْنَا مَآئِدَةً مِّنَ السَّمَآءِ۔ (اے رب! آسمان سے ہم پر مائدہ نازل کیجئے) اور وہ قبول ہوئی تھی تو اسی طرح اگر حضور ﷺ دعا فرماتے تو روٹیاں یہاں بھی غائب سے آ تیں لیکن حضور ﷺ نے چاہا کہ انہیں روٹیوں میں سے نکلیں اور اسی سالن میں سے تو دیکھئے کہ خدا تعالیٰ کی حکمتوں کی آپ نے کتنی رعایت کی ہے کہ معجزہ میں بھی ایک گونہ تدبیر کی رعایت فرمائی تو چونکہ تدبیر خدا تعالیٰ کی مشروع کی ہوئی ہے اس وجہ سے حضور ﷺ جنگ میں زرہ پہنتے تھے۔ نہ اس وجہ سے کہ آپ کو اندیشہ تھا یا اسباب پر نظر تھی۔ غرض کہ اس کافر نے جب آپ سے کہا کہ من یمنعک منی (اب آپ کو میرے ہاتھ سے کون بچائے گا) تو آپ نے بے دھڑک فرمایا اللہ۔ اس کہنے سے کافر کے بدن پر لرزہ پڑ گیا اور تلوار اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئی۔ پس حضور ﷺ نے تلوار اٹھائی اور فرمایا من یمنعک منی کہ اب تجھے میرے

ہاتھ سے کون بچائے گا۔ مگر اس کی زبان سے یہ نہ نکلا کہ اللہ تعالیٰ بچائیں گے اس کو اتنی ہمت نہ ہوئی کہ یہ جواب دے حالانکہ اگر وہ کہہ دیتا کہ اللہ کیا اللہ تعالیٰ کا نام سنکر آپ اس کو قتل کرتے ہرگز نہیں۔ اور آپ کی بڑی شان ہے بعض اولیاء اللہ کی آپ کو حکایت سناتا ہوں۔

مسلمانوں کی حضرات اہل بیتؓ سے محبت:

حضرت مرزا مظہر جان جاناںؒ فرماتے ہیں کہ مجھے وہم ہوا کرتا تھا کہ حضرات اہل بیت سے مجھے محبت نہیں ہے۔ اور اکثر اہل سنت کے متعلق لوگوں کا یہ خیال ہے کہ ان کو جتنی محبت صحابہ سے ہے اتنی اہل بیت سے نہیں ہے۔ چنانچہ ایک صاحب نے مجھ سے یہ شبہ کیا بھی تھا کہ میں نے کہا کہ وجہ یہ ہے کہ ہندوستان میں صحابہ کے منکر تو ہیں۔ اس لئے ان کی نصرت اور حمایت میں اہتمام کیا جاتا ہے اور اہل بیت کے منکر نہیں اس لئے ان کے متعلق اس قدر اہتمام نہیں کیا جاتا۔ اس وجہ سے شبہ ہوتا ہے کہ اہل بیت سے محبت نہیں تو جیسے اکثر لوگوں کو یہ شبہ ہوتا ہے۔ حضرت مرزا صاحب کو بھی یہ خیال ہوا اور اس کی وجہ سے پریشان ہوئے۔ آخر ایک مرتبہ ایسا اتفاق ہوا کہ ایک شخص نے آپ کے سامنے صحابہ کی شان میں گستاخی کی آپ سن کر غصہ سے بے تاب ہوئے۔ اور تلوار نکال کر چاہا کہ اس کا کام تمام کردیں اس نے کہا کہ امام حسینؓ کے واسطے مجھ کو چھوڑ دو۔ بس امام حسینؓ کا نام سنکر آپ کی یہ حالت ہوئی کہ بدن پر لرزہ پڑ گیا اور پھر اس پر ہاتھ نہ اٹھ سکا اس سے آپ کو تسلی ہوئی کہ مجھ کو اہل بیت کے ساتھ بھی محبت ہے تو جب امام حسینؓ کا نام سن کر حضرت مرزا صاحب کی یہ کیفیت ہوئی تو کیا خدا کا نام سن کر حضور ﷺ اس کو قتل کر دیتے کبھی نہیں اور یہ اس کو بھی معلوم تھا۔ مگر چونکہ اس کے دل میں خدا تعالیٰ پر بھروسہ نہ تھا اس وجہ سے اس زبان سے بھی نہ نکلا۔ غرض یہ حالت تھی انبیاء کی شجاعت کی کہ ایسے سخت سخت موقعوں میں بھی ذرا نہ ڈرتے تھے۔ حالانکہ اس وقت تبلیغ کا وقت بھی نہ تھا۔ تو اس سے معلوم ہو سکتا ہے کہ تبلیغ کے اندر وہ کسی سے کیا اندیشہ کریں گے۔ پس اگر ان کے سامنے کسی کا قول نقل کیا جاوے اور ساکت ہو جاویں تو ان کا سکوت اس وجہ سے ہوگا کہ وہ قول ان کے نزدیک صحیح ہے انکی نسبت دب جانے کا احتمال ہرگز نہیں ہوگا۔

حدیث تقریری:

غرض یہ مسئلہ ثابت ہے کہ اگر خدا اور رسول ﷺ کسی کلام پر سکوت فرماویں تو وہ دلیل

اسکی صحت کی ہے چنانچہ جس کو حدیث تقریری کہتے ہیں وہ یہی ہے کہ اگر کسی بات کو دیکھ کر حضور ﷺ انکار نہ فرماویں تو محدثین اسکی نسبت کہتے ہیں کہ حضور ﷺ کی حدیث ہے اور اسی طرح اگر خدا تعالیٰ نقل فرما کر انکار نہ فرما دیں وہ خدا تعالیٰ ہی کا قول ہے پس یہ مقولہ گو جنوں کا ہے مگر جب حق تعالیٰ نے نقل فرما کر انکار نہیں کیا تو یہ حق تعالیٰ ہی کا ارشاد ہوا۔ یہ میں نے اس لئے کہا کہ شاید ترجمہ دیکھ کر کسی کو شبہ ہو کہ استدلال جنوں کے قول سے کیا ہے تو سمجھ لو کہ یہ خدا تعالیٰ ہی کا قول ہے۔

تفسیر آیت متلو:

غرض وہ جن قرآن سنکر اپنی قوم کے پاس گئے اور جا کر وہ مقولہ کہا جو یہاں مذکور ہے۔ اور اب وہ ارشاد ہو گیا خدا تعالیٰ کا تو فرماتے ہیں کہنا مانو خدا کی طرف سے پکارنے والے کا آگے اجیبو (کہنا مانو) کی تفسیر ہے کہ امنو ابہ تصدیق کرو آپ کی یہ نہیں کہ زبان سے کہہ لیا کہ ہاں صاحب اور آگے کچھ بھی نہیں بہت سے لوگوں کی اجابت اس قسم کی ہوتی ہے کہ زبان سے کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے لیکن جب احکام سنے تو ہٹنے لگے۔ اس لئے کہتے ہیں کہ امنو بہ کہ دل سے مانو اگر ایسا کرو گے تو کیا ثمرہ ملے گا۔ یہ ملے گا کہ یغفر لکم من ذنوبکم اور تمہارے گناہوں کو بخش دیں گے وَیُجِرْکُمْ مِنْ عَذَابٍ اَلِیْمٍ اور تم کو دردناک عذاب سے پناہ دیں گے۔ یہ مضمون گو ظاہراً اس مجلس کے مناسب نہ تھا اس لئے کہ آیت میں تو خطاب ان کو تھا جو ایمان لائے تھے۔ اور یہاں تو سب مومن ہی ہیں۔ مگر میں نے اس کو اس لئے اختیار کیا ہے کہ مجھے لفظ داعی سے ایک مرض کا ازالہ کرنا ہے۔ جو بعض مومنوں میں بھی ہے۔ وہ یہ کہ آج کل احکام شرعیہ میں نکتہ چینی کی جاتی ہے۔ بعض تو کرتے ہیں ان کو احکام اجتہاد سمجھ کر رد کرنے کیلئے اور بعض محققانہ طور پر سمجھنا چاہتے ہیں۔ چنانچہ ہر چیز کی فلسفی اور راز معلوم کرنا چاہتے ہیں اور علماء کو مکلف کرتے ہیں کہ احکام کے اسرار بتلائیں۔ اور یہ مرض عام ہو رہا ہے مگر اس کا الزام جیسا زیادہ حصے ہیں مریض پر ہے۔ تھوڑا سا طبیب پر بھی ہے کیونکہ مرض بڑھتا ہے۔ کبھی تو مریض کی بدپرہیزی سے اور کبھی طبیب کی بے جا رعایت سے مثلاً اگر کسی کو مٹھائی مضر ہو اور مریض کی درخواست پر طبیب اس کو مٹھائی کی اجازت دے دے تو ظاہر ہے کہ مرض بڑھے گا۔ اور ایسی رعایت یا تو اپنی مصلحت سے ہوگی یا اخلاق کی وجہ سے کہ کوئی یہ نہ کہے کہ بڑے سخت ہیں اس الزام سے بچنے کیلئے طبیب کہے کہ اچھا بھائی کھالو سو خوب سمجھ لو کہ طبیب کو

اس کی کچھ پرواہ نہ کرنی چاہئے کہ مجھے کوئی خوش اخلاق کہے گا یا نہیں پس طبیب اگر اس قصد سے مریض کو مضر چیز کی اجازت دیدے تو مرض بڑھنے کا الزام خود اسی پر ہے اور اگر یہ قصد نہیں بلکہ وہ اس کو مضر نہیں سمجھتا تو وہ اس قسم کی تو غلطی نہیں ہوگی۔ مگر طبابت کی غلطی ضرور ہوگی۔

اب سمجھئے کہ میرا مقصود اس وقت بیان کرنا یہ ہے کہ عوام نے تو یہ شیوہ اختیار کیا ہے کہ ہر چیز کے اسرار تلاش کرتے ہیں خواہ ان کا مقصود اس سے کچھ ہی ہو رد کرنا ہو یا تحقیق۔

علماء کو اسرار احکام نہ بتلانے کی نصیحت:

اور علماء نے اپنے اخلاق سے ان کے ساتھ چلنا شروع کیا ہے کہ جو کچھ انہوں نے پوچھا وہ بتلانے لگے یہ کہنا ہی نہیں جانتے کہ یہ سوال فضول ہے تو اس کے سبب دو ہیں، اور دونوں میں غلطی ہے۔ کبھی تو یہ سبب ہوتا ہے کہ علماء یہ خیال کرتے ہیں کہ اگر میں نے اس کو تسلی کا جواب نہ دیا اور کہہ دیا کہ یہ سوال فضول ہے تو یوں سمجھے گا کہ علماء کچھ نہیں جانتے مجھے سمجھا نہ سکے۔ اس خیال کا اثر اچھا نہ ہوگا تو علماء اس مصلحت کے خیال سے عوام کے ساتھ ہو لیتے ہیں اور یہ علماء کی وہ نیت ہے کہ ممکن ہے دینی نیت ہو۔ یعنی ان کو یہ خیال ہوتا ہے کہ اگر میں بتلاؤں گا تو دین کا ضرر لازم آئے گا اس لئے ایسا کرتا ہوں تو سمجھ لو کہ اگر کوئی جاہ کیلئے ایسا کرتا ہے وہ تو برا ہے ہی لیکن اگر دینی مصلحت کی نیت سے کرتا ہے۔ جب بھی غلطی ہے کیونکہ حفظت شيئا وغابت عنك اشياء (تمہاری ایک مصلحت کی رعایت سے بہت سی مصلحتیں فوت ہوگئیں) اس مصلحت کی رعایت سے دوسری دینی خرابیاں جو پیدا ہوتی ہیں انکو بھی تو دیکھنا چاہئے وہ یہ کہ ایسا کرنے سے باب سوال وسیع ہوتا ہے اور اس قدر وسیع ہوتا ہے کہ بعض اوقات آپ بھی تحمل نہ کرسکیں گے یعنی جب آپ نے ان کر ہر بات کا جواب دے دے کر اور اسرار بتلا بتلا کر عادی کر دیا سوال کا تو ممکن ہے کہ کل وہ یوں کہیں کہ زکوٰۃ چالیسواں حصہ کیوں مقرر ہوئی تو اس وقت آپ کو بھی یہی کہنا پڑے گا کہ یہ تو ہم کو معلوم نہیں اور یہ سوال فضول ہے تو جب آخر ایک مرتبہ یہ کہنا ہی ہے تو ایسے سوال کی کیوں نوبت آنے دیجئے۔ ابھی سے کیوں نہ ایسا کیجئے اور اس وقت ان کو عادی بنا کر اس طرح کہنے میں بڑی مشکل ہوگی۔ اس وقت تو ان کو یقین ہو جائے گا کہ آپ اس کی مصلحت نہیں جانتے ورنہ جیسے اور چیزوں کی مصلحتیں تھیں۔ اس کی مصلحت بھی بتلا دیتے اور اسی کا ایک شعبہ یہ ہے کہ اکثر لوگ ہر حکم کی دلیل قرآن سے طلب کرتے ہیں۔

داڑھی کا ثبوت:

چنانچہ داڑھی کے متعلق ایک استفتاء چھپا تھا کہ داڑھی رکھنا قرآن سے ثابت کرو۔ میں نے کہا کہ اس کی کیا ضرورت ہے کہ قرآن ہی سے ثابت ہو۔ ضرورت تو دلیل صحیح کی ہے۔ خواہ قرآن سے ہو یا حدیث سے یا قیاس یا اجماع سے کیونکہ یہ چاروں ادلۂ شرعیہ (شرعی دلیلیں) ہیں تو جس دلیل سے بھی ثابت کر دیا جاوے اسکے بعد کسی کو یہ کہنے کا حق نہیں کہ اس دلیل سے نہیں فلاں دلیل سے ثابت کرو جیسے عدالت کے گواہ کہ وہاں ضرورت اس کی ہے کہ معتبر گواہوں سے دعوے کو ثابت کیا جائے۔ پس جب معتبر گواہوں سے دعوے کو ثابت کر دیا تو مدعا علیہ اگر یوں کہے کہ میں تو ان کی گواہی نہیں جانتا فلاں ہی شخص گواہی دے گا تو مانوں گا تو یہ بات اس کی ہرگز نہیں سنی جائے گی۔ کیونکہ گواہ معتبر ہونے چاہئیں یہ کیا واہیات کہ گواہ ہیں تو معتبر مگر میں ان کی نہیں مانتا تو اسی طرح شرعی ادلہ (شرعی دلیلیں) گواہ ہیں ہم کو اختیار ہے کہ خواہ قرآن سے ثابت کریں۔ خواہ حدیث سے خواہ قیاس سے خواہ اجماع سے سائل کو حق نہیں ہے کہ وہ فرمائش کرے کہ قرآن ہی سے ثابت کرو سائلوں کو خبط ہے ہی مجیبوں کو بھی خبط ہے وہ بھی اس کی کوشش کرتے ہیں کہ ہر بات کو قرآن سے ثابت کر دیں۔ چنانچہ ایک صاحب ملے کہنے لگے کہ مجھ سے ایک شخص نے سوال کیا کہ داڑھی کا ثبوت قرآن سے ہونا چاہیے تو میں نے داڑھی کو قرآن سے ثابت کر دیا وہ اس طرح کہ حضرت ہارونؑ کے قصہ میں ہے لَا تَاْخُذْ بِلِحْیَتِیْ یعنی میری داڑھی نہ پکڑیئے۔ اس سے معلوم ہوا کہ ہارونؑ داڑھی رکھتے تھے۔ میں نے کہا کہ اس کو سن کر وہ سائل کیا بولا کہنے لگے کہ وہ مان گیا میں نے کہا کہ اس سے تو داڑھی کا وجود ثابت ہوتا ہے وجوب کہاں ثابت ہوا تو آپ کیا جواب دیتے کہنے لگے کہ اس کو اتنی عقل کہاں تھی کہ یہ پوچھتا۔ سو آج کل مجیبوں نے یہ طرز اختیار کر رکھا ہے۔ مگر سمجھو کہ یہ بنیاد کو کھوکھلی کرنا ہے اگر ایسی بنیاد پر مکان بنائیں گے تو بہت جلد مکان گر پڑے گا مثلاً اگر وہ اسی وقت یہ کہہ دیتا کہ اس سے تو داڑھی کا صرف وجود ثابت ہوا وجوب کیسے ثابت ہوا۔ تو اب ان کے پاس کیا جواب تھا تو اگر ایسے جواب دیئے جاویں گے تو اس پر شبہات ہوں گے اور اس سے سائل سمجھے گا کہ شریعت کے دلائل ایسے ہی ہوتے ہیں سو اس طرز کے اختیار کرنے میں یہ ضرر ہے پس اصلی جواب یہ ہے کہ تم کو اس کے کہنے کا منصب نہیں ہے کہ قرآن سے ثابت کرو۔ ہم چاروں دلیلوں میں سے

[illegible]

[illegible]

[illegible]

ایک منادی کرنے والے کو سنا کہ وہ ندا کر رہا ہے اور منادی کرنے والے اس واسطے کہا کہ ہمارے محاورے میں منادی مصدر کے معنی میں مستعمل ہوتا ہے۔ تو دیکھئے اس آیت میں منادی فرمایا ہے۔ پس معلوم ہوا کہ منادی اور داعی ایک ہی بات ہے۔ منادی سے مراد بھی حضور ﷺ ہیں اور یہاں بھی حضور ﷺ ہی مراد ہیں تو لفظ داعی سے اس بات کو بتلا دیا کہ حضور ﷺ کے ارشاد کے ساتھ کیا عمل کرنا چاہئے ایک مختصر لفظ میں بہت بڑی بات بتلائی اور وہ ایسی صاف بات ہے کہ روزمرہ دیکھتے ہو۔ مثلاً ابھی کوئی شخص سامنے سے یہ کہتا ہوا نکلے کہ صاحب کلکٹر کا یہ حکم ہے تو آپ کی کیا حالت ہوگی۔ ظاہر ہے کہ دو حالتیں ہوتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ اس شخص کو جھوٹا سمجھا اور سرکاری حکم ہونے کا یقین نہ ہوا۔ دوسرے یہ کہ اس کو سچا سمجھا اور یقین ہو گیا کہ سرکاری حکم ہے۔ خواہ یہ یقین کسی وجہ سے ہو عقل سے ہو یا اس وجہ سے کہ اس کو آپ جانتے ہیں کہ معتبر شخص ہے، یا اس وجہ سے کہ اس کو کہتے ہوئے پولیس سن رہی ہے اور کسی نے اس کو روکا نہیں یا کلکٹر کے بنگلہ سے کہتا ہوا نکلا تو معلوم ہوا کہ یہ سرکاری منادی ہے۔

خبر قطعی کا حکم:

اور یہاں سے ایک اور بات یاد آ گئی، حدیث میں ہے کہ جب تحویل قبلہ ہوا تو قبا میں اس وقت خبر ہوئی جبکہ لوگ صبح کی نماز میں تھے ایک شخص نے آ کر خبر دی کہ اب کعبہ کی طرف رخ کرنے کا حکم ہو گیا ہے وہ سنتے ہی کعبہ کی طرف پھر گئے یہاں ایک شبہ ہوتا ہے کہ پہلا حکم تو قطعی تھا اور یہ دوسرا خبر واحد سے معلوم ہوا جو کہ ظنی ہوتی ہے۔ اور ظاہر ہے کہ حکم ظنی حکم قطعی کا ناسخ نہیں ہو سکتا پھر اہل قبا نے اس خبر پر کیسے عمل کیا تو میری تقریر سے اس کا جواب ہو گیا کہ کلکٹر کے بنگلہ سے کہتا ہوا نکلا۔ خلاصہ جواب کا یہ ہے کہ یہ خبر قطعی تھی کیونکہ قطعیات صرف خبر دینے والوں کی تعداد ہی سے نہیں ہوتی بلکہ قرائن مقامیہ سے بھی ہوتی ہے اور وہ قرینہ اس جگہ یہ ہے کہ عہد نبوت میں ایک شخص علی الاعلان حضور ﷺ کی نسبت ایسا کہے کہ آپ نے یہ حکم دیا ہے اس طرح جھوٹ کہنے کی کسی کو ہمت نہیں ہو سکتی۔ نیز اس میں دلائل نبوت کا بھی ذکر ہو گیا کہ جب ایک شخص دعویٰ نبوت کا کرے اور حق تعالیٰ کی طرف سے اس کی تکذیب نہ ہو بلکہ معجزات اس کے ہاتھ پر ظاہر فرما کر اور اس کی تصدیق کر دی جائے تو وہ واقعی نبی ہے۔ یہ حقیقت ہے نبوت پر معجزات سے استدلال کی اور دوسرا

اگر یہ جن نیک ہے تو اس شخص کو کیوں ستاتا ہے اور اگر نیک نہیں تو نماز کا کیوں کہتا ہے۔ میں نے لکھا کہ یہ جن نہیں ہے بلکہ یہ اس کی حرارت اور کچھ شرارت ہے چنانچہ کچھ دنوں بعد وہاں سے خط آیا واقعی اس پر جن نہ تھا بلکہ نماز پڑھوانے کیلئے اس نے یہ تدبیر کی تھی۔ سو اس نے تو ایک مصلحت کیلئے مکر کیا تھا بعض تو بالکل پریشان کرنے کو اور دھمکی دینے کو کہتے ہیں۔ دھمکی پر یاد آیا کہ ایک بڈھے نے مولوی صاحب کے کہنے سے نماز شروع کر دی تھی اتفاق کی بات کہ دو چار روز کے اندر ان کے یہاں کئی جانور مر گئے بیٹوں نے کہا کہ بڈھے نے نماز شروع کی ہے خدا خیر کرے آخر سب مشورہ کر کے باپ کے پاس گئے اور کہنے لگے کہ بابا تو نے جب سے نماز شروع کی ہے اس وقت سے گھر پر تباہی آ رہی ہے تو نماز چھوڑ دے بڈھے نے کہا کہ میں تو نہیں چھوڑتا بیٹے خوشامد کرنے لگے۔ بڈھے نے کہا کہ اچھا اگر میری خدمت اچھی طرح کیا کرو تو چھوڑ دوں گا بیٹوں نے منظور کر لیا غرض بڈھے کی خوب خاطر ہونے لگی اب جب کبھی بڈھے کی خدمت میں کمی ہوتی تو کہتا لاؤ میرا الکھڑا میں وضو کر کے نماز پڑھوں۔ بس یہ سنتے ہی بیٹے ڈر جاتے اور خوشامد کر کے راضی کر لیتے تو جیسے یہ نماز کی دھمکی دیتا تھا ایسے ہی بعض جنوں کی دھمکی نکالتے ہیں اور کہیں مرض ہوتا ہے اور کہیں واقعی جن بھی ہوتا ہے۔ بعض جگہ تو ایسی دلیلیں ہیں کہ انکار ہو ہی نہیں سکتا۔ ہمارے اطراف میں ایک اللہ بخش ہیں کہتے ہیں کہ وہ بھوت ہو گیا ہے خیر یہ تو غلط خیال ہے کیونکہ بھوت کوئی چیز نہیں حضور علیہ السلام فرماتے ہیں لا غول ولا صفر یعنی نہ آدمی مر کر بھوت ہوتا ہے نہ صفر کی نحوست کوئی چیز ہے۔ مگر جنوں کا انکار نہیں۔ جنوں سے بیشک ایسے واقعات ہوتے ہیں گو بعض لوگوں نے اس کا بالکل انکار کیا ہے۔

جن بھگانے کے لئے اذان:

مگر حدیث میں ہے۔ اذا تغولت الغیلان نادیٰ بالاذان یعنی جگہ جن کسی شکل کے اندر ظاہر ہو تو اذان پکار کر کہہ دے اس پر مجھے یاد آیا کہ بعض لوگ طاعون پر اذان کہتے ہیں اور استدلال یہ کرتے ہیں کہ طاعون ہے جن سے اور تغول جن (جن کی شکل میں ظاہر ہونے) کے لئے اذان کہنا آیا ہے۔ یہ تو استدلال صحیح نہیں کیونکہ تغول دفعۃً ہوتا ہے اور اس سے دفعۃً ہی ضرر پہنچتا ہے تو اگر اس کے لئے نماز کی اذان کا انتظار کریں تو اتنی دیر میں وہ تباہ کر دے گا۔ اور طاعون کا ضرر دفعۃً نہیں ہوتا پس اس میں جو جن ہیں وہ نماز مغرب کی اذان سے اور دوسرے اوقات کی

نماز کی اذان سے بھاگ جائیں گے تو اس کیلئے مستقل اذان کی کیا ضرورت ہے خیر یہ تو جملہ معترضہ تھا اصل بات یہ ہے کہ جب حدیث میں اذا تغولت الغیلان ہے تو لاغول کے معنی یہ ہیں کہ آدمی مر کر بھوت نہیں ہوتا اب رہی یہ بات کہ وہ تو مرے ہوئے شخص کا نام بتلاتے ہیں کہ میں فلانا ہوں تو وہ جھوٹ اپنا نام بدل کر بتلا دیتے ہیں

ہمزاد کی حقیقت:

اور اگر کہئے کہ وہ اس کا ہمزاد ہے تو سنئے ہمزاد کے معنی لوگ یوں سمجھتے ہیں کہ انسان کے ساتھ اس کی ماں کے پیٹ سے پیدا ہوتا ہے سو یہ تو محض لغو بات ہے حدیث میں اتنا آیا ہے کہ ہر انسان کے ساتھ ایک شیطان ہے۔ سو اگر ہمزاد اس کو کہا جاوے تو خیر یہ بات صحیح ہو سکتی ہے اور ہمزاد اس کو اس لئے کہہ سکتے کہ وہ اپنی ماں سے اس کے ساتھ ایک وقت میں پیدا ہوا ہے تو اس کا ہمزاد ہو یا اور کوئی جن ہو وہ کہہ دیتا ہے کہ میں فلاں ہوں تو وہ دراصل اس شخص کی روح نہیں ہوتی بلکہ وہ جن ہوتا ہے، کیونکہ حدیث میں بھوت کا انکار آیا ہے دوسرے وہ مر کر اما الی الجنۃ واما الی النار (یا تو جنت کی طرف یا دوزخ کی طرف) چلا جاتا ہے تو اسے اس کی فرصت کہاں کہ لوگوں کو لپٹتا پھرے۔ پس وہ درحقیقت وہ شخص نہیں ہے جس کا نام بتلا رہا ہے۔ بلکہ وہ جن ہے اور اس کا نام بتلاتا ہے غرض یہ کہ وہ اللہ بخش جاہلوں پر آتا ہے اور وہ جاہل قرآن پڑھنے لگتا ہے۔ اور ایک عجیب قصہ ہے کہ ایک جاہل پر وہ آیا اور اس کیلئے ایک عامل نے تعویز لکھا تو وہ کہنے لگا کہ یہ چال تو غلط ہے پھر غور کر کے دیکھا تو وہ چال غلط تھی۔ اب ایک شبہ یہ ہے کہ جو منکر ہیں ان کو کیوں نہیں لپٹتا تو سمجھو کہ انسان میں ایک قوت دافعہ بھی ہے! اس کا خاصہ یہ ہے کہ اگر تخیل کرے کسی چیز کے دفعہ کا تو وہ چیز اسے نہیں ستا سکتی انسان کی قوت فاعلہ بھی جن سے زیادہ ہے اور قوت دافعہ بھی تو اگر کوئی شخص یہ خیال کر کے بیٹھ جاوے کہ مجھے کوئی نہ ستاوے گا تو اس کو کوئی نہیں ستا سکتا اور اگر کوئی کہے کہ پھر اس سے تو منکر ہی اچھے وہ انکار کی بدولت ان کے ضرر سے تو بچے ہوئے ہیں۔ پس ہم بھی انکار سے یہ کام لیں تو میں کہتا ہوں کہ ہم آیۃ الکرسی سے یہ کام کیوں نہ لیں اور سورۂ جن سے کیوں نہ لیں۔ اب بحمد اللہ اس کے متعلق سب باتیں محقق ہو گئیں۔ اب اس میں یہ تاویل کرنا کہ آیت میں جن سے وہ لوگ مراد ہیں کہ جو چھپ کر قرآن سنا کرتے تھے یہ نری تحریف ہے ذرا کسی تاریخ سے

یہ تو بتلاؤ کہ جو چھپ کر قرآن سنا کرتے تھے انہوں نے اپنی قوم میں جا کر اسلام پھیلایا ہو۔

جنات کے جنتی ہونے کا ثبوت:

اب وہ مسئلہ بتلاتا ہوں کہ اس میں علماء کا اختلاف ہوا ہے وہ یہ کہ اگر جن عمل صالح کریں تو ان کو جنت ملے گی یا نہیں ایک قول امام صاحبؒ کا ہے عذاب سے تو بچیں گے لیکن جنت میں جانے کا حکم نہیں کیا جا سکتا اور اسی آیات سے استدلال کیا ہے کہ اس میں ایمان لانے پر مغفرت اور عذاب سے نجات کا وعدہ ہے جنت کا وعدہ نہیں تو امام صاحب نے بہت احتیاط کی ہے کہ جس کی تصریح نہ تھی اس میں توقف فرمایا اصل قول تو امام صاحب کا اتنا ہے اور یہ بھی احتیاط کی بنا ہے کہ اثبات بھی نہ کریں اور انکار بھی نہ کریں مگر اب مشہور قول یہ ہے کہ وہ جنت میں نہ جاویں گے۔ باقی پھر کہاں ہوں گے۔ تو اس کے متعلق مختلف احتمال ہیں بعض کے میں کہا ہے یہ ہے امام صاحب کے مذہب کا حاصل مگر جو میری سمجھ میں آتا ہے وہ عرض کرتا ہوں کہ ظاہر آیہ امام صاحب کی احتیاط ہے اور یہ بھی ثابت نہیں کہ آخر تک امام صاحب اسی قول پر رہے کیونکہ دوسری آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر جن اچھے عمل کریں گے تو جنتی ہوں گے۔ میں تو اس کو قریب قریب قطعی سمجھتا ہوں ایک تو سورۂ رحمٰن میں جنت کی نعمتیں ذکر کر کے فرمایا ہے فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ (پھر تم (اے جن وانس اپنے رب کی کونسی نعمت کا انکار کرتے ہو) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جنت کی نعمتیں دونوں کو ملیں گی نیز یہ بھی فرمایا کہ لَمْ یَطْمِثْھُنَّ اِنْسٌ قَبْلَھُمْ وَلَا جَآنٌّ (یعنی حوروں کو ان سے پہلے نہ کسی انسان نے ہاتھ لگایا ہوگا نہ کسی جن نے) تو اگر جن کا احتمال ہی نہ تھا۔ تو یوں کیوں فرمایا اور اس سے بھی صاف لیجئے کہ فَرِیْقٌ فِی الْجَنَّۃِ وَفَرِیْقٌ فِی السَّعِیْرِ ایک فریق جنت میں ہوگا۔ اور ایک فریق دوزخ میں ہوگا تو دو فریق فرمائے ہیں تیسرا فریق نہیں فرمایا اور یہ یقین ہے کہ دوزخ سے بچے رہیں گے۔ تو اب اگر وہ جنت میں جاویں تو تیسرا فریق ہونا لازم آتا ہے نہ فریق فی الجنۃ (جنت کے فریق) میں داخل ہوئے نہ فریق فی السعیر (دوزخ کے فریق) میں اب رہی یہ بات کہ بعض آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ کچھ لوگ اعراف میں بھی رہیں گے۔ پس تیسرے فریق کا بھی ثبوت ہوا۔ مگر یہ شبہ بہت جلد زائل ہو جاوے گا کیونکہ اسی مقام پر فرماتے ہیں اُدْخُلُوا الْجَنَّۃَ لَا خَوْفٌ عَلَیْکُمْ وَلَآ اَنْتُمْ تَحْزَنُوْنَ۔ (تم جنت میں داخل ہو جاؤ تم پر کوئی

خوف نہیں تم رنجیدہ ہو گے) اس میں دو تفسیریں ہیں۔ ایک تو وہ جو میں اختیار کرتا ہوں کہ یہ اہل اعراف کا قول ہے وہ دوزخیوں کو چڑانے کے لئے اہل جنت کے بارہ میں کہیں گے کہ

اہل اعراف امیدوار جنت ہوں گے:

اَهٰؤُلَآءِ الَّذِيْنَ اَقْسَمْتُمْ لَا يَنَالُهُمُ اللّٰهُ بِرَحْمَةٍ (کیا یہ وہی لوگ ہیں جن کے بارہ میں تم قسمیں کھاتے تھے کہ اللہ تعالیٰ ان پر رحمت نہیں کرے گا۔

قِيْلَ لَهُمُ ادْخُلُوا الْجَنَّةَ (لو دیکھو انہیں تو یہ کہہ دیا گیا کہ تم جنت میں چلے جاؤ تم پر کوئی خوف نہیں اور نہ تم رنجیدہ ہو گے۔ دوسرا ایک قول اور ہے کہ یہ خدا تعالیٰ کا ارشاد ہے اہل اعراف کیلئے ادْخُلُوا الْجَنَّةَ یعنی تم بھی جنت میں داخل ہو جاؤ۔ سو اس آیت میں تو دونوں احتمال ہیں۔ مگر میں دوسری آیت سے استدلال کرتا ہوں فرماتے ہیں وَبَيْنَهُمَا حِجَابٌ وَعَلَى الْاَعْرَافِ رِجَالٌ يَّعْرِفُوْنَ كُلًّا بِسِيْمَاهُمْ وَنَادَوْا اَصْحَابَ الْجَنَّةِ اَنْ سَلَامٌ عَلَيْكُمْ لَمْ يَدْخُلُوْهَا وَهُمْ يَطْمَعُوْنَ ۔ (ان دونوں کے درمیان ایک آڑ ہوگی اور اعراف کے اوپر بہت سے آدمی ہوں گے وہ لوگ ہر ایک کو ان کے قیافہ سے پہچانیں گے اور جنت والوں کو پکار کر کہیں گے السلام علیکم ابھی یہ اہل اعراف جنت میں داخل نہ ہوئے ہوں گے اور اس کے امیدوار ہوں گے) اس سے معلوم ہوا کہ اہل اعراف کو جنت میں داخل ہونے کی امید ہوگی اور عالم آخرت عالم انکشاف حقائق ہے وہاں غلط امید نہیں ہو سکتی دوسرا استدلال اور ہے کہ سورۂ حدید میں ہے فَضُرِبَ بَيْنَهُمْ بِسُوْرٍ لَّهٗ بَابٌ بَاطِنُهٗ فِيْهِ الرَّحْمَةُ وَظَاهِرُهٗ مِنْ قِبَلِهِ الْعَذَابُ ۔ (پھر ان کے درمیان ایک دیوار قائم کر دی جاوے گی جس میں ایک دروازہ ہوگا کہ اس کے اندرونی جانب رحمت ہوگی اور بیرونی جانب عذاب ہوگا۔)

اہل اعراف:

مگر اس سے قبل سمجھئے کہ حدیث میں ہے کہ تین قسم کے لوگ ہوں گے ایک وہ کہ ان کے حسنات زیادہ ہوں گے سیئات سے وہ تو جنت میں جائیں گے۔ یہ لوگ اعراف میں ہوں گے اب سنئے بِسُوْرٍ لَّهٗ بَابٌ کو مفسرین نے بالاجماع اعراف کہا ہے تو اس کے دو رخ ہیں۔ ایک طرف عذاب ہے اور ایک طرف رحمت ہے تو وہاں دونوں طرف کا اثر ہے۔ اور اب دوسرا مقدمہ

یہ سمجھئے کہ مومن میں سے جو جاویں گے وہ گناہوں کی سزا ملنے کے بعد جنت میں جاویں گے۔ تو اہل اعراف جوان سے اصلح حال ہیں وہ کیوں جنت میں نہ جاویں گے اور گفتگو ان جنوں میں ہو رہی ہے جو صالح ہوں ہاں اس کے ہم بھی قائل ہوں گے کہ جنوں میں بھی تین قسم کے لوگ ہوں گے اس میں سے ایک قسم کے لوگ وہ بھی ہیں جن کے حسنات وسیئات برابر ہوں گے اور وہ اولا اعراف میں ہوں گے مگر کچھ دنوں کے بعد پھر جنت میں جاویں گے اور اعراف کے متعلق ایک اور بات یاد آئی جو عوام میں مشہور ہے اور بالکل غلط ہے وہ یہ کہ رستم اور نوشیرواں اور حاتم طائی یہ سب اعراف میں رہیں گے۔ لوگوں کی بھی عجیب حالت ہے اپنی طرف سے جو چاہتے ہیں کہہ دیتے ہیں گویا یہ اس محکمہ کے حاکم ہیں کہ ان کے اختیار میں ہے جس کو جہاں چاہیں بھیج دیں۔ خوب سمجھ لو کہ اگر ان کا خاتمہ کفر پر ہوا ہے تو محض سخاوت یا شجاعت یا عدالت کی وجہ سے جنت کے مستحق نہیں ہو سکتے کسی کے اندر کتنی ہی خوبیاں ہوں جب تک ایمان نہ ہوگا سب بیکار ہیں۔ مجھے یہ شعر یاد آتا ہے

شاہد آں نیست کہ موئے ومیانے دارد　　　بندۂ طلعت آں باش کہ آنے دارد

(محبوب وہ نہیں جو پتلی کمر اور عمدہ بال رکھتا ہو بلکہ محبوبیت ایک آن اور ادا میں ہوتی ہے) آجکل بعض لوگ کفار کی ظاہری خوبیاں دیکھ کر ان کے مقابلہ میں مسلمانوں کو ذلیل سمجھتے ہیں مگر سمجھئے کہ ان کا ایک ایمان سب کے مقابلہ میں ہے ان میں ایک ایمان کی آن ایسی ہے کہ اس کے مقابلہ میں دوسروں کی ساری خوبیاں ہیچ ہیں کیونکہ

شاہد آں نیست کہ موئی ومیانے دارد　　　بندۂ طلعت آں باش کہ آنے دارد

(محبوب وہ نہیں جس کے عمدہ بال اور پتلی کمر ہو بلکہ محبوب وہ ہے جس کے ایک آن اور ادا ہو)

ایک شخص نے مجھ سے خود اپنا مرض بیان کیا کہ مجھ کو ایک عورت سے تعشق ہو گیا ہے۔ میں نے کہا کیا وہ عورت خوبصورت ہے کہنے لگا کہ میں اس کی ایک آن پر عاشق ہوا ہوں اس سے یہ کہنا کہ اس کی ناک تو چپٹی ہے حماقت ہے۔ آپ تعجب کریں گے کہ بعض کو بڈھوں کے ساتھ بھی عشق ہوتا ہے۔ مشہور ہے کہ لیلیٰ بڈھیا ہو گئی تھی مگر مجنوں اسی کے پیچھے دیوانہ تھا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس کے حسن پر عاشق نہ تھا کیونکہ

عشقہائے کز پے رنگے بود　　　عشق نبود عاقبت ننگے بود

(جو عشق محض رنگ و روپ پر ہوتا ہے وہ واقع میں عشق نہیں ہوتا محض ننگ و نام ہوتا ہے)

تو بات کیا ہے لیلیٰ میں کوئی آن تھی جو مجنوں کو پسند آ گئی تھی ورنہ صورت تو اس کی یہ تھی۔

گفت لیلیٰ را خلیفہ کاں توئی کز تو مجنوں شد پریشان و غوی

(لیلےٰ سے خلیفہ نے پوچھا کہ تو وہی ہے جس سے مجنوں پریشان اور عقل گم کردہ ہو گیا ہے۔)

از دگر خوباں تو افزوں نیستی گفت خامش چوں تو مجنوں نیستی

(دوسرے حسینوں سے تو کسی بات میں زیادہ تو ہے نہیں پھر کیا بات ہے اس نے جواب دیا جب تو مجنوں نہیں تو خاموش ہی رہ)

حلاوت اعمال:

تو مسلمانوں کی یہ ادا جس کو ایمان کہتے ہیں ایسی ہے کہ حق تعالیٰ کو یہ پسند ہے آپ دوسرے اخلاق کو لئے پھرتے ہیں۔ تو حاتم طائی وغیرہ میں گو اخلاق تھے لیکن اگر ایمان نہ تھا تو اللہ میاں کو ہی اخلاق نرے پسند نہیں تو ان کے لئے زبردستی اعراف تجویز کرنا یہ غلطی ہے۔ غرض اعراف کا ذکر اس پر آ گیا تھا کہ بعض لوگوں نے جنوں کو اعراف میں کہا ہے کہ تو امام صاحبؒ نے اول نظر میں ممکن ہے فرما دیا ہو۔ یہ ہے میرا خیال اس کے متعلق خیر یہ تو متعلقات تھے۔ اب میں اصل مقصود کا پھر اعادہ کرتا ہوں اور بیان کو ختم کرتا ہوں کہ غور کرو کہ حضور ﷺ اور آپ کے نائب وائی ہیں تو ان کے ساتھ وہی برتاؤ کرو جو کہ داعی سے کرتے ہو۔ پھر میں ایک بشارت دیتا ہوں کہ اگر ان کا اتباع کر کے عمل کرو گے تو دو لتیں ملیں گی ایک تو حلاوت اعمال میں کہ وہ مغنی (بے پرواہ کرنے والی) ہو گی اسرار کے دریافت کرنے سے اس مزہ میں ایسے مستغرق ہوں گے کہ پر اسرار کی طرف توجہ بھی نہ کریں گے۔ دوسری دولت ہی نصیب ہو گی کہ جن اسرار پر مرتے پھرتے ہیں ان کا دروازہ بھی کھلے گا پھر آپ حکماء امت سے اور فقہائے امت سے ہوں گے اور یہ کمال تقویٰ سے حاصل ہوتا ہے۔ مولانا محمد قاسم صاحبؒ نے کیا کسی دوسرے عالم سے زائد پڑھا تھا نہیں پھر ان میں کیا بات تھی۔ یہی تقویٰ کی برکت تھی۔ حدیث میں ہے کہ **من عمل بعلم علمه الله مالم يعلم** (جو شخص کہ عمل کرے گا اس علم کے ساتھ جو خدا تعالیٰ نے اس کو سکھلایا ہے تو سکھلا ئیں گے اس کو اللہ تعالیٰ وہ کہ نہیں جانتا ہے) مولانا فرماتے ہیں۔

بینی اندر خود علوم انبیا　　بے کتاب و بے معید و اوستا

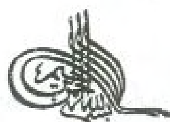
(بے کتاب و بے معین و استاد کے انبیاء جیسے علوم اپنے اندر پاؤ گے)

ہماری پریشانی کا راز:

اب میں ختم کرتا ہوں اور کہتا ہوں کہ دعا کرو کہ خدا تعالیٰ عمل کی توفیق دے۔ اور میں کہتا ہوں کہ اگر دین کی ضرورت سے نہیں تو تمدن ہی کی ضرورت سے ان حجتوں کو ترک کرو اس سے ہمارے اجتماع کا شیرازہ منتشر ہے جب تک آپ اس لم اور کیف کو نہ چھوڑیں گے۔ مذہب کو نہیں پکڑ سکتے اور جب تک مذہب نہ ہوگا اجتماع نہ ہوگا۔ یہی راز ہے ہماری پریشانی کا۔ اب دعا کرو خدا عمل کی توفیق دے۔

وصلی اللّٰہ تعالیٰ علیٰ خیر خلقه

محمد و اٰله و اصحابه اجمعین



التوکل

توکل

یہ وعظ ۴ جمادی الاخریٰ ۱۳۳۴ھ بمقام جامع مسجد تھانہ بھون جو کہ حضرت والا نے بیٹھ کر ۳ گھنٹے پندرہ منٹ ارشاد فرمایا۔ سامعین کی تعداد تقریباً ۲۰۰ تھی جس کو مولوی محمد عبداللہ گنگوہی نے قلم بند فرمایا۔

خطبہ ماثورہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للہ نحمدہ نستعینہ و نستغفرہ و نومن بہ و نتوکل علیہ و نعوذ باللہ من شرور انفسنا و من سیئات اعمالنا من یھدہ اللہ فلا مضل لہ و من یضللہ فلاھادی لہ و نشھد ان لا الہ الا اللہ وحدہ لا شریک لہ و نشھد ان سیدنا و مولانا محمدا عبدہ و رسولہ وصلی اللہ تعالی علیہ وعلی الہ واصحابہ وبارک وسلم۔

اما بعد فاعوذ باللہ من الشیطان الرجیم. بسم اللہ الرحمن الرحیم
فَبِمَا رَحْمَةٍ مِنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيظَ الْقَلْبِ لَا انْفَضُّوا مِنْ حَوْلِكَ فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ وَشَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ فَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِيْنَ. اِنْ يَّنْصُرْكُمُ اللّٰهُ فَلَا غَالِبَ لَكُمْ وَاِنْ يَّخْذُلْكُمْ فَمَنْ ذَا الَّذِيْ يَنْصُرُكُمْ مِّنْ بَعْدِهٖ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ.

ترجمہ:۔ بعد اس کے خدا ہی کی رحمت کے سبب آپ ان کے ساتھ نرم رہے اور اگر آپ تندخو سخت طبیعت ہوتے تو یہ آپ کے پاس سے سب منتشر ہو جاتے سو آپ ان کو معاف کر دیجئے اور آپ ان کے لئے استغفار کر دیجئے اور ان سے خاص خاص باتوں میں مشورہ لیتے رہا کیجئے پھر جب آپ رائے پختہ کر لیں سو خدا تعالیٰ پر اعتماد کیجئے بے شک اللہ تعالیٰ ایسے اعتماد کرنے والوں سے محبت فرماتے ہیں اگر خدا تعالیٰ تمہارا ساتھ دیں تب تو تم سے کوئی نہیں جیت سکتا اور اگر تمہارا ساتھ نہ دیں تو اس کے بعد ایسا کون ہے جو تمہارا ساتھ دے اور صرف اللہ تعالیٰ پر ایمان والوں کو اعتماد رکھنا چاہیے۔

تمہید

یہ دو آیتیں ہیں جو اپنی خصوصیت شان نزول کے اعتبار سے ایک خاص مقصود کے واسطے نازل ہوئی تھیں جس کا حاصل جناب رسول اللہ ﷺ سے خطا معاف کرانا ہے بعض مفسرین صحابہؓ کی وجہ یہ ہے کہ صحابہ میں سے بعض سے حضور ﷺ اس لئے ناخوش ہو گئے تھے کہ ان سے کچھ کوتاہی جس کا حاصل کسی قدر تجاوز ہے حدود شرعیہ سے ہو گئی تھی گو صحابہ اس میں معذور تھے اس

لئے کہ بقصد تجاوز ان سے وہ کوتاہی نہیں ہوئی تھی اور حضور ﷺ بھی حق بجانب تھے اس لئے کہ گو تعمد نہ تھا لیکن تاہم غفلت تو تھی اس لئے حضور ﷺ قدرے ناخوش ہو گئے تھے مگر حق تعالیٰ کی تو بڑی رحمت ہے اور تیز نظر ہے بندے کے عذروں پر بلکہ بندہ کو اپنے بعضے وہ عذر معلوم بھی نہیں جو حق تعالیٰ کو معلوم ہیں اور اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ بندہ کو اپنے نفس پر وہ رحمت نہیں ہے جو خالق تعالیٰ شانہٗ کو اس کے حال پر ہے۔

حقوق العباد بھی دراصل حقوق اللہ ہیں:

اس لئے اللہ تعالیٰ ان کو معذور فرما کر حضور ﷺ کو ان کی خطائیں معاف کرنے کا امر فرماتے ہیں اور ہر چند کہ وہ حقوق جن میں صحابہ سے کوتاہی ہوئی تھی حقوق اللہ ہی تھے کہ قانون کے اعتبار سے ان کے معاف کرنے کا حق تعالیٰ کو اختیار ہے اور قانون کے اعتبار سے میں نے اس لئے کہا کہ واقع کے اعتبار سے تو اللہ تعالیٰ کو یہ بھی اختیار ہے اور قانون کے اعتبار سے میں نے اس لئے کہا کہ واقع کے اعتبار سے تو اللہ تعالیٰ کو یہ بھی اختیار ہے کہ بندہ کے حقوق بھی خود ہی معاف فرما دیں اس لئے کہ وہ حقوق العباد درحقیقت اللہ ہی کے حقوق ہیں اس لئے کہ اللہ تعالیٰ ہر شے کے مالک ہیں تو بندے کے اموال اور انفس اور عزت و آبرو کے مالک بھی وہی مالک ہیں تو جو کوئی کسی بندے کو مالی یا جسمانی ضرر پہنچائے گا تو اس نے فی الواقع اللہ کے ملک میں تصرف کیا اس کی ایسی مثال ہے جیسے کوئی کسی کا غلام ہو اور اس کے پاس مال ہو تو اگر کوئی اس غلام کا وہ مال لے گا تو واقع میں اس نے اس کے مولا کی حق تلفی کی پس اس واقعیت کے لحاظ سے حقوق العباد کو حقوق اللہ کہنا صحیح ہے لیکن کیا انتہا ہے رحمت کا کہ ان حقوق اللہ کا نام حقوق العباد رکھ دیا ہے جیسے اپنے غلام یا اپنے بچہ سے اپنی کسی شے کی نسبت یہ کہیں کہ یہ شے تمہاری ہے اس کہنے سے وہ شے اس کی نہیں ہو جاتی لیکن ان کی دلجوئی کے واسطے کہتے ہیں کہ یہ شے تمہاری ہے بلکہ بچہ کو تو اگر کوئی شے ہبہ دیدیں تو وہ بھی مالک ہو جاتا ہے اور غلام مملوک تو کسی شے کا کسی صورت سے مالک ہی نہیں ہوتا یہی راز ہے شریعت کا کہ شارع نے غلامی کو موانع ارث سے قرار دیا ہے یعنی اگر کوئی شخص مر جائے تو ایک بیٹا جو کسی کا غلام ہے وارث چھوڑ دے تو اس کو میراث نہ ملے گی اس لئے اگر اس کو میراث ملے تو وہ مالک نہ ہو گا بلکہ اس کا مولا مالک ہو گا جو اس مورث سے اجنبی ہے تو توریث اجنبی کی لازم آوے گی اس لئے غلام

کو میراث نہ ملے گی دیکھئے شریعت کا کیا عدل ہے غلام کو میراث نہیں دی اس لئے کہ وہ جب مالک ہی نہ ہوگا تو اس کی حسرت ہی حسرت ہوگی پس یہ مسئلہ بھی فرع ہے اسی کی کہ غلام کسی شے کا مالک نہیں ہوتا اور بیٹا ہبہ سے مالک ہو جاتا ہے اور اسی فرق کی وجہ سے میں نے مثال میں یہ قید لگائی تھی کہ اپنی شئے کی نسبت کہا پس بیٹے سے مثلاً جو کہا جاتا ہے کہ یہ چارپائی مثلاً تمہاری ہے یا یہ کٹورہ تمہارا ہے اس سے کیا مقصود ہوتا ہے ظاہر ہے یہ مقصود نہیں کہ تم اس کے مالک ہو محض دلجوئی مقصود ہے اسی طرح نسبت ہے حق تعالیٰ کے بعض حقوق کے ہماری نسبت ورنہ وہ بھی واقع میں ان ہی کے حقوق ہیں اس سے اندازہ کیجئے حق تعالیٰ کی محبت کا اپنے بندہ کے ساتھ ورنہ ہماری کیا شئے ہے۔

خودکشی کے حرام ہونے کا سبب:

بلکہ ہماری جان بھی ہماری نہیں ہے اسی لئے حق تعالیٰ نے خودکشی کو حرام فرمایا ہے اگر جان ہماری ہوتی تو ہم اس میں جس طرح چاہتے تصرف کر سکتے یہی وجہ ہے کہ جن معاصی میں دوسروں کو ضرر پہنچتا ہے وہ تو ظاہر ہے کہ حرام ہیں ہی اور ان کی وجہ بھی ظاہر ہے کہ اس کو کیا اختیار ہے کہ دوسرے کی چیز میں تصرف کرے لیکن جن معاصی سے خود اپنے آپ کو ضرر پہنچتا ہے ان معاصی کا حاصل خود اپنے جوارح اور حواس میں تصرف ہے جیسے کسی کو بری نگاہ سے دیکھنا کسی نامشروع آواز کا سننا یہ بھی حرام ہے اس لئے کہ نہ کان ہمارے ہیں نہ آنکھیں ہماری ہیں سب سرکاری چیزیں ہیں جس موقع پر صرف کرنے کیلئے اجازت دی گئی ہے۔ ان ہی مواقع پر ان کو صرف کرنا چاہیے ورنہ مجرم ہوں گے الحاصل اس تقریر سے معلوم ہو گیا کہ ہم نہ اپنی جان کے مالک ہیں نہ مال کے مالک ہیں سب کچھ اللہ تعالیٰ کے ملک ہے۔ اس پر بھی جو بعض حقوق کو حقوق العباد فرمایا تو یہ محض رحمت ہے اور پھر یہ نہیں کہ محض حقوق العباد برائے گفتن ہی فرما دیا ہو بلکہ اس پر آثار اور احکام بھی مرتب فرمائے۔

حق تعالیٰ شانہ کی بے انتہا رحمت:

بچوں کے نامزد تو جو شئے مجازاً کی جاتی ہے وہ برائے نام ہی ہے محض دلجوئی کیلئے ہی ہے آثار اور احکام اس پر ملک کے مرتب نہیں ہوتے اس لئے کہ اس کو اس شئے میں تصرف کا اختیار نہیں ہوتا مثلاً وہ کسی کو دے نہیں سکتا، کسی کے ہاتھ بیچ نہیں سکتا اور غلام کے پاس جو شئے ہے وہ اس سے

بھی ضعیف درجہ میں ہے اور خدا تعالیٰ ایسے مولیٰ ہیں کہ باوجود اس کے کہ ہر شئے کے مالک حقیقی وہی ہیں مگر پھر بھی جس شئے کی نسبت فرما دیا کہ یہ تمہاری ہے تو برائے نام نہیں کیا بلکہ اس میں تصرف کا بھی اختیار دیدیا گیا ہے کہ خواہ اس شئے کو تم استعمال کر دیا کسی کو دیدو یا بیچ دو یہ سب ہمارے نزدیک معتبر ہے اگر تم کسی کو دیدو گے تو ہم بھی یہی کہیں گے کہ اب یہ شئے اس شخص کی ہوگئی کیا ٹھکانا ہے اس رحمت کا ایک تو دلجوئی کیلئے ہماری طرف منسوب کیا دوسرے اگر کسی کو ہم دیدیں تو اس کو نافذ قرار دیا اور اس کو معتبر قرار دیا بخلاف ماں باپ کے کہ وہ اتنی دلجوئی نہیں کر سکتے اگر وہ بچہ کسی کو شئے دینے لگے تو روک دیں گے پس جب یہ ثابت ہوا کہ حقوق العباد واقع میں حقوق اللہ ہی ہیں تو اگر اس واقعیت کے اعتبار سے وہ معاف کرنے لگیں تو کر سکتے ہیں لیکن قانون شریعت کے اعتبار سے ان حقوق سے اپنا تعلق بالکل اٹھا لیا اور یہ فرما دیا کہ جب تک کہ اصحاب حقوق معاف نہ کریں گے ان کے حقوق کو ہم استقلالاً معاف نہ کریں گے پس اس نسبت کے باوجود اس کے ضعیف بلکہ اضعف بلکہ نہ ہونے کے جو اسقدر قوی کیا ہے تو اس میں کیا حکمت ہے پورا علم تو حکم کا حق تعالیٰ ہی کو ہے۔

قانون شریعت کی ایک حکمت:

مگر ایک حکمت اسکی مجھ جیسے نادان کی سمجھ میں بھی آتی ہے اور اس سے قدر ہوگی شریعت کی کہ شریعت کا وجود ہمارے لئے کس قدر نعمت ہے کہ اگر قانون کی شریعت نہ ہوتا تو زندگی گزارنا مشکل ہو جاتا تفصیل اس کی یہ ہے کہ اگر اشیاء کی نسبت عباد کی طرف نہ ہوتی اور یہ قانون مقرر نہ کیا جاتا تو حقیقت اور واقعیت کا مقتضا تو یہ تھا کہ کوئی شخص کسی شئے کا مالک نہ ہوتا کیونکہ واقع میں حق تعالیٰ ہی سب کے مالک ہیں۔

جائیداد کی نسبت تملیک میں حکمت:

پس اس صورت میں مثل مباحات عامہ کے ہر شخص کو اختیار ہوتا کہ جس شئے سے چاہے متمتع ہوتا میں تمہارے پاس کی چیز چھین لیتا تم میری چیزیں لے بھاگتے پس اگر اس حقیقت کا ظہور ہوتا تو تمام عالم میں فساد برپا ہو جاتا۔ ہاں اگر فنا کا سب پر غلبہ ہوتا اور سب کے سب مغلوب الحال ہوتے اور اضمحلال وجود کی حالت سب پر ہوتی تو البتہ اس صورت میں کوئی مفسدہ نہ تھا لیکن تمام عالم تو اہل حال نہیں ہے حالت تو یہ ہے کہ انانیت کے دعوے کرنے والے اور اپنے

حظوظ کو پورا کرنے والے اور اپنے نفس کو دنیاوی نعم سے متمتع کرنے والے مقدار میں زیادہ ہیں تو اس حالت میں اگر اس حقیقت کا ظہور ہوتا تو روک تو کچھ ہوتی نہیں تم میری شئے چھین لیتے میں تمہاری شئے لے لیتا کوئی کسی کے مکان پر قابض ہو جاتا کوئی کسی کا مال لے بھاگتا کوئی کسی کو قتل کر دیتا اور یہ کتنا بڑا مفسدہ تھا پس اس صورت میں امن کی یہی صورت ہوسکتی ہے کہ قانون شریعت کا جاری ہوا اور اس نسبت کی حفاظت کی جاوے کہ فلاں شئے میری ہے اور فلاں شئے زید کی اور فلاں مکان اس شخص کا اور فلاں جائداد عمرو کی ہے یہاں سے معلوم ہوگا کہ شریعت کیا چیز ہے کہ اس نے بڑے بڑے مفاسد کو روک رکھا ہے اور یہی معنے ہیں مولنا رومیؒ کے اس شعر کے

سر پنہان است اندر زیر و بم — فاش اگر گویم جہاں برہم زنم

(ہر نشیب و فراز میں ایک ایسا راز پنہاں ہے جس کو اگر صاف صاف کہوں تو دنیا تہہ و بالا ہو جائے)

مطلب یہ ہے کہ یہاں حقائق و اسرار میں ایک سر پنہاں ہے اگر ظاہراً اس کو بیان کردوں تو جہاں میں فساد برپا کردوں بظاہر یہ مضمون شاعرانہ معلوم ہوتا ہے اس لئے کہ دیکھا جاتا ہے کہ جن لوگوں نے حقائق کو بیان کیا ہے انہوں نے کونسا فساد مچا دیا ہے منصور نے انا الحق کہا تو کیا ہوا یا کوئی کلمہ توحید بیان کردے تو عالم میں کیا تغیر ہو بہت وہ اپنی جان سے جائے بس اس کے معنی یہی ہیں کہ سر پنہاں سے مراد حقیقت و توحید کا راز ہے اور توحید کا مقتضے یہ ہے کہ کوئی وجود کوئی ہستی موجود حقیقی کے سامنے موجود اور ہست کہنے کے قابل نہیں ہے چنانچہ بزرگوں نے فرمایا ہے الممکنات ماشمت رائحة الوجود اور مالک کا ہونا اور اسی طرح تمام اضافات یہ سب ہستی کے آثار ہیں پس مولنا رومیؒ کا مطلب یہ ہے کہ اگر میں حقیقت کا راز بیان کردوں اور عام خیالات پر اس کا اثر ہو جاوے اور اس لئے یہ سب اضافات باطل ٹھہریں تو عالم میں فساد برپا ہو جاوے جیسا کہ مذکور ہوا اور اس کا میں سبب ہو جاؤں اس سے شریعت کی قدر کرنا چاہیے کہ اس نے کتنے بڑے فساد کو روکا ہے کہاں ہیں وہ صوفی اور کہاں وہ شاہ صاحب جو کہتے ہیں کہ شریعت کوئی چیز نہیں ایسے صوفی اور شاہ صاحب کا علاج یہ ہے کہ ان کے کپڑے اور لنگی اتار لی جاوے اگر کچھ تعرض کریں تو کہنا چاہیے کہ صرف شرعی قانون کے اعتبار سے یہ چیزیں تمہاری ہیں اور وہ آپ کے نزدیک کوئی شے نہیں ہے اور اس کو تم تسلیم ہی نہیں کرتے پھر کیوں تعرض کرتے ہو مولانا رومیؒ نے

ایک ایسے جاہل کی حکایت لکھی ہے کہ وہ باغ میں گیا اور وہاں جا کر بے تکلف میوے توڑ توڑ کر کھانے لگا۔ باغ والا آیا اور اس نے مؤاخذہ کیا کہنے لگا میں بھی خدا کا پھل بھی خدا کا درخت بھی خدا کا باغ بھی خدا کا لا فاعل الا اللہ لا موجود الا اللہ پھر تو کون ہوتا ہے روکنے والا اس نے کہا کہ اچھا اور نوکر سے پکار کر کہا لائیو میرا سوٹا اور رسا اور رسے سے باندھ کر خوب ٹھوکا وہ فریاد کرنے لگا کہا چلاتے کیوں ہو، ڈنڈا بھی خدا کا رسا بھی خدا کا مارنے والا بھی خدا کا اور تو بھی خدا کا پھر شکایت کے کیا معنے اس وقت تو مدعی صاحب کو ہوش آیا اور توبہ کی ؎

گفت توبہ کردم از جبر اے عیار اختیار است اختیار است اختیار

(اس نے کہا اے عیار میں نے جبر سے توبہ کی اختیار ہے اختیار ہے اختیار)

شریعت ہمارے لئے کتنی بڑی رحمت ہے:

واقعی ایسوں کا یہی علاج ہے کہ لوگوں کا مال لوٹنے کے واسطے موحد اور جبری بنتے ہیں اور اپنے مال کو حفاظت سے رکھتے ہیں جیسے ایک پیشہ ور واعظ کی حکایت مشہور ہے کہ وعظ میں کہا کہ خدا کے واسطے مال خوب دینا چاہئے کوئی شئی پاس نہ رکھے وعظ کہہ کر جب گھر آئے تو دیکھا کہ بیوی ننگی بیٹھی ہے۔ ایک چھلا تک بدن پر نہیں پوچھا کہ زیور کیا ہوا کہا تم نے ہی تو وعظ میں کہا تھا کہ مال خدا کے واسطے دینا چاہے سب فقراء کو دے آئی کہنے لگے ارے بیوقوف میں نے وعظ اس لئے نہیں کہا تھا کہ تو لوگوں کو دے آئے میں نے اس لئے کہا تھا کہ لوگ ہم کو دیں پس جب شاہ صاحب کے کپڑے گئے اس وقت ان کو شریعت کی قدر ہوئی اب آپ کو معلوم ہو گیا ہوگا کہ شریعت ہمارے لئے کتنی بڑی رحمت ہے کہ شریعت نے بعض چیزوں کو ہماری طرف منسوب کر دیا ہے، حالانکہ واقع میں مالک حقیقی اللہ تعالیٰ ہی ہیں تاکہ کوئی کسی کے مال پر دست برد نہ کرے اور نیز کسی کے ساتھ احسان کرنے میں دریغ نہ کرے اس لئے کہ واقع میں تو کوئی شئے ہماری ہے نہیں تو بڑی بے مروتی ہے کہ ہمارے پاس کوئی شئے زائد ہو اور ہمارے دوسرے بھائیوں کو ضرورت ہو اور ہم اسکو نہ دیں اگر چہ عدل کا مقتضی تو یہ تھا کہ سب کے پاس یکساں مقدار میں مال اسباب ہوتا لیکن اس میں بڑی بے انتظامی ہوتی اس لئے کہ ہم کو مثلاً ضرورت ہوتی خط بنوانے کے لئے نائی کی اور اس کو بلاتے تو ہر گز نہ آتا اور کہتا کہ تم ہی میرا خط بنا دو مجھ کو کیا ضرورت یا ضرورت ہوتی مثلاً

معماروں کی تو کہیں نہ ملتے دھوبی بھنگی نہ ہوتے کپڑے میلے ہو جاتے اور سڑ جاتے حق تعالیٰ کی رحمت ہوئی کہ اول تو اشیاء کو ہماری طرف منسوب کیا اور پھر باہم تفاوت رکھا کسی کو عمل کا محتاج کر دیا کسی کو مال کا اس طور سے تمام عالم کا انتظام فرما دیا لیکن اصل فطرت اور حاجت پر نظر کر کے انسان کو سمجھنا چاہیے کہ میرے پاس جو زائد ہے اور یہ دوسرے حاجتمندوں کا حصہ ہے مجھ کو ان سے دریغ نہ کرنا چاہیے یہ نسبتیں تو حق تعالیٰ نے اس لئے مقرر فرما دی ہیں۔ تاکہ تمہارے مال کو کوئی زبردستی نہ لے سکے اس لئے نہیں ہیں کہ جس کی یہ نسبتیں پیدا کی ہوتی ہیں اس ہی کے حکم سے انحراف کرنے لگو اگر وہ یہ نسبت قطع کر دیں تو پھر کیا کر لو اور اگر کہو کہ اب تو جو قواعد مقرر ہو گئے ہیں ان کا کوئی منسوخ کرنے والا نہیں ہے اس لئے کہ نبوت تو ختم ہو گئی ہے۔ پھر یہ نسبتیں کیسے قطع ہو سکتی ہیں تو اس پر اگر ناز ہے تو اللہ تعالیٰ کو دوسرا طریقہ بھی آتا ہے اور وہ تکوینی طریقہ ہے باوجود حفاظت قانون نسبت کے اور وہ یہ کہ مال تمہارے پاس حسانند رہے لیجئے وہ نسبت یوں منقطع ہو سکتی ہے مثلاً آگ لگ کر سب متاع جل جاوے یا چور لیجاویں۔

ہر چیز پر اللہ تعالیٰ کا قبضہ اور تصرف تام ہے:

یاد رکھو تم ان اضافات اور نسبت کے اندر کسی طرح حقیقت کا شائبہ مت سمجھو یہ تو محض انتظام عالم کے لئے ہے ورنہ فی الواقع ہر شے پر حق تعالیٰ کا قبضہ اور تصرف تام ہے اسی لئے ارشاد ہے۔

وَلِلّٰهِ مِيْرَاثُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ لفظ میراث اس لئے فرمایا کہ اگر ملک فرماتے تو شبہ ہو سکتا تھا کہ بظاہر ملک تو ہماری ہے اس لئے علی سبیل التسلیم ارشاد ہے کہ اگر مان لیا جاوے کہ تمہاری ملک ہے تو جب تم سب مر جاؤ گے پھر بتلاؤ اس وقت یہ سب چیزیں کس کی ملک ہونگی اس وقت تو سب ہماری ہیں پھر ہم سے کیوں دریغ کرتے ہو الحاصل اس تقریر سے معلوم ہو گیا ہو گا کہ حق تعالیٰ کو حقوق العباد کے معاف فرما دینے کا بھی پورا حق ہے لیکن قانون میں تفصیل کر دی بس اس قانون کی رو سے بھی صحابہؓ سے جو اس موقعہ پر کوتاہی ہوئی تھی کہ جس کو رسول اللہ ﷺ کا حق نہیں کہہ سکتے بلکہ خاص حق اللہ کہیں گے ہاں اس معنے کر حق الرسول ﷺ بھی کہہ سکتے ہیں کہ احکام شریعت کی مخالفت کرنا آپ کے بتلائے ہوئے اور امر کئے ہوئے احکام کی مخالفت ہے مگر اصطلاح شرع میں اس کو حقوق الرسول ﷺ نہیں کہا جاتا اس کے احکام جداگانہ نہیں ہیں وہی حقوق اللہ کے احکام ہیں۔

حقوق الرسول ﷺ کی دو اقسام:

حاصل یہ ہے کہ حقوق الرسول کی دو قسمیں ہیں ایک تو وہ حق جو خود ذات رسول کی طرف راجع ہے جیسے کوئی رسول ﷺ کے مال کی چوری کر لے یا ان کو کوئی اذیت پہنچائے دوسرے وہ کہ انہوں نے جو احکام الٰہی تعلیم فرمائے ہیں ان کی مخالفت کرے قسم اخیر کو حق رسول ﷺ کہنا مجازاً ہوگا اس لئے کہ وہ احکام خود رسول کے بنائے ہوئے نہیں ہاں بتائے ہوئے ہیں شارع تو درحقیقت اللہ تعالیٰ ہیں اور پہلی قسم حقیقۃً حق رسول ﷺ ہے پس صحابہؓ کی کوتاہی قسم ثانی سے ہے جو حقیقۃً اللہ تعالیٰ کا حق اور مجازاً رسول ﷺ کا حق ہے تو اس کوتاہی کو اللہ تعالیٰ خود معاف کر سکتے تھے چنانچہ کر بھی دیا چنانچہ ارشاد ہے۔ وَلَقَدْ عَفَا اللّٰهُ عَنْهُمْ لیکن کیا انتہا ہے حضور ﷺ کی محبوبیت کا کہ آپ سے بھی فرمائش ہے کہ ہم نے تو معاف فرما دیا آپ بھی معاف فرما دیں اگر کوئی کہے جبکہ وہ کوتاہی محض حق اللہ تھی اور اللہ تعالیٰ نے اس کو معاف بھی کر دیا تو پھر حضور ﷺ سے معاف کرانے کے کیا معنے اور وہ کون چیز باقی رہ گئی جس سے حضور ﷺ کی معافی متعلق ہوگی۔ بات یہ ہے کہ ایک تو توبہ ہے دوسرے تکمیل توبہ تو حق تعالیٰ کے معاف فرمانے سے توبہ تو متحقق ہو گئی لیکن تکمیل اس توبہ کی حضور ﷺ کے معاف کرنے سے ہوگی۔

گناہ کے دو اثر:

تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ اول یہ سمجھو کہ گناہ کے دو اثر ہیں ایک آجل یعنی عذاب کا ہونا دوسرے عاجل یعنی گناہ سے قلب میں ایک ظلمت پیدا ہو جاتا جو سبب ہوتا ہے آئندہ دوسرے معاصی کے صدور کا اور جب بندہ توبہ کرتا ہے تو قبولیت توبہ کے بھی دو درجے ہیں ایک تو یہ کہ عذاب سے نجات ہو جاوے دوسرے یہ کہ قلب میں ظلمت اور کدورت جو گناہ سے ہوئی تھی وہ نہ رہے تو یہ محض توبہ سے نہیں جاتی بلکہ بار بار توبہ کرنے سے ندامت سے گھل جانے اور مجاہدات اور مراقبات طویلہ کرنے سے جاتی ہے ہاں توبہ بشرائطہا کرنے سے عذاب سے نجات ہو جاوے گی۔ باقی یہ کدورت اور ایک قسم کی رکاوٹ اور حجاب جو فیما بین اللہ وبین العبد پیدا ہو گیا ہے سو نفس توبہ اس کیلئے کافی نہیں ہے۔ اس کی ایسی مثال ہے جیسے کسی بزرگ کے حق میں ہم سے کوتاہی ہو جاوے مثلاً ان کو ٹھوکر لگ جاوے اور پھر ان سے اس بے ادبی کو معاف کرایا اور انہوں نے معاف کر دیا لیکن اس

معاف کرنے سے تسلی نہیں ہوتی بار بار کہتے ہیں کہ حضرت بڑی حماقت ہوئی بہت قصور ہوا اور وہ برابر کہہ رہے ہیں کہ میں نے معاف کر دیا تم اس قدر کیوں پریشان ہوتے ہو مگر دل ہے کہ مانتا نہیں جب بہت کہہ سن لیں گے اس وقت اطمینان ہوتا ہے جب ادنیٰ سی عظمت کا یہ اثر ہے تو حق تعالیٰ کی عظمت تو غیر محدود ہے اتنا جلدی قلب صاف ہونا مشکل ہے وہاں تو یہ حالت ہوتی ہے

بر دل سالک ہزاراں غم بود　　　　گر ز باغ دل خلالے کم بود

(اگر دل کے باغ میں سے ایک تنکا بھی کم ہو جاوے تو سالک کے دل میں ہزاروں غم ہوتے ہیں)

اور ایسے غم کے موقعہ پر ضرورت ہوتی ہے شیخ مبصر کی کیونکہ بعض مرتبہ اس غم مفرط میں ضرر بھی ہو جاتے ہیں۔ تو شیخ اس وقت غم کو منع کرتا ہے اگر چہ مقتضی اصل معصیت کا یہی ہے کہ بے حد غم ہونا چاہیے مگر کبھی اس سے ہلاکت اور کبھی مایوسی کا احتمال ہو جاتا ہے اس لئے شیخ تعدیل کرتا ہے۔ غرض یہ ہے وہ اثر جو بعد قبول توبہ بھی کانٹا سا کھٹکتا ہے تو اگر چہ حق تعالیٰ نے توبہ اس کی قبول فرمائی ہے چنانچہ ارشاد ہے۔ وَلَقَدْ عَفَا اللّٰهُ عَنْهُمْ لیکن صحابہؓ چونکہ جان نثار تھے جناب رسول ﷺ کے اس لئے ان کا دل ابھی اس لئے صاف نہ ہوا تھا کہ حضور ﷺ ہم سے مکدر ہیں اور حضور ﷺ کا یہ تکدر بمقتضائے بشریت تھا۔

عبد کامل:

اور اس کا ہونا خاصہ بشریت کا ہے اور یہ سراسر رحمت ہے اس لئے کہ اگر اس قسم کا تکدر و نیز دوسرے خواص بشریہ حضور ﷺ کے لئے ثابت نہ ہوتے اور ہم کو آپ کی بشریت کے اعتقاد کا مکلف نہ بنایا جاتا تو بدون اس کے ہماری توحید کامل نہ ہوتی افسوس ہے کہ ہمارے زمانہ کے بعض لوگ اسکی نفی کرتے ہیں اور حضور ﷺ کو درجہ الوہیت تک پہنچاتے ہیں حضرت مولانا محمد یعقوب صاحبؒ کے پاس ایک استفتا آیا تھا اس میں سائل نے یہ پوچھا تھا کہ کیا حضور ﷺ کھانا بھی کھاتے تھے ایک شخص نے یہ سوال کیا تھا کہ کیا حضور ﷺ والدہ مریفہ کے بطن سے ایسے پیدا ہوئے تھے جیسے اور بچے پیدا ہوتے ہیں یا ران سے پیدا ہوئے تھے غرض یوں چاہتے ہیں کہ حضور ﷺ کے اندر الوہیت ثابت کر دیں۔ لیکن یہ کتنی ہی کوشش کریں حضور ﷺ الوہیت کے

درجہ تک نہیں پہنچ سکتے اور اگر بالفرض پہنچیں بھی تو کیسے فلذ ہوں گے ظاہر ہے کہ فلذ ناقص ہوں گے۔ رسالت کا حق ان لوگوں نے اچھا ادا کیا کہ آپ کے اندر نقص ثابت کیا۔ ہم تو یہ کہتے ہیں کہ عبد تھے لیکن عبد کامل تھے بالکل عقل مسخ ہوگئی ہے اور پھر اس کو محبت رسول ﷺ سمجھتے غرض حضور ﷺ میں عبدیت کا اعتقاد سراسر رحمت ہے اور آپکی بشریت وعبدیت کے آثار سے یہ ہوا کہ حضور ﷺ کے قلب مبارک پر ان حضرات کی طرف سے ایک قسم کی طبعاً کدورت تھی اور حضور ﷺ کی کدورت سے ان حضرات کے قلوب پر بھی تکدر کا اثر تھا اور ایسا تکدر اگرچہ حالاً مضر نہیں ہے لیکن احیاناً سبب بعد کا ہو جاتا ہے اس لئے کہ جب اس کا اثر زیادہ بڑھتا ہے تو قلب ضعیف ہو کر تعطل کی نوبت آجاتی ہے شیطان کہتا ہے کہ تیرا کوئی عمل قبول تو ہے نہیں پھر کیوں بے فائدہ مشقت اٹھاتا ہے اور راز ان کا یہ ہے۔

تکدر کا خاصہ:

کہ عمل کے اندر بشاشت قلب کی معین ہے اور تکدر کا خاصہ ہے کہ قلب میں بشاشت نہیں رہتی ہے اور بشاشت ہی معین ومحرک تھی جب وہ جاتی رہی تو نرا اعتقاد رہ گیا اب عمل کے اندر اس شخص کو بڑا بھاری مجاہدہ کرنا پڑتا ہے جس پر دوام دشوار ہے پس اگر یہ کدورت بڑھی اور اس کو استقرار ہو گیا تو رفتہ رفتہ اعمال چھوٹ جاتے ہیں اور جو ہمت کر کے اس حالت میں بھی عمل کرتے ہی رہے تو یا تو وہ بشاشت عود کر آتی ہے اور اگر اس نے عود نہ کیا تو یہ ہمت زیادہ نہیں چلتی اعمال رخصت ہو جاتے ہیں غرض اس کدورت وانقباض کے ہوتے ہوئے دوام علی العمل سخت دشوار ہے بھلا اور کوئی تو کس شمار میں ہے۔

صبر موجب بسط بنتا ہے:

حضور ﷺ سے زیادہ کون مستقل مزاج ہوگا تین سال تک جو قبض رہا یعنی وحی منقطع ہوئی اس مدت کے اندر حضور ﷺ کو ایسی کلفت آئی کہ کئی مرتبہ ارادہ فرمایا کہ پہاڑ سے گر کر جان دے دوں لیکن جب ایسا ارادہ فرماتے جبرائیلؑ ظاہر ہوتے اور تسلی فرماتے کہ آپ نبی ہیں آپ سے حق تعالیٰ کو بہت کام لینا ہے آپ ایسا ارادہ نہ فرماویں تین سال کے بعد وحی نازل ہوئی

اور قلب مبارک سے یہ بوجھ زائل ہوا جسکی نسبت ارشاد ہے اَلَمْ نَشْرَحْ لَکَ صَدْرَکَ وَوَضَعْنَا عَنْکَ وِزْرَکَ الَّذِیْ اَنْقَضَ ظَھْرَکَ (کیا ہم نے آپ کی خاطر آپ کا سینہ کشادہ نہیں کر دیا اور ہم نے آپ پر سے آپ کا وہ بوجھ اتار دیا جس نے آپ کی کمر توڑ رکھی تھی)

وزر سے یہی حالت مراد ہے نہ کہ گناہ پس جبکہ حضور ﷺ جیسے کوہ وقار و استقلال بھی اس کے متحمل نہیں ہوئے تو اور تو کیا کسی کا منہ ہے جو اس کے تحمل کا دعویٰ کرے مگر ایسی حالت میں شیوخ کی تعلیم یہی ہوتی ہے کہ صبر کرو اور یہ جواب محض ٹالنے کے لئے نہیں ہے بلکہ راز اس میں یہ ہے کہ صبر کرنا سبب ہو جاتا ہے بسط کا مولانا فرماتے ہیں۔

چونکہ قبض آمد تو دروے بسط بیں ۔۔۔ تازہ باش و چیں میفگن بر جبیں

(جب تیری روح میں انقباض پیدا ہو جائے تو اس کے اندر بھی کشادگی تلاش کر۔ تازہ رہ اور اپنی پیشانی پر شکن مت ڈال)

چونکہ قبضے آیدت اے راہ رو ۔۔۔ آں صلاح تست آتش دل مشو

(اے راہ رو جو تجھکو انقباض ہو تو وہ تیری بہتری کے لئے ہو اس پر چراغ پا ہونے کی ضرورت نہیں)

دوسرے بزرگ اس کے بعد بسط کی بشارت دیکر تسلی کرتے ہیں

یوسف گم گشتہ باز آید بکنعاں غم مخور ۔۔۔ کلبۂ احزاں شود روزے گلستاں غم مخور

(کھویا ہوا یوسف ایک روز کنعان واپس آجائے گا غم مت کر اور تیرا غم کا جھونپڑا گلستان بن جائے گا)

یوسف گم گشتہ سے مراد بسط ہے جو قبض آنے سے مفقود ہو گیا ہے ایک اور بزرگ کہتے ہیں۔

اگر چہ دور افتادم بایں امید خورسندم ۔۔۔ کہ شاید دست من بار دگر جاناں من گیرد

(اگر چہ میں دور ہوں مگر اس امید پر خوش ہوں کہ شاید میرا محبوب میرا ہاتھ دوبارہ پکڑے)

بہر حال یا تو بسط ہو اور امید بسط کی ہو تو عمل پر استقامت کر سکتا ہے اور اگر دونوں نہ ہوں تو قلب ضعیف ہونا شروع ہوتا ہے اور رفتہ رفتہ چھوٹ جاتا ہے غرض بعض اوقات اس تنگد سے یہ ضرور ہوتا ہے۔

تفسیر آیت تلاوت کردہ:

اس لئے باری عز اسمہ چاہتے ہیں کہ ہمارے رسول ﷺ کے صحابہ اس سے بھی پاک ہو جاویں اور یہ کیفیت ان میں نہ رہے اس لئے ارشاد ہے کہ آپ بھی معاف فرما دیں پس فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللَّهِ لِنتَ لَهُمْ اس کی تمہید ہے اور فَاعْفُ عَنْهُمْ مقصود ہے سبحان اللہ کیا رحمت ہے کہ اسی پر اقتصار نہیں فرمایا آگے اس کے وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ بڑھایا یعنی آپ ہی معاف فرما دیجئے اور ہم سے بھی درخواست کیجئے کہ ہم معاف کر دیں۔ بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے پہلے ہی معاف فرما دیا تھا تو وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ اب تحصیل حاصل ہے بات یہ ہے کہ وہ معافی تو قانونی ہے اس کا اثر تو یہ ہے کہ عذاب سے نجات ہو جاوے گی اب دوسری قسم جو معافی کی ہے یعنی دفع کدورت جس کا سبب فَاعْفُ عَنْهُمْ ہوا لیکن سبب کا وجود تو وجود مسبب کے لئے علت تامہ نہیں یعنی آپ کے معاف کر دینے سے بدون حق تعالیٰ کے تصرف کے رفع کدورت تو ضروری نہیں کیونکہ وہ آپ کے اختیار میں تو نہیں اس لئے حق تعالیٰ نے وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ کا امر فرمایا یعنی مغفرت کی قسم دوم کے وجود کی ہم سے درخواست کیجئے اور یہاں تک دونوں قسمیں متحقق ہو گئیں لیکن اس کا اثر صرف یہ ہوا کہ حالت اصلی انشراح کی لوٹ آئی مگر یہاں اور چیز کی بھی ضرورت ہے وہ کیا یعنی اس انشراح کی ترقی کیونکہ اعمال میں آیندہ کو ترقی موقوف ہے۔ زیادہ انشراح پر پس رحمت پر رحمت اور نعمت پر نعمت حق تعالیٰ کی دیکھئے کہ آگے اس کی تدبیر بھی ارشاد فرماتے ہیں تاکہ ہماری یہ مقبول جماعت کسی پہلو سے ناقص نہ رہے چنانچہ فرماتے ہیں وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ یعنی ان سے کام میں مشورہ بھی کیجئے کہ اس سے ان کا انشراح ترقی پذیر ہو کر وسیلہ ترقی مراتب کا ہو گا اس لئے کہ مشورہ کے اندر جو مصلحتیں خاص نفس مشورہ کے اعتبار سے ہیں ان کے علاوہ ایک اور عجیب خاصہ ہے وہ یہ ہے کہ اول یہ سمجھنا چاہیے کہ یہ مشورہ کس سے لیا کرتے ہیں مشورہ اس شخص سے لیا کرتے ہیں کہ جس میں دو وصف پائے جاویں اول تو اس پر پورا وثوق اور نہایت اطمینان اور اعتماد ہو اور اس کو اپنا خیر خواہ اور اس سے خصوصیت سمجھی جاوے۔ دوسرے یہ جس امر میں مشورہ کیا جاوے اس کے اندر وہ صاحب بصیرت ہو اسی واسطے بعض مرتبہ بھائی سے مشورہ نہیں کرتے بلکہ دوست سے کرتے ہیں۔ غرض مشورہ ہر شخص سے نہیں لیا جاتا پس جس شخص سے مشورہ لیا جاوے گا

تو اس کو پہلے سے اور زیادہ تعلق بڑھ جاویگا اس لئے کہ وہ اس سے استدلال کرے گا کہ ہماری بات پر اس کو پورا اطمینان ہے ہماری دیانت پر اس کو اعتماد ہے اور ہم کو اس قابل سمجھتا ہے کہ ہم سے امر خاص میں مشورہ لیا جاوے اس سے دل بڑھ جاوے گا اور دل کے بڑھ جانے کو بڑا دخل ہے اعمال صالحہ کی ترقی میں پس یہ راز ہے اس کا کہ حضور علیہ السلام کو امر فرمایا کہ ان سے مشورہ لیجئے تا کہ وہ انشراح ان کا اور زیادہ بڑا ہو کر سبب ہو جاوے اعمال صالحہ کے اندر ترقی کا جو سبب ہے قرب کا یہاں سے۔

شیخ کامل مربی کی پہچان:

یہ بھی معلوم ہوا کہ شیخ کامل مربی وہ ہے جو طالب کے دل کو بڑھاتا رہے اور دلجوئی اور تسلی کرتا رہے اس بارہ میں تو ہم نے اپنے حضرت مرشد علیہ الرحمۃ کو دیکھا ہے کہ رحمت کے مجسمہ تھے ہر شخص کی تسلی کرتے تھے کبھی دیکھا ہی نہیں کہ کسی کو دل شکستہ کیا ہو اسی واسطے جو نفع اور جگہ برسوں میں ہوتا تھا وہ وہاں لمحوں اور منٹوں میں ہوتا تھا ایسے ہی شیخ کی نسبت حافظ شیرازیؒ فرماتے ہیں ۔

بندہ پیر خراباتم کہ لطفش دائم است ۔ زانکہ لطف شیخ وزاہد گاہ ہست وگاہ نیست

(میں پیر میخانہ کا غلام ہوں کیونکہ اسکی مہربانی ہمیشہ ہے اور شیخ اور زاہد کی مہربانی کبھی ہے کبھی نہیں ہے)

یعنی ہم تو اس کے غلام ہیں جس کا لطف دائمی ہے یہ مطلب نہیں کہ وہ کسی وقت عتاب نہیں کرتے امر ناجائز اور خلاف شرع پر عتاب بھی ضرور فرماتے ہیں مگر واللہ ان کے عتاب میں بھی لطف ہوتا ہے۔

شیخ کے جذب کا اثر:

ہمارے حضرتؒ فرمایا کرتے تھے کہ شیوخ جو کبھی کبھی اپنے خدام سے ناراض ہو جاتے ہیں حتیٰ کہ نکال بھی دیتے ہیں تو زبان سے تو ناراض ہوتے ہیں لیکن دل سے کشش کیا کرتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ نکالنے سے وہ جاتا نہیں اور معذرت کرتا ہے اور معافی چاہتا ہے ان کے اس جذب کا اثر ہے پس اکثر محبت اول شیخ کو ہی ہوتی ہے ورنہ ان کی نفرت کی صورت میں دوسرے کا انجذاب عادتاً مستبعد ہے مولانا اسی کو فرماتے ہیں۔

نفرت فرعون تو میدان از کلیم ۔ (فرعون کی نفرت تو موسیٰ سے سمجھ)

(یعنی فرعون جو موسیٰ پر ایمان نہیں لایا اور ان سے عداوت رکھتا تھا اس کی وجہ یہ نہیں کہ موسیٰ چاہتے تھے کہ ایمان لے آوے اور فرعون انکار کرتا تھا بلکہ خود موسیٰ کو ہی اس سے نفرت تھی فرعون کو ان کا قلب دفع کرتا تھا اور اگر ان کے قلب میں کشش ہوتی تو بعادت غالبہ فرعون کی مجال نہ تھی کہ وہ منجذب نہ ہو لیکن حق تعالیٰ کو منظور نہ تھا کہ ایمان لاوے اس لئے اس کے اسباب جمع کر دیئے اور موسیٰ کے قلب کو اس کی طرف سے سخت کر دیا یہ بھی اسباب حرمان سے ہو گیا اور عادت غالبہ اور اکثر اس لئے کہا گیا کہ کبھی اس میں تخلف بھی ہوتا ہے تا کہ حق تعالیٰ اپنی مشیت کا اثر دکھلا دیں جیسا ابوطالب کے لئے ارشاد ہے اِنَّكَ لَا تَهْدِیْ مَنْ اَحْبَبْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ یَهْدِیْ مَنْ یَّشَآءُ (آپ جس کو چاہیں ہدایت نہیں کر سکتے بلکہ اللہ تعالیٰ جس کو چاہے ہدایت کر دیتا ہے) اور اس عادت غالبہ پر مبنی کر سکتے ہیں کہ حضور ﷺ کفار کیلئے چاہتے تھے کہ ایمان لے آویں اللہ تعالیٰ نے اس تقاضا کو آپ کے قلب سے دفع فرمایا کہ آپ کا تقاضا اسباب انجذاب سے ہوتا تو اس سبب کو مرتفع فرما دیا چنانچہ ارشاد ہے لَسْتَ عَلَیْهِمْ بِمُصَیْطِرٍ (آپ ان پر مسلط نہیں ہیں) دوسری جگہ فرماتے ہیں لَا تَحْزَنْ عَلَیْهِمْ ایک اور مقام پر خطاب ہے فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ حضور ﷺ کو جو بہت زیادہ توجہ اس جانب تھی کہ آپ کو شب و روز اس کا غم رہتا تھا۔ اس کو ان خطابات سے ہلکا کیا گیا ہے اور حضور ﷺ کی کشش وجذب قلب کو گھٹایا گیا ہے رہی بات یہ کہ ایسا کیوں کیا گیا اگر آپ کے جذب کو کم نہ کیا جاتا اور سب ایمان لے آتے تو کیا حرج تھا بلکہ دین کی ترقی زیادہ تھی۔

دنیا میں کفر کا وجود بھی حکمت خداوندی ہے:

بات یہ ہے کہ یہ حق تعالیٰ کی حکمت کا مقتضا ہے کہ عالم میں کفر کا رہنا بھی ضرور ہے اسی کی نسبت حافظ شیرازی کہتے ہیں ؎

در کارخانہ عشق از کفر ناگزیر است آتش کرا بسوزد گر بولہب نباشد

(عشق کے کارخانے میں کفر بھی ناگزیر ہے کیونکہ آگ کس کو جلائے گی اگر ابولہب نہ ہو)

اگر کوئی کہے کہ اگر آگ ابولہب کو نہ جلاتی تو کیا حرج ہے جواب یہ ہے کہ راز دان حقائق نے فرمایا ہے کہ حق تعالیٰ کے اسماء جمیل ہیں اور جمال کی سب ہر اسم مقتضی ظہور کو ہے اور ان

ہی اسماء میں سے منتقم بھی ہے وہی ظہور کو چاہتا ہے اور اس کے ظہور کی یہی صورت ہے کہ دنیا میں کفر و معصیت کرنے والے بھی ہوں تا کہ وہ دوزخ میں جاویں علی ہذا غفور بھی نام پاک باری تعالیٰ کا ہے اس کے ظہور کا مقتضیٰ یہ ہے کہ معاصی کا وجود بھی عالم میں ہو (لیکن اس سے کوئی شخص معصیت و کفر کے ارتکاب سے معذور نہ قرار دیا جاوے گا اس لئے کہ رضا اور شے ہے اور مشیت دوسری چیز ہے۔ یہ صحیح ہے کہ سب کچھ اللہ کی مشیت اور تخلیق سے ہوتا ہے لیکن رضا کا تعلق ایمان اور اعمال صالحہ سے ہے اور ہم کو خیر و شر دونوں راہ بتا دیئے گئے ہیں پس جس راہ کو ہم اختیار کریں گے اس کے خواص ولوازم آثار اس پر مرتب ہوں گے ۱ جامع)

پس جبکہ تکوینا کفر اور کفار کے وجود کی ضرورت ثابت ہوئی پس اس لئے حضور ﷺ کو بے فکر فرما دیا گیا اور آپ کے قلب سے ان کی طرف میلان کو کم کر دیا گیا ورنہ اگر حضور ﷺ کی کشش رہتی تو بعادت غالبہ ضرور ایمان لے آتے اس لئے بزرگوں نے فرمایا ہے کہ اگر شیخ کشش نہ کرے تو مرید آ نہیں سکتا

عشق اول در دل معشوق پیدا میشود ۔۔۔ تا نہ سوزد شمع کے پروانہ شیدا میشود

(عشق پہلے معشوق کے دل میں پیدا ہوتا ہے جب تک شمع نہ جلائے پروانہ اس کا عاشق نہیں ہوتا۔

دوسرے بزرگ کا قول ہے

اگر از جانب معشوق نباشد کششے ۔۔۔ طالب عاشق بیچارہ بجائے نرسد

(اگر معشوق کی طرف سے کشش نہ ہو تو عاشق کبھی معشوق تک نہیں پہنچ سکتا)

پس چونکہ شیوخ اور مربین کشش کرتے ہیں اس لئے ان کے عتاب میں بھی لطف ہوتا ہے چنا غصہ ہو رہے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ اتنا نہ ہو سکا کہ معذرت ہی کر لو پس ایسے مشائخ کے بارہ میں فرماتے ہیں

بندہ پیر خراباتم کہ لطفش دایم ست ۔۔۔ زانکہ لطف شیخ و زاہد گاہ ہست و گاہ نیست

(میں پیر میخانہ کا غلام ہوں جس کی عنایت پیہم ہوتی ہے نہ کہ شیخ اور زاہد کا) غلام جس کی عنایت کبھی ہوتی ہے کبھی نہیں)

پس شیخ کی طرف سے اگر کشش ہو تو مرید خواہ زیادہ مجاہدہ بھی نہ کرے بہت جلد عروج

ہوتا ہے اور ترقیات محسوس ہوتی ہے۔ ہمارے حضرات کے سلسلہ میں بفضلہ تعالیٰ یہ بات ہے کہ مجاہدہ ریاضت زیادہ نہیں کراتے اور نفع اس قدر ہوتا ہے کہ دوسری جگہ برسوں کے مجاہدہ میں نہیں ہوتا خیر یہ سب امور وجدانی ہیں من لم یذق لم یدر کسی نے خوب کہا ہے

پرسید یکے کہ عاشقی چیست　　　گفتم کہ چو ما شوے بدانی

(ایک شخص نے پوچھا کہ عاشقی کیا ہوتی ہے میں نے جوابدیا کہ جب تو ہماری طرح ہو جائے گا تو پتہ چل جائے گا)

مشورہ دلجوئی کا سب سے بڑا سبب ہے:

مجھے تو اس مقام پر صرف اس قدر بیان کرنا ہے کہ تسلی شیخ کو بڑا دخل ہوتا ہے ترقی باطن میں اور دلجوئی اور تسلی کا سب سے بڑھ کر طریقہ مشورہ ہے چنانچہ کسی شاگرد یا مرید کی اگر دعوت کر دو یا کوئی شے دیدو مگر کسی شے سے وہ اس قدر استدلال عنایت و مہربانی پر نہیں کرسکتا جس قدر کہ اس سے کرسکتا ہے کہ اس کو بلا کر کہدو کہ ہم کو تم سے ایک صلاح کرنا ہے سنتے ہی اس کا دل ہاتھوں بڑھ جائے گا کہ ہم کو انہوں نے اپنا مخصوص سمجھا ہے اور ہم آج سے وزیر بن گئے ہیں میرے نزدیک تو کوئی شے تسلی کے اندر اس قدر دخیل نہیں جس قدر کہ صلاح لینا ہے جس کی دلجوئی کرنا ہو سیدھی بات ہے کہ بلا کر یہ کہدو کہ ہم کو تم سے کچھ صلاح کرنا ہے فوراً اس کو خیال ہوگا یہ ہم سے بہت خوش ہیں ورنہ اگر ناراض ہوتے تو مشورہ کیوں لیتے اس لئے ارشاد ہوا کہ وشاورھم فی الامر لوگ آج کے تمدن کو گاتے پھرتے ہیں۔

تمدن قرآن سے سیکھو:

قرآن سے کوئی سیکھ لے کہ تمدن کیا شے ہے اور اس کی تحصیل کا کیا طریقہ ہے لیکن قرآن مجید کا لطف صدر الشمس بازغہ پڑھنے والے کو نہیں آسکتا۔ قرآن میں لطف اس کو آوے گا جس کی نظر واقعات پر ہو اور اس میں غور کرنے کی عادت ہو اس کو معلوم ہوگا کہ قرآن نے ہم کو معاش و معاد کے وہ طریقے سکھائے ہیں کہ ہماری بہبودی کا انحصار ان ہی طرق میں ہے اور اس سے اگر ذرہ برابر بھی تجاوز ہوگا تو دنیوی اور دینی مصائب کا سامنا ہے واللہ اس کی ہر تعلیم میں ایسی دلکشی ہے کہ طبع سلیم ہو تو بے اختیار دل کھنچتا ہے۔

زفرق تا بقدم ہر کجا کہ مے نگرم — کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا اینجاست

(پیشانی سے پیر تک جہاں بھی دیکھتا ہوں کرشمہ اور رعنائی دامن دل کھینچتی ہے کہ سب سے زیادہ پرکشش جگہ یہی ہے)

اس کا وہ حسن ہے کہ ہر پہلو سے محبوبیت برستی ہے جیسے بعض محبوبوں میں ایسی دلربائی ہوتی ہے کہ ان کی ہر ادا دلربا ہوتی ہے اور ہر بات ان کی پیاری معلوم ہوتی ہے حتی کہ رونا بھی تو پیارا نظر آتا ہے اسی طرح قرآن وحدیث کی تعلیم ہے چنانچہ اس آیت میں تمدن کی ایسی بے نظیر تعلیم فرمائی گئی ہے کہ اگر ارسطو اور افلاطون اور تمام حکماء بھی جمع ہو کر سوچتے تو یہاں تک رسائی نہ ہوتی۔

دشمن کے شر سے محفوظ رہنے کے لئے قریب چھپنا مسنون ہے:

حضرت مولانا محمد یعقوب صاحبؒ کو قرآن وحدیث سے تمدن اور اخلاقی تعلیم کے استنباط کا بڑا ملکہ تھا۔ ایک روز فرمایا کہ دیکھو حدیث سے ایک قاعدہ ثابت ہوتا ہے کہ اگر کوئی شخص کسی کے شر سے بھاگے اور یہ چاہے کہ میں ہاتھ نہ آؤں تو بہت دور نہ جاوے نزدیک ہی کہیں چھپ جاوے اس لئے کہ ڈھونڈ جب پڑتی ہے تو دور دور تو دیکھنے جاتے ہیں اور پاس کوئی نہیں دیکھتا اور اس قاعدہ کو ہم نے حضور ﷺ کے فعل سے سمجھا ہے کہ حضور ﷺ جو مکہ معظمہ سے تشریف لے گئے ہیں تو تین میل پر جا کر غار ثور میں چھپے ہیں حالانکہ تمام عالم دشمن اور اونٹنیاں ایسی تیز موجود کہ اگر دھاوا فرماتے تو کم سے کم مدینہ طیبہ کی آدھی منزل پر تو قیام فرماتے لیکن حضور ﷺ سے زیادہ کون دانشمند ہوگا آپ تین میل جا کر چھپ گئے لوگوں نے دور دور ڈھونڈا اور قریب کسی نے نہ ڈھونڈا اور جب لاچار ہو گئے تو ایک قائف کو لائے اس زمانہ میں قیافہ شناس غضب کے تھے اس قائف نے غار ثور لا کر کھڑا کر دیا کہ اس سے آگے نہیں گئے۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ اس موقع پر حضور ﷺ کے ساتھ تھے جن سے حضرات شیعہ بہت خفا ہیں بلکہ اس میں ایک فرقہ ایسا بھی ہے کہ جن حضرات کی خاطر یہ لوگ حضرت ابوبکر صدیقؓ سے خفا ہیں اور وہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ ہیں یہ لوگ ان سے ناراض ہیں حضرت ابوبکر صدیقؓ سے اس واسطے کہ انہوں نے ان کا حق کیوں نہ دیا اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے اس واسطے کہ انہوں نے اپنا حق کیوں نہ وصول کیا۔ ایک جاہل متعصب شیعی کی حکایت ظرافت آمیز یاد آ گئی کہ نماز کے واسطے سنیوں کی مسجد میں گیا وہاں لکھا دیکھا

تیراغ مسجد و محراب منبر — ابوبکرؓ و عمرؓ و عثمانؓ و حیدرؓ

دیکھ کر بہت خفا ہوئے کہ ہم تو تمہارے واسطے جان کھپاتے پھرتے ہیں اور تم کو جب دیکھتے ہیں ان ہی کے ساتھ بیٹھا دیکھتے ہیں اور غصہ میں چھری لے کر چڑھ گیا اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا اسم مبارک چھری سے چھیل دیا گویا اپنے نزدیک ان کو وہاں سے علیحدہ کر دیا خدا بچاوے جہل سے ایسی محبت سے بھی خدا محفوظ رکھے اور ایسی عداوت سے بھی مامون رکھے غرض ایسے وقت بھی حضرت صدیق اکبرؓ نے ساتھ نہیں چھوڑا تھا کوئی ان سے پوچھے کہ اگر ابوبکرؓ دشمن تھے تو کیا ایسے وقت دشمن کو ساتھ رکھا کرتے ہیں القصہ جب وہ لوگ غار پر آئے اور حضرت ابوبکر صدیقؓ نے ان کو دیکھا تو عرض کیا کہ یا رسول اللہ ﷺ اگر یہ لوگ اپنے قدموں کو دیکھیں تو ہمکو پالیں گے حضور ﷺ نے فرمایا۔ لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰہَ مَعَنَا حضرات شیعہ میں ایک شخص اس کی تفسیر میں کہتے ہیں کہ مطلب اس کا یہ ہے کہ شور و غل مت کرو اول تو حزن کے معنے شور و غل کے نہیں دوسرے آگے اِنَّ اللّٰہَ مَعَنَا کے کیا معنے ہوں گے یہ توجیہ تو جب صحیح ہو کہ جب اللہ تعالیٰ کو بھی (نعوذ باللہ) دشمن قرار دیں اور معنے یہ کئے جاویں کہ شور و غل مت کرو اللہ میاں ہمارے ساتھ ہیں وہ سن لیں گے سبحان اللہ کیا اچھا حق ادا کیا ہے رسول اللہ ﷺ کا کہ اللہ تعالیٰ کو بھی رسول اللہ ﷺ کا دشمن گردانا الحاصل ان لوگوں نے ادھر ادھر تلاش کیا ادھر حق تعالیٰ کی یہ قدرت ظاہر ہوئی کہ اسی وقت غار کے منہ پر مکڑی نے جالا تن دیا اور کبوتر نے انڈے دیئے۔ انہوں نے قائف سے کہا کہ تو احمق ہوا ہے اس غار میں تو کسی طرح جا نہیں سکتے اس لئے اس کے منہ پر مکڑی کا جالا ہے اور کبوتر نے انڈے دے رکھے ہیں کبوتر وحشی جانور ہے یہ انڈے بچے ویرانہ میں دیتا ہے معلوم ہوتا ہے کہ تو مجنون ہے قائف نے کہا کہ کچھ کہو واللہ آگے نہیں بڑھے حق تعالیٰ نے عقلوں پر ان کی ایسا پردہ ڈال دیا کہ اتنا سننے کے بعد بھی اتنا نہ ہوا کہ علی سبیل الاحتمال ہی غار کے اندر دیکھ لیتے اگرچہ احتمال بعید تھا لیکن جو شخص کسی شئے کو تلاش کیا کرتا ہے تو ایسی ایسی جگہ بھی دیکھتا ہے جس میں بالکل احتمال نہ ہو سکے جیسے کسی بنئے کی تھالی کھوگئی تھی تو اس نے سب جگہ دیکھا حتیٰ کہ گڑھے کے اندر شاید اس میں نہ ہو حالانکہ اس میں کسی درجہ بھی احتمال نہ تھا تو احتیاطاً غار میں بھی دیکھ لیتے لیکن عقل اور وہم اور خیال سب قوتیں حق تعالیٰ کے قبضہ میں ہیں جس طرف چاہیں ان کو پھیر دیں۔ دیکھ بھال کر چلے گئے غرض اس قصہ سے یہ نکلا اگر چھپنا ہو تو قریب جگہ چھپنا چاہیے۔

انبیاء اور اولیاء کی ایک شان:

اور اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ انبیاءؑ بھولے بھالے نہیں ہوتے عقل کامل ان کو عطا ہوتی ہے اور بعض بزرگوں کی نسبت جو بھولے ہونے کو صفت کمال شمار کیا جاتا ہے تو یہ صفت ان بزرگوں کی ہے جن کے متعلق ارشاد اور تربیت نہیں ہے اور جن حضرات کو ارشاد اور تربیت اور ہدایت کا کام سپرد ہوتا ہے وہ بھولے نہیں ہوتے وہ سب سے زیادہ عاقل اور ہوشیار ہوتے ہیں انبیا کی بھی یہی شان تھی کہ بڑے عاقل ہوتے تھے۔کوئی شخص ان کو دھوکا نہیں دے سکتا تھا۔

بعض بھولے بزرگوں کی حکایات:

اور جو بزرگ یکسو ہیں اور ہدایت ان کے سپرد نہیں وہ البتہ بھولے ہوتے ہیں، چنانچہ ہمارے دوستوں میں ایک شخص تھے بہت بھولے تھے اور فطرۃً ایسے ہی تھے ان سے کسی نے کہہ دیا کہ جب کنکوا اڑاؤ گے جب نجات ہوگی ورنہ نہ ہوگی بیچارے کنکوا اڑانے کیلئے تیار ہو گئے۔ایک اور بزرگ تھے ان کو کسی نے کہہ دیا کہ ڈھول گلے میں ڈال کر بجاتے پھرو تو نجات ہوگی چنانچہ مستعد ہوئے اور ان کنکوے والے کی ایک اور حکایت ہے کہ ایک عورت جارہی تھی کسی ظریف نے کہا کہ میاں صاحب دیکھتے ہو اس کے سینے پر دو ابھری ہوئی کیا چیزیں ہیں اس کے پھوڑے ہو رہے ہیں جب تک تم ہاتھ نہ پھیرو گے تو اچھے نہ ہوں گے بہتر ہے کہ ہاتھ پھیر دو کسی کو تم سے نفع ہو تو کیا حرج ہے ورنہ قیامت میں پکڑ ہوگی کہ ایک شخص تمہارے سبب تندرست ہو جاتا مگر تم نے بخل کیا بیچارے ہاتھ پھیرنے کو مستعد ہو گئے۔دوسرے شخص نے اس مشورہ دینے والے کو دھمکایا کہ میاں کیوں ان کو پٹواتے ہو۔ایک اور حکایت ان کی یاد آئی ان کی نئی نئی شادی ہوئی تھی میں پوچھا تمہاری بی بی عورت ہے یا مرد کہنے لگے نتھ پہن رہی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ عورت ہے آج کل لوگ ایسے لوگوں کو بہت بزرگ جانتے ہیں اور جو عاقل ہیں ان کو سمجھتے ہیں۔کہ یہ تو ایسے ہی ہیں جیسے ہم ہیں غرض بھولے بھالوں کی بزرگی کا انکار نہیں لیکن یہ حکایتیں ان بزرگوں کی ہیں جن کے متعلق خلق اللہ کی ہدایت نہیں ہے اور جو ورثۃ الانبیاء ہیں وہ کامل العقل اور تام الفہم ہوتے ہیں کسی کی مجال نہیں کہ ان کو دھوکا دے سکے۔

شان فاروق اعظمؓ:

حضرت عمرؓ نے قیصر روم کے پاس قاصد بھیجا تھا قیصر نے پوچھا تمہارا خلیفہ کیسا ہے اس قاصد نے کیا جامع مختصر جواب دیا ہے یہ کہا کہ ہمارے خلیفہ کی شان یہ ہے لا یخدع ولا یخدع یعنی نہ کسی کو دھوکا دیتا ہے اور نہ کسی دوسرے کے دھوکے میں آتا ہے ہرقل سنکر متحیر رہ گیا اور اپنے لوگوں سے کہا کہ اگر یہ صحیح ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ حق تعالیٰ کی تائید اس کے ساتھ ہے اس لئے کہ دھوکہ نہ دینے سے تو معلوم ہوتا ہے کہ دین اس کا کامل ہے اور دھوکہ نہ کھانا یہ علامت ہے عقل کے کامل ہونے کی پس جس شخص کے اندر یہ دونوں صفتیں ہوں اس پر ہم غالب نہیں آسکتے اس کا ارادہ ایمان لانے کا تھا لیکن قوم نے مخالفت کی اس لئے رہ گیا ایک اور قصہ حضرت عمرؓ کا ہے کہ ایک مرتبہ اونٹ تقسیم فرمارہے تھے اور دو دو آدمیوں کو ایک ایک اونٹ دے رہے تھے ایک اعرابی آیا اور اس نے عرض کیا یا امیرالمومنین احملنی وسحیما علی بعیر واحد یعنی مجھکو اور سحیم کو ایک اونٹ دیجئے سحیم آدمی کا نام زیادہ ہوتا تھا اور مشک کو بھی کہتے ہیں مگر اس کے معنے میں مشہور نہیں تو بظاہر وہ دھوکہ سے چاہتا تھا کہ مجھ کو ایک اونٹ سالم مل جاوے اور یہ سخت تھا غریب لیکن حضرت عمرفوراً سمجھ گئے اور فرمایا میں تجھ کو قسم دیتا ہوں سچ بتلاؤ سحیم سے مراد مشک ہے۔ اس نے عرض کیا یا امیرالمومنین مشک ہی مراد ہے۔ فرمایا ہم کو دھوکہ دینا چاہتے ہو غرض حضرت عمرؓ کبھی کسی کے دھوکہ میں نہیں آئے اہل ارشاد کی یہی شان ہوتی ہے پس انبیاً بھولے بھالے نہیں ہوئے چنانچہ حضور ﷺ کی بیدار مغزی اور کمال عقل اس قصہ سے سمجھی گئی کہ ایسے تشویش کے وقت اس قدر قریب جا کر چھپے غرض ہم کو حق تعالیٰ نے ایسے رسول اللہ ﷺ عطا فرمائے ہیں کہ اخروی فلاح تو ان کے اتباع میں منحصر ہے ہی دینوی کامیابی بھی ان کی اطاعت کے ساتھ وابستہ ہے کسی نے خوب کہا ہے ؎

حسن یوسف دم عیسےٰ ید بیضا داری — آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری

(یوسف کا حسن، عیسٰی کی پھونک اور موسٰی کا ید بیضا تیرے پاس ہے جو کچھ معشوق فرداً فرداً رکھتے تھے تو تنہا رکھتا ہے)

اور دوسرا شعر کہتا ہے ؎

لیس علی اللہ بمستنکر — ان یجمع العالم فی واحد

الی اصل قرآن مجید کی تعلیم سے معلوم ہوا کہ مشورہ دلجوئی کا بڑا سبب ہے یہ تمام تر تقریر اس آیت کی شان نزول میں تھی میرا ارادہ اس قدر تطویل کا نہ تھا لیکن اتفاق سے بیان طویل ہو گیا مگر بہت سی کام کی باتیں اس سے معلوم ہو گئیں باقی مجھ کو اس وقت اصل مقصود آیت وشاورھم فی الامر ۔ ایک کوتاہی اور غلطی کا بیان کرنا ہے اگرچہ وہ کوتاہی کوئی بڑی معصیت نہیں ہے تاہم غلطی ضرور ہے اور اس میں عوام تو کیا خواص بلکہ اخص الخواص مبتلا ہیں وہ مضمون میرے ذہن میں اولاً آیا اس کے بعد دل چاہا کہ کسی آیت میں بھی یہ مضمون مل جاوے۔

اسباب کو مؤثر حقیقی سمجھنا کفر ہے

دفعۃً یہ آیت ذہن میں آئی اس میں جو غور کیا تو وہ مضمون بہت صاف اور واضح نکلا اول وہ غلطی سنئے وہ غلطی ہے توکل کے متعلق شرح اس کی یہ ہے کہ اللہ کے بندوں میں بہت سے متوکل عملاً بھی ہیں اور یوں علماً اور اعتقاداً تو سب ہی مسلمان متوکل ہیں یعنی اس بات کا اعتقاد ہر مسلمان کو ہے کہ جو کچھ عالم میں ہوتا ہے وہ مؤثر حقیقی کی طرف سے ہوتا ہے اور اسباب کا تعلق مسببات سے محض ظاہری تعلق ہے کوئی مسلمان بھی اس اعتقاد سے خالی نہیں ہے اور اگر خالی ہو تو وہ مسلمان نہیں کافر ہے چنانچہ افسوس کے ساتھ کہا جاتا ہے کہ اس زمانہ میں بعض نام کے مسلمان ایسے بھی ہیں کہ اسباب کو مؤثر حقیقی جانتے ہیں سو یہ لوگ نام کے مسلمان ہیں۔

احمقوں اور ملحدوں کی چند حکایات:

ایک صاحب تھے جو بڑے معزز مشہور ہیں اور اعلیٰ طبقہ میں ان کا شمار ہوتا ہے ان کی نسبت سنا ہے کہ ایک شخص نے ان کے سامنے کسی امر کے بارہ میں یہ کہا خدا چاہے گا تو اس معاملہ میں کامیابی ہو گی کہنے لگے کہ اس میں خدا کے چاہنے کی کیا بات ہے ہم تدبیر کرتے ہیں تدبیر سے یہ کام ہو جاوے گا عقل تو مسخ ہو ہی گئی تھی مگر بات بھی برٹ گئی باوجود صاحب زبان ہونے کے بات بھی کرتے ہیں تو غلط بولنے والے انگریزوں کی طرح سے اور خیر بات کا تو کچھ نہیں مگر عقائد کفریہ سے تو بچنا چاہئے لیکن ان کا اسلام کچھ ایسا مضبوط ہے کہ کفر و شرک کر لو جب بھی نہیں جاتا صاحبو اسلام تو ایسے ناز اور دماغ کا ہے کہ اس کا ذرا اعراض کرو تو وہ ناراض ہو جاتا ہے اس حکایت مذکورہ کے مناسب ایک اور لطیفہ یاد آیا ایک احمق چلا جا رہا تھا کسی نے پوچھا کہاں جا رہے ہو کہا بازار

جاتا ہوں گدھا خریدوں گا اس نے کہا انشاءاللہ کہہ لو کہنے لگا روپیہ میری جیب میں ہے گدھا بازار میں پھر انشاءاللہ کہنے کا کیا موقع ہے آگے گیا تو کسی نے جیب کتر لی اور روپیہ اڑا لیا اپنا سامنہ لے کر واپس آئے پھر وہ شخص ملا پوچھا کہاں سے آرہے ہو کہا میں بازار گیا انشاءاللہ اور میرا روپیہ چوری ہوگیا انشاءاللہ اور گدھا میں نے نہیں خرید ا انشاءاللہ اور اب میں مفلس ہوں انشاءاللہ اب اس کو انشاء اللہ کا ایسا سبق یاد ہوا کہ واقع میں جو موقع انشاءاللہ کا نہ تھا اس میں بھی انشاءاللہ داخل کر دیا۔

اگر غفلت سے باز آیا جفا کی تلافی کی بھی ظالم نے تو کیا کی

یہ تو احمقوں اور ملحدوں کی حکایتیں ہیں لیکن مسلمان کوئی ایسا نہیں ہے جو علماً و اعتقاداً اس کا قائل نہ ہو کہ جو کچھ ہوتا ہے خدا تعالیٰ کے چاہنے سے ہوتا ہے۔

جن اسباب کا ترک کرنا حرام ہے:

مگر گفتگو اس توکل میں نہیں ہے بلکہ گفتگو توکل خاص میں ہے جو بمعنے ترک اسباب ہے اور ترک اسباب مطلقاً مراد نہیں ہے بلکہ اس میں یہ تفصیل ہے کہ جو اسباب ایسے ہیں کہ عادتاً مسبب اسی پر مرتب ہوتا ہے ایسے اسباب کو ترک کرنا حرام ہے ہاں اس کی تقلیل کر دے جیسے کھانا پیٹ بھرنے کے لئے پینا سیرابی کے لئے سونا راحت کے واسطے اگر کسی نے یہ اسباب ترک کر دیئے اور مر گیا تو گنا ہگار ہوگا ہاں اگر کسی کے ساتھ حق تعالیٰ کی یہ عادت ہو جاوے کہ اس کے بغیر کھائے بھوک نہ لگے اور ضعف نہ ہو تو مستثنیٰ ہے جیسے بعض بزرگوں نے سال سال بھر نہیں کھایا۔ جناب رسول اللہ ﷺ متواتر کئی کئی روز بدون شب کو افطار کئے ہوئے روزہ رکھتے تھے صحابہؓ نے بھی دیکھ کر شروع کئے حضور ﷺ کو خبر ہوئی تو فرمایا ایکم مثلی انما یطعمنی ربی ویسقینی یعنی تم میں مجھ جیسا کون ہے مجھ کو تو میرا رب کھلا پلا دیتا ہے ذکر اللہ سے ایسے حضرات کو ایسی سیری حاصل ہو جاتی ہے جیسے غذا سے کسی نے خوب کہا ہے

وذکرک للمشتاق خیر شراب وکل شراب دونہ کسراب

کثرت ذکر کا ایک خاصہ:

اور کثرت ذکر کا یہ تو خاصہ مشترکہ ہے کہ بھوک کم لگتی ہے بیقراری نہیں ہوتی آجکل عقل پرستی کا بہت زور ہے شاید اس پر کوئی سوال کرے کہ یہ بات تو سمجھ میں نہیں آتی اس لئے اس کی میں

وجہ عقلی بھی بیان کئے دیتا ہوں بات یہ ہے کہ جب خیال آدمی کا دوسری طرف متوجہ ہوتا ہے تو بھوک پیاس کا احساس نہیں ہوتا ہے۔ دیکھ لو جو لوگ کسی کے کام میں منہمک ہوتے ہیں اور غایت مشغولی ہوتی ہے تو کھانے کا وقت گزر جاتا ہے۔ یاد بھی نہیں آتا کہ ہم نے کھانا نہیں کھایا۔ پس جب دنیوی مشاغل میں یہ حالت ہے تو اللہ تعالیٰ کی یاد تو اس سے کہیں بڑھ کر ہے۔ اس کی محبت کی شراب تو ایسی ہے کہ بھوک پیاس تو علیحدہ آدمی اپنے آپ کو بھول جاتا ہے عوام کے مسلمات سے ہی اس کا پتہ چلتا۔ یہ عورتیں کہا کرتی ہیں کہ ان کو بھوک نہیں لگتی انکا پیٹ تو اللہ کے نور سے بھرا ہوا ہے تو یہ واقعی بات ہے کہ نور ذکر وہ شئے ہے کہ طبعیات اس سے مغلوب ہو جاتی ہیں۔ میرے ایک ذاکر دوست کہتے تھے کہ میں نے آزمایا تھا کہ دیکھوں کتنے دن نہیں کھا سکتا دس بارہ دن تک متواتر نہیں کھایا تو کچھ زیادہ ضعف محسوس نہیں ہوا ہاں یہ لوگ تو مستثنیٰ ہیں لیکن جو ایسا نہ ہو اور پھر کھانا پینا ترک کر دے اور مر جاوے تو حرام موت مرے گا اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ حق تعالیٰ کو ہم پر ہم سے زیادہ رحم ہے کہ اس طور سے اپنے کو ہلاک کر دینے کو حرام فرما دیا۔

توکل کا مفہوم:

پس ایسے اسباب کو ترک کر دینا جائز نہیں ہاں ایسی تقلیل جو مفضی الی الضعف المفرط نہ ہو جائز ہے اور جس طرح ترک اسباب ناجائز ہے اسی طرح اسباب میں انہماک بھی ناجائز ہے۔ مثلاً کھانے ہی کی صورت میں نہ یہ جائز ہے کہ بالکل ترک کر دے اور نہ ایسا انہماک جائز ہے جو ملے کھا جائے، نہ حرام کی تمیز کرے نہ حلال کی ایسے امور میں اسی توسط کا نام توکل ہے ایک قسم اسباب کی یہ ہوئی اور بعض اسباب وہ ہیں کہ مسبب ان پر بلا اسباب کے بھی مرتب ہو جاتا ہے جیسے کسب مال کے ذرائع مال تحصیل کے لئے مسبب ان ذرائع پر موقوف نہیں ہے بلا ان اسباب کے بھی بکثرت ترتب ہو جاتا ہے۔

اسباب میں توکل:

ایسے اسباب میں توکل یہ ہے کہ اگر اپنے نفس میں قوت پائے اور پریشانی نہ ہو تو ترک کر دینا جائز ہے تیسرے اسباب وہمیہ کہ مسبب کا مرتب ہونا ان پر بہت بعید ہے جیسا دور دراز کا سامان کرنا کہ فلاں جگہ سے روپیہ مل جاوے تو جائیداد خریدوں گا۔ اور اس جائیداد کی آمدنی سے

ایک تجارت کا کارخانہ کھولوں گا اس کے بعد فلاں کام کروں گا یہ سوچ کر ان اسباب میں ایسا مشغول و منہمک ہو گیا کہ حلال و حرام کی بھی تمیز نہ رہی ایسے اسباب کا ترک واجب ہے۔

اسباب کے تین اقسام:

پس اسباب کی کل تین قسمیں ہوئیں اسباب قطعیہ، اسباب ظنیہ، اسباب وہمیہ اسباب قطعیہ کا ترک حرام اور اسباب ظنیہ کا ترک بشرط قوت نفس مندوب اور اسباب وہمیہ کا ترک واجب صوفیہ کرام توکل سے مراد اسباب ظنیہ کا ترک لیتے ہیں اور قرآن مجید اور احادیث میں جہاں توکل کا امر ہے اس سے کہیں تو تقلیل یا ترک اسباب ظنیہ مراد ہے اور کسی جگہ ترک اسباب وہمیہ مقصود ہے یہ تقریر تو نفس توکل کے متعلق تھی۔

خواص متوکلین کی ایک غلطی:

اس کے بعد سنئے کہ توکل کے متعلق بعضے خواص متوکلین ایک غلطی میں مبتلا ہیں وہ غلطی یہ ہے کہ متوکلین کی حالت باعتبار توکل کے تمام احوال میں یکساں نہیں دیکھی جاتی حالانکہ توکل کا اقتضاء یہ ہے کہ تمام احوال میں حق تعالیٰ پر یکساں نظر ہو لیکن ان کے مختلف احوال میں بڑا فرق دیکھا جاتا ہے اور اس فرق کا احساس خود ان کو بھی نہیں ہوتا اور وہ فرق یہ ہے کہ اسباب کے ترک میں جتنی انکی نظر حق تعالیٰ پر ہے اس قدر نظر اسباب کے اختیار کرنے کی صورت میں نہیں ہوتی حالانکہ دونوں مواقع توکل کے ہیں کہ دونوں میں تفویض الی الحق یکساں ہونا چاہیے گو اسباب کے اختیار کرنے کو اصطلاحاً توکل نہیں کہا جاتا۔

توکل کی حقیقت:

لیکن توکل کی حقیقت جو تفویض الی الحق ہے وہ اختیار اسباب اور عدم اختیار اسباب دونوں میں یکساں ظاہر ہونا چاہیے اس لئے کہ الشئی اذا ثبت ثبت بلوازمہ تو توکل کے لوازم بلکہ حقیقت اس کی یہی تفویض الی الحق ہے کہ ہر موطن میں اس کا ظہور ہونا ضروری ہے گو اعتقاداً تو یکساں حالت ہے لیکن حالاً یکساں نہیں ہے دیکھ لیجئے اور اپنے وجدان کی طرف رجوع کر لیجئے متوکلین اور غیر متوکلین سب اس بات کا احساس کر سکتے ہیں کہ ترک اسباب جو کیفیت قلب کی

تفویض کے اعتبار سے ہوتی ہے اس درجہ کی کیفیت اسباب کے اختیار کرنے میں نہیں ہوتی مثلاً ایک شخص نوکری یا تجارت چھوڑ کر بیٹھ گیا تو جیسی نظر اس صورت میں حق تعالیٰ پر ہوتی ہے اس مرتبہ کی نظر اس صورت میں نہیں ہے کہ کھانا کھا رہے ہیں اس صورت میں حالانظر اس پر ہے کہ کھانا کھانے سے یہ شبع ہوگا یہ حالت نہیں ہے کہ خدا تعالیٰ اگر چاہیں گے تو شبع اور قوت حاصل ہو گی ورنہ نہیں۔ یا مثلاً مکان بنوا رہے ہیں یہاں اس قسم کی نگاہ حق تعالیٰ پر نہیں بلکہ اسباب پر نظر ہے جتنا روپیہ پاس ہے اس پر نظر ہے اور آئندہ کے لئے فکر ہے کہ کیسے اس کی تکمیل ہوگی پس اس فرق کے کیا معنے، یہ ہے وہ غلطی جو اوّل میرے ذہن میں آئی اس کے بعد تلاش ہوئی کہ کہیں شریعت میں بھی اس کا پتہ ہے یا نہیں چنانچہ بعد تلاش کے معلوم ہوا کہ سب سے زیادہ صریح دلالت اس مضمون پر اس آیت کو ہے تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ حق تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ فَإِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ یعنی ان سے کام میں مشورہ کیجئے پھر جب آپ عزم کریں گے تو اللہ پر بھروسہ کیجئے اس آیت میں ایک مرتبہ تو ہے مشورہ کا اور دوسرا مرتبہ ہے عزم کا یعنی جب مشورہ میں پختہ ارادہ ایک جانب کا طے ہو جائے اس کے بعد حکم ہے کہ اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کیجئے یہ ظاہر بات ہے کہ مشورہ ایک تدبیر ہے پس مشورہ کا محل وہ امر ہوگا جو محل تدبیر ہو اور اس کا تعلق اسباب اور تدبیر سے ہو غیر اختیاری نہ ہو نیز عزم کا حاصل ہے ترجیح احد المقدورین اس سے بھی واضح ہو جاتا ہے کہ امر اختیاری کے متعلق یہ ارشاد ہے پس حاصل یہ ہوا کہ جن امور کا تعلق اسباب سے ہے انکی نسبت ارشاد ہے کہ ان کے اسباب اور تدبیر میں اول آپ مشورہ فرمائیے اور مشورہ میں جو امر طے ہو یعنی جس سبب کی مباشرت قرار پائے جب آپ اس سبب کا عزم فرما دیں تو اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کیجئے پس اس آیت سے معلوم ہو گیا کہ توکل کچھ اسی موقع کیساتھ خاص نہیں ہے کہ جس میں اسباب کو ترک کر دیا جاوے بلکہ اسباب کے اختیار کرنے کی صورت میں بھی توکل مع اپنے آثار و لوازم کے ہونا چاہئے اب دیکھ لیجئے کہ اس حالت میں توکل کس کے اندر ہے عوام تو عوام خواص جو تارک اسباب یا مقلل اسباب ہیں ان میں بھی یہ کوتاہی دیکھی جاتی ہے جیسے ان کی نظر ترک اسباب کی صورت میں اللہ تعالیٰ پر ہوتی ہے اس درجہ کی نظر اسباب کے اختیار کرنے کی حالت میں نہیں ہوتی تو یہ بڑی کوتاہی ہے۔

صفت توکل میں کمی:

اور حقیقت میں توکل کی صفت میں کمی ہے اور اپنی اس غلطی پر تنبیہ نہیں ہے۔ مجھ کو خود اس پر تنبہ نہیں تھا سفر میں یہ بات محسوس ہوئی تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ سفر میں تو توکل کی صفت کا ظہور زیادہ ہوتا ہے یعنی جب کہیں سفر ہوتا ہے تو قلب خوف و رجا میں ہوتا ہے کہ دیکھئے کہ گھر واپسی ہوگی یا نہیں اگر حق تعالیٰ خیر و عافیت رکھیں گے تو ہو جاوے گی ورنہ ممکن ہے کوئی عارض ایسا پیش آجاوے کہ جو راہ ہی میں ختم ہو جائیں حالانکہ اسباب گھر پہنچنے کے موجود ہیں لیکن ان اسباب پر نظر نہیں ہوتی صرف حق تعالیٰ پر ہوتی ہے پس اس مقام پر تو حالی توکل حق تعالیٰ نے نصیب کر دیا اور ممکن ہے کہ یہ امر میرے ضعف قلب سے ہو اور میں اس کو توکل سمجھتا ہوں بہر حال جو کچھ بھی ہو اس حالت میں نظر حق تعالیٰ پر ہوتی ہے یہ تو سفر کی حالت تھی اور مسجد سے گھر جانے تک یہ کیفیت نہیں ہوتی کہ قلب کے اندر خوف و رجا کی کیفیت ہو کہ اگر اللہ تعالیٰ کو منظور ہوگا تو پہنچیں گے ورنہ نہیں جیسے جناب رسول اللہ ﷺ کی یہ کیفیت ہر وقت تھی چنانچہ احادیث میں آیا ہے کہ حضور ﷺ پیشاب سے فارغ ہو کر فوراً تیمم فرما لیتے تھے۔ صحابہؓ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ ﷺ پانی تو موجود ہے آپ فرماتے ہیں کہ شاید پانی تک نہ پہنچ سکوں پس حضور ﷺ کی نظر ہر وقت اور ہر حال میں حق تعالیٰ پر تھی یہ بات ہم لوگوں کو میسر نہیں ہماری جو حالت کلکتہ جانے سے ہوتی ہے اسٹیشن پر جانے میں وہ کیفیت نہیں ہے یا مثلاً مکان بنوار ہے ہیں جتنا روپیہ پاس ہے اس کا نقشہ تو سامنے ہے اور آگے کا کھٹکا ہے گویا روپیہ کا اختتام کے بعد حق تعالیٰ پر نظر ہے اور روپیہ ہونے تک اسباب پر نگاہ ہے توکل کا مقتضا تو یہ تھا کہ اسباب کے ہوتے ہوئے بھی حق تعالیٰ ہی پر نظر ہوتی کہ اگر وہ چاہیں گے تو مکان بنوا دیں گے ورنہ نہیں سو یہ حالت نہیں ہے اور لیجئے دوا پی کر صحت کی امید میں حق تعالیٰ پر نظر ہوتی ہے ایسی نظر اس وقت تک نہیں ہوتی کہ جو شائدہ پک کر ہمارے پاس آرہا ہے اس وقت یہ احتمال نہیں ہوتا کہ شاید راستہ ہی میں گر جائے اور ہم تک نہ پہنچے خلاصہ یہ ہے کہ خوف و رجا ہر وقت ہونا چاہیے اس لئے کہ خوف و رجا توکل کے لوازم سے ہے حالانکہ ہماری یہ حالت نہیں بے شک یہ کمی ہے حال کی اور بڑی بھاری کمی ہے کہ جس کی طرف آج تک التفات بھی نہ ہوا تھا۔ اسی ہفتہ میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس پر تنبہ ہوا اور سفر کی بدولت یہ بات سمجھ میں آئی

میں کہا کرتا تھا کہ سفر عذاب جان ہے مگر اس سفر میں اس علم کے حاصل ہونے سے یہ خیال بدل گیا اور معلوم ہوا کہ سفر بسا اوقات سبب بہت سے فوائد کا ہوتا ہے مگر اس کا احساس چھوٹے سفر میں نہیں ہوا بڑے سفر میں ہوا یہ ریل کی برکت ہے کہ اس کے سبب توجہ الی اللہ ہوگئی اسی طرح ریلوے کے قصے جو سنے گئے کہ ٹکرا جاتی ہیں اس روز سے جب ریل میں سوار ہونے کا اتفاق ہوتا ہے تو خوف معلوم ہوتا ہے کہ دیکھئے کہ صحیح سلامت گھر پہنچتے ہیں یا نہیں۔ اور حق تعالیٰ پر نظر ہوتی ہے کہ وہی چاہیں گے تو پہنچائیں گے اس اعتبار سے ان ریلوں کا وجود بھی ہمارے حق میں رحمت ہو گیا اس لئے کہ جو شئے توجہ الی اللہ کا سبب ہو جاوے اس کی رحمت ہونے میں کیا شک ہے۔

حکایت حضرت عمر بن عبدالعزیز:

حضرت عمر بن عبدالعزیز کی حکایت یاد آ گئی کہ اس کے مکان میں ایک زینہ تھا جب وہ اس پر چڑھتے تھے اس کی ایک اینٹ ہلا کرتی تھی ایک لونڈی نے اس کو گارا لگا کر مضبوط و درست کر دیا ایک بار جو وہ چڑھتے تو وہ ہلی نہیں پوچھا کہ اینٹ کیوں نہیں ہلی عرض کر دیا گیا کہ اس کو درست کر دیا گیا ہے فرمایا کہ اس کا ہلنا ہمارے لئے رحمت تھا کہ جب ہم اس پر قدم رکھتے تھے تو ہم کو پلصراط یاد آتا تھا کہ اے اللہ اس اینٹ سے ہم کو جب اندیشہ ہوتا ہے تو پلصراط پر کیا حال ہوگا بس منشا میری اس اندیشہ وخوف کا جو کہ ریل میں ہوتا ہے اگر ضعف قلب و وہم بھی ہو تو جو ضعف سبب ہو جاوے استحضار کا تو وہ مبارک ہے اور بہتر ہے اس قوت سے جو کہ غفلت کا باعث ہو ایسی قوت کس کام کی ہے۔

ہر وقت مسبب پر نظر رکھنے کی ضرورت:

ایک مختصر سی بات تھی جس کو میں مختصر ہی بیان کرنا چاہتا تھا لیکن مضمون طویل ہو گیا یہاں سے بھی یہ مسئلہ جس کا ذکر کر رہا ہوں ثابت ہو گیا اور اپنی بصیرت کی کمی بھی معلوم ہو گئی کہ اختصار کے قصد کے وقت نظر ہونا چاہیے تھا حق تعالیٰ پر کہ اگر اللہ تعالیٰ کی مشیت ہو گی تو اختصار ہو گا ورنہ نہیں مگر اس سے غفلت ہوئی اور میرا مقصود اس مضمون کے اظہار سے یہ نہیں کہ اسباب کو ترک کر دیا جاوے بلکہ مقصود یہ ہے کہ جیسے ترک اسباب میں خدا تعالیٰ پر نظر ہے اسی طرح اسباب کے اختیار کرنے کی صورت میں بھی ہونا چاہیے غرض کسی وقت مسبب سے غفلت نہ ہو، ایک بزرگ کہتے ہیں ؎

عقل در اسباب می دارد نظر عشق می گوید مسبب را نگر

(عقل اسباب پر نظر رکھتی ہے اور عشق مسبب پر نظر رکھتا ہے)

یعنی اسباب سے نظر متجاوز کر کے خالق الاسباب کو دیکھو اسباب پر جس طرح اعتقاداً نظر نہیں ہے حالاً بھی نظر نہ ہو مثلاً ایک شخص لکڑی سے کسی کو مار رہا ہے تو جو کوتاہ بیں ہے وہ تو کہیگا لکڑی مار رہی ہے اور جس کی نظر اس سے آگے ہے وہ کہتا ہے کہ بے وقوف لکڑی کیا مارتی ہے ہاتھ مارتا ہے اور حقیقت میں ضارب کی طرف نسبت کرے گا۔ پس اسباب کو ایسی حیثیت سے مت دیکھو جس حیثیت سے اس ظاہر میں شخص نے لکڑی کو دیکھا مولانا فرماتے ہیں۔

یک دہاں پنہان ست در لبہائے وے　　　دو دہاں داریم گویا ہمچو نے

ہائے وہوئے درفگندہ در شما　　　یک دہاں نالاں شدہ سوئے شما

(بانسری کی طرح ہم دو منھ رکھتے ہیں ایک منھ اس کے لبوں میں چھپا ہوا ہے اور دوسرے منھ کا رخ تمہاری طرف ہے اور اس سے ہائے ہو کا شور برپا ہو رہا ہے)

قال الجدار للوتد لم تشقنی، قال الوتد انظر الی من یدقنی

(یعنی دیوار نے میخ کو کہا کہ تم مجھ کو کیوں چیرتی ہے میخ نے کہا کہ اس شخص کو دیکھ جو مجھ کو ٹھونکتا ہے مولانا فرماتے ہیں

نیستم در صف طاعت بین بین　　　من چو کلکم درمیان اصبعین

(میں طاعت کی صف میں جو بیچ میں ہوں وہ طاعت کی وجہ سے نہیں ہوں بلکہ قلم کی طرح دو انگلیوں کی درمیان پھنسا ہوا ہوں)

درمیان اصبعین کیستی　　　بنگر اے دل گر تو اجلالیتی

(اے دل اگر تو بزرگی چاہتا ہے تو تو بھی غور کر کہ تو کن دو انگلوں کے درمیان پھنسا ہے)۔

می برد ہر جا کہ خاطر خواہ اوست　　　رشتہ در گردنم افگندہ دوست

(میری گردن میں دوست نے رسی باندھ رکھی ہے اور جدھر جو اس کی طبعیت چاہتی ہے مجھے کھینچ کر لے جاتا)

حقیقت میں اگر غور کیا جاوے تو کوئی شئے بھی اپنے قبضے میں نہیں ہے اپنے ہاتھ پاؤں اور اپنی ذات پر تو قبضہ ہے ہی نہیں دوسری اشئے تو علیحدہ باقی رہی یہ بات کہ یہ حالت کس طرح میسر ہو سکتی ہے تو اس کا طریقہ کثرت مراقبات و مجاہدات اور شیخ کامل کی صحبت ہے۔

تردد اور سکون میں فرق:

اب یہاں ایک شبہ ہو سکتا ہے وہ یہ ہے کہ تمہاری تقریر کا حاصل تو یہ ہوا کہ توکل کی شان یہ ہے کہ آدمی ہر وقت ایسے ہی خوف رجا کے اندر رہے جیسے ترک اسباب کی صورت میں رہتا ہے پس تم تو تردد اور تذبذب اور پریشانی اور بے اطمینانی کی تعلیم کرتے ہو حالانکہ بزرگوں کی تصریحات سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا تعالیٰ پر بھروسہ کرنے کے معنے یہ ہیں کہ خلجان بالکل نہ ہو قلب مطمئن ہو اور بعض آیات سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے چنانچہ قَالَ الَّذِيْنَ يَظُنُّوْنَ اَنَّهُمْ مُّلٰقُوا اللّٰهِ كَمْ مِّنْ فِئَةٍ قَلِيْلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيْرَةً بِاِذْنِ اللّٰهِ غرض قرآن حدیث اور بزرگوں کے اقوال سے تو قرار کی تعلیم ہوتی ہے اور تم بیقراری سکھلاتے ہو دوسری جگہ ارشاد ہے وَمَنْ يَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَهُوَ حَسْبُهٗ یعنی جو شخص اللہ پر بھروسہ کرے وہ اس کو کافی ہے یہ آیت بھی سکون کی تعلیم کرتی ہے اور تمہاری تقریر سے حرکت اضطراب کی تعلیم معلوم ہوتی ہے بات یہ ہے حفظت شیأ وغابت عنک اشیاء حق تعالیٰ کے ارشاد سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک جانب کو قرار دے لو یہ کہیں کہ وعدہ نہیں ہے کہ جو جانب تمہاری مرضی کے موافق ہے اس کا ہی وقوع ہوگا كَمْ مِّنْ فِئَةٍ میں خود اس کی طرف ارشاد ہے کہ بعض جماعتیں مغلوب بھی ہوتی ہیں اسی طرح وَمَنْ يَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَهُوَ حَسْبُهٗ، کفایت کا مطلب یہ نہیں کہ حسب مرضی سب کام ہوا کریں گے بلکہ مطلب یہ ہے کہ جو مناسب ہوگا اس کا ظہور ہوگا اور جو کچھ واقع ہوگا وہی مصلحت ہوگا کارسازی ان کی شان ہے کہ خواجہ خود روش بندہ پروری داند جیسے بچہ کو طبیب کے سپرد کیا جاتا ہے اور اس پر کفایت ہوجاتی ہے اور تردد نہیں رہتا اس لئے کہ جانتے ہیں کہ جو اس کے لئے بہتر ہوگا وہی تجویز کریگا یہ مقصود نہیں ہوتا کہ جو بچہ چاہے گا وہ ملے گا حلوا مانگے گا تو حلوا ملے گا اور مٹھائی چاہے گا تو مٹھائی ملے گی بلکہ جو شے اس کے لئے مفید اور نافع ہوگی خواہ اس کو گوارا ہو یا نا گوار وہ ملے گی پس تردد تو تصور کے درجہ میں ہے اور سکون ہے حال کے مرتبہ میں یعنی تردد اس معنے کو ہے کہ دیکھئے قضا و قدر سے کیا واقع ہوتا ہے اور سکون اس پر ہے کہ کچھ واقع ہوگا بہتر اور مناسب ہوگا چنانچہ جو شق بھی ظاہر ہوتی ہے اس پر یہ حضرات اسی طرح مطمئن ہوتے ہیں جس طرح دوسری شق کے وقوع پر دونوں حالتوں میں سکون کے اعتبار سے کوئی فرق نہیں ہوتا ہاں طبعی رنج اور غم امر آخر ہے

پس سکون اور حرکت دونوں اس طرح جمع ہو گئے حاصل یہ ہوا کہ توکل یہ ہے کہ خواہ اسباب کو ترک کرے یا اختیار کرے ہر وقت اس پر نظر ہونا چاہئے کہ خدا تعالیٰ چاہیں گے تو یہ کام ہوگا ورنہ نہ ہوگا اور سکون یہ ہے اگر کام نہ بھی ہو تو اس پر قلب کو راضی ہونا چاہیے کہ یہی بہتر تھا لیکن باوجود اس حالت کے اسباب کو پھر بھی نہ چھوڑے۔

دعا بھی اسباب توکل میں شامل ہے:

اور انہیں میں دعا بھی داخل ہے جس پر بظاہر یہ شبہ ہوتا ہے کہ جب یہ امر متعین ہے کہ جو کچھ ہوگا بہتر ہوگا پھر ایک جانب کی درخواست اور دعا کرنے کے کیا معنے بات یہ ہے کہ اس میں اظہار ہے افتقار کا اور اسی لئے دعا کرتے وقت تردید نہ کرو بلکہ جس جانب کو تم خیر سمجھتے ہو اور تمہارے علم میں وہ مصلحت ہے اس کو بالتعیین خدا تعالیٰ سے مانگو ہاں جس کے خیر ہونے میں شبہ ہو وہاں قید لگا دی جاوے اور تنگ چشموں کے نزدیک اس میں بھی بظاہر سخت تعارض معلوم ہوتا ہے کہ مانگی ہوئی چیز بھی خیر ہو اور جب اس کے خلاف واقع ہو تو اس مانگی ہوئی چیز کے مقابل خیر ہو مگر فی الواقع تعارض کچھ نہیں اس لئے کہ جس جانب کو تم مانگ رہے ہو۔ وہ تمہارے علم کے اعتبار سے خیر ہے اور جو واقع ہوگا وہ نفس الامر کے لحاظ سے خیر ہے۔

بندہ کو علم غیب عطا نہ ہونے میں حکمت:

اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ بندہ کو غیب کامل جو عطا نہیں کیا گیا اس میں بڑی مصلحت ہے اور حکمت ہے ورنہ جس چیز کا نہ ہونا معلوم ہو جاتا اس کو یہ کیوں کر مانگ سکتا اور اس صورت میں کہ دعا کا جو مقصود ہے عبدیت اور تذلل اور افتقار اس سے یہ محروم رہتا پس رضا بالقضا اور دعا اور حرکت اور سکون سب جمع ہو گئے اور کوئی اشکال نہ رہا جیسے گھڑی کے کل پرزے جب علیحدہ علیحدہ کر دیئے جاویں تو ناواقف اگر ان کو بے ٹھکانے جوڑ دے تو گھڑی نہ چلے گی اور واقف ہر پرزے کو اس کے ٹھکانے پر رکھ دیگا تو گھڑی چل جاوے گی۔

شیخ کامل کا کام شبہات اور تعارض کو دور کرنا ہے:

شیخ کامل کا یہی کام ہے کہ وہ ایسے شبہات اور تعارض کو دفع کرتا ہے اور یہی ہے وہ

بات جو کتابوں کو دیکھنے سے حاصل نہیں ہوتی اب اس کے بعد جو اشکلات اور شبہات کئے جاویں یا تو منشاء ان کا اعتراض اور عناد ہے یا غلبہ حال سے جیسے کسی کا شعر ہے ؎

درمیان قعر دریا تختہ بندم کردہ ۔ بازمی گوئی کہ دامن ترمکن ہشیار باش

(دریا کی گہرائی میں تختہ میں باندھ کر مجھے ڈالدیا ہے اور اس کے بعد پھر یہ کہتا ہے کہ ہوشیار رہنا دامن بھیگنے نہ پائے)

اگر یہ شاعر حیرت اور غلبہ حال میں ہے تو معذور ہے مگر جاہل اور اگر معترضانہ کہتا ہے تو ایمان دے بیٹھا لوگ ایسے ہی اقوال سے ابطال شریعت پر استدلال کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ حقیقت اور شریعت کو کیسے جمع کریں مولانا ایسے ہی بے باکوں کے بارہ میں فرماتے ہیں ؎

ظالم آں قومیکہ چشماں دوختند ۔ از سخنہا عالمے راسوختند

ظالم وہ ہیں جنہوں نے آنکھیں بند کرلیں اور تمام دنیا کو اپنی باتوں سے جلاتے رہے

ایسے اقوال اکثر یا سڑی اور دیوانوں کے ہوتے ہیں اور یا ملحدوں کے عمر خیام کی رباعیاں بہت مشہور ہیں ان میں بہت رباعیاں ایسی ہی ہیں آج کل جاہل لوگ ایسے اشعار بڑے مزے لے کر پڑھتے ہیں۔ یاد رکھو ادب بڑی چیز ہے۔ مولانا فرماتے ہیں ؎

از خدا جوئیم توفیق ادب ۔ بے ادب محروم گشت از فضل رب

ہم خدا سے ادب کی توفیق مانگتے ہیں کیونکہ بے ادب اللہ کے فضل سے محروم ہو جاتا ہے۔

بے ادب تنہا نہ خود را داشت بد ۔ بلکہ آتش در ہمہ آفاق زد

(بے ادب خود ہی برا نہیں رہتا بلکہ تمام دنیا میں بے ادبی کی آگ لگا دیتا ہے)

اور ایسی گستاخی و بے ادبی جہل کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے۔ اور اسی واسطے بڑی ضرورت شیخ کامل کی ہے جو جہل کو دور کرے ایسے جاہل صوفیوں سے تو وہ لوگ بہت اچھے ہیں جو سیدھا سادا نماز روزہ کر لیتے ہیں اور اپنی عمر ختم کر دیتے ہیں الحاصل یہ مسئلہ توکل اچھی طرح محقق ہو گیا اور سب شبہات دفع ہو گئے اور مجھ کو جو کچھ مقصود تھا اس کا بیان شافی کافی ہو گیا اب جس طرح مقصود سے پہلے ایک تمہید تھی اسی طرح مقصود کے بعد مناسب معلوم ہوتا ہے کہ چند فوائد اس آیت کے بطور لواحق کے بیان کر دیئے جاویں گو مقصود میں ان کا دخل زیادہ نہ ہو۔

تقدیر وتدبیر میں منافات نہیں:

سو من جملہ ان فوائد کے ایک امر اس آیت سے یہ مستنبط (اخذ ہوتا) نکلا ہوا کہ تقدیر وتدبیر میں منافات (آپس میں نفی کرنا) نہیں ہے چنانچہ مفصل اس کا بیان گزر چکا اور ایک فائدہ یہ معلوم ہوا کہ مشورہ دلجوئی کا بہت بڑا آلہ ہے اور یہ معلوم ہوا کہ مشورہ فی نفسہ مطلوب ہے چنانچہ دوسرے مقام پر فرمایا ہے و امرھم شوری (اوران کا ہر کام مشورہ سے ہوتا ہے) یہاں مشورہ اور امر کو متحد قرار دینے سے یہ بتلا دیا کہ کوئی امر بغیر مشورہ نہ ہونا چاہیے اس لئے بغیر مشورہ جو کام ہوتا ہے اس کا انجام اگر اچھا ہو گیا تو خیر ورنہ ملامت ہوتی ہے اور اگر چار آدمیوں کے مشورہ سے ہو تو ندامت اور ملامت نہیں ہوتی گو انجام بخیر نہ ہو۔

اہل یورپ کے نزدیک جمہوری سلطنت بہتر ہے:

ایک فائدہ یہ ہے کہ آجکل جن لوگوں کو لیڈر کہا جاتا ہے وہ ایک خاص مسئلہ کے اندر اکثر کلام کیا کرتے ہیں وہ یہ ہے کہ سلطنت جمہوری بہتر ہے یا شخصی ان لوگوں کی وہی مثل ہے "رہیں جھونپڑوں میں خواب دیکھیں محلوں کا اپنی حد پر نہیں رہتے مولانا فرماتے ہیں۔

آرزو می خواہ لیک اندازہ خواہ　　　برنتابد کوہ را یک برگ کاہ

(آرزو کر لیکن اعتدال کے ساتھ کیونکہ گھاس کا ایک تنکا پہاڑ کو موڑ نہیں سکتا)

اے صاحبو! اپنی بساط سے زیادہ مت کودو۔ حد سے زیادہ مت اچھلو تم سلطنت جمہوری وشخصی کا کیا فیصلہ کرو گے تم اپنا ہی فیصلہ کرلو۔ تمہارے اندر رات دن ایک معرکہ رہتا ہے مولانا فرماتے ہیں۔

موسیٰ وفرعون در ہستی ست

ایک مصرعہ یاد نہیں رہا۔ اور خاص کر یہ زمانہ تو بہت زیادہ سکوت کا ہے۔ ھذا وقت السکوت و ملازمۃ البیوت جو بالکل ساکت رہتے ہیں اگر ان کو سلطنت نہیں ملتی تو یہ لوگ جو دن رات بیٹھکوں میں بیٹھ کر سلطنتوں کے فیصلے کیا کرتے ہیں ان کو بھی کچھ ہاتھ نہیں آتا بلکہ ایسے لوگوں کی ان خرافات سے قوم کو نقصان پہنچ جانے کا اندیشہ رہتا ہے۔ ان پر وہی مثل صادق ہے۔ گھر کا نہ گھاٹ کا۔ ادب مانع ہے ورنہ پہلا فقرہ بھی اس مثل کا میں کہہ دیتا خیر یہ مسئلہ ان لوگوں کے زیر بحث ہے اور لوگوں کے یہاں فتویٰ اس پر دیا گیا ہے کہ جمہوری سلطنت اچھی ہے اور اصل وجہ تو

اس کی صرف یہ ہے کہ یہ لوگ ہر بات میں یورپ پر ایمان لائے ہوئے ہیں یورپ ہی ان کا قبلہ ہے گو ٹیڑھا قبلہ ہے۔ غرض دلیل کا ایک مقدمہ تو یہ ہے کہ اہل یورپ سلطنت جمہوری کو ترجیح دیتے ہیں اور دوسرا مقدمہ یہ ملایا کہ یورپ جو کہتا ہے وہ حق ہے اس لئے کہ وہ معصوم ہے بس نتیجہ نکال لیا کہ سلطنت جمہوری سلطنت شخصی سے بہتر ہے۔ میں کہتا ہوں کہ تم کو تو نہ شخصی ملتی ہے نہ جمہوری تم کو اس فیصلہ سے کیا ملا ہاں جمہوری سلطنت البتہ مل جاوے گی جس کی نسبت کسی نے کہا ہے۔

گر بہ میر و سگ وزیر و موش را دیوان کنند　　　　این چنیں ارکان دولت ملک را ویراں کنند

(اگر بلی میر بنی ہوئی اور کتا وزیر اور چوہا منشی تو اس قسم کے ارکان حکومت ملک کو ویران کر دیتے ہیں۔)

آج لوگوں کو حکومت کا بڑا شوق ہے کوئی انجمن بناویں گے اس میں عہدہ دار ہوں گے اور عشق تقلید یورپ میں عہدوں کا نام بھی انگریزی میں رکھیں گے مثلاً ایک سیکرٹری ہوگا کوئی گورنر بنے گا۔ میں کہتا ہوں بجائے سیکرٹری کے اگر آپ ناظم یا مہتمم یا خادم لقب رکھتے تو کیا حرج تھا اور پھر سیکرٹری ہی پر بس نہیں بلکہ اس کو انگریزوں کی طرح سیکرٹری کہتے ہیں تشبہ نے ناس کر دیا ہے ہر شے میں یورپ کے ساتھ تشبہ کا شوق ہے۔

گورنر یتیم خانہ:

میرے پاس ایک شخص کا خط آیا اپنے نام کے ساتھ اس نے لکھا تھا کہ گورنر یتیم خانہ میں حیران ہوا کہ میرے پاس گورنر کا خط کیوں آیا جب آگے یتیم خانہ کا لفظ دیکھا اس وقت معلوم ہوا کہ یتیم خانہ کے آپ منتظم ہیں گورنر صاحب نے اس میں ایک مسئلہ پوچھا تھا۔ لیکن گورنری کے گھمنڈ میں آ کر خط میں ٹکٹ بھی نہیں رکھا ہم تھے اپنی مولویت کے غرہ میں ہم نے بیرنگ جواب بھیج دیا۔ گورنر صاحب نے واپس کر دیا۔ ایک آنہ دینا پڑا۔ جس شہر کا وہ خط تھا اتفاق سے وہاں میرا جانا ہوا تو میں نے اپنے ایک عزیز سے جس کے پاس ٹھہرا تھا پوچھا کہ وہ کون گورنر صاحب ہیں میں ان سے ملنا چاہتا ہوں اور اپنا ایک آنہ وصول کروں گا اور میں نے تمام قصہ ان کی اس حرکت کا ذکر کیا اتفاق سے اسی وقت ان گورنر صاحب کے ایک بیٹے بھی بیٹھے تھے جو ولایت سے ڈاکٹری پاس کر کے آئے تھے۔ جب وہ چلے گئے تو بھائی نے کہا کہ یہ ان ہی گورنر کے بیٹے ہیں ایک گلی میں ایک جھونپڑا ہے اس میں

رہتے ہیں رہتے تو ہیں جھونپڑے میں اور دماغ ایسا عالی مجھ کو صرف ان کی حماقت ظاہر کرنا تھی ایک آنہ تو ان سے وصول ہونا غالب تو ہے کہ ان کے بیٹے نے سارا قصہ نقل کردیا ہوگا یہ حالت ہے گورنری کے مدعی کی کوئی اپنے کو پلیڈر لکھتا ہے مقصود صرف ہیبت اور عظمت بٹھلانا ہے۔

صاحبو تم لوگ مسلمان ہو تم نے اپنی قومی شعار کو کیوں چھوڑ دیا۔ دیکھو انگریزوں کو اتنا زمانہ ہندوستان میں ہو گیا مگر انہوں نے اپنا لباس اپنی وضع نہیں بدلی اگر ان کی ہی اقتدا کا تم کو شوق ہے تو ان کی اقتدا تو یہ ہے کہ تم بھی اپنی وضع کو نہ بدلو اپنے عربی کے پاکیزہ الفاظ چھوڑ کر دوسری زبان بلا ضرورت کیوں اختیار کرتے ہو اور عربی سے کیوں اس قدر توحش کرتے ہو۔ ہر عاقل کے فعل کی کوئی نہ کوئی غایت ہوتی ہے آخر اس انگریزی الفاظ کے اختیار کرنے کی بھی کوئی غایت ہے بس اس کی غایت غایط بالطأ معلوم ہوتی ہے اس لئے کہ اس سے شہرت ہوتی ہے اور شہرت سے روپیہ آتا ہے اور روپیہ کا کھانا پکتا ہے اور کھانے کی غایت ظاہر ہے کہ غائط (پاخانہ) ہے یہ سب لغو اور فضول باتیں ہیں۔ چھوڑو ان قصوں کو اور اپنی قدیمی وضع اختیار کرو، بہر حال ان حضرات نے یہ فتوے دیدیا اور فیصلہ کردیا کہ سلطنت جمہوری سلطنت شخصی سے بہتر ہے خیر اسی پر رہتے تو کچھ نہ تھا۔

قرآن پاک سے سلطنت جمہوری کا اثبات نہیں ہوتا:

غضب یہ ہے کہ یہ بھی کہتے ہیں کہ قرآن سے ثابت ہے کہ سلطنت جمہوری سلطنت شخصی سے بہتر ہے اور دلیل میں وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ کو پیش کرتے ہیں اس استدلال کی ایسی مثال ہے جیسے کسی شخص نے لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ أَنْ تَأْكُلُوا جَمِيعًا أَوْ أَشْتَاتًا سے یہ فتوی لکھا تھا۔ اور وہ فتوئی میں بھی دیکھا تھا کہ جمع ہو کر کھانا واجب ہے۔ اگر سلطنت جمہوری کی حقیقت صرف اسی قدر ہوتی ہے کہ جس میں صرف مشورہ ہو تو بے شک یہ استنباط صحیح تھا سلطنت جمہوری میں تو یہ ہوتا ہے کہ مشورہ کے بعد کثرت رائے پر فیصلہ ہوتا ہے اور بادشاہ کی رائے دو رائے کے برابر سمجھی جاتی ہے اور اس آیت سے اس کیخلاف سمجھا جاتا ہے اس لئے کہ وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ کے بعد ارشاد ہے فَإِذَا عَزَمْتَ صیغہ مفرد مخاطب سے جس کا حاصل یہ ہے کہ مشورہ تو کیجئے لیکن مشورہ کے بعد عمل اس پر کیجئے۔ جس کا آپ عزم کرلیں اور اس میں کوئی قید ہے نہیں تو اس میں

سب مختلف صورتیں آ گئیں ان صورتوں میں یہ صورت بھی داخل ہے کہ کہ سب کی رائے ایک جانب ہو اور حضور ﷺ کی رائے ایک طرف تو اس صورت میں بھی آپ ہی کی عزم اور ترجیح پر مدار رہا پس اس سے تو سلطنت جمہوری کا اثبات نہیں ہوتا بلکہ سلطنت جمہوری کی بناء ہی اس سے منہدم ہو جاتی ہے کیونکہ اس میں ایسا نہیں ہوتا غرض اس آیت سے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ مشورہ کے بعد فیصلہ کثرت رائے سے ہوگا بلکہ سلطان مشورہ کے بعد مستقل و مستعد ہے کہ اپنی بصیرت خداداد سے جس صورت کو چاہے اختیار کر لے۔

مشورہ کا فائدہ:

اور مشورہ کا فائدہ یہ ہوگا کہ کام کرنے والے کی نظر سے کوئی پہلو اس امر کا مخفی نہ رہے گا ورنہ بسا اوقات ایک شخص کی نظر تمام پہلوؤں کو محیط نہیں ہوتی ہے اور ایک دوسری آیت سے بھی سلطنت جمہوری کا ابطال اور سلطنت شخصی کا اثبات ہوتا ہے۔ حق تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں۔ اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَاِذَا كَانُوْا مَعَهٗ عَلٰۤى اَمْرٍ جَامِعٍ لَّمْ يَذْهَبُوْا حَتّٰى يَسْتَاْذِنُوْهُ اِنَّ الَّذِیْنَ يَسْتَاْذِنُوْنَكَ اُولٰٓئِكَ الَّذِیْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ فَاِذَا اسْتَاْذَنُوْكَ لِبَعْضِ شَاْنِهِمْ فَاْذَنْ لِّمَنْ شِئْتَ اس اخیر جملہ سے سلطنت شخصی کا اثبات ہوتا ہے اس لئے کہ فرض کرو کہ مجلس میں دس آدمی ہیں اور وہ دس اعلیٰ طبقہ کے ہیں اور سردار قوم ہیں ان سب آدمیوں نے اجازت چاہی تو سلطنت جمہوری کا مقتضا تو یہ ہے کہ چونکہ سب اہل مجلس ایک طرف ہو گئے تو بادشاہ کو اجازت دینا واجب ہوگا حالانکہ اس صورت میں بھی ارشاد ہے فَاْذَنْ لِّمَنْ شِئْتَ کہ جس کو آپ چاہیں اجازت دیں یہ صاف دلیل ہے کہ حضور ﷺ مستقل بادشاہ ہیں اگر قرآن حدیث میں اور زیادہ غور کیا جاوے تو بہت دلائل نکلیں گے ایک فائدہ اس آیت سے معلوم ہوا کہ آیت میں مشورہ کا بھی ذکر ہے اور عزم کا بھی جو کہ منجملہ تدابیر کے ہیں۔

تدبیر کے وقت اللہ پر نظر رکھنے کا حکم:

لیکن آیت کو ختم فرمایا ہے اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِيْنَ پر جس سے مفہوم ہوا کہ تدبیر تو کرے لیکن اصل مقصود تدبیر کے وقت بھی توکل اور خدا پر نظر رکھنا ہے تدبیر کی مشروعیت کی علت تو محض ہمارا ضعف ہے اور اظہار ہے غایۃ افتقار کا کہ اے اللہ ہم ایسے مضبوط نہیں ہیں کہ آپ کی بنائی ہوئی چیزوں کے محتاج نہ ہوں۔

افتقار الی اللہ منافی توکل نہیں:

اور یہاں سے راز معلوم ہو گیا ہو گا حضور ﷺ کی اس دعا کا کہ کھانا تناول فرما کر آپ دعا فرماتے الحمد للہ الذی اطعمنا وسقانا غیر مستغنی عنه ربنا یعنی اے اللہ اس روٹی کے ہم محتاج ہیں ہم اس سے مستغنی نہیں ہیں۔ غرض حق تعالیٰ کے سامنے اسباب کی احتیاج کا اظہار اس نظر سے کہ اپنا افتقار (اللہ تعالیٰ کی طرف محتاجی کا اظہار) الی اللہ ظاہر ہو توکل کے منافی نہیں ہے ہاں اگر خود ان اسباب ہی کو مطلوب بنالیوے تو یہ البتہ منافی توکل ہے غرض اسباب اور تدابیر کی مشروعیت (شرع کے مطابق جائز) ہمارے ضعف اور افتقار کے اظہار کے لئے ہے نہ کہ ان کو مقصود بالذات بنانے کے واسطے۔

تدابیر کی مشروعیت میں حکمت:

اور بعض اہل اللہ نے تدابیر کی مشروعیت کی عجیب حکمت لکھی ہے وہ کہتے ہیں کہ تدبیر کرنا اس لئے جائز کیا گیا ہے کہ ہم تدبیر کریں اور وہ اس کو توڑتے رہیں تاکہ ہم کو یہ معلوم ہو جاوے کہ ہمارے اسباب اور تدابیر کوئی چیز نہیں۔ موثر حقیقی حقیقت میں ذات واحد ہے چنانچہ بعض اہل حال کے ساتھ عجیب معاملہ ہوتا ہے کہنے کی بات تو نہ تھی لیکن زبان پر آئی ہوئی بات کہہ دی جاتی ہے وہ یہ ہے کہ عوام کے ساتھ تو یہ معاملہ ہوتا ہے کہ ان کو اپنی تدابیر میں کامیابی حاصل ہو جاتی ہے شاذ و نادر تدبیر خطا بھی ہو جاتی ہے۔

بعض اہل حال و خواص سے معاملہ:

اور اہل حال و خواص عباد کیساتھ یہ معاملہ ہوتا ہے کہ جو تدبیر وہ کرتے ہیں اکثر توڑ دی جاتی ہے۔ وہ عزم کرتے ہیں کہ فلاں کام نہ کریں گے وہی ان سے صادر ہوتا ہے آخر رفتہ رفتہ ان کو واضح ہو جاتا ہے کہ ہماری حول اور قوت اور ارادہ لاشے محض ہے اور اس کو بالکل چھوڑ دیتے ہیں اور تفویض محض ان کی شان ہو جاتی ہے حضرت ابراہیم بن ادہم کی تہجد کی نماز قضا ہو گئی بہت افسوس کیا بہت روئے دوسرے روز بڑا اہتمام آنکھ کھلنے کا کیا کھانا کم کھایا پانی کم پیا اور سویرے سے سوئے اس روز صبح کی نماز بھی اڑ گئی وہ فرماتے ہیں ففوضت استرحت کہ اس کے بعد میں

نے اپنے کو تفویض کر دیا اور راحت سے ہو گیا، پس وہ کہتے ہیں کہ تدبیر اس واسطے ہے کہ ہم کریں وہ توڑیں بہر حال تدبیر کی بھی یہ ایک حکمت ہے مگر یوں نہیں کہہ سکتے کہ یہی ہے جو حکمت میں نے بیان کی ہے وہ بھی ہے اس میں کوئی تنافی نہیں ایک شے میں حکمتیں متعدد بھی ہوا کرتی ہیں یہ وہ فوائد ہیں جو ملحقات کے طور پر ذکر کیے گئے باقی مقصود بالذات وہ نئی بات تھی جو اوپر بیان ہو چکی ہے بڑے کام کی اور یاد رکھنے کی بات ہے اور عملی مضمون ہے یہ نہیں کہ صرف مزہ لینے ہی کے واسطے ہو۔

توکل کے لئے ایک ضروری دستور العمل:

بلکہ اس کو اپنا دستور العمل بنا لو کہ جو کام کرو کم از کم ایک ہی مرتبہ ضرور سوچ لیا کرو کہ اے اللہ یہ کام آپ کے اختیار میں ہے اگر آپ چاہیں گے تو ہو گا ورنہ نہیں ہو گا یہ ایسی سہل اور آسان بات ہے کہ کچھ اس میں مشقت نہیں اور نفع اس کا کثیر ہے چند روز کر کے تو دیکھو کیا رنگ لاتی ہے۔ اب میں ختم کر چکا ہوں، اللہ تعالیٰ سے دعا کرو کہ اللہ تعالیٰ توفیق عمل کی عطا فرماویں۔

آمین یا رب العالمین۔



الاصابة فی معنی الاجابة

اجابت کے صحیح معنی

یہ وعظ ۱۸ شوال ۱۳۴۶ھ بعد نماز عصر بمقام مسجد خانقاہ امدادیہ تھانہ بھون جو کہ حضرت والا نے مصلّی پر بیٹھ کر ڈیڑھ گھنٹہ ارشاد فرمایا۔ سامعین کی تعداد تقریباً تمیں عدد تھی جس کو حضرت مولانا ظفر احمد صاحبؒ نے قلم بند فرمایا۔

خطبہ ماثورہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للّٰہ نحمدہ ونستعینہ ونستغفرہ ونؤمن بہ ونتوکل علیہ ونعوذ باللّٰہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا من یھد اللّٰہ فلامضلّ لہ ومن یضللہ فلاھادی لہ ونشھد ان لاالہ الا اللّٰہ وحدہ لاشریک لہ ونشھد ان سیدنا ومولانا محمداعبدہ ورسولہ صلّی اللّٰہ تعالیٰ علیہ وعلیٰ الہ واصحابہ وبارک وسلّم اما بعد.

فاعوذ باللّٰہ من الشیطان الرجیم

بسم اللہ الرحمن الرحیم

وَاِذَاسَاَلَکَ عِبَادِیْ عَنِّیْ فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ اُجِیْبُ دَعْوَۃَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ فَلْیَسْتَجِیْبُوْالِیْ وَلْیُؤْمِنُوْا بِیْ لَعَلَّھُمْ یَرْشُدُوْنِ.

ترجمہ:۔ جب آپ سے میرے بندے میرے متعلق دریافت کریں تو میں قریب ہی ہوں ۔ منظور کرلیتا ہوں عرضی درخواست کرنے والے کی جبکہ میرے حضور میں درخواست دے پس انکو چاہئے کہ میرے احکام قبول کریں اور مجھ پر یقین رکھیں تا کہ بھلائی حاصل کرسکیں۔

تمہید

شانِ نزول آیت متلوہ:

اس آیت سے مجھ کو ایک مضمون بیان کرنا ہے آیت کی تفسیر کرنا مقصود نہیں گو تبعاً تفسیر بھی ہوجائے مگر دراصل مجھ کو ایک غلطی عام پر متنبہ کرنا ہے جو علمی غلطی ہے اس اور علمی غلطی سے عملی غلطی بھی ناشی ہے او اس کی وجہ سے لوگ ایک دولت سے محروم ہیں جو بڑی دولت ہے۔

ترجمہ:۔آیت کا یہ ہے کہ جب میرے بندے آپ سے دریافت کریں میرے متعلق ۔کیا دریافت کریں؟ اس کا ذکر نہیں ہے مگر آگے جواب سے معلوم ہوجائے گا کہ سوال کس بات کے

متعلق تھا، نیز حدیثوں سے بھی معلوم ہو گیا ہے کہ سوال قرب و بعد خداوندی سے تھا کہ اللہ تعالیٰ قریب ہیں یا بعید حدیث میں آتا ہے کہ بعض لوگوں نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا اقریب ربنا فننا جیہ ام بعید فننادیہ کیا اللہ تعالیٰ ہم سے نزدیک ہیں تو آہستہ سے عرض معروض کر لیا کریں یا دور ہیں کہ زور سے پکارا کریں اس پر آیت نازل ہوئی اور اس سوال کو بعید نہ سمجھا جائے کیونکہ اللہ تعالیٰ کے کمالات کا علم اگرچہ بدیہی ہے مگر اسکی تفصیل نظری ہے سائلین کو یہ تو معلوم تھا کہ حق تعالیٰ اس کی سنتے ہیں اور کوئی بات ان سے مخفی نہیں رہتی مگر یہ معلوم نہیں تھا کہ قریب سے ہی سنتے ہیں یا بعید سے بھی کیونکہ عام لوگ دور سے سننے کو عیب نہیں سمجھتے چنانچہ سلاطین بواسطہ ذرائع (ٹیلیفون وتار و قاصد) کے دور سے ہی سنتے ہیں۔ غرض جہل مطلق تو سب کے نزدیک عیب ہے مگر علم و سمع بواسطہ ان کے نزدیک عیب تھا اس لئے کہ سلاطین عالم کا علم و سمع بواسطہ ہی ہے اور انسان کی عادت ہے قیاس الشاہد علی الغائب کی۔ اور اسی کو شریعت نے بہت سختی سے منع کیا ہے کہ قیاس شاہد علی الغائب کی اور اسی لئے حدیث میں ہے کہ اللہ تعالیٰ سے ہر چیز مانگو حتیٰ کہ نمک اور جوتہ کا تسمہ بھی اللہ ہی سے مانگو یہ اس واسطے فرمایا کہ بعض لوگ خدا تعالیٰ سے معمولی چیزوں کے مانگنے کو عیب سمجھتے ہیں اور اس کا منشاء بھی وہی قیاس الشاہد علی الغائب ہے کیونکہ سلاطین سے پیسہ مانگنا عرفاً عیب ہے تو وہ یہ سمجھے کہ خدا سے بھی پیسہ اور نمک عیب ہوگا۔ حضور ﷺ نے اس غلطی کو رفع کر دیا کیونکہ اس غلطی ہی سے شرک پیدا ہوا کہ مشرکین نے چھوٹے کاموں کیلئے دوسرے معبود تجویز کر لئے منشاء تو ہر جہل کا ہوتا ہے مگر اسکا رفع کرنا بھی تو ضروری ہے اور تعلیم کی خوبی تو یہی ہے کہ رفع جہل کے ساتھ اس کے منشا کو بھی رفع کر دے بہر حال یہی قیاس منشا ہوا اس سوال کا کہ اللہ تعالیٰ قریب ہیں یا بعید سائلین یوں سمجھے کہ اللہ تعالیٰ سنتے ہیں سب کی اور ان کے نزدیک سلاطین عالم سے خدا تعالیٰ کو یہی ایک امتیاز تھا کہ سب کی سنتے ہیں کیونکہ سلاطین دنیا تک ہر شخص کی بات نہیں پہنچتی ہے مگر اس سوال کرنے والوں کو یہ شبہ ہوا کہ شاید اللہ تعالیٰ زور کی آواز کو سنتے ہوں آہستہ کو نہ سنتے ہوں یا تو اس لئے کہ وہ ہم سے دور ہیں اور بعد کا خیال بوجہ عظمت کے ہوا۔

(وایضا فان کونہ تعالیٰ فوق العرش منصوص و اثبات العلولہ لازم شرعاً کما ہو عقیدۃ السلف من غیر بیان کیفیۃ علوہ وفوقیتہ)

(اور نیز یہ کہ اللہ تعالیٰ کا عرش کے اوپر ہونا نص سے ثابت ہے اور شرعاً بلند ہونے کا

ثبوت لازم ہے جیسا کہ اسلاف کا عقیدہ ہے اس کے بلند ہونے اور اوپر ہونے کی کیفیت نہیں معلوم) یا اس لئے کہ وہ بہت سے کاموں میں مشغول ہیں اور شغل کی حالت میں آہستہ آواز مسموع نہیں ہوتی گو سامع قریب ہی ہو آگے اس سوال کا جواب ہے فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ ظاہر حال کا مقتضا یہ تھا کہ یہاں فقل انی قریب ہوتا کیونکہ اوپر وَاِذَا سَاَلَکَ میں سوال بواسطے حضور کے ہے تو جواب بھی حضور کے واسطہ سے دیا جاتا کہ آپ اس سوال کے جواب میں فرما دیجئے کہ اللہ تعالیٰ قریب ہیں دور نہیں مگر اللہ تعالیٰ نے جواب بلا واسطہ دیا ہے کہ یہاں قل کو حذف کر دیا گویا یہ جواب پہنچے گا بواسطہ رسول ہی کے مگر حذف قل میں اس بات کو ظاہر فرما دیا کہ ہم تمہارے سوال کا جواب بلا واسطہ دیتے ہیں گو یہ سوال ہماری شان وعظمت کے خلاف ہے مگر ہم اس خطا کو عفو کر کے بلا واسطہ جواب دیتے ہیں اس طرز عنوان میں جو کچھ عنایت وکرم مزید ہے ظاہر ہے

قرب کی دو قسمیں:

آگے جواب کے بعد ارشاد ہے اُجِیْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ. اس میں ایک دوسری عنایت کا اظہار ہے کیونکہ سوال کا جواب تو اس سے ہو گیا کہ فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ اس کے بعد سائل کو کسی اور بات کا انتظار نہ تھا مگر کلام علی اسلوب الحکیم کے طور پر ارشاد فرماتے ہیں اجیب دَعْوَةَ الدَّاعِ جس میں اس پر تنبیہ ہے کہ قرب کی دو قسمیں ہیں ایک قرب علمی یہ تو فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ سے معلوم ہو چکا ہے دوسرے قرب تعلق خصوصیت جیسے اردو میں ہم کبھی تو یوں کہتے ہیں کہ میں پاس ہی ہوں کہو کیا کہتے ہو یعنی سن رہا ہوں اس میں تو پاس ہونے سے قرب علمی وقرب سماع کا بیان مقصود ہے اور کبھی ہم یوں کہتے ہیں کہ فلاں تو ہمارا قریب ہے یعنی اس کو ہم سے خاص تعلق ہے نیز کہتے ہیں کہ تم تو دور رہ کر بھی پاس ہی ہو یعنی تم سے ہمارے دل کو خاص تعلق ہے۔ پس اُجِیْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ میں دوسرے قرب کو یعنی تعلق اور قرب خصوصیت کو بیان کیا گیا ہے کہ میں باعتبار علم کے بھی قریب ہوں کہ سب کی بات سنتا ہوں اور باعتبار شفقت ورحمت وتوجہ وعنایت کے بھی قریب ہوں کہ دعا کرنے والے کی دعا قبول کرتا ہوں۔ اب میں مضمون مقصود کی طرف رجوع کرتا ہوں دعا کے متعلق ایک غلطی علمی وعملی پر متنبہ کرنا چاہتا ہوں اور اس غلطی ہی کی وجہ سے لوگ دعا میں کوتاہی کرتے ہیں حالانکہ اس کی برابر کی کوئی چیز نہیں کیونکہ ہر نافع شئی میں یا منافع دینیہ ہوتے ہیں یا منافع دنیویہ اور دعا میں یہ

امتیاز ہے کہ اس میں دونوں منافع ہیں یعنی تدابیر دنیا میں سے یہ بھی ایک تدبیر ہے اور سب سے بڑی تدبیر ہے۔ دوسرا امتیاز دعا میں یہ ہے کہ دوسری تدابیر دنیا من حیث التدبیر پر کچھ ثواب نہیں اور دعا میں گو دنیا ہی مانگی جائے (بشرطیکہ ناجائز اور حرام شے کی دعا نہ ہو) ثواب ملتا ہے۔ پس دعا میں ایک امتیاز تو یہ ہوا کہ وہ جامع بین الدین والدنیا یعنی دین و دنیا دونوں کے منافع کو جامع ہے دوسرا امتیاز یہ ہے کہ دعا ہر حال میں ثواب و عبادت ہے۔ دیگر عبادات میں اگر دنیا کی آمیزش ہو جائے تو وہ عبادت نہیں رہتی اور اگر مقصود ہی دنیا ہو پھر تو بطلان عبادت ظاہر ہے مگر دعا سے اگر دنیا ہی مطلوب ہو جب بھی وہ عبادت ہے اس میں مقصودیت دنیا سے وصف عبادت باطل نہیں ہوتا کیونکہ دعا میں عبدیت کی شان ہر حال میں باقی رہتی ہے۔ حدیثوں میں اسی لئے دعا کی بڑی فضیلت آئی ہے اور عقلاً بھی یہ بھی سب سے بڑی چیز ہے کہ کیونکہ اس کا حاصل اللہ تعالیٰ سے سوال ہے کہ اے اللہ ہمیں یہ دیدے اور یہ ہر تدبیر سے بڑھ کر تدبیر ہے کیونکہ دوسری تدبیر کا حاصل یہ ہے کہ انسان اس میں اپنے مثل کے سامنے اپنی احتیاج کو ظاہر کرتا ہے جیسے ملازمت وغیرہ میں اور زراعت میں گو کاشتکار حق تعالیٰ ہی سے مانگتا ہے مگر اسباب ظاہرہ کی طرف بھی احتیاج ہوتی ہے۔ بغیر اسباب ظاہرہ کے زراعت غیر مکمل ہے اور ان اسباب میں غیر حق کا محتاج بننا پڑتا ہے اسی لئے حق تعالیٰ نے حضرت مسیحؑ اور ان کی والدہؑ کے عدم الوہیت پر کَانَا یَاْکُلٰنِ الطَّعَامَ سے استدلال فرمایا ہے کیونکہ جو شخص طعام کا محتاج ہے وہ سارے عالم کا محتاج ہے۔ زمین کا بھی آسمان کا بھی چاند سورج کا بھی بادل اور بارش کا بھی لکڑی کا بھی لوہے کا بھی جانور کا بھی اور لوہار و بڑھئی اور بالدی کمہروں کا بھی کیونکہ ان سب سے مل کر زراعت ہوتی ہے پھر کسی نے آٹا پیسا کسی نے گوندھا کسی نے پکایا تب کھانا تیار ہوا تو طعام میں تمام عالم کی طرف احتیاج ہے پھر ایسا محتاج الٰہ کب ہو سکتا ہے اسی کو سعدیؒ فرماتے ہیں

ابر و باد و مہ و خورشید و فلک در کارند — تا تو نانے بکف آری و بہ غفلت نہ خوری

ہمہ از بہر تو سرگشتہ فرماں بردار — شرط انصاف نہ باشد کہ تو فرمان نہ بری

(بادل، ہوا، چاند اور سورج کام میں مصروف ہیں تاکہ تو اپنے ہاتھوں میں روٹی دیکھے اور غفلت نہ کرے۔ سب تیری فرمانبرداری میں پریشان ہیں انصاف کی شرط نہیں کہ اس کے باوجود تو اللہ کی اطاعت نہ کرے)

غرض ہر تدبیر میں انسان اپنے عاجز کے سامنے احتیاج کو ظاہر کرتا ہے خواہ قالاً یا حالاً اور دعا میں ایسے سے مانگتا ہے جو سب سے کامل القدرۃ ہے اور جس کے سب محتاج ہیں پس یقیناً یہ تدبیر ہر تدبیر سے بڑھ کر ہے کیونکہ اور تدابیر بھی حق تعالیٰ کی مشیت وارادہ ہی سے کامیاب ہو سکتے ہیں تو شخص حق تعالیٰ سے مانگے گا وہ ضرور کامیاب ہوگا اب عقل سے پوچھو تو وہی یہی کہے گی کہ جو سب سے قادر تر ہے اسی سے مانگنا اکمل وانفع ہے۔ جب عقل اور نقل سے دعا کی فضیلت ثابت ہوگئی تو اب اپنی حالت میں غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ سب سے زیادہ متروک دعا کو کر رکھا ہے لوگ سب تدبیریں کرتے ہیں مگر دعا نہیں کرتے بجز اس کے کہ دو تین دعائیں یاد کر لی ہیں نماز کے بعد آموختہ کے طور پر ان کو پڑھ منہ پر ہاتھ پھیر لیتے ہیں میں نے عمر بھر میں ایک شخص کے سوا کسی کو دعا کرتے نہیں دیکھا وہ بہت بھولے تھے ان کا بھولا پن اس سے معلوم ہوگا کہ جمعہ کے دن ایک جنازہ لایا گیا تو وہ کہتے ہیں کہ اے اللہ یہ دن سب کو نصیب ہو۔ لوگ اس پر بگڑ گئے وہ سمجھے کہ کوستا ہے کہ سب مر جائیں حالانکہ ان کی مراد یہ تھی کہ جب موت آوے جمعہ کا دن ہو مگر اپنے اس مطلب کو اس عنوان سے ادا کیا جس پر سب بگڑ گئے تو میں نے ان کو دیکھا ہے کہ ایک ایک دعا میں ایک ایک گھنٹہ لگا دیتے تھے اور اچھی طرح ہاتھ پسار پسار کر منہ بنا بنا کر دعا کرتے تھے اس طرح دعا کرتے بہت کم لوگوں کو دیکھا گیا ہے۔ یہ تو لوگوں کی عملی غلطی تھی۔

دعا سے متعلق ایک علمی غلطی:

اور علمی غلطی یہ ہے کہ دعا کے قبول نہ ہونے سے شیطان یہ دھوکہ دیتا ہے کہ یہ تدبیر تو تدبیروں سے کمتر ہے دیکھو ایک مہینہ دعا کرتے ہو گیا قبول ہی نہیں ہوئی اب یہ شخص کسی مولوی صاحب کے پاس جاتا ہے انہوں نے اس کی یوں تسلی کی کہ قبول دعا کیلئے کچھ شرائط مگر عدم قبول فقدان شرائط ہی پر موقوف نہیں بلکہ بعض دفعہ باوجود اجتماع شرائط کے بھی عدم قبول متحقق ہوتا ہے تو اب وسوسہ پھر پیدا ہوگا اور آئندہ کو دعا سے ہمت ٹوٹ جائے گی اور بعض لوگوں کو ممکن ہے کہ نصوص میں شبہات پیدا ہونے لگیں اس لئے یہ جواب ناکافی ہے اس سے وسواس وشبہات کا استیصال نہیں ہوتا اس لئے ضرورت ایسے جواب کی ہے کہ جس سے حقیقت واضح ہو کر شبہات ووسواس کی جڑ کٹ جائے تو اس شبہ کا ایک جواب آج ذہن میں آیا جو شاید پہلے بھی آیا ہو مگر اس تفصیل سے

غالباً نہ آیا تھا جیسا آج آیا اس لئے احباب کو وہ جواب سنانا چاہتا ہوں تاکہ شیطان کے اس دھوکہ سے نجات کلی ہو جائے پھر دعا میں کوتاہی نہ ہو۔

اجابت دعا کے دو درجے:

وہ جواب یہ ہے کہ منظوری اور اجابت اور قبول کے دو درجے ہیں ایک یہ کہ درخواست لے لی جائے اور اس پر توجہ کی جائے دوسرے یہ کہ درخواست کے موافق فیصلہ بھی کر دیا جائے۔ صاحبو! درخواست کا لے لیا جانا بھی ایک قسم کی منظوری اور بڑی کامیابی ہے آپ نے مقدمات میں دیکھا ہوگا کہ جب کسی مقدمہ کی اپیل کی جاتی ہے تو وہاں بھی دو درجے ہیں ایک یہ کہ اپیل لے لیا جائے اور اس میں غور کیا جائے اور یہی بڑی کامیابی ہے۔ بڑی ناکامی اس شخص کی جس کا اپیل لیا ہی نہ جائے اس کے بعد دوسرا درجہ کامیابی یہ ہے کہ اپیل منظور کر لینے کے بعد درخواست کے موافق فیصلہ کر دیا جائے اور پہلے فیصلہ کو منسوخ کر دیا جائے اور جب یہ بات سمجھ میں آ گئی تو اب سمجھئے کہ اُجِیْبُ دَعْوَۃَ الدَّاعِ منظوری کی قسم اول پر محمول ہے قسم ثانی پر محمول نہیں جس کی دلیل خود نص کے الفاظ ہی ہیں کیونکہ اس کو مرتب فرمایا ہے اِنِّیْ قَرِیْبٌ پر اور اس جملہ میں قرب تعلق کو بیان فرمایا ہے اور قرب تعلق کا مقتضا یہی ہے کہ درخواست کو لے لیا جائے اس پر توجہ کی جائے خواہ فیصلہ دیر میں ہو یا جلدی ہو موافق ہو یا نہ کیونکہ فیصلہ تو قانون کے موافق ہوگا یا سائل کی مصالح پر نظر کر کے اور مقدمہ کی روئے داد دیکھ کر حاکم کے تعلق اور توجہ کا مقتضا صرف اتنا ہے کہ سائل کی درخواست کو واپس نہ کرے بلکہ اس کی درخواست کو توجہ کیساتھ سنے اور اس کو فیصلہ کے واسطے لے لے پس اجیب کے معنی یہ ہوئے کہ ہم ہر دعا کرنیوالے کی درخواست کو لے لیتے ہیں اس پر توجہ کی جاتی ہے بے توجہی نہیں کی جاتی ہے۔ تو یہ کیا تھوڑی بات ہے۔

درخواست لینے کی عجیب مثال:

صاحبو! دنیا میں تو اتنی ہی بات کیلئے بہت سی تدبیریں اور خوشامدیں کی جاتی ہیں کہ بادشاہ ہماری درخواست کو لے لے۔ اس کے بعد جی کو سمجھا لیتے ہیں کہ اگر فیصلہ قانون کے موافق ہوا تو ہماری مرضی کے موافق ہوگا ورنہ نہیں۔ ایسے ہی یہاں بھی دل کو سمجھانا چاہئے کہ جب درخواست لے لی گئی ہے تو اگر اسی کا پورا کرنا ہماری مصلحت کے خلاف نہ ہوا تو ضرور پوری ہوگی ورنہ اس کی جگہ

کچھ اور مل جائے گا یہ اس واسطے کہا کہ اللہ تعالیٰ دعا کے پورا کرنے میں کسی قانون کے تو پابند نہیں ہاں بندہ کی مصالح پر ضرور نظر فرماتے ہیں کہ اس دعا کو پورا کرنا اس کیلئے مضر نہ ہو سو یہ تو عین کامیابی ہے دیکھو بچہ باپ سے پیسہ مانگتا ہے تو ایک درجہ تو قبول کا یہ ہے کہ باپ اس کی درخواست کو سن کر محبت سے اس کو پیار کرے کہ ہاں ہاں ہم نے تمہاری درخواست سن لی اب کبھی تو وہ اس کو پیسہ دیدیتا ہے اور کبھی اس خیال سے کہ پیسہ لیکر یہ بازار میں جائے گا اور نہ معلوم کیا خرید کر کھالیگا جس سے نقصان پہنچے یا بازار جانے سے عادت خراب ہو جائے تو وہ اس کو بجائے پیسہ دینے کے کوئی چیز اس کو اپنے ہاتھ سے خرید کر دیتا ہے تو کیا اس کو یوں کہا جائے گا کہ درخواست پوری نہیں کی ہرگز نہیں کہا جائے گا کہ بلکہ یوں کہا جائے گا کہ گو صورتاً پوری نہیں کی مگر حقیقتاً درخواست پوری کردی گئی کیونکہ اس کو پیسہ سے بہتر چیز دیدی گئی اسی طرح یہاں سمجھو کہ حق تعالیٰ حکیم بھی ہیں قادر بھی ہیں رحیم و مہربان بھی ہیں۔ باپ ماں سے زیادہ بندہ پر مہربان ہیں۔ اسکے بعد بھی جو کچھ طلب کے موافق عطا نہیں ہوتا تو دل کو سمجھانا چاہیے کہ ضرور ہماری درخواست کا بجنسہٖ پورا کرنا حکمت کے موافق نہ تھا اس لئے اللہ تعالیٰ بجائے اس کے ہم کو کچھ اور نعمت عطا فرمائیں گے حکام دنیا تو درخواست منظور کرنے کے بعد فیصلہ کرنے کے وقت صرف اتنا دیکھتے ہیں کہ درخواست کا پورا کرنا قانون کے خلاف تو نہیں اگر قانون کے خلاف ہوا تو اس کو رد کر دیتے ہیں اور اس کی جگہ اور کچھ نہیں دیتے اور اللہ تعالیٰ اس قانون کے ساتھ اس کو بھی دیکھتے ہیں کہ درخواست کا پورا کرنا بندہ کی مصالح کے خلاف نہیں اور اس صورت میں درخواست کا پورا کرنا عین کامیابی ہے۔

اجابت کے معنی درخواست لے لینا ہے:

پس اجابت جس کا وعدہ ہے اس کے معنی درخواست لے لینا اور درخواست پر توجہ کرنا ہے یہ اجابت یقینی ہے اس میں کبھی تخلف نہیں ہوتا آگے دوسرا درجہ ہے کہ جو مانگا ہے وہی مل جائے اس کا وعدہ نہیں بلکہ وہ انشاء سے مقید ہے کہ اگر مشیت ہوگی تو ایسا ہو جائے گا ورنہ نہیں چنانچہ ارشاد ہے۔ بَلْ اِيَّاهُ تَدْعُوْنَ فَيَكْشِفُ مَا تَدْعُوْنَ اِلَيْهِ اِنْ شَآءَ (بلکہ خاص اسی کو پکارنے لگو۔ پھر جس کے لئے تم پکارو اگر وہ چاہے تو اس کو ہٹا بھی دے) بعض علماء نے اُجِيْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ کو بھی انشاء سے مقید کیا ہے اور اس کو بعض لوگوں نے حذاقت میں شمار کیا ہے مگر میرے نزدیک یہ صحیح

نہیں کیونکہ دوسری آیت میں ہے وَقَالَ رَبُّكُمُ ادْعُوْنِیْ اَسْتَجِبْ لَكُمْ (تمہارے پروردگار نے فرمادیا ہے کہ مجھ کو پکارو میں تمہاری درخواست قبول کروں گا) یہاں سیاق آیت بتلا رہا ہے کہ دعا پر اجابت ضرور مرتب ہوتی ہے کیونکہ جواب امر کا ترتب امر پر ضروری ہے اس میں انشاء کی قید خلاف ظاہر ہے۔ نیز یہ بھی اِنِّیْ قَرِیْبٌ کے بعد اُجِیْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ کو بیان فرمانا جس میں قرب کو محقق وموکد کیا گیا ہے اس امر کی دلیل ہے کہ یہ اجابت مشیت کیساتھ مقید نہیں ورنہ قرب کا معلق بالمشیت ہونا لازم آئے گا حالانکہ حق تعالیٰ کا قرب ہونا محقق ہے علما بھی اور تعلق خصوصیت سے بھی۔ (لقوله سبقت رحمتی وغضبی وهو المراد بالتعلق ۱۲) پس میرے نزدیک اجابت بالمعنی الاول نہیں ہاں اجابت بالمعنی الثانی انشاء سے مقید ہے جب دعا اس طرح سے مقبول ہے پھر دعا میں کوتاہی کیوں ہے۔ اور اگر کسی کے ذہن میں تحقیق نہ ہو تو وہ دعا میں اس طرح بھی تو دل سمجھا سکتا ہے کہ دنیا میں تو نفع موہوم پر بھی بہت سے کام کر لیتے ہیں گو آخر میں خسارہ بھی ہو جائے اور خسارہ کا خطرہ بھی ہوتا ہے جیسے تجارت وغیرہ میں احتمال ہے اور دعا میں تو خسارہ کا احتمال ہی نہیں پھر اس میں کوتاہی کیوں کی جاتی ہے دعا میں ایک بات اور ہے وہ یہ کہ دعا کرنے سے بندہ کو حق تعالیٰ سے خاص تعلق ہو جاتا ہے جس وقت آدمی دعا کرتا ہے اس وقت غور کر کے ہر شخص دیکھ لے اس کو اللہ تعالیٰ سے خاص تعلق محسوس ہوگا پس دعا کے بعد اگر مطلوب بعینہ حاصل نہ ہو تو یہ بات تو اسی وقت حاصل ہو جائے گی کہ دل میں قوت اور اطمینان حاصل ہوگا اور یہ برکت اس کی ہے کہ دعا سے اللہ تعالیٰ کے ساتھ بندہ کو تعلق ہو جاتا ہے عشاق کو تو دعا سے یہی مطلوب ہے اور کچھ مطلوب نہیں مولانا فرماتے ہیں

از دعا نبود مراد عاشقاں — جز سخن گفتن باشیریں دہاں

(دعا سے عاشقوں کو مراد مطلوب نہیں سوائے اپنے محبوب حقیقی سے راز ونیاز اور بات چیت سے کچھ اور مقصود نہیں) اس لئے عشاق کو دعا قبول ہونے یا نہ ہونے پر کبھی التفات نہیں ہوتا کیونکہ عاشق کے لئے یہی بڑی بات ہے کہ محبوب اس کی باتیں سن لے عاشق کے لے یہی بات بہت کافی ہے اسکے بعد اگر اجابت کی دوسری قسم کا بھی ظہور ہو جائے تو مزید عنایت ہے تو چاہئے کہ حق تعالیٰ سے خاص تعلق پیدا کیا جائے جس کا بہت آسان طریقہ دعا ہے بغیر اس کے خاص تعلق نہیں ہوتا بلکہ ہوائی تعلق ہوتا ہے کہ اگر سوچا جائے اور غور کیا جائے تو حق تعالیٰ سے بہت دور نظر آتا

ہے۔صاحبو! پھر یہ کتنے افسوس کی بات ہے کہ ہمارا ایک تو خدا جس سے سابقہ ہے اور آئندہ بھی سابقہ پڑے گا اور ہم اس سے اس قدر دور ہورہے ہیں وہ تو قریب ہی ہیں بس ہم دور ہورہے ہیں۔

حق تعالیٰ شانہ، کا قرب علمی:

اسی لئے نَحْنُ اَقْرَبُ اِلَیْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِیْدِ (ہم انسان کے اس قدر قریب ہیں کہ اس کی رگ گردن سے بھی زیادہ) انتم اقرب الینا (تم ہمارے بہت قریب ہو) نہیں فرمایا کیونکہ یہاں قرب علمی مراد ہے اور قرب علمی میں طرفین سے قرب لازم نہیں ہے بخلاف قرب حسی کے کہ یہاں طرفین سے قرب لازم ہے پس اس وقت ہماری حالت سعدیؒ کے شعر کی مصداق ہے۔

دوست نزدیک تر از من بمن ست　　　　دین عجب تر کہ من از وے دورم

(دوست مجھ سے نزدیک تر ہے لیکن تعجب یہ ہے کہ میں اس سے دور ہوں) اس مقام پر استطرادًا میں ایک شبہ کو بھی رفع کردینا چاہتا ہوں وہ یہ بعض لوگوں کو پوری آیت نَحْنُ اَقْرَبُ اِلَیْهِ سے یہ شبہ ہوگیا کہ وساوس پر بھی مواخذہ ہوتا ہے کیونکہ پوری آیت یہ ہے وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ وَنَعْلَمُ مَاتُوَسْوِسُ بِهٖ نَفْسُهٗ وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَیْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِیْدِ (اور ہم نے انسان کو پیدا کیا اور ہم ان باتوں کو جانتے ہیں جو اس کے دل میں بطور وسوسہ کے آتی ہیں اور ہم انسان کے اس قدر قریب ہیں کہ اس کی رگ گردن سے بھی زیادہ) ان لوگوں نے نَعْلَمُ مَاتُوَسْوِسُ بِهٖ نَفْسُهٗ کو وعید پر محمول کیا ہے اور منشا شبہ کا یہ ہوا کہ بہت سی آیتوں میں جیسے وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ اور وَهُوَ عَلِیْمٌ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ. وَاِنَّهٗ خَبِیْرٌ بِمَا تَعْمَلُوْنَ علم وعید کیلئے وارد ہے انہوں نے وَنَعْلَمُ مَاتُوَسْوِسُ بِهٖ نَفْسُهٗ کو بھی اسی پر قیاس کیا حالانکہ یہاں سیاق وسباق میں نظر کرنے سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے اس کو وعید سے کچھ علاقہ نہیں بلکہ دراصل یہاں اوپر سے حق تعالیٰ معاد کو ثابت فرمارہے ہیں جس کے لئے کمال قدرت اور کمال علم کی ضرورت ہے پس اولاً کمال قدرت کو ثابت فرمایا اَفَلَمْ یَنْظُرُوْٓا اِلَی السَّمَآءِ فَوْقَهُمْ کَیْفَ بَنَیْنٰهَا الآیات میں اور اس کے بعد وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ سے کمال علم کو ثابت فرمارہے ہیں کہ ہم کو انسان کے وساوس تک کا علم ہے جو دل میں جتی نہیں پھر عیان خارجہ واجزا اجسام کا علم کیونکر نہ ہوگا۔اس کے بعد وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَیْهِ میں قرب علمی کو بیان فرمایا ہے کہ ہم انسان کی شہ رگ سے بھی زیادہ اس

کے قریب ہیں اور یہ مبالغہ نہیں بلکہ حقیقت ہے کیونکہ حق تعالیٰ کو ہمارا اور ہماری حالت کا جس قدر علم ہے ہم کو حق تعالیٰ کا اس قدر علم نہیں بلکہ یوں کہیے کہ ہم کو بجز اسماء کے حق تعالیٰ کا کچھ بھی علم نہیں بلکہ ہم کو خود اپنی حالت کا بھی پورا علم نہیں کہ ہمارے اندر کتنی رگیں ہیں اور ان سے کیا کیا کام لئے جارہے ہیں اور یہ اوپر معلوم ہو چکا کہ آیت میں قرب علمی مراد ہے پس یقیناً حق تعالیٰ کو ہم سے قرب علمی اس درجہ ہے کہ ہم کو بھی اپنے ساتھ نہیں۔ اسی کو اس طرح تعبیر فرمایا کہ وہ ہماری شہ رگ سے بھی زیادہ ہمارے قریب ہیں اور دوسرے یہ کہ حق تعالیٰ خالق ہیں تمام اعضاء اور تمام قویٰ انہی کے عطا کئے ہوئے ہیں پس یقیناً حق تعالیٰ کو ہم سے ہمارے اعضاء سے زیادہ قرب ہے پہلے اللہ تعالیٰ کو ہمارے ساتھ تعلق ہوا پھر ہمارے اعضاء وغیرہ کو ہم سے تعلق ہوا ۱۲) بہر حال یہ بات واضح ہوگئی کہ قرب علمی میں شیئین میں ایک شئی قریب ایک بعید ہوسکتی ہے۔ پس ہم کو جو اللہ تعالیٰ سے بعد ہے اس کو قرب سے بدلنا چاہئے جس کی ایک تدبیر تو وہ مراقبات واشتغال ہیں جو مشائخ کے یہاں معمول بہا ہیں اور سب سے زیادہ آسان اور نزدیک طریقہ دعا ہے کیونکہ طریقہ دعا میں انسان اللہ تعالیٰ سے باتیں کرتا ہے عرض معروض کرتا ہے اور جب تمام باتیں کروگے تو یہ تمہارا ایک خاص فعل ہوگا۔ جس میں تم خود یہ تصور کروگے کہ اللہ تعالیٰ سن رہے ہیں اور وہ ہم سے قریب ہیں تو اس سے تم اللہ تعالیٰ کا قرب اور ان کے ساتھ تعلق خصوصیت زیادہ ہوگا اور یہ دعا کا وہ ثمرہ ہے جو کبھی مختلف نہیں ہوتا اس کے بعد اس دعا کی اجابت بالمعنی الاول کا ثمرہ الگ ہے کہ اللہ تعالیٰ تمہاری درخواست کو لے لیتے ہیں وراس پر توجہ فرماتے ہیں اور شفقت ورحمت کے ساتھ تمہاری عرض ومعروض کو سنتے ہیں اس کے بعد اجابت بالمعنی الثانی کا ثمرہ الگ ہے جو کبھی مرتب نہیں ہوتا۔ پس دعا کے متعلق علمی غلطی کو تو میں نے رفع کردیا۔

دعاء کی عملی کوتاہی دور کرنے کا طریق:۔

اب عملی کوتاہی رہ گئی اس کو آپ رفع کریں جس کا طریقہ یہ ہے کہ ہر حاجت میں دعا کیا کریں اور دل سے دعا کیا کریں اور اس کے ساتھ تدبیر بھی کرو کیونکہ تدبیر امر مشاہد ہے اور مشاہدے سے تسلی زیادہ ہوتی ہے اور دعا کو تدبیر کہنا تو برائے ظاہر ہے ورنہ حقیقت میں اس کا درجہ تدبیر سے آگے ہے۔ دعا کو تقدیر سے زیادہ قرب ہے کیونکہ اس میں اس ذات سے درخواست وسوال ہے جس کے قبضہ میں تقدیر ہے باقی اسباب وتدابیر کا درجہ صرف اتنا ہے جیسے ریلوے کا ملازم جھنڈی

دکھلا دے جس سے ریل گاڑی فوراً رک جائے گی۔ ظاہر ہے کہ لال جھنڈی میں تاثیر کی قوت نہیں اگر ڈرائیور انجن کو نہ روکے تو ہزار لال جھنڈیاں بھی پامال ہو جائیں گی پس لال جھنڈی کا درجہ صرف اتنا ہے کہ یہ ڈرائیور نے اصطلاح مقرر کر لی ہے کہ ہم ایسی جھنڈی سے گاڑی کو روک دیں گے۔ اور دوسری قسم سے چلا دیں گے لیکن اگر کسی وقت وہ اس قرارداد کے خلاف کرنا چاہے تو جھنڈی میں اس کو روکنے کی اصلاً طاقت نہیں ہے اسی طرح اللہ تعالیٰ نے یہ قاعدہ مقرر فرما دیا ہے کہ جو شخص اسباب کو اختیار کرے گا ہم مسببات کو ان پر فائض کر دیں گے لیکن اگر کسی وقت وہ مسببات کو پیدا نہ کرنا چاہیں تو اسباب سے کچھ نہیں ہو سکتا اسی لئے حقیقت شناس یوں کہتا ہے۔

کار زلف تست مشک افشانی اما عاشقاں   مصلحت را تہمتے برآہوے چیں بستاند

(اسباب کا نام ایک مصلحت وحکمت کیوجہ سے ہے ورنہ سب کچھ وہی کرتے ہیں اور بندہ کا نام ہو جاتا ہے کہ حکیم صاحب کے ہاتھ سے شفا ہوئی یا فلاں صاحب کی تقریر کا یہ اثر ہوا۔

اسباب میں تاثیر کی طاقت نہیں:

صاحبو! اثر اور تاثیر سب خدا کی طرف سے ہے وعظ کہہ کر جب یہ وسوسہ آتا ہے کہ آج اچھا مضمون بیان ہوا تو میں یہ شعر پڑھتا ہوں۔

بوئے نافہ کاخر صبا زاں طرہ بکشاید   زتاب جعد مشکینش چہ خوں افتاد در دلہا

ایک شعر اردو کا بھی اس معنی میں اچھا ہے۔

کہاں میں اور کہاں یہ نکہت گل   نسیم صبح تیری مہربانی

مولانا فرماتے ہیں۔

عشق من پیدا و معشوقم نہاں   یار بیروں فتنہ او در جہاں

(میرا عشق ظاہر ہے اور میرا معشوق پوشیدہ ہے۔ یار تو جہاں سے باہر ہے مگر خوف جہاں کے اندر ہے) حقیقت میں موثر وہی ہیں اسباب میں تاثیر کی طاقت نہیں وہ صرف علامات ہیں جیسے میں نے ابھی لال جھنڈی کی مثال دی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن میں اس مضمون کو بار بار بیان فرمایا ہے چنانچہ ایک جگہ بہت تصریح کے ساتھ فرماتے ہیں۔ اَفَرَءَیْتُمْ مَّا تَحْرُثُوْنَ ءَاَنْتُمْ تَزْرَعُوْنَهٗۤ اَمْ نَحْنُ الزّٰرِعُوْنَ لَوْ نَشَآءُ لَجَعَلْنٰهُ حُطٰمًا فَظَلْتُمْ تَفَكَّهُوْنَ اِنَّا لَمُغْرَمُوْنَ بَلْ نَحْنُ مَحْرُوْمُوْنَ اَفَرَءَیْتُمُ الْمَآءَ الَّذِیْ تَشْرَبُوْنَ ءَاَنْتُمْ اَنْزَلْتُمُوْهُ مِنَ الْمُزْنِ اَمْ نَحْنُ

الْمُنْزِلُوْنَ لَوْنَشَآءُ جَعَلْنٰهُ اُجَاجًا فَلَوْلَا تَشْكُرُوْنَ اَفَرَءَيْتُمُ النَّارَ الَّتِيْ تُوْرُوْنَ ءَاَنْتُمْ اَنْشَاْتُمْ شَجَرَتَهَا اَمْ نَحْنُ الْمُنْشِئُوْنَ نَحْنُ جَعَلْنٰهَا تَذْكِرَةً وَّمَتَاعًا لِّلْمُقْوِيْنَ فَسَبِّحْ بِاسْمِ رَبِّكَ الْعَظِيْمِ ۔

ترجمہ بھلا دیکھو جوتم بوتے ہو کیا تم کرتے ہو اس کو کھیتی یا ہم ہیں کھیتی کرنے والے اگر ہم چاہیں تو کر ڈالیں اس کو روندا گھاس پھر تم رہو سارا دن باتیں بناتے ہم تو قرض دار رہ گئے بلکہ ہم بے نصیب ہو گئے بھلا دیکھو پانی جوتم پیتے ہو کیا تم اس کو بادل سے برساتے ہو یا ہم برسانے والے ہیں اگر چاہیں اسکو کڑوا کر ڈالیں سوتم شکر نہیں کرتے ہو اچھا دیکھو وہ آگ جوتم سلگاتے ہو اس کے درخت کو تم نے پیدا کیا ہے یا ہم پیدا کرنے والے ہیں ہم نے اس کو یاد رکھنے اور مسافروں کے فائدے کی چیز بنایا ہے پس آپ اپنے پروردگار کے نام کی تسبیح کیجئے۔

حاصل اس کا یہ ہے کہ کھیتی کا پیدا کرنے والا بھی وہی ہے اگر وہ چاہے تو ہرے بھرے کھیت ایک دم میں خشک ہو جائیں اور کاشتکار ہاتھ ملتے رہ جائیں گے بادل سے شیریں پانی وہی برساتا ہے اگر وہ چاہیں تو سمندر کا شور پانی اسی شوریت کے ساتھ نازل ہوا کرے جو سمندر میں ہے مگر وہ اپنی رحمت سے اس کو صاف کر کے شیریں کر کے نازل کرتے ہیں ان آیتوں میں اللہ تعالی نے بار بار سوال فرمایا ہے کہ بتلاؤ یہ کام تم کرتے ہو یا ہم کرتے ہیں جس کا جواب کسی کے پاس اس کے سوا کچھ نہیں کہ اللہ تعالی ہی کرتے ہیں یہ تو اعیان کے متعلق گفتگو تھی میں کہتا ہوں کہ ہمارے افعال بھی ظاہر میں ہمارے معمول نظر آتے ہیں ورنہ حقیقت میں ان کی علت بھی وہی ہیں اور ہماری طرف ان اعمال کی نسبت ایسی ہے جیسے بچے کے ہاتھ میں قلم دے کر پھر اس کے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لے کر لکھا جائے اور دو چار حرف خوشنما لکھ کر بچہ کی تعریف کی جائے کہ شاباش بہت اچھا لکھا اب اگر بچہ سمجھدار ہے وہ جانے گا کہ میرا کمال کچھ نہیں بلکہ اس کا کمال ہے جس نے اپنے ہاتھ میں میرا ہاتھ لے رکھا تھا اور ناداں ہے تو جہالت سے ناز کرنے لگے گا۔ مگر جس وقت وہ دوسرا ہاتھ اس کے ہاتھ سے الگ ہو جائیگا اس وقت اس کو معلوم ہوگا کہ وہ لکھنے پر کتنا قادر ہے اور اس میں کتنا کمال ہے۔

صاحبو! اسی طرح اپنے اعمال صالحہ و اوصاف کمالیہ پر نادان ہی ناز کرسکتا ہے جس کو اپنا ہاتھ تو نظر آتا ہے اور دوسرا ہاتھ نظر نہیں آتا۔ اور جن کو دوسرے ہاتھ کا مشاہدہ ہو گیا ہے۔ ان کی نظر اپنے کمالات پر اصلا نہیں ہوتی بلکہ یہ حال ہوتا ہے جیسے دیوار میں کسی نے میخ ٹھونکی دیوار نے میخ سے کہا کہ میرا سینہ کیوں پھاڑتی ہے میخ نے کہا کہ جو مجھ کو ٹھوک رہا ہے اس سے کہہ مجھ سے کیا کہتی ہے اور

بعض پر یہ مشاہدہ اس درجہ غالب ہو جاتا ہے کہ وہ وحدۃ الوجود میں پھنس جاتے ہیں مگر محقق وہ ہے جو دونوں ہاتھوں کا مشاہدہ کرے خالق کا بھی کاسب کا بھی نہ صرف کاسب پر نظر کرے نہ صرف خالق پر بلکہ خالق و کاسب دونوں پر نظر کر کے فعل کو دونوں کی طرف منسوب کرے خالق کی طرف خلقاً اور کاسب کی طرف کسباً خوب سمجھ لو۔ پس اس حقیقت کو حاصل کرنا چاہیے جس کا سہل طریق دعا ہے کہ حق تعالیٰ سے ہر حاجت کو عرض کرو۔ آج سے اس کا التزام کر لو کہ جو بات ہو گی حق تعالیٰ سے عرض کیا کریں مگر آموختہ سا نہ پڑھو بلکہ جیسا حکام دنیا کے سامنے لجاجت اور خوشامد سے عرضی دیتے ہو اور حاکم کے سامنے زبانی عرض و معروض کرتے ہوئے ہمہ تن اسی کی طرف متوجہ ہو جاتے ہو اس طرح توجہ و خشوع کے ساتھ دعا کرو اور پختگی کے ساتھ درخواست کرو کہ اے اللہ ایسا کر ہی دیجیے یوں نہ کہو کہ اگر آپ کی مرضی ہو تو ایسا کر دیجئے کیونکہ ان پر اکراہ کرنے والا کون ہے وہ تو بدون تمہارے اس سے کہے بھی اپنی مرضی کے موافق ہی کریں گے پس تم پختگی کے ساتھ درخواست کرو کیونکہ حدیث میں ہے ان اللہ یحب الملحین فی الدعاء اور الحاح سے جو یہ وسوسہ مانع تھا کہ نہ معلوم دعا قبول ہو یا نہ ہو اس کو میں رفع کر چکا ہوں اور بتلا چکا ہوں کہ ایک اجابت تو یقینی ہے یعنی عرضی کا لے لینا اور اس کو توجہ سے سننا کیونکہ اجابت کو آیت میں قرب پر مرتب فرمایا گیا ہے اور قرب تعلق کا ادنیٰ درجہ یہ ہے کہ عرضی لے لی جاوے پس آیت میں اس کا وعدہ ہے اس سے آگے کا وعدہ نہیں بلکہ وہ انشاء کے مقید ہے۔ اب شبہات سب رفع ہو گئے تو عمل شروع کر دینا چاہیے۔

معمولی چیز بھی اللہ تعالیٰ سے مانگو:

اور کسی حاجت کے لئے بھی مت سوچو! کہ یہ تو معمولی سی بات ہے اس کے واسطے اللہ تعالیٰ سے کیا دعا کریں کیونکہ حدیث میں اللہ تعالیٰ سے نمک تک مانگو اس حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے ایک شبہ کو رفع کیا ہے وہ یہ کہ بعض لوگ چھوٹی سی چیز مانگنی شان خداوندی کے خلاف سمجھتے ہیں جیسے سکندر سے کسی نے ایک روپے کا سوال کیا تھا سکندر نے کہا کہ۔ ایک روپیہ مانگنا میری شان کے خلاف ہے سائل نے کہا پھر سلطنت دیدو کہا یہ تیری شان کے خلاف ہے سلاطین دنیا کے مذاق پر قیاس کر کے بعض کو یہ شبہ ہوا کہ شاید اللہ تعالیٰ بھی چھوٹی چیز کے سوال سے ناخوش ہوں گے مگر یہ غلط ہے کیونکہ سلاطین چھوٹی چیز کے سوال سے اس واسطے ناخوش ہوتے ہیں کہ ان کے نزدیک کوئی چیز بڑی بھی ہے اور حق تعالیٰ کے سامنے کسی چیز کی بھی کچھ وقعت نہیں ان کے نزدیک عرش اور نمک کی

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

اس سے اس آیت کو ساکت مانا ہے پھر تم نفی کے عمل کی زیادت کیسے کرتے ہو۔ دوسرے أُجِيبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ میں تو سکوت عن عطاء المراد کی ایک وجہ ہے وہ یہ کہ تمہاری درخواست بعض دفعہ مناسب خلاف مصلحت ہوتی ہے اور اللہ تعالیٰ کے احکام میں یہ بات نہیں ہے تو ہم کو یہ بھی حق ہے کہ ہم فَلْيَسْتَجِيبُوا لِي وَلْيُؤْمِنُوا بِي کو طلب عمل سے ساکت نہ مانیں کیونکہ جو احکام سراپا خیر اور سراپا مصلحت ہیں ان کے ماننے کے معنی یہی ہیں کہ ان کے موافق عمل کیا جائے۔ اس کے بعد ارشاد ہے لَعَلَّهُمْ يَرْشُدُونَ بظاہر یہ سب امور مذکورہ کے متعلق ہے۔ مطلب یہ ہوا کہ بندوں کو میرے قرب علمی اور قرب تعلق سے اطلاع دیدی جائے تا کہ وہ اس کو معلوم کر کے میرے پاس احکام کو بھی مانیں اور اس مجموعہ سے توقع ہے کہ ان کو صواب و رشد حاصل ہو جائے گا۔ یہ جملہ اس پر دلالت کر رہا ہے کہ صواب و رشد یہی ہے کہ حق تعالیٰ سے اس طرح معاملہ کیا جائے کہ اعتقاداً ان کو اپنے پاس سے قریب سمجھے اور عملاً اللہ تعالیٰ سے مانگنے اور دعا کرنے کی عادت کی جائے اب یہ دعا کیجئے کہ اللہ تعالیٰ ہم کو اس کی توفیق عطا فرمائیں۔ وصلی اللّٰہ تعالیٰ علیٰ خیر خلقہ سیدنا و مولانا محمد وعلی الہ و اصحابہ اجمعین ۵ واخر دعونا ان الحمد للّٰہ رب العلمین۔



الفصل والانفصال فی الفعل والانفعال

الفاظ کی تاثیر جداگانہ ہے

یہ وعظ ۲۲ شوال ۱۳۴۶ھ بمقام مکان حضرت حکیم الامت تھانہ بھون جو کہ حضرت والا نے کرسی پر بیٹھ کر ساڑھے تین گھنٹے ارشاد فرمایا۔ سامعین کی تعداد تقریبا ۵۰ تھی مستورات بھی تھیں جس کو مولانا ظفر احمد صاحب نے قلم بند فرمایا۔

خطبہ ماثورہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للہ نحمدہ ونستعینہ ونستغفرہ ونؤمن بہ ونتوکل علیہ ونعوذ باللہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا من یھدہ اللہ فلامضل لہ ومن یضللہ فلاھادی لہ ونشھد ان لاالہ الا اللہ وحدہ لاشریک لہ ونشھد ان سیدنا ومولانا محمداً عبدہ ورسولہ صلی اللہ علیہ وعلی الہ واصحابہ وبارک وسلم امابعد فاعوذ باللہ من الشیطن الرجیم. بسم اللہ الرحمن الرحیم
لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَآ اِنْ نَّسِيْنَآ اَوْ اَخْطَاْنَا رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْ عَلَيْنَآ اِصْرًا كَمَا حَمَلْتَهٗ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِنَا رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهٖ وَاعْفُ عَنَّا وَاغْفِرْ لَنَا وَارْحَمْنَا اَنْتَ مَوْلٰىنَا فَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ.

ترجمہ:۔ اللہ تعالیٰ کسی شخص کو مکلف نہیں بناتا مگراسی کا جواس کی طاقت اور اختیار میں ہو اس کوثواب بھی اس کا ملے گا جوارادہ سے کرے اوراس پرعذاب بھی اسی کا ہوگا جوارادہ سے کرے۔ اے ہمارے پروردگارہم پر داروگیر نہ فرمایئے اگرہم بھول جائیں یاچوک جائیں۔ اے ہمارے پروردگارہم پرکوئی سخت حکم نہ بھیجئے۔ جیسے ہم سے پہلے لوگوں پرآپ نے بھیجے تھے۔ اے ہمارے رب ہم پرکوئی ایسابار(دنیایاآخرت کا نہ ڈالئے جسکی ہم کوسہارنہ ہواوردرگزرکیجئے ہم سے اور بخش دیجئے ہم کواوررحم کیجئے ہم پرآپ ہمارے کارساز ہیں آپ ہمیں کافروں پرغالب کیجئے۔

تمہید

یہ مضمون اہل علم، اہل عمل اوراہل حال سب کیلئے مناسب ہے:

میں نے برکت کیلئے سب آیتیں پڑھ دی ہیں مگرمقصود بالبیان صرف اول کے جملے ہیں ہر چند کہ یہ مضمون اہل علم کے زیادہ مناسب ہے اوران میں سے بھی زیادہ مناسب ان کے ہے جو اہل عمل ہیں اوراہل عمل میں بھی اہل حال کے زیادہ مناسب مگرسب مسلمان فی الجملہ علم وحال سے متصف ہیں ہی اس لئے فی الجملہ یہ مضمون سب کے مناسب ہے گو بظاہر خشک مضمون ہے مگر

ضرورت کی وجہ سے تر مضامین پر مقدم اوران سے اہم ہے اور یہ مضمون مختصر بھی ہے اور عمل میں سہل بھی ہے ان وجوہ سے بھی یہ اہم ہے کہ ضرورت کا بھی ہے مختصر بھی ہے سہل بھی ہے اس لئے بھی اختیار کیا گیا کہ طبیعت کسلمند ہے بیان کا قصد تو بالکل نہ تھا مگر بعض مہمانوں کی خاطر قصد کرلیا گیا۔ اور ارادہ کے بعد خیال یہ ہوا تھا کہ مدرسہ میں بیان کروں مگر بعض مہمان مستورات بھی ہیں ان کو بھی سنانا چاہا اس لئے گھر میں بیان تجویز ہوا گو مستورات سے یہ امید نہ تھی کہ وہ اس کو سمجھ سکیں گی مگر توکلا علی اللہ یہ ارادہ کرلیا گیا کیونکہ مستورات کو بعض احوال تکوینیہ ایسے پیش آتے ہیں جن کی تعدیل کیلئے یہ مضمون زیادہ مناسب ہے گو ان کی سمجھ میں بھی نہ آئے تاہم احکام شرعیہ میں کچھ ایسا لطف ہے کہ جس کی وجہ سے ہر سننے والے پر ان کا اثر ہوتا ہے گو وہ کسی کے سمجھ میں بھی نہیں آئیں ۔احکام شرعیہ طبعاً دل میں گھر کر لیتے ہیں اس لئے مجمع مستورات کو بھی فائدہ کی امید ہے کیونکہ مضمون فی نفسہ سہل ہے گو بعض مقدمات دقیق ہیں جو غیر اہل علم کی فہم میں نہ آئیں مگر اصل مضمون کچھ دقیق نہیں اور عملاً تو بہت ہی سہل ہے۔ یہ ایک اجمالی حاصل ہے مضمون کا اور اس کے محرک کا اور اس کے سبب اختیار کا اب میں وہ مسئلہ بیان کرتا ہوں اور جو غلطی اس میں کی جاتی ہے اس کو رفع کرنا چاہتا ہوں۔ جو آیات میں نے تلاوت کی ہیں یہ مسئلہ ان کے ابتدائی جملوں کا مدلول ہے اور یہ ایسا مسئلہ ہے جس کو میں اکثر بیان کیا کرتا ہوں گو جس طرح آج اس آیت کے تحت میں سمجھ میں آیا ہے اس طرح کبھی بیان نہیں ہوا اس لئے اس میں گونہ جدت بھی ہے کیونکہ طرز بیان کے جدید ہونے سے بھی مضمون میں کسی قدر جدت آجاتی ہے مگر جدت فی نفسہا مطلوب نہیں۔

مضمون میں جدت کا نہ ہونا فی نفسہ رحمت ہے:

بلکہ میں تو یہ کہتا ہوں کہ جدت نہ ہونا رحمت حق ہے۔ کیونکہ جدید محض ذہن سے مانوس نہیں ہوتا اور غیر جدید مانوس ہوتا ہے اور جس بات سے ذہن کو انس ہوتا ہے وہ جلدی دل میں گھر کرلیتی ہے پس تعلیمات شرعیہ کا پرانا ہونا اور سبق کہنہ ہونا ہمارے لئے رحمت ہے اگر احکام شرعیہ جدید محض ہوتے تو ذہن سے مانوس نہ ہوتے اور غیر مانوس سے طبیعت اچھتی ہے پس جو لوگ بیان میں جدت کے طالب ہیں وہ گویا مضمون غیر مانوس کے طالب ہیں۔ اب مقصود کو سنئے کہ حاصل اس مضمون کا جن کو میں بیان کرنا چاہتا ہوں یہ ہے کہ امور اختیاریہ قابل توجہ ہیں اور امور غیر اختیاریہ غیر قابل توجہ ہیں اس کے بعد سمجھئے کہ انسان میں دو چیزیں ہیں ایک اعمال یہ تو اختیاری ہیں جن میں بعض اعمال تو کرنے کے ہیں اور بعض بچنے کے ہیں مثلاً نماز، روزہ، زکوٰۃ وحج وغیرہ

یہ اعمال تو کرنے کے ہیں اور رغیبت نہ کرنا تکبر نہ کرنا کسی کا مال غصب نہ کرنا فرض نہ مارنا یہ اعمال کف کے متعلق ہیں کیونکہ کسی عمل سے بچنا بھی عمل ہے اعمال عدمیہ من حیث العدم تو عمل نہیں لیکن من حیث الکف عمل ہیں۔ دوسرے احوال ہیں یہ اختیاری ہیں۔

احوال قابل توجہ نہیں:

پس حاصل ہوا کہ اعمال قابل توجہ ہیں اور احوال قابل توجہ نہیں کیونکہ اعمال سب اختیاری ہیں خواہ ظاہری ہوں یا باطنہ۔

لوگ اعمال باطنہ کا اہتمام نہیں کرتے:

یہ تعمیم اس لئے کی کہ بعض لوگ اعمال ظاہرہ کا تو اہتمام کرتے ہیں مثلاً نماز، روزہ کا مگر اعمال باطنہ کا اہتمام نہیں کرتے مثلاً خدا سے محبت کرنا حالانکہ شرعاً یہ بھی مثل نماز کے ضروری ہے۔

حق تعالیٰ شانہٗ اور انکے رسولؐ سے محبت کی کمی پر اظہار افسوس:

بدوں محبت حق کے نماز بھی نماز نہیں مگر لوگوں کو اس کا اہتمام نہیں چنانچہ دل کو ٹٹول کر نہیں دیکھتے کہ اس میں خدا کی محبت کتنی ہے اور یہ بہت بڑی کوتاہی ہے۔ حدیث میں ہے لا یکون احدکم مؤمنا حتی یکون اللہ و رسولہ احب الیہ مما سواھما۔

ترجمہ:۔ کوئی تم میں سے مومن نہ ہوگا جب تک اللہ اور اس کا رسولؐ اس کے نزدیک سب ماسوائے یعنی اپنے نفس اور مال اور اہل وعیال سب سے زیادہ محبوب نہ بن جائیں۔

یہ ایک ایسی حدیث ہے جس میں کوئی تاویل نہیں ہوسکتی کیونکہ یہ کسی نص کے معارض نہیں اور تاویل تعارض ہی کی وجہ سے کی جاتی ہے اب ہر شخص دیکھ لے کہ اس کے دل میں اللہ ورسول کی محبت زیادہ ہے یا برادری واہل وعیال کی، بعض کو تو اس کی فکر ہی نہیں اور جن کو انہوں نے یہ سمجھ لیا ہے کہ محبت تو غیر اختیاری ہے۔ جب ہمارے دل میں اللہ تعالیٰ کی محبت نہیں ہے تو کیا کریں اور بعض نے سمجھ لیا کہ اللہ تعالیٰ کی محبت کی صورت تو یہ ہے کہ گھر یا ہر بیوی بچے چھوڑ کر ایک حجرہ میں بیٹھ جاؤ اور یہ نہیں ہوسکتا پس محبت الٰہی کا حاصل ہونا محال ہے اور محال نہیں تو دشوار ضرور ہے۔ پس یہ حساب اپنے دل میں لگا کر بیٹھ گئے اور تحصیل محبت الٰہیہ میں سعی چھوڑ دی۔ رہا یہ کہ ترک محبت پر اللہ تعالیٰ مواخذہ فرمائیں گے سو اس کا اول تو ان کو وہم ہی نہیں ہوتا اور کچھ خیال ہوتا

ہے تو دل کو یہ سمجھا لیتے ہیں کہ قیامت میں کہہ دیں گے کہ یا اللہ جیسے اور گناہ آپ معاف فرمائیں گے ویسے ہی اس گناہ کو بھی معاف فرما دیجئے مگر افسوس دنیا کے متعلق کسی نے یہ حساب نہیں لگایا جس طرح عذاب آخرت کے متعلق دل کو یہ سمجھا لیا ہے کہ کٹ پٹ کر ایک دن نجات ہو ہی جائے گی اسی طرح دنیا کے متعلق دل کو سمجھانا چاہئے تھا کہ اگر دنیا میں راحت نہ ہوتی تو بلا سے ایک دن سب تکالیف کا خاتمہ ہو ہی جائے گا بلکہ دنیا کے متعلق یہ حساب اھون تھا کیونکہ دنیا کا زوال وانقطاع قریب وقت میں مشاہدہ ہے اور آخرت میں ایک دن کو بھی عذاب ہو گیا تو آخرت کا ایک دن ہزار سال کے برابر ہے۔ وَاِنَّ یَوْمًا عِنْدَ رَبِّکَ کَاَلْفِ سَنَۃٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ ۔ اور اگر خدانخواستہ دو چار دن کے لئے عذاب ہوا تو پھر کیا ٹھکانا ہے۔ پھر حیرت ہے کہ دنیا کی تکالیف کا تحمل نہیں اور یہاں ہر شخص اپنے لئے راحت ہی تجویز کرتا ہے حالانکہ دنیا کی راحت و تکلیف چند روزہ ہے اور آخرت کی تکلیف و عذاب سے اس قدر یہ بے فکری ہے کہ اس کے لئے ہر شخص نے اپنے دل میں ایک حساب لگا رکھا ہے میں یہ نہیں کہتا کہ دنیا سے ترک تعلق کر کے جنید و شبلی بن جاؤ میں تو اس کا متمنی ہوں کہ مسلمان بن جاؤ۔ افسوس تو اسی بات کا ہے کہ آجکل اکثر مسلمانوں کا ایمان کمزور ہے کہ نہ خدا اور رسول کی محبت کی فکر ہے نہ آخرت کا خوف ہے۔ ایک مہینہ کی جیل سے جتنی وحشت ہے۔ عذاب جہنم کا اتنا بھی خوف نہیں۔

اللہ اور رسول ﷺ کی محبت کے بغیر کوئی آدمی مومن نہیں ہو سکتا:

اب سنئے کہ رسول اللہ ﷺ تو اس حدیث میں مطلقاً فرماتے ہیں لایؤمن احدکم جس کا مطلب یہ ہے بدوں اللہ و رسول کی محبت کے آدمی مومن ہی نہیں ہوتا۔ اگر خوارج و معتزلہ نہ ہوتے جو مرتکب کبیرہ کو کافر یا لامومن ولا کافر کہتے ہیں تو علماء کو اس حدیث کی تقیید کی کچھ ضرورت نہ تھی کیونکہ تقیید کے بعد وہ اثر نہیں ہوتا جو اطلاق کا اثر ہوتا ہے مگر حضرات علماء جو تقیید بضرورت کی ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ جب دوسرے نصوص کو ملا کر یہ معلوم ہو گیا کہ مقصود مقید ہے تو اعتقاد تقیید کا رکھو مگر اثر اطلاق کا لو۔ رہا یہ کہ لفظی اطلاق کا اثر ہی کیا ہو گا جب کہ اعتقاد تقیید کا ہے۔

تاثیر الفاظ کے دلائل:

تو میں کہتا ہوں کہ الفاظ کا اثر بھی بہت ہوتا ہے ورنہ رسول اللہ ﷺ بجائے من ترک الصلوۃ متعمد افقد کفر کے فقد عصی فرماتے میرے پاس تاثیر الفاظ کے دلائل موجود

ہیں کہ باوجود اتحاد معنی کے الفاظ کا اثر جدا ہوتا ہے جیسے باپ کو قبلہ و کعبہ کہو تو اور اثر ہے۔ ابا کہو تو اور اثر ہے اور ماں کا خصم کہو تو جدا اثر ہے۔ بتلائیے یہ کس چیز کا اثر ہے معنی کا اثر نہیں ہو سکتا کیونکہ معنی سب کے متحد ہیں یہ اختلاف اثر محض اختلاف لفظ کی وجہ سے ہے۔ مجھے خود ایک واقعہ پیش آچکا ہے کہ ایک زمانہ میں مجھے اختلاج قلب کا مرض ہوا اور قوت اس درجہ سلب ہو گئی کہ ایک طبیب نے قارورہ دیکھ کر یہ کہا کہ حیرت ہے یہ شخص زندہ کیونکر ہے قارورہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ حرارت عزیزیہ بالکل فنا ہو گئی۔ قارورہ لے جانے والے میرے ایک دوست تھے انہوں نے یہ قول مجھ سے آکر کہہ دیا میں ان پر بہت خفا ہوا کہ تم کو مریض سے ایسی بات نہیں کہنا چاہئے تھی وہ نادم ہوئے اور کہنے لگے کہ اب تو غلطی ہو گئی اس کا تدارک کیونکر ہو میں نے کہا اس کا تدارک یہ ہے کہ تم یہاں سے واپس جاؤ اور کچھ دور سے لوٹ کر آؤ اور مجھ سے یوں کہو کہ میں نے پہلے جو بات کہی تھی وہ غلط تھی حکیم صاحب فرماتے ہیں کہ حالت اچھی ہے خطرہ نہیں انشاء اللہ صحت ہو جائے گی۔ وہ دوست کہنے لگے میرے اس کہنے سے کیا تدارک ہو گا جبکہ آپ کو معلوم ہے کہ میں آپ ہی کا پڑھایا ہوا سبق آکر سنادوں گا۔ میں نے کہا تم نہیں جانتے اللہ نے الفاظ میں بھی خاص اثر رکھا ہے چنانچہ وہ گئے اور تھوڑی دیر میں آکر وہی الفاظ کہے جو میں نے سکھلائے تھے۔ تو میں نے اس وقت اپنے اندر ان الفاظ کا اثر خود محسوس کیا اور دیکھتا تھا کہ ان الفاظ کے سننے سے وہ وحشت جاتی رہی جو پہلے حکیم صاحب کا قول سنکر پیدا ہوئی تھی پھر خدا کے فضل و کرم سے چند روز ہی مجھے صحت ہو گئی۔ تو جب اپنے پڑھائے ہوئے الفاظ میں اتنا اثر ہے تو غور کیجئے کہ جو الفاظ اپنے سکھلائے ہوئے بھی نہیں ہیں ان کا کیا اثر ہو گا گو یہ بھی معلوم ہو جائے کہ مراد کیا ہے۔ حضور ﷺ نے اسی وجہ سے فقد کفر فرمایا ہے فقد عصی نہیں فرمایا گو مطلب وہی ہے جو فقد عصی کا ہے مگر فقد کفر میں خاص اثر ہے اور اسی لئے رسول اللہ ﷺ نے خدا اور رسولؐ کی محبت کے متعلق لایؤمن فرمایا ہے کہ اس کے بغیر آدمی مومن نہیں ہوتا اب بتلائیے اس کی فکر کیوں نہیں ہے۔

دل میں اللہ اور رسول ﷺ کی محبت ٹٹولنے کا معیار:

ٹٹول کر دیکھو کہ دل میں اللہ و رسول ﷺ کی محبت زیادہ ہے یا بیوی بچوں کی شاید تم کہو کہ تعارض آثار سے دونوں طرف ذہن جاتا ہے اس کا معیار بتلاؤ جس سے فیصلہ کیا جائے تو وہ معیار یہ ہے جس معاملہ میں ایک طرف اللہ اور رسول کا حکم ہو اور ایک طرف اپنے نفس کی یا بیوی بچوں کی

خواہش ہو تو اس وقت یہ دیکھو کہ تم کس کو ترجیح دیتے ہو اگر تم نے اللہ و رسول ﷺ کے حکم کو ترجیح دی تو بے شک تم کو اللہ و رسول کی محبت ہے گو جوش و خروش نہ ہو کیونکہ محبت کے الوان ہیں اس کو صوفیہ نے اچھی طرح سمجھا ہے ورنہ اہل ظاہر تو سب کو کافر ہی بنا دیتے کیونکہ ان کے نزدیک تو محبت جوش و خروش ہی کا نام ہے اگر جوش نہ ہو تو ان کے نزدیک محبت ہی نہیں تو وہ سب کو محبت سے خالی کہتے۔

محبت کے دو الوان:

مگر صوفیہ نے کہا ہے کہ محبت کے دو لون ہیں ایک شوق کا رنگ ہے اس میں جوش و خروش ہوتا ہے ایک لون انس کا ہے اس میں جوش و خروش نہیں جیسے ایک محبت چھوٹے بچہ سے ہوتی ہے ایک بڑے لڑکے سے دونوں کا لون مختلف ہے۔

انس سے متعلق احادیث مختلفہ میں تطبیق:

اسی تحقیق سے محققین نے احادیث مختلفہ میں تطبیق دی ہے کہ بعض احادیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا گیا من احب الناس الیک کہ آپ کو دو آدمیوں میں کس سے محبت بہت زیادہ ہے تو حضور ﷺ نے اس سوال کے جواب میں کبھی تو فرمایا کہ حضرت عائشہؓ سب سے زیادہ محبوب ہیں اور کبھی حضرت فاطمہ کا نام لیا اور بعض روایات میں ابوبکر صدیق کا نام آیا ہے۔ محققین نے فرمایا ہے کہ ان احادیث میں تعارض کچھ نہیں کیونکہ محبت کے الوان و انواع ہیں۔ ایک نوع محبت کی وہ ہے جو بیوی سے ہوتی اس نوع میں حضرت عائشہؓ کے مساوی کوئی نہیں۔ ایک نوع محبت کی وہ ہے جو اولاد سے ہوتی ہے۔ اس میں حضرت فاطمہؓ کے برابر کوئی نہیں ایک نوع وہ ہے جو دوستوں سے ہوتی ہے اس نوع میں حضرت صدیقؓ کے برابر کوئی نہ تھا وعلی ہذا القیاس۔

محبت کے لئے جوش و خروش کی ضرورت نہیں:

غرض محبت کیلئے جوش و خروش کی ضرورت نہیں بدوں اس کے بھی محبت ہو سکتی ہے بس جو شخص اللہ و رسول ﷺ کے احکام کو اپنی نفسانی خواہش اور بیوی بچوں کی خواہش پر ترجیح دے اس کو اللہ و رسول ﷺ سے اسی درجہ کی محبت حاصل ہے گو جوش نہ ہو اور جو اپنے نفس یا اہل عیال کی خواہش کو ترجیح دے اس کو اللہ و رسول ﷺ سے وہ محبت نہیں تو کیا اب کیا یہ بات فکر کی نہیں کہ ہم کو اللہ و رسول ﷺ سے تعلق ہے یا نہیں میں یہ کہہ رہا تھا کہ۔

اعمال کی دو قسمیں:

اعمال دو قسم کے ہیں ظاہرہ و باطنہ اور آجکل بہت لوگوں کو اعمال باطنہ کی فکر نہیں نیز میں نے کہا تھا کہ اعمال سب اختیاری ہیں۔ اس لئے اعمال سب کے سب قابل توجہ ہیں اور جو لوگ محبت الٰہی کو دشوار یا محال سمجھے ہوئے ہیں یہ ان کی غلطی ہے کیونکہ انہوں نے محبت الٰہی کی حقیقت یہ سمجھی ہے کہ تعلقات دنیویہ کو کلیتہً ترک کر دیا جائے بیوی بچوں کو چھوڑ کر ایک حجرہ سنبھال لیا جائے یہ خیال جاہلانہ ہے کیونکہ انبیاء علیہم السلام سے زیادہ کسی کو اللہ تعالیٰ سے محبت نہ تھی اور انبیاء علیہم السلام اکثر صاحب ازواج وذریۃ تھے اور کسی نے بیوی بچوں کو چھوڑ کر حجرہ نہیں سنبھالا بلکہ سب ان کے حقوق کو اہل دنیا سے زیادہ ادا کرتے تھے۔ حق تعالیٰ فرماتے ہیں۔ وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلاً مِّنْ قَبْلِکَ وَجَعَلْنَا لَهُمْ اَزْوَاجًا وَّذُرِّيَّةً وقال وَمَآ اَرْسَلْنَا قَبْلَکَ مِنَ الْمُرْسَلِيْنَ اِلَّآ اِنَّهُمْ لَيَاْكُلُوْنَ الطَّعَامَ وَيَمْشُوْنَ فِي الْاَسْوَاقِ اور حدیث میں ہے. ان من اکمل المؤمنین ایمانا احسنهم خلقا والطفهم باهله. (رواہ الترمذی) تم میں کامل الایمان وہ ہے جو اپنے گھر والوں کے ساتھ خلق ولطف سے پیش آوے۔

بیوی بچوں کو چھوڑ کر حجرہ سنبھالنا معصیت ہے:

پس خوب سمجھ لو کہ بیوی بچوں کو چھوڑ کر حجرہ سنبھالنا محبت الٰہی نہیں بلکہ معصیت حق ہے محبت الٰہیہ ان کو چھوڑنے کا امر نہیں کرتی بلکہ پہلے سے زیادہ ان کی دل داری دلجوئی کا امر کرے گی۔ یہ گفتگو تو اعمال کے متعلق تھی۔ ایک دوسری چیز انسان کے اندر اور ہے جس کا نام حال ہے جیسے شوق وجذب و وجد وغیرہ یہ اختیاری نہیں ہیں وہبی ہیں اور صاحب حال وغیر صاحب حال میں تفاوت یہ ہے کہ غیر صاحب حال کو مثلاً رشوت سے نفرت تو ہوتی ہے مگر ایسی نہیں جیسے گوہ سے اور صاحب حال کو گناہوں سے ایسی ہی نفرت ہوتی ہے جیسی نجاست ظاہرہ سے اس لئے احوال کے محمود ہونے میں کلام نہیں مگر وہ مقصود نہیں ہیں کیونکہ غیر اختیاری ہیں اسی لئے مقصود ان پر موقوف نہیں مثلاً مقصود گناہوں سے بچنا ہے تو یہ بدوں حال کے بھی حاصل ہو سکتا ہے گو بدوں حال کے گناہوں سے ایسی نفرت نہ ہو گی جیسی گوہ سے مگر ایسی نفرت تو ہو سکتی ہے جیسی سنکھیا سے سو گناہوں سے بچنے کیلئے اتنی نفرت بھی کافی ہے اسی طرح مصیبت کے وقت صبر مطلوب ہے کہ اس کو خدا کا تصرف سمجھ کر راضی رہے اور دل میں خدا سے شکایت نہ لائے نہ ظاہر میں جزع فزع کرے یہ تو اعمال

اختیار میں سے ہے جس کے مکلف ہم سب ہیں اب بعض لوگ کسی عزیز کی موت کے وقت صبر کر کے اس کا انتظار کرتے ہیں کہ ہم کو اس کا خیال ہی نہ آئے تو یہ غیر اختیاری ہے۔ غلبۂ حال میں ایسا بھی ہو جاتا ہے مگر حال اپنے اختیار میں نہیں۔

دینداروں کی غلطی:

اب دینداروں کی غلطی یہ ہے کہ جس میں عوام بھی بعض دفعہ مبتلا ہو جاتے ہیں کہ ان کو اعمال سے زیادہ احوال کا اہتمام ہو جاتا ہے وہ یہ چاہتے ہیں کہ مصیبت کے وقت ایسا صبر آئے کہ عزیز کے مرنے کا خیال ہی دل سے نکل جائے۔ اور نماز میں ایسا دل لگے کہ ڈھول بھی بجتے ہوں تو خبر نہ ہو اسی لئے ذاکرین شیوخ سے کہتے ہیں کہ ذکر میں دل نہیں لگتا ذکر کر کے جی پھیکا پھیکا رہتا ہے۔ تہجد کا ہم کو ایسا اہتمام نہیں جیسا اسٹیشن پر جانے کا اہتمام ہوتا ہے یا تہجد و ذکر کے ناغہ ہونے کا اتنا قلق نہیں ہوتا جتنا مال چوری ہو جانے کا قلق ہوتا ہے۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ سالکین نے اعمال صالحہ کی بے قدری شروع کر دی کہ جب نماز میں بیوی بچوں کا خیال آ گیا تو وہ نماز ہی کیا ہوئی یہ شخص ناشکری میں مبتلا ہو گیا۔ میرا یہ مطلب نہیں کہ نماز کو اپنی نماز سمجھے اور اس کو اپنا کمال سمجھے کیونکہ نماز تو اپنی جب ہوتی کہ اپنے اسباب سے کام لیا ہوتا یہاں تو اعضاء وارادہ سب حق تعالیٰ کی طرف سے ہیں اپنی حیثیت سے تو نماز وغیرہ کچھ بھی نہیں۔

عطائے حق ہونے کی وجہ سے اعمال صالحہ قابل قدر ہیں:

مگر دوسری حیثیت سے یہ اعمال قابل قدر ہیں یعنی عطائے حق ہونے کی وجہ سے یہ نماز و روزہ جس درجہ میں بھی ہے قابل قدر ہے (مصرعہ) بلا بودے اگر ایں ہم نبودے۔ اس کی ایسی مثال ہے کہ جیسے ایک چمار کو بادشاہ موتی دیدے تو وہ اپنے کو چمار ہی سمجھے گا مگر اس کے ساتھ ہی موتی کو موتی بھی سمجھے گا یہ نہیں کہ اپنے چمار ہونے کیوجہ سے موتی کو بھی ٹھیکرا سمجھنے لگے۔ یا موتی کو موتی سمجھنے سے اپنے کو چمار نہ سمجھے۔ بس یہ مطلب ہے شکر کا کہ اپنے کو تو چمار سمجھو مگر اعمال صالحہ عطائے حق ہونے کی وجہ سے قابل قدر سمجھو اور نعمت حق کی بے قدری نہ کرو مجھے اس پر ایک حکایت یاد آئی الٰہ آباد میں ایک بزرگ محمدی شاہ صاحب تھے جو ولایتی تھے اور مجرد بھی تھے الٰہ آباد والے بھی کہتے تھے کہ رات کو جب یہ ذکر کرتے ہیں تو سارا شہر گونج جاتا ہے۔ بہت لوگ ان کے معتقد تھے اور اکثر اہل مقدمات ان کے پاس بہت جاتے تھے اور بعضے بزرگوں کے پاس طالبان دین زیادہ

جاتے ہیں اور یہ بھی اللہ تعالیٰ کی نعمت ہے کہ لوگ کسی کے پاس دین کی طلب کو جائیں بحمد اللہ ہمارے حضرات کے پاس اکثر اہل دین اور طالب آخرت ہی آتے ہیں میں بھی ایک دفعہ والد صاحب کے ساتھ ان بزرگ کے پاس حاضر ہوا ہوں۔ یہ مجھے یاد نہیں رہا کہ والد صاحب کیوں گئے تھے کسی مقدمہ کی وجہ سے دعاء کیلئے گئے تھے یا محض زیارۃ اہل اللہ کا قصد تھا ان بزرگ کا ایک واقعہ حافظ عبدالرحمٰن صاحب بکھیر دی بیان کرتے تھے کہ وہ ایک شخص کے ساتھ ان بزرگ کے پاس حاضر ہوئے۔ اس دوسرے شخص کو محمدی شاہ صاحب جانتے تھے ان سے حافظ عبدالرحمٰن صاحب کی تعریف پوچھی تو انہوں نے کہا یہ حافظ بھی ہیں حاجی بھی ہیں ذاکر شاغل بھی ہیں۔ اس پر حافظ عبدالرحمٰن صاحب نے تواضعاً کہہ دیا کہ حضرت میں تو کچھ بھی نہیں یہ سنکر محمدی شاہ صاحب بگڑ گئے اور فرمایا اچھا تو تم حافظ نہیں ہو تم یہ چاہتے ہو کہ اللہ تعالیٰ تمہارا حفظ قرآن سلب کرلیں اور تمہارا حج باطل ہو جائے۔ حافظ عبدالرحمٰن کہتے تھے کہ انہوں نے میری ایسی خبر لی کہ پیچھا چھڑانا مشکل ہو گیا اور اس کے بعد جب کبھی حافظ جی ان کے پاس حاضر ہوتے تو کہتے آؤ نا شکرا آؤ نا شکرا۔ انہوں نے ان کا لقب ہی ناشکرا رکھ لیا۔ غرض ہمارے اعمال میں دو حیثیتیں ہیں اور اس کو اہل علم اچھی طرح سمجھیں گے۔ اسی لئے کچھ درسی کتابوں کے پڑھنے کی بھی ضرورت ہے۔ پس ہماری حیثیت تو یہ اعمال کچھ نہیں ہیں مگر دوسری حیثیت سے قابل قدر ہے کہ عطاء حق ہیں گو وہ ٹوٹا ہی ہوا بریں دے دیں۔ پس سالکین پر تو احوال کے مقصود سمجھنے کا یہ اثر ہوا کہ وہ اپنے اعمال کی بے قدری کرنے لگے اور عوام پر یہ اثر ہوا کہ انہوں نے عمل ہی کو چھوڑ دیا کہ جب نماز میں خیالات دنیویہ کا سلسلہ بند نہیں ہوتا تو ایسی نماز کو کیا کریں سالکین تو عمل کے بعد معطل ہوئے تھے۔

نماز کا شوق پڑھنے سے پیدا ہوتا ہے:

عوام کو قبل عمل ہی کے تعطل ہو گیا۔ چنانچہ یہ لوگ کسی بزرگ کے پاس جائیں گے تو یہ کہیں گے کہ کوئی ایسی تدبیر بتلا دیجئے کہ نماز کا شوق ہو جائے حالانکہ شوق ہوتا ہے نماز پڑھنے ہی سے نماز تو یہ چاہتی ہے کہ یہ اس کو پڑھیں تو شوق پیدا ہو اور وہ یہ چاہتے ہیں کہ پہلے شوق ہو جائے تو نماز پڑھیں۔ اس کی ایسی مثال ہے جیسے کوئی شخص چاہے کہ کھانا پختہ ہو جائے مگر جو اسباب ہیں پختہ ہونے کے ان کو جمع نہ کرے تو کیسے پختہ ہوگا البتہ ایسا پختہ ہو جائے گا جیسے ایک مسخرہ کی حکایت ہے کہ اس کو رس کی کھیر کا شوق ہوا لوگوں سے ترکیب پوچھی معلوم ہوا کہ چاول اور رس کو ملا کر آگ پر

پکانا پڑتا ہے اور گھوٹنا بھی پڑتا ہے کہنے لگا یہ تو بکھیڑا ہے آپ نے کیا کیا چاول کچے چبا کر اوپر سے رس پی لیا اور چولہے کی طرف سرین کر کے کھڑا ہو گیا کہ آنچ لگ کر کہ پیٹ میں سب پک جائے گا تو جیسے اس شخص کی کھیر پک گئی تھی ایسا ہی ان لوگوں کا شوق حاصل ہو گا جو بدوں عمل کے شوق کے طالب ہیں اور اس غلطی کا منشا یہ ہے کہ یہ لوگ بدوں حال کے عمل کو کالعدم سمجھتے ہیں اور یہ ناس کیا ہے واعظوں نے جو اپنے وعظوں میں علی الاطلاق کہہ دیتے ہیں۔

برزباں تسبیح و دردل گاؤ خر   ایں چنیں تسبیح کے دارد اثر

زبان پر اللہ کا نام اور دل میں دنیا کا خیال۔ ایسی عبادت کیا اثر رکھتی ہے۔

اگر یہ لوگ محقق سے رجوع کرتے تو کبھی یہ حالت نہ ہوتی مگر غیر محقق واعظوں کی تعلیم نے مخلوق کا ناس کر دیا ان کی یہ حالت ہے کہ۔

ایک واعظ کے دیہاتی کو روزہ سے محروم کرنے کی حکایت:

ایک واعظ نے رمضان میں کسی دیہاتی سے کہا کہ آج روزہ رکھا ہے کہا ہاں رکھا ہے کہا نیت بھی کی تھی کہا ہاں کی تھی پوچھا کس طرح کی تھی اس نے بتلایا کہ سحری کھاتے ہوئے دل میں خیال کر لیا تھا کہ کل کو روزہ رکھیں گے واعظ صاحب بولے کہ یوں نہیں بلکہ زبان سے یوں کہنا چاہئے۔ نویت الصوم للہ تعالیٰ غدا۔ دیہاتی نے کہا بہت اچھا اب سے یوں کہا کروں گا۔ اگلے دن واعظ صاحب نے دیکھا کہ چودھری چوپال میں بیٹھے ہوئے حقہ بجا رہے ہیں کہا میاں یہ کیا؟ رمضان میں حقہ پیتے ہو کیا روزہ نہیں ہے کہا نہیں آج روزہ نہیں رکھا کیونکہ نیت یاد نہیں ہوئی جب نیت یاد ہو جائے گی تب روزہ رکھوں گا۔ دیکھئے اس واعظ نے بیچارے دیہاتی کا کیسا ناس کیا کہ اس کو روزہ سے محروم کر دیا بس ان کی وہ حالت ہے جو اناڑی حکیم کی حالت ہوتی چنانچہ ایسے ہی حکیم نے ایک بیمار کو مسہل دیا تھا نہ معلوم کیا خاک بلا دے دی کہ غریب کو بے انتہا دست آ گئے حکیم صاحب کو مسہل دینا تو آتا تھا مگر دست بند کرنے کی ترکیب معلوم نہ تھی۔ تیمارداروں نے آ کر اطلاع کی کہ دست بہت آ رہے ہیں بند نہیں ہوتے کہا کچھ ڈر نہیں مادہ فاسد ہے نکلنے دو۔ تھوڑی دیر کے بعد پھر اطلاع کی کہ بہت ضعف ہو گیا ہے کہا کہ کچھ ڈر نہیں مادہ فاسد نکلنے دو۔ پھر اطلاع کی کہ اس کو تو نزع کی سی کیفیت طاری ہے کہا مادہ فاسد ہے نکلنے دو۔ پھر اطلاع دی کہ وہ تو مر بھی گیا تو آپ فرماتے ہیں اللہ رے مادے جس کے نکلنے سے مر گیا اگر وہ اندر رہتا تو کیا ہوتا۔ یہ دنیا

ہی جواب ہے جیسے بوجھ بجھکو نے جواب دیا تھا جس کا قصہ یہ ہے کہ ایک گاؤں میں ایک شخص تاڑ کے درخت پر چڑھ گیا۔ چڑھ تو گیا مگر اترنا جانتا نہ تھا۔ لگا چلانے کہ مجھے اتارو گاؤں والے سارے بیوقوف تھے۔ کسی کے سمجھ میں تدبیر نہ آئی تو بوجھ بجھکو (یعنی گاؤں کے عاقل کو) بلایا گیا۔ وہ کچھ دیر سوچنے کے بعد بولے کہ بس تدبیر سمجھ میں آ گئی۔ ایک لمبا سا رسا لاؤ اور اس کے پاس پھینکو کہ اس کو اپنی کمر سے مضبوط باندھ لے۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا اس کے بعد حکم دیا کہ زور سے جھٹکا دو۔ چنانچہ یہ بھی کیا گیا وہ نیچے تو آ گیا مگر روح اوپر کو اڑ گئی۔ گاؤں والے بوجھ بجھکو کے سر ہو گئے کہ یہ کیا ہوا تو آپ جواب دیتے ہیں کہ اس کی قسمت میں نے تو بہت آدمیوں کو اسی تدبیر سے کنویں سے نکالا ہے۔ بس یہی حالت آج کل کے واعظوں کی تعلیم کی ہے تحت کو فوق پر قیاس کرتے ہیں اور عوام کا ناس کرتے ہیں ان ہی لوگوں کی نسبت عارف فرماتے ہیں ؎

خستگاں را چو طلب باشد و قوت نبود گر تو بیداد کنی شرط مروت نبود

جب کمزوروں کو طلب کی خواہش ہو اور قوت نہ ہو۔ تو ان پر ظلم کرنا اچھا نہیں ہے۔

واقعی ایک کاروباری آدمی کو یہ مجاہدہ بتلانا کہ چالیس دن تک تجارت و زراعت و اہل و عیال سے الگ ہو کر ایک کونہ میں بیٹھ کر اللہ اللہ کرے۔ بیداد و ظلم ہے بلکہ ہر شخص کو اس کے مناسب حال طریق بتلانا چاہئے۔ مولانا فرماتے ہیں۔ ؎

چار پا را قدر طاقت بار نہ بر ضعیفاں قدر ہمت کار نہ

چوپایوں پر طاقت اور اندازہ سے بوجھ رکھنا چاہئے۔ کمزوروں سے ہمت کے موافق کام لینا چاہئے۔

نان و حلوا کے شعر میں تبدیلی:

اس طرح واعظوں نے یہ شعر پڑھ پڑھ کر ؎

بر زباں تسبیح و در دل گاؤ خر

عوام کو نماز وغیرہ سے متوحش کر دیا ہے۔ یہ شعر مثنوی کا نہیں بلکہ نان و حلوا کا ہے جس کا مصنف شیعی ہے مگر نقال صوفی ہے کیونکہ ہر فن میں نقال بھی ہوتے ہیں اس لئے میں نے اس شعر کو یوں بدلا ہے۔ ؎

بر زباں تسبیح و در دل گاؤ خر ایں چنیں تسبیح ہم دارد اثر

یعنی گو نماز میں گاؤ خر کے وسواس آتے ہوں مگر پھر بھی نماز تسبیح کا اثر ضرور ہوتا ہے بیکار نہیں

ہے ہاں ایک ذرا سی شرط ہے اور کیمیا تو ایک ہی چٹکی سے بنتی ہے وہ یہ کہ نماز و تسبیح کے وقت یہ ارادہ رکھو کہ اس نماز سے ہمارے وسواس و خطرات بھی دور ہو جاویں نماز کا شوق بھی پیدا ہو جائے۔ پھر اسی نماز سے ایک دن یہ حال ہوگا۔

یوسف گم گشتہ باز آید بکنعان غم مخور　　　کلبۂ احزاں شود روزے گلستاں غم مخور

کنعان سے گم ہوا یوسف واپس آجائیگا فکر نہ کر۔ یہ اجڑا ہوا مکان ایک دن باغ ہو جائے گا فکر نہ کر۔

مولانا فرماتے ہیں

اندریں رہ می تراش و مے خراش　　　تا دم آخر دمے فارغ مباش

اس راستہ میں خوب کوشش کر　　　آخر دم تک بے کار مت رہ

تا دم آخر دمے آخر بود　　　کہ عنایت باتو صاحب سر بود

جب تیرا وقت موت کا قریب آجائے۔ شاید اللہ تعالیٰ تجھ پر عنایت فرمائیں۔

سلوک جذب سے مقدس ہے:

صاحبو! اعمال احوال سے مقدم ہیں۔ حصول احوال کا طریق یہ ہے کہ اعمال میں لگ جاؤ بدوں اس کے احوال حاصل نہیں ہو سکتے۔ قاعدہ کی رو سے سلوک ہی جذب سے مقدم ہے اور وہب کا ذکر نہیں مگر لوگ جذب کو مقدم کرنا چاہتے ہیں اور یہ سخت غلطی ہے۔ نصوص سے قاعدہ یہی معلوم ہوتا ہے کہ سلوک جذب سے مقدم اور جذب سلوک پر مرتب ہوتا ہے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں اِنَّ رَحْمَتَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ مِّنَ الْمُحْسِنِيْنَ۔ رحمت جذب ہے اور احسان سلوک ہے۔ اور اللہ تعالیٰ فرمار ہے ہیں کہ رحمت الٰہیہ نیک کام کرنے والوں کے قریب ہے اور دوسری آیت میں یعنی اَللّٰهُ يَجْتَبِيْٓ اِلَيْهِ مَنْ يَّشَآءُ میں جو اجتبا ہو یعنی جذب کا مدار محض مشیت پر رکھا ہے وہ جذب موہوب ہے باقی کسب کے درجہ میں وہ ترتیب ہے۔ جس کو اسی آیت کے دوسرے جملہ میں فرمایا ہے يَهْدِيْٓ اِلَيْهِ مَنْ يُّنِيْبُ۔ بہر حال دلائل سے ثابت ہے کہ سلوک جذب سے مقدم اور سلوک ہی کی بدولت جذب کے درجہ قویہ کا تحمل ہو سکتا ہے۔ اور اگر جذب قوی سلوک سے مقدم ہو جائے تو اس کا تحمل بھی نہ ہو سکے۔ چنانچہ وحی بھی اسی جذب کی ایک قسم ہے۔ جس کی نسبت اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔ لَوْ اَنْزَلْنَا هٰذَا الْقُرْاٰنَ عَلٰى جَبَلٍ لَّرَاَيْتَهٗ خَاشِعًا مُّتَصَدِّعًا مِّنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ۔ یہ تو جبل کی نسبت فرمایا اور آپ کے قلب کی نسبت فرماتے ہیں فَاِنَّهٗ نَزَّلَهٗ عَلٰى قَلْبِكَ اس سے

معلوم ہوا کہ آپ کے قلب نے اس چیز کا تحمل کیا جبل سے نہیں ہو سکتا تھا پس یہ حضور ﷺ ہی کا دل تھا جس نے وحی الٰہی کے اس ثقل کا تحمل کیا ورنہ واقعات حدیثیہ سے معلوم ہوتا ہے کہ نزول وحی کے وقت اگر آپ اونٹنی پر سوار ہوتے تو اونٹنی آپ کو لے کر بیٹھ جاتی تھی اور نزول وحی کے وقت ایک صحابی کی ران پر آپ کا سر تھا تو انکی ران کے پھٹ جانے کا اندیشہ ہوا نیز سخت سردی کے موسم میں بھی نزول وحی کے وقت آپ کی پیشانی پسینہ پسینہ ہو جاتی تھی ان واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ وحی میں ثقل باطنی کے ساتھ ثقل ظاہری بھی تھی اور جذب قوی کے دوسرے افراد ہیں گو اس درجہ کا ثقل نہ ہو لیکن اس ثقل کا تحمل بھی قبل سلوک نہیں ہو سکتا اس لئے مقتضائے حکمت یہی ہے کہ سلوک جذب سے مقدم ہو تا کہ جذب کا تحمل ہو جائے۔

نَزَّلَهٗ عَلٰی قَلْبِکَ کی عجیب وغریب تفسیر:

اور نَزَّلَهٗ عَلٰی قَلْبِکَ کے متعلق ایک بات طلبہ کے کام کی یاد آئی گو مقام سے اجنبی ہے مگر استطراد اً اسی آیت کی ذکر کی مناسبت سے بیان کرتا ہوں وہ یہ کہ بعض اہل باطل کے نزدیک یہ الفاظ قرآنیہ منزل من اللہ نہیں ہیں اور ان کو نَزَّلَهٗ عَلٰی قَلْبِکَ سے دھوکہ ہوا کہ اس میں محل نزول قرآن قلب کو فرمایا ہے اور قلب معانی کا مورد ہوتا ہے اور الفاظ کا مورد سمع ہوتا ہے نہ کہ قلب سو واقع میں یہی غلط ہے کیونکہ الفاظ دل میں بھی ہوتے ہیں چنانچہ ہر حافظ قرآن سوچ لے کہ الحمد للہ وغیرہ کے الفاظ دل میں ہیں یا نہیں یقیناً ہیں اسی کو ایک شاعر کہتا ہے ۔

ان الکلام لفی الفواد وانما ۔۔۔ جعل اللسان علی الفؤاد دلیلا

تحقیق کلام منہ میں ہوتا ہے اور اسی وجہ سے زبان کو منہ اس لئے نشان بنایا ہے۔

البتہ اس پر یہ سوال ضرور ہو گا کہ گو قلب پر بھی الفاظ کا ورود ہوتا ہے مگر بواسطہ سمع کے ہوتا ہے تو یہاں سمع کا ذکر چھوڑ کر قلب کی قید کی کیا ضرورت تھی اس کا جواب ایک محقق نے خوب دیا ہے کہ مادری زبان اور غیر مادری زبان میں فرق ہوتا ہے غیر مادری زبان تو اول التفات الفاظ پر ہوتا ہے پھر معانی پر اور مادری زبان میں بالعکس ہے کہ التفات اول معانی پر ہوتا ہے پھر الفاظ کی خصوصیات پر گو خارج میں دونوں متقارن ہیں مگر التفات میں تقدم وتاخر ضرور ہے پس نَزَّلَهٗ عَلٰی قَلْبِکَ میں اس امر کو بتلایا گیا ہے کہ چونکہ قرآن آپ کی مادری زبان میں نازل ہوا ہے اس لئے اس کا نزول اول آپ کے قلب پر ہوتا ہے یعنی الفاظ پر التفات ہونے سے پہلے قلب کو معانی کا ادراک ہو جاتا ہے واقعی یہ بات بہت عجیب ہے۔

قرآن پاک کو سب سے زیادہ کون سمجھ سکتا ہے:

اور یہ بات اسی شخص کو معلوم ہو سکتی ہے جس کی عادات وطبائع پر نظر ہو۔ اسی لئے قرآن کو سب سے زیادہ وہ شخص سمجھتا ہے جو عادات وجذبات انسانیہ پر نظر رکھتا ہو نہ کہ دقائق منطقیہ پر کیونکہ قرآن میں جذبات وعادات کی رعایت بہت زیادہ ہے مصنفین کی طرح دقائق فلسفہ کی رعایت نہیں کی گئی یہ تو جملہ معترضہ تھا میں یہ کہہ رہا تھا کہ جذب کا تقدم مفید نہیں کیونکہ اس صورت میں اس کا تحمل اشد ہے اسی لئے ایسے لوگ جن پر سلوک سے پہلے جذب قوی طاری ہوتا ہے مجذوب ہو جاتے ہیں۔ جو نماز روزہ وغیرہ اعمال شرعیہ سے بھی محروم ہیں گو وہ مقبول ہیں مگر کامل نہیں بلکہ کامل کہو تو ممکن ہے۔ ان کی ایسی مثال ہے جیسے چھوٹا بچہ کہ محبوب تو ہے مگر کامل نہیں بلکہ ہگتا موتا پھرتا ہے۔ ننگا بھی رہتا ہے۔ اور بڑا بچہ محبوب بھی ہے اور کامل بھی ہے کہ تہذیب وادب کیساتھ آراستہ ہے پس مجذوب گو مقبول ہیں مگر کامل نہیں کیونکہ وہ اعمال سے محروم اور ترقی اعمال ہی سے ہوتی ہے ورنہ ارواح کو عالم ارواح سے عالم اجسام میں نہ بھیجا جاتا کیونکہ عالم ارواح میں ارواح حامل احوال تھیں مگر حامل اعمال نہ تھیں چنانچہ ارواح میں محبت اس درجہ تھی کہ اس کی محبت ہی کی وجہ سے حمل امانت پر آمادہ ہو گئیں اس کا منشا محبت ہی تھا ورنہ تمام عالم اس امانت کے تحمل سے عاجز تھا اور محبت کی منشا حمل ہونے کی طرف شیرازی نے بھی اشارہ فرمایا ہے۔

آسماں بار امانت نتوانست کشید	قرعۂ فال بنام من دیوانہ زدند
امانت کا بوجھ آسمان نہ اٹھا سکا	فال کا پھانسہ مجھ دیوانہ کے نام پر نکلا

باوجود یہ کہ حمل امانت کا اس کو امر بھی نہ ہوا تھا بلکہ محض استفسار ہی تھا جب محبوب کی طرف سے کلام ہوا تو عاشق کی کیا مجال تھی کہ امانت محبوب کے لئے تیار نہ ہو جاتا وہ تو ابتداء کلام ہی سے مست ہو گیا پھر یہ سوچ کر کہ امانت کے تحمل کے بعد مکالمت زیادہ ہوا کرے گی فوراً روح انسانی نے بار امانت کا تحمل کر لیا یہ تو محبت کی حالت تھی جو احوال میں سب سے اعلیٰ ہے۔ اب معرفت کی حالت دیکھئے کہ وہ مسئلہ توحید جس میں بڑے بڑے مدعیان عقل کو اختلاف ہو گیا اور ارواح انسانیہ نے عالم ارواح میں اس کو بدون فکر کے فوراً حل کر دیا کہ جب سوال ہوا الست بربکم تو معاً بلیٰ کہہ دیا۔ یہ معرفت اضطراری تھی غرض محبت ومعرفت دونوں ارواح کو حاصل تھیں۔ پھر کیا مصیبت تھی کہ ان کو عالم اجسام میں پھینک دیا گیا یہ وہ بات ہے کہ جس کو سوچ کر بعض مغلوبین تو

بے چین ہو جاتے ہیں کہ ہائے ہم یہاں کیوں بھیجے گئے عالم ارواح ہی میں محبت و معرفت میں مستغرق رہتے تو اچھا تھا۔ چنانچہ مولانا نیاز اسی بے چینی کی حالت میں فرماتے ہیں ۔

کیا ہی چین خواب عدم میں تھا نہ تھا زلف یار کا کچھ پتہ
سو جگا کے شور ظہور نے مجھے کس بلا میں پھنسا دیا

مراد وہ خیال جو ناسوت میں آ کر از خود رفتہ کر رہا ہے

ارواح کو عالم اجسام میں کیوں بھیجا گیا:

اہل ظاہر اس سوال کا جواب دیں کہ ارواح کو عالم اجسام میں بھیجا گیا۔ کیا چیز ان کو یہاں کھینچ کر لائی۔ حضرت وہ وہ چیز ہے جس کو اہل ظاہر نہیں سمجھ سکتے۔ سنئے یہاں ارواح کو بھیجنے سے مقصود قرب حاصل کرنا تھا۔ یعنی وہ قرب جو اعمال سے ہوتا ہے اور احوال سے نہیں ہوتا کیونکہ اعمال اختیاری ہیں اور احوال غیر اختیاری اور اس قرب کا مدار صرف اختیار پر ہے اور بہت سے اعمال وہاں یعنی عالم ارواح میں ممکن نہ تھے۔ کیونکہ بعض اعمال کا تعلق جسد سے ہے اور وہاں روح مجرد تھی مثلاً روزہ کیسے رکھا جاتا کیونکہ بھوک ہی نہ تھی۔ حج کیسے ہوتا وہاں خانہ کعبہ ہی نہ تھا۔ زکوۃ کیسے ادا ہوتی وہاں مال ہی نہ تھا۔ اور مصائب پر صبر کیسے ہوتا وہاں بیماری اور موت ہی نہ تھی۔ پس یہ قرب خاص اعمال پر موقوف تھا اس لئے حکمت حق مقتضی ہوئی کہ ارواح کو عالم اجسام میں بھیجا جائے تاکہ قرب خاص حاصل ہو۔ یہ ہے سلوک پھر اس کے بعد جذب حاصل ہوتا ہے مگر چونکہ اثناء سلوک میں استعداد کامل ہو جاتی ہے اس لئے اب اس کے جذب کا ایسا غلبہ نہیں ہوتا کہ حواس معطل ہو جائیں اور اعمال سے محروم ہو جائیں۔

کاملین پر بھی بعض دفعہ غلبہ احوال ہوتا ہے:

اسی تفاوت استعداد کے سبب مبتدیوں پر احوال کا غلبہ زیادہ ہوتا ہے اور متوسطین پر ان سے کم اور منتہی پر سب سے کم۔ اور منتہی پر گاہ گاہ غلبۂ احوال کا ہونا یہ ایک غیر مشہور مسئلہ ہے جو شاید اس سے پہلے نہ سنا ہو۔ سالکین کا عام طور پر خیال یہ ہے کہ کاملین پر غلبۂ احوال بالکل نہیں ہوتا مگر یہ صحیح نہیں کاملین پر بھی بعض دفعہ غلبہ ہوتا ہے جس کی دلیل نصوص میں بھی ہے۔ چنانچہ حضرت موسیٰ کے قول کو رَبِّ لَوْ شِئْتَ اَهْلَكْتَهُمْ مِّنْ قَبْلُ وَاِيَّايَ اَتُهْلِكُنَا بِمَا فَعَلَ السُّفَهَآءُ مِنَّا اِنْ هِيَ اِلَّا فِتْنَتُكَ تُضِلُّ بِهَا مَنْ تَشَآءُ وَتَهْدِيْ مَنْ تَشَآءُ ۔

بعض مفسرین نے ادلال پر محمول کیا ہے اور ادلال غلبہ حال میں ہوتا ہے۔ مگر میں نے اپنی تفسیر میں اس کو ادلال سے نکال دیا ہے اور صحو کی حالت کے مناسب تفسیر کی ہے۔ کیونکہ انبیاء میں صحو اصل ہے اور سکر نادر تو جب تک صحو پر محمول ہو سکے ادلال پر محمول کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ خیر یہ آیت تو محتمل ہے مگر حدیث اس میں صریح ہے یعنی جب غزوہ بدر میں مسلمانوں کی مختصر جماعت کفار کے بڑے لشکر کے مقابل ہوئی تو حضور علیہ السلام نے اہل اسلام کی نصرت و فتح کے لئے دعا فرمائی۔ اور دعا میں اس قدر الحاح فرمایا کہ یہ الفاظ آپ کی زبان سے صادر ہوئے اللهم ان تهلك هذه العصابة لم تعبد بعد اليوم ۔ اے اللہ اگر یہ مختصر جماعت ہلاک ہو گئی تو آج کے بعد کوئی آپ کی عبادت نہ کرے گا۔ آخر یہ کیا تھا یہ واقعی ادلال تھا یہاں اس کے سوا کوئی احتمال ہی نہیں۔ جس سے معلوم ہوا کہ حضرات انبیاءؑ پر بھی کبھی کبھی غلبہ حال ہوتا ہے۔ اور احادیث سے تو ملائکہ پر بھی غلبہ حال ہونا معلوم ہوتا ہے۔ چنانچہ ترمذی کی حدیث میں ہے کہ حضرت جبرائیلؑ نے رسول علیہ السلام سے فرمایا کہ میری وہ حالت دیکھنے کے قابل تھی کہ جب فرعون ڈوبنے لگا اور اس کی زبان سے نکلا اٰمَنْتُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا الَّذِیْٓ اٰمَنَتْ بِهٖ بَنُوْٓا اِسْرَآءِیْلَ ۔ میں اس کے منہ میں کیچڑ ٹھونستا تھا کہ کہیں اس پر رحمت نہ ہو جائے۔ حضرت محبت حق چین سے نہیں بیٹھنے دیتی نہ کسی کامل کو نہ فرشتہ کو۔ حضرت جبریلؑ کے اس فعل کو غلبۂ حال پر محمول نہ کیا جائے تو سخت اشکال واقع ہوتا ہے اگر ایمان مطلوب اعظم ہے اور حضرت جبریلؑ اسی کے واسطے وحی لاتے ہیں مگر حضرت جبریلؑ کو فرعون کے ایمان پر غصہ آ رہا ہے کہ یہ ایمان لا کر جہنم سے نہ بچ جائے۔ بس اس کی توجیہ یہی ہے کہ اس وقت حضرت جبریلؑ پر بغض فی اللہ کا اس قدر غلبہ تھا کہ مغلوب ہو گئے حالانکہ وہ یہ بھی جانتے تھے کہ اس تدبیر سے کچھ نفع نہیں ہو سکتا کیونکہ ایمان کا تعلق اصلی قلب سے ہے اور تکلم بالایمان یعنی اقرار باللسان قدرت کے وقت فرائض اور کیچڑ ٹھونسنے کے بعد اس کی قدرت سلب ہو گئی تو اب تکلم کا فرض اس کے ذمہ سے ساقط ہو گیا۔ نیز حضرت جبریلؑ جانتے تھے کہ اس وقت کا ایمان معتبر نہیں کیونکہ عالم آخرت کے بعد ایمان معتبر نہیں مگر پھر بھی حضرت جبریلؑ نے ایسا کام کیا جس کی کوئی غایت نہ تھی حالانکہ وہ بڑے درجہ کے فرشتہ ہیں جن کی تعریف میں عند ذی العرش مكين مطاع ثم امين ۔ وارد ہے۔ بس منشاء اس فعل کا وہی ہے کہ حضرت جبریلؑ پر بغض فی اللہ کا غلبہ تھا۔ بہر حال یہ مسئلہ نصوص سے ثابت ہے کہ کاملین پر بھی کبھی غلبہ ہوتا ہے ہاں اتنا فرق ہے کہ منتہی کو ایسے وقائع کم پیش آتے ہیں اور متوسط کو زیادہ جیسے مشاق سوار بھی گرتا ہے اور مگر کم اور سیکھنے والا زیادہ

گرتا ہے تو جذب کا طلین کو بھی نچاتا ہے جیسا کہا گیا ہے

نہ تنہا من دریں میخانہ مستم جنید و شبلی و عطار شد مست

نہ میں ہی تنہا (اکیلا) اس میخانہ میں مست ہوں۔ بلکہ جنید اور شبلی اور شیخ فریدالدین صاحب مست ہو چکے ہیں۔ اب اگر یہ جذب سلوک سے پہلے کسی کو حاصل ہو جائے تو سمجھ لیجئے کیا حال ہو گا۔ یقیناً اعمال سے معطل ہو جائے گا۔ اور بعض دفعہ ممکن ہے کہ ہلاک بھی ہو جائے۔

حضرت خواجہ باقی باللہ اور ایک بھٹیارہ کی حکایت:

چنانچہ حضرت خواجہ باقی باللہؒ کی توجہ سے ایک شخص مر گیا تھا۔ حضرت خاتم مثنوی نے یہ قصہ لکھا ہے کہ حضرت خواجہ صاحب متوکل تھے بعض دفعہ فاقہ بھی ہوتا۔ چنانچہ ایک دن حضرت کے یہاں فاقہ تھا اتفاق سے اسی دن مہمان آگئے۔ حضرت کو مہمانوں کی وجہ سے فکر ہوا۔ ایک بھٹیارہ حضرت کا معتقد تھا اس کو حضرت کی فکر کا احساس ہوا تو وہ فوراً کھانا سب مہمانوں کے لئے تیار کر کے لایا۔ حضرت کو اس سے بے حد خوشی ہوئی اور جوش مسرت میں فرمایا کہ مانگ کیا مانگتا ہے۔ بھٹیارہ نے کہا کہ حضرت وعدہ کر لیجئے کہ جو میں مانگوں گا آپ دیں گے فرمایا ہاں میرے پاس جو کچھ ہے اس میں سے مانگو گے دوں گا۔ کہا میں ایسی چیز مانگوں گا جو آپ کے پاس ہے۔ فرمایا ہاں مانگو۔ کہا مجھے اپنا جیسا کر لیجئے۔ حضرت نے فرمایا

آرزو می خواہ لیک اندازہ خواہ برنتابد کوہ را یک برگ کاہ

جو کچھ مانگو اندازہ سے مانگو گھاس کا ایک پتہ پہاڑ نہیں اکھاڑ سکتا

بہت سمجھایا کہ یہ بات تمہارے تحمل سے زیادہ ہے۔ اس ہوس سے باز آؤ مگر اس نے نہ مانا۔ جب اس کا اصرار بڑھتا ہی گیا تو اپنے حجرہ میں لے جا کر توجہ اتحادی ڈالی جس کا یہ اثر ہوا کہ توجہ کے بعد جو دونوں حجرہ کے باہر آئے تو صورت میں بھی اتحاد ہو گیا تھا۔ کسی کو یہ امتیاز نہ ہوتا تھا کہ خواجہ صاحب کون سے ہیں اور بھٹیارہ کونسا ہے صرف یہ فرق تھا کہ بھٹیارہ پر اضطراب غالب تھا اور حضرت پر سکون مگر نتیجہ یہ ہوا کہ تھوڑی دیر کے بعد بھٹیارہ مر گیا اس سے تحمل نہ ہو سکا کیونکہ سلوک سے جذب قوی وارد ہو گیا تھا۔ رہا یہ کہ پھر خواجہ صاحب نے اس کی درخواست کو کیوں منظور کیا اور ایسی توجہ کیوں دی جس سے ہلاکت واقع ہوئی۔ اس کا جواب یہ ہے کہ حضرت خواجہ صاحب کو یہ معلوم نہ تھا کہ مر ہی جائے گا۔ یہ خیال ہو گا کہ بہت مجذوب ہو جائے گا۔ لیکن اس درجہ ضعف کا علم نہ تھا کہ زندہ بھی نہ رہے گا کیونکہ دوسرے کا ضعف پوری طرح معلوم نہیں ہو سکتا۔

حضرات نقشبندیہ سلاطین اور حضرات چشتیہ مساکین ہیں:

نقشبندیہ کے یہاں توجہ اور تصرف بہت زیادہ ہے۔ یہ حضرات سلاطین ہیں یہ دوسروں پر بھی تصرف کرتے ہیں اور چشتیہ مساکین ہیں ان کا سارا تصرف اپنی ہی ذات پر ہوتا ہے ضرب بھی اپنی ہی ذات پر ہے اور سوزش وشورش بھی ان کا تو وہ حال ہے

افروختن وسوختن جامہ دریدن　　　پروانہ زمن شمع زمن گل زمن آموخت

روشن ہونا اور جلنا اور کپڑے پھاڑنا　　　پروانہ اور شمع اور گل نے مجھ سے سیکھا ہے

پس جذب اگر سلوک سے مقدم ہوتا ہے تو یا ہلاک ہوتی ہے یا اعمال سے تعطل ہوتا ہے اور دونوں حالتوں میں ترقی بند۔ کیونکہ ترقی اعمال سے ہوتی ہے اور اسی لئے مسلمان کے لئے طول حیات موت سے افضل ہے جبکہ وہ اپنی زندگی میں اعمال صالحہ کرے کیونکہ اعمال سے ترقی ہوتی ہے۔

اعمال صالحہ کے ساتھ مسلمان کیلئے طول حیات افضل ہے:

حدیث میں ہے کہ دو شخص ساتھ ساتھ مسلمان ہوئے تھے ان میں سے ایک تو شہید ہو گیا اور دوسرے رفیق کا ایک ہفتہ کے بعد بستر پر انتقال ہوا تو حضرات صحابہؓ نے دوسرے کو یہ دعا دی اللھم الحقہ بصاحبہ کہ اے اللہ اس کو اس کے ساتھی کے ساتھ ملا دیجئے یعنی اس کو بھی وہی درجہ عطا فرمایئے جو اس کے رفیق کو بوجہ شہادت ملا۔ حضور ﷺ نے فرمایا کہ تم نے یہ کیا کہا۔ سبحان اللہ حضرات صحابہؓ کی بھی کیا شان تھی کہ ان کو ہر وقت بارگاہ وحی سے فیضان علوم ہوتا تھا۔ اور الحمد للہ ہم بھی صاحب نصیب ہیں کہ ہم پر بھی ہر دم فیضان ہے۔ البتہ اتنا فرق ہے کہ وہاں فیضان بالمشافہ تھا۔ یہاں بواسطہ ہے اور یہ فرق ایسا ہے جیسے ایک شخص سے محبوب سامنے ہو کر باتیں کرے اور ایک سے پردہ میں ہو کر باتیں کرے تو رسول اللہ ﷺ سے ہم کو بھی فیضان ہو رہا ہے مگر بواسطہ کیونکہ حدیث میں رسول اللہ ﷺ متجلی ہیں جیسا قرآن میں اللہ تعالیٰ شانہ، جلوہ فرما ہیں اس پر مجھے مخفی کا شعر یاد آتا ہے

در سخن مخفی منم چوں بوئے گل در برگ گل　　　ہر کہ دیدن میل دارد در سخن بیند مرا

میں اپنے کلام میں اس طرح پوشیدہ ہوں جیسے پھول کی خوشبو پھول کی پتی میں جو مجھ سے ملاقات کا شوق رکھتا ہے میرا کلام دیکھے۔

جب ایک معمولی شاعر کا یہ دعویٰ ہے جو مجھے دیکھنا چاہے میرے کلام میں مجھے دیکھ لے

حالانکہ وہ کلام کی کوئی عظمت نہیں رکھتا تو اللہ تعالی اور رسول اللہ ﷺ کے کلام کی تو بڑی شان ہے وہ تو واقعی جلوہگاہ متکلم ہے۔ پس اب یوں کہیں گے

ہنوز آں ابر رحمت درفشاں ست	خم وخمخانہ بامہرونشاں ست
ابھی وہ رحمت کا ابر موتی برسا رہا ہے	اور شراب خانہ محبت سے لبریز ہے

اگر یہ دولت بھی نہ ہوتی تو عشاق کی زندگی کس طرح ہوتی ہم تو اس حدیث سے زندہ ہیں۔ **لایزال طائفة من امتی ظاهرین علی الحق لایضرهم من خذلهم**۔ جس میں رسول اللہ ﷺ نے ہم کو بشارت دی ہے کہ انشاء اللہ قرب قیامت تک قرآن وحدیث وعلوم حقہ محفوظ رہیں گے ورنہ آج کل تو جو حالت مسلمانوں کو پیش آرہی ہے کہ ہر طرف مسلمان نرغہ میں ہیں اور کفار دین حق کو مٹانا چاہتے اس کو دیکھ کر بعض دفعہ خطرہ ہوتا تھا کہ کہیں علوم اسلامیہ فنا نہ ہوجائیں مگر اس حدیث نے تسلی کردی۔ غرض حضور ﷺ نے صحابہ کی اس دعا کو سن کر **اللهم الحقه بصاحبه**۔ فرمایا کہ تم نے یہ کیا کہا کہ اس کو پہلے شخص سے ملادیا جائے جس سے اس شخص کا ادنی ہونا معلوم ہوتا ہے آخر اس نے جو اس کے بعد عمل کیے ہیں وہ کہاں گئے بخدا ان اعمال کی وجہ سے جو اس نے اپنے ساتھی کے بعد کیے ہیں دونوں کے درجہ میں اتنا تفاوت ہے جتنا آسمان وزمین میں تفاوت ہے کیونکہ اس نے اس کے بعد نمازیں پڑھی ہیں۔ روزے رکھے ہیں ذکر اللہ کیا ہے۔ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ مسلمان کے لیے طویل حیات افضل ہے جبکہ اعمال صالحہ کے ساتھ زندگی ہو۔

شہادت کی فضیلت علی الاطلاق نہیں ہے:

یہاں ایک شبہ ہوتا ہے میں اس کو بھی رفع کرنا چاہتا ہوں وہ یہ کہ دوسرے شخص نے گو پہلے کے بعد اعمال صالح بہت کچھ کیے تھے مگر پہلے کو تو شہادت حاصل ہوئی تھی دوسرے کو حاصل نہیں ہوئی اور شہادت کو دوسرے اعمال سے ایسی نسبت ہے کہ سونار کی ایک لوہار کی۔ اس کا جواب یہ ہے کہ شہادت کی فضیلت علی الاطلاق نہیں ہے ورنہ لازم آئے گا کہ شہید انبیاء سے بھی افضل ہو۔ دوسرے یہ کہ تمنائے شہادت بجائے شہادت ہے۔ حدیث میں ہے انما الاعمال بالنیات۔ **نية المومن خير من عمله** دوسری حدیث میں ہے **من طلب الشهادة صادقا من قلبه اعطيها ولولم تصبه** (رواہ مسلم)

اور اگر کسی کے قلب میں تمنائے شہادت بھی نہ ہو تو اس کا ایمان ناقص ہے حدیث میں ہے

من لم یغز ولم تحدث به نفسه لقی اللہ وفی دینه ثلمه ..... اور بحمد اللہ ہر مسلمان ان کے لئے آمادہ ہے کہ اگر دین کے واسطے جان دینے کی نوبت آئے تو جان دینے کو حاضر ہیں اور جب ہم جیسے مہمل بھی اس کے لئے آمادہ ہیں تو وہ صحابی اس کے طالب اور اس کے لئے آمادہ کیوں نہ ہوں گے اور اسی بنا پر ہم کہیں گے کہ حضور ﷺ کو ظاہری شہادت خفیہ حضرت حمزہؓ کی شہادت جلیہ سے افضل ہے گو حضور ﷺ کو ظاہری شہادت حاصل نہیں ہوئی مگر آپ کو اس کی تمنا تو بے حد تھی حدیث ہے وددت ان اقتل فی سبیل اللہ ثم احی ثم اقتل ثم احی ثم اقتل (الحدیث) اور بعض دفعہ ذکر خفی ذکر جلی سے افضل ہوتا ہے اس لئے حضور ﷺ کی شہادۃ خفیہ دوسروں کی شہادت جلیہ سے افضل ہے اور اگر اس قاعدہ شرعیہ کو تسلیم نہ کیا جائے تو سخت اشکال وارد ہو کہ معاذ اللہ حضور ﷺ کو بعض کمالات حاصل نہیں ہوئے اور یقیناً شہادت بھی کمالات میں سے ہے پس یہ اشکال اسی تقریر سے رفع ہو جائے گا جو میں نے نصوص حدیث سے بیان کی ہے۔

شہادت کی فضیلت کا سبب:

تیسرے یہ بھی تو دیکھو کہ شہادت کی فضیلت کس وجہ سے ہے۔ سو ظاہر ہے کہ شہادت کے دو جز ہیں ایک اقدام یعنی اعداء اللہ کی طرف پیش قدمی کرنا ان پر حملہ کرنا۔ دوسرے گردن کٹ جانا۔ اور قواعد سے یہ بات معلوم ہے کہ مبنیٰ فضیلت کا امور اختیاریہ ہیں تو اب خود سمجھ لو کہ ان دونوں میں امر اختیاری کونسا ظاہر ہے کہ اقدام ہی اختیاری ہے گردن کٹ جانا اختیاری نہیں یہ تو دوسرے فعل پر موقوف ہے۔ جب یہ بات سمجھ میں آ گئی تو اب سمجھو کہ رسول اللہ ﷺ اقدام میں سب سے بڑھے ہوئے تھے۔ حضرات صحابہ خود فرماتے ہیں کہ ہم میں بڑا بہادر وہ شمار ہوتا تھا جو معرکہ جنگ میں رسول اللہ ﷺ کے پاس رہتا ہے کیونکہ حضور ﷺ سب سے آگے دشمن کی صف میں گھسے رہتے تھے تو شہادت کا جو مبنیٰ اختیاری ہے حضور ﷺ اس میں سب سے افضل تھے لہذا آپ کی شہادت بھی سب سے افضل ہے چوتھے یہ کہ اللہ تعالیٰ کے یہاں بعض اعمال کا اجر بے حساب ہے چنانچہ ذکر اللہ کے فضائل جو احادیث میں مذکور ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے ذکر اللہ شہادت سے بھی افضل ہے جس کی وجہ میری سمجھ میں آتی ہے کہ شہادت میں تو جو کچھ ہوتا ہے ایک دفعہ ہو جاتا ہے۔ تلوار کے ایک ہاتھ میں فیصلہ ہو جاتا ہے اور ذکر اللہ میں ہر دم دل پر آرہ چلتا ہے۔ ذاکرین کی حالت دیکھ لی جائے کہ ان پر کیسی کیسی حالتیں گزرتی ہیں۔

بر دل سالک ہزاراں غم بود　　　　گرز باغ دل خلالے کم بود

اللہ والے کے دل پر ہزاروں غم ہوتے ہیں۔ اگر چہ دل کے باغ میں گنجائش کم ہوتی ہے

اور اس حالت کو دیکھتے ہوئے یہ کہنا زیبا ہے کہ۔

کشتگان خنجر تسلیم را　　　　ہر زماں از غیب جانے دیگر ست

خنجر تسلیم سے مرنے والوں کیلئے ہر وقت اللہ کی طرف سے دوسری جان موجود ہے

کہ ان کیلئے تو بار بار موت وحیات کا تکرار ہوتا رہتا ہے۔ (خصوصا ذکر نفی اثبات میں تو

ذاکر کامل کو بار بار موت وحیات کا تکرار ہونا بہت ظاہر ہے کما لا یخفی علی من له ذوق

بالذاکر مع المعرفة رزقناه الله تعالیٰ دائماً ابدا) پس یہ مسلم نہیں کہ شہادت کی فضیلت

علی الاطلاق ہے بلکہ بعض اعمال شہادت سے بھی افضل ہیں اور اب وہ اشکال مرتفع ہو گیا جو اس

حدیث پر وارد ہوا تھا۔

شہادت سے بغیر مشقت کے درجات مل جاتے ہیں:

ہاں یہ ضرور ہے کہ شہادت سے درجات بے مشقت مل جاتے ہیں۔ دوسرے طرق میں جو

شہادت سے افضل ہیں مشقت ضرور ہے شہادت سے بے مشقت درجات ملنے پر مجھے ایک

حکایت یاد آئی لکھنؤ میں ایک خان صاحب تھے جو نہ نماز پڑھتے نہ روزہ رکھتے تھے جب کوئی ان

کو اصلاح اعمال کے لئے کہتا اور اس کا ثمرہ حصول جنت اور نجات دوزخ بتلاتا تو کہتے میاں

جہاں تلوار کے دو ہاتھ ادھر دو ہاتھ ادھر مارے تو سب کائی سے پھٹتی چلی جائے گی۔ اور جنت میں جا

پہنچیں گے۔ وہاں پہنچنا مشکل ہے لوگ ان کی باتوں پر ہنستے تھے پھر جس وقت مولانا امیر علی

صاحب کے پاس آئے اور پوچھا کہ مولانا کیا مجھ جیسا فاسق بھی خدا کے یہاں مقبول ہو سکتا ہے

اور کیا شہادت سے میری بھی مغفرت ہو جائے گی فرمایا مقبولیت سے کیا چیز مانع ہے یقیناً شہادت

سے جنت ملے گی۔ یہ سنتے ہی خان صاحب نے تلوار ہاتھ میں لی اور دو ہاتھ ادھر مارے اور دو ہاتھ

ادھر بہت سے کافروں کو مار کر خود بھی شہید ہو گئے سو واقعی تلوار کے دو ہاتھ میں کائی سی پھٹ گئی اور

خان صاحب نے ذرا سی دیر میں جنت لے لی بس یہ ضرور ہے کہ شہادت سے بے مشقت ذرا سی

دیر میں درجات مل جاتے ہیں یہ بات دوسرے اعمال میں نہیں لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتی کہ

دوسرا کوئی عمل شہادت کے برابر نہ ہو۔ یہ گفتگو اس پر چلی تھی کہ میں نے کہا تھا کہ مسلمان کے لئے

طول حیات مع الاعمال افضل ہے اور احوال سے اعمال افضل ہیں اور جذب کے تقدیم میں یا جان کا خطرہ ہے یا اعمال سے تعطل کا اندیشہ پس تم اعمال کی اتنی بے وقعتی نہ کرو کہ اگر احوال نہ ہوں تو اعمال ہی سے ہاتھ دھولو۔

نماز حظ نفس کے لئے نہ پڑھو:

اگر کسی کا ذکر اللہ یا نماز میں دل نہ لگے تو اس کو چاہئے کہ ذکر و نماز کو ترک نہ کرے بلکہ ہمت کر کے کام میں لگا رہے کیونکہ

گر مرادت را مذاق شکرست　　　بے مرادی نے مرادِ دلبر است

اگر تیری مراد کا مذاق اچھا ہے۔ نامرادی سے امید مت رکھ مراد حاصل ہونے والی ہے

اگر تم اعمال کے بعد اس پر بھی راضی نہ ہو اور تم کو اتنی بات بھی حاصل نہ ہو تو معلوم ہوتا ہے کہ تم نے نماز وغیرہ اللہ کے واسطے نہیں پڑھی بلکہ حظ نفس کی نیت سے پڑھی ہے جیسے ایک گاؤں والے کی حکایت ہے کہ اس کو واعظ مولوی صاحب نے نماز کی نصیحت کی ان نے کہا کیا ملے گا مولوی صاحب نے کہا کہ اگر تو چالیس دن اس طرح نماز پڑھ لے کہ تکبیر تحریمہ فوت نہ ہو تو میں تجھے ایک بھینس دوں گا اور خیال تھا کہ اس طرح پڑھنے سے خود نماز ہی سے محبت ہو جاوے گی۔ پھر بھینس بھی نہ مانگے گا۔ اس نے کہا بہت اچھا۔ چالیس دن پورے کر کے وہ مولوی صاحب کے پاس آیا کہ وعدہ پورا کرو مولوی صاحب نے کہا کیسا وعدہ میں نے تو اس لئے بات کہہ دی تھی کہ چالیس دن نماز پڑھنے سے تجھے عادت ہو جائے گی اس نے کہا اچھا یہ بات تھی تو جاؤ پھر یاروں نے بھی بے وضو ہی ٹرخائی ہے۔ اس ظالم کو جو چالیس دن بعد بھی نماز کا شوق نہ ہوا تو وجہ اس کی یہ تھی کہ اس نے اللہ کے واسطے نماز ہی نہ پڑھی تھی۔ اسی طرح جو لوگ طالب احوال ہیں ان کو بھی اعمال کا شوق نہیں ہوتا کیونکہ وہ رضائے حق کے طالب نہیں بلکہ اپنی مراد کے طالب ہیں اور یہ حالت صدق قلب کے خلاف ہے۔ صدق طلب کی شان یہ ہے کہ اگر ساری عمر بھی شوق و کیفیت پیدا نہ ہو تو اسی پر راضی رہے اور یوں کہے

ارید وصاله ویرید هجری　　　فاترک ما ارید لما یرید.

میں ارادہ کرتا ہوں اس کے وصال کا اور وہ ارادہ کرتا ہے مجھ سے فراق کا پس میں چھوڑتا ہوں اپنے ارادہ کو اس کے ارادہ کے لئے۔

عارف شیرازی فرماتے ہیں ؎

میل من سوئے وصال و میل او سوئے فراق ترک کام خود گرفتم تا بر آید کام دوست

عارف نے یہ بھی بتلا دیا ہے کہ عاشق کے نزدیک یہ عدم وصال بھی وصال ہی کے برابر ہے۔

فراق و وصل چہ باشد رضائے دوست طلب کہ حیف باشد ازو غیر او تمنائے

فراق و وصل کے جھگڑے بے کار ہیں دوست کی رضامندی طلب کر۔اس سے غافل رہ کر تمنا کرنا بیکار ہے۔

اور فراق و وصال کی تساوی کا جو حکم کیا ہے یہ وصال و فراق مزعوم ہے۔یعنی فراق سے مراد قبض ہے جس میں احوال و کیفیات نہیں ہوتے اور وصال سے مراد بسط جس میں احوال و کیفیات کا ورود ہوتا ہے تو کہتے ہیں تم قبض و بسط کی فکر میں کیوں پڑے ہو بس رضائے دوست کو طلب کرو خواہ یہ رضا مضاف الی الفاعل ہو خواہ مضاف الی المفعول یعنی وہ رضا خواہ ادھر سے ہو خواہ ادھر سے۔

محققین رضا کے طالب ہیں:

اگر تم کو رضائے حق کا یقین نہیں ہو سکتا تو اپنی رضا کا تو علم ہو سکتا ہے۔پس تم ہر حال میں ان سے راضی رہو یہ بھی کافی ہے کیونکہ ؎

بخت اگر مدد کند دامنش آورم بکف گر بکشد زہے طرب ور بکشم زہے شرف

اگر قسمت نے یاوری کی اس کا دامن پکڑ لوں گا۔اگر میں نے اپنی طرف کھینچ لیا تو اچھا ہے اور اگر اس نے کھینچ لیا بہت اچھا ہے۔

رضا ہونی چاہئے خواہ کسی طرف سے ہو۔حضرت صدیقؓ کے بارے میں آیت نازل ہوئی ہے وَلَسَوْفَ يَرْضٰى . علماء نے اس کے مرجع ضمیر میں گفتگو کی ہے کہ حضرت صدیق ہیں یا حق تعالیٰ مگر محققین نے کہا ہے دونوں صورتیں برابر ہیں۔ خدا تعالیٰ راضی ہوں جب بھی مراد حاصل ہے اور صدیق راضی ہوں جب بھی کیونکہ دونوں رضاؤں میں تلازم ہے۔غرض محققین تو رضا کے طالب ہیں خواہ قبض ہو خواہ بسط وہ قبض کی حالت میں یوں کہتے ہیں ؎

چونکہ قبض آید تو در وے بسط بیں تازہ باش و چیں میفگن بر جبیں

جن کی تنگی معلوم ہو کشادگی کا خیال کر خوش رہ پیشانی پر بل مت لا

چونکہ قبضے آیدت اے راہرو آں صلاح تست آلیس دل مشو

جب قبض تجھے پیش آوے اے سالک تیرے بہتر ہے رنجیدہ مت ہو

البتہ چونکہ قبض میں احتمال مسبب عن المعصیہ کا بھی ہوتا ہے اس لئے وہ احتیاطاً قبض میں استغفار بھی کرتے ہیں اسی کو مولانا فرماتے ہیں۔ ؎

غم چو بینی زود استغفار کن　　　غم بحکم خالق آمد کار کن

جب تجھ پر کوئی تکلیف آئے جلد توبہ (استغفار) کر کیونکہ اللہ ہی کے حکم سے تکلیف آتی ہے۔ پس قبض کی حالت میں بھی مقصود سے مایوس نہ ہو بلکہ قبض اس اعتبار سے بڑی نعمت ہے کہ قبض کے بعد جو بسط ہوتا ہے وہ بڑا ہی قوی ہوتا ہے جیسے وہ پیاس بڑی نعمت ہے جس کے بعد برف ٹھنڈا پانی ملنے کی امید ہو کیونکہ لطف برف پیاس ہی کے بعد ہے اسی طرح بسط کا لطف قبض کے بعد ہے۔ عارف اسی کو فرماتے ہیں۔ ؎

از دست ہجر یار شکایت نمی کنم　　　گر نیست غیبتے ند ہد لذتے حضور

یار کی جدائی سے شکایت نہیں کرتا ہوں میں۔ جب جدائی نہ ہو حضوری میں مزا نہیں آتا یہ لفظ ہجر بفتح الہا ہے ایک دفعہ سعادت علی خان کی مجلس میں رزیڈنٹ کے جو فارسی دانی کا مدعی تھا اس لفظ کی تحقیق میں کہا کہ یہ لفظ ہجر بکسرا الہا ہے انشاء اللہ خان نے کہا بے شک بجا ہے چنانچہ شاعر اس کی شہادت بھی دیتا ہے ؎

شب قدر ست طے شدہ نامہ ہجر　　　سلام فیہ حتی مطلع الفجر

شب قدر سے ختم ہو گیا جدائی کا خط۔ سلامتی ہے اس میں سورج نکلنے تک

آپ نے فجر کو بکسر الفاء پڑھا رزیڈنٹ شرمندہ ہو کر چپ ہو گیا۔ اسی طرح ایک دفعہ اسی رزیڈنٹ نے کہا کہ سعدی کا یہ مصرع ؎

شاید کہ پلنگ خفتہ باشد (شاید درندہ سوتا ہووے)

غلط مشہور ہو گیا ہے۔ یخ نخفتہ ہے۔ انشاء اللہ خان نے کہا بے شک حضور یخ ہے کیونکہ دوسرا مصرعہ بھی اس کا موید ہے۔ ؎

تا مرد سخن نگفتہ باشد　　　عیب و ہنرش نہفتہ باشد

جب تک انسان بات نہ کرے اس کی بھلائی برائی معلوم نہیں ہو سکتی۔

یہاں بھی رزیڈنٹ بہت شرمندہ ہوا۔ انشاء اللہ خان بڑا مسخرہ تھا اور وقت پر اس کو بڑی دور کی سوجھتی تھی ایک دفعہ یہ سعادت علی خان کے ساتھ ننگے سر کھانا کھا رہا تھا سعادت علی خان نے چپکے سے ایک چپت اس کے رسید کیا تو آپ نیچے گردن کئے ہوئے کہتے ہیں کہ اللہ تعالی والد

صاحب قبلہ کو غریق رحمت کرے یہ کہہ کر پھر کھانے میں مشغول ہو گیا۔ سعادت علی خان نے پوچھا کہ والد صاحب کی کیا بات یاد آ گئی کہا کچھ نہیں اس نے اصرار شروع کیا تو کہا والد صاحب قبلہ نصیحت فرمایا کرتے تھے کہ ننگے سر کھانا کھانے سے شیطان چپت مارا کرتا ہے آج مجھے ان کی بات یاد آ گئی کہ واقعی وہ صحیح فرماتے تھے۔ اس جواب سے سعادت علی خان پر پانی پڑ گیا مگر پہلے زمانہ کے روساء علم اور اہل علم کے قدردان تھے۔ اس لئے ان سب باتوں کو گوارا کرتے تھے آج کل کے رؤسا کی طرح بددماغ نہ تھے۔ خیر یہ تو درمیان میں ایک لفظی تحقیق پر چند لطیفے یاد آ گئے۔

قبض باعتبار آثار کے بسط سے زیادہ نافع ہے:

اب ایک بات یہ بھی سمجھو کہ قبض باعتبار آثار کے بسط سے زیادہ نافع ہے کیونکہ بسط میں عجب کا خطرہ ہے اس میں اپنے کمالات پر نظر ہوتی ہے اور قبض میں اپنے اوپر نظر نہیں ہوتی بلکہ عجز و نیازمندی کا غلبہ ہوتا ہے اس وقت انسان اپنے کو کتے اور فرعون سے بدتر سمجھتا ہے اور یہ بات اس شخص کے سمجھ میں نہیں آ سکتی جس پر یہ حال نہ گزرا ہو کیونکہ یہ ذوقی امر ہے جس پر گذرتی ہے وہی اس کو جانتا ہے اور یہ نہیں کہ اس وقت یہ شخص اپنے کو مومن نہیں سمجھتا۔ بلکہ اپنے کو مومن اور فرعون کو کافر سمجھ کر پھر بھی اپنے کو اس سے بدتر سمجھتا ہے۔ میں الفاظ سے اس حالت کی حقیقت کو نہیں بتلا سکتا تم اتنا سمجھ لو کہ اس کو اپنے مآل پر نظر ہوتی ہے کہ نہ معلوم مآل کیسا ہو۔ اور اس طریق میں عجز و نیاز ہی سے کام چلتا ہے۔ عجب و پندار سے کامیابی نہیں ہو سکتی۔ مولانا فرماتے ہیں۔ ؎

فہم و خاطر تیز کردن نیست راہ جز شکستہ می نگیرد فضل شاہ

عقل و سمجھ تیز کرنے کا خیال نہیں ہو سکتی۔ جب تک اللہ کا فضل شامل حال نہ ہو اور فرماتے ہیں۔ ؎

ہر کجا پستی ست آب آنجا رود ہر کجا مشکل جواب آنجا رود

ہر کجا دردے دوا آنجا رود ہر کجا رنجے شفا آنجا رود

جس جگہ درد ہوتا ہے دوا اسی جگہ کام آتی ہے۔ جس جگہ بیماری ہوتی شفا اسی جگہ پر جاتی ہے۔

سالہا تو سنگ بودی دلخراش آزموں رایک زمانے خاک باش

برسوں سے تو سخت پتھر کی طرح ہے امتحاناً تھوڑی دیر کے واسطے خاک ہو جا

در بہاراں کے شود سرسبز سنگ خاک شوتا گل بروید رنگ رنگ

موسم بہار میں پتھر سبز کب ہوتا ہے خاک ہو جا تا کہ رنگ برنگ کے پھول اگیں

ناز را روئی بباید ہمچوں ورد — چوں ندا ری گرد بدخوئی مگرد

ناز کے لئے گلاب کا سا منہ چاہئے — جب تجھ میں عاجزی نہیں ہے تکبر مت کر

ہمچو یوسف نازش وخوبی مکن — جز نیاز وآہ یعقوبی مکن!

حضرت یوسف علیہ کی طرح ناز انداز مت کر۔ یعقوبؑ کی طرح عاجزی اور آہ کر۔

اب یہاں سے معلوم ہوتا ہے کہ چشتیہ کا مذاق کیسا اچھا ہے گو تمام صوفیہ کا یہی مذاق ہے مگر چشتیہ پر سب سے زیادہ اس کا غلبہ ہے کہ

افروختن وسوختن وجامہ دریدن — پروانہ زمن شمع زمن گل زمن آموخت

روشن ہونا اور جلنا کپڑے پھاڑنا — پروانہ اور گل شمع نے مجھ سے سیکھا ہے۔

ساری عمر کے مجاہدات وریاضات کا حاصل:

میں نے مولانا گنگوہیؒ سے سنا ہے کہ جس شخص کو ساری عمر کے مجاہدات وریاضات کے بعد میں یہ بات سمجھ میں آ گئی ہے کہ مجھے کچھ حاصل نہیں ہوا اس کو سب کچھ حاصل ہو گیا کیونکہ اس طریق کا حاصل یہی ہے بے حاصلی۔ اور جو یہ سمجھتا ہے کہ مجھے کچھ کمال حاصل ہو گیا وہ اس شعر کا مصداق ہے۔

خواجہ پندارد کہ دارد حاصلے — حاصل خواجہ بجز پندار نیست

اب قبض تو ایسا مفید مگر لوگ پھر بھی بسط ہی کے طالب ہیں اور تاویل یہ کرتے ہیں کہ بسط میں سہولت زیادہ ہے۔ میں کہتا ہوں مگر سہولت ہی چہ ضرور جیسے کسی نے شعر میں بے موقع ایک لفظ کو مشدد کیا تھا جب اعتراض ہوا تو کہا ضرورت شعری سے ایسا کیا گیا۔ استاد نے کہا شعر گفتن چہ ضرور۔ اور یہ ظاہر ہے کہ قبض میں قدرت عمل تو سلب نہیں ہوتی پس ہمت سے کام لو اور بدوں سہولت ہی کے عمل کرتے رہو سہولت کے طالب نہ ہو۔ ورنہ ایسی مثال ہو گئی جیسے ایک فقیر سلطنت کا طالب ہو اور یہ تاویل کرے کہ بادشاہ ہو جاؤں گا تو سہولت سے روٹی ملے گی تو کیا آپ اس طلب کو صحیح مانیں گے۔ ہرگز نہیں اور اگر یہ کہو کہ یہ طلب اس لئے صحیح نہیں کہ ایسا ہو نہیں سکتا کہ فقیر بادشاہ ہو جائے اور یہ تو سکتا ہے کہ عمل سہل ہو جائے۔ جواب یہ ہے کہ یہ کہنا کہ ایسا ہو نہیں سکتا غلط ہے کیونکہ ممکن ہے کہ کوئی پاگل بادشاہ مر جائے اور یہ وصیت کر جائے کہ شہر پناہ سے جو شخص سب سے پہلے داخل ہو اس کو بادشاہ بنا دیا جائے اور ایک فقیر کو اس طرح بادشاہت مل بھی چکی ہے پھر تخت پر بیٹھنے سے پہلے تو وہ فقیر تھا اور تخت پر بیٹھتے ہی شاہی دماغ عطا ہو گیا۔ چنانچہ دربار سے اٹھتے

وقت اس نے وزیر کو اشارہ کیا کہ بغل میں ہاتھ دیکر اٹھائے کیونکہ سلاطین کا یہی قاعدہ تھا وزیر کو بڑی حیرت ہوئی کہ اس بھک منگے کو ایک دن میں یہ قواعد کیوں کر معلوم ہو گئے آخر پوچھا اس نے جواب دیا کہ جس خدا نے بے مشقت مجھے بادشاہت دی ہے اسی نے دفعۃً دماغ شاہی بھی عطا کر دیا ہے سچ ہے جب خدا حسن دیتا ہے نزاکت آ ہی جاتی ہے۔ اس لئے یہ طلب سلطنت محال، کی طلب نہیں بلکہ احتمال کی طلب ہے گو اس احتمال کا پورا ہونا ایسا ہی ہے جیسے شیخ چلی کے احتمال کا پورا ہونا جیسے آج کل سوراج کی بہت شورش ہے۔ ہندوستانی بادشاہت کے طالب شاید تم کو ہی مل جائے احتمال تو ضرور ہے مگر بس احتمال ہی سے خوش ہولو ورنہ یہ احتمال ایسا ہے جیسے ایک مولوی صاحب نے سیاہ کتے کو جھک کر سلام کیا تھا۔ کسی نے وجہ پوچھی تو کہا شاید جن ہو اور جنوں میں بھی بادشاہ ہو اور میرے سلام کی وجہ سے خوش ہو کر کچھ دیدے۔ بس ایسی ہی حالت آپ کی طلب کی ہے۔

سہولت کا منتظر رہنا غلطی ہے:

یہ مسلم ہے کہ بسط میں سہولت ہوتی ہے مگر سہولت کا منتظر رہنا ہی غلطی ہے اس کے متعلق میرا ایک واعظ التحصیل والتسہیل ہے اس میں ایک جزو کی بہت تفصیل ہے خدا کرے جلد طبع ہو جائے تو اس کا مطالعہ مل جائے تو شکر کرو جیسے کسی کو عالی شان مکان ٹھنڈا مل جائے تو نعمت ہے یا برف کا ٹھنڈا پانی مل جائے تو نعمت ہے اور اگر نہ ملے تو کنوئیں ہی کے پانی سے راضی رہو۔ یہ کیا ضرور ہے کہ اسٹیشن پر جا کر لاؤ چاہے گھل کر سیر بھر کا آدھ پاؤ ہی رہ جائے۔ اور جانے کی مشقت گرمی کی مصیبت جدا رہی۔ پس سلامتی اس میں ہے کہ تم عمل کرتے رہو اگر حال مرتب ہو جائے تو شکر کرو اور نہ مرتب ہو تو مناسب تو یہی ہے کہ اس حال میں بھی شکر کرو ورنہ صبر کرو۔

سالک کو نہ ملنے پر بھی شکر کرنا چاہیے:

ایک عارف نے ایک سالک سے پوچھا تھا کہ کس حال میں ہو کہا مقام توکل میں ہوں اگر ملتا ہے شکر کرتا ہوں نہیں ملتا تو صبر کرتا ہوں عارف نے کہا کہ اتنا تو بغداد کے کتے بھی کرتے ہیں۔ سالک کو تو یہ چاہیے کہ نہ ملنے پر بھی شکر کرے کہ یہ بھی نعمت ہے اس میں بھی حکمت عظیمہ ہو گی اسی کو عارف فرماتے ہیں۔

تو بندگی چو گدایان بشرط مزد مکن　　　که خواجه خود روش بنده پروری داند

فقیروں کی طرح عبادت مزدوری پر مت کر۔ مالک تو خود ہی بندہ پروری کا طریقہ جانتا

ہے۔ کیونکہ کیا معلوم تم کو زیادہ روئی ملتی تو کیا حال ہوتا اس لئے نہ ملنے پر بھی شکر چاہئے۔ حضرت حاجی صاحب سے جب کوئی شخص ذکر میں حال وغیرہ نہ حاصل ہونے کی شکایت کرتا اور یہ کہتا کہ کچھ نفع نہیں معلوم ہوتا تو فرماتے کہ یہ کیا تھوڑا نفع ہے کہ تم خدا کا نام لے رہے ہو پھر یہ شعر پڑھتے۔

یابم اور ایا نیابم جستجوئے می کنم — حاصل آید یا نیاید آرزوئے می کنم

وہ ملے یا نہ ملے ہمیں تلاش کرنا چاہئے — نتیجہ نکلے یا نہ نکلے آرزو رکھنا چاہئے

واقعی ذکر اللہ کی توفیق ہو جانا ہی بڑی نعمت ہے اس کے بعد اور کیا چاہتے ہو۔

شیطان سالک کے ہمیشہ درپے رہتا ہے:

مولانا رومی نے ایک حکایت لکھی ہے کہ ایک صوفی کو شیطان نے دھوکا دیا تم کو ذکر اللہ کرتے ہوئے بہت سال ہو گئے مگر اللہ کی طرف سے نہ کچھ پیام نہ جواب۔ جب وہاں شنوائی نہیں ہوتی تو خواہ مخواہ سر مارنے سے کیا فائدہ۔ سالک اس دھوکہ سے متاثر ہو گیا۔ آہ اس طریق میں بہت دھوکے ہیں کیونکہ شیطان سالک طریق کا درپے ہو جاتا ہے وہ اس کو طرح طرح سے بہکاتا ہے۔ اس لئے بہت احتیاط و اہتمام کے ساتھ چلنا چاہئے۔

درره عشق وسوسۂ اہرمن بسے است — ہشیار و گوش را بہ پیام سروش دار

عشق کے راستہ میں اہرمن کا خیال ہی کافی ہے۔ ہوش رکھ اور کان کو اس کے احکام کی طرف لگا۔ پیام سروش سے مراد وحی ہے کہ شریعت کو پیش نظر رکھو اور شیطان کے ہر دھوکہ کا جواب شارع علیہ السلام کے ارشادات سے حاصل کرو۔ اور شریعت کے خلاف ہرگز کسی بات کو دل میں جمنے نہ دو۔ مگر بعض سالک محبوب مراد ہوتے ہیں۔ ان کی دستگیری ایسے وقت میں غیب سے ہوتی ہے ان کو احتیاط و اہتمام کی بھی ضرورت نہیں ہوتی چنانچہ یہ سالک مرد تھا اس کو شیطان نے دھوکہ دیا اور دھوکہ میں آ گیا کہ رات کو سب معمولات ترک کر کے سو رہا۔ مگر غیب سے اس کی دستگیری ہوئی رات کو خواب میں کوئی لطیفہ غیبی آیا اور اس نے حق تعالیٰ کی طرف سے دریافت کیا کہ کیوں میاں صاحب آج تم کو ہم بھول ہی گئے کیا بات ہے۔ کیوں خفا ہو گئے کہا میں نے برسوں سے حق تعالیٰ کو یاد کیا جب اس طرف سے کوئی پیام و جواب تک نہ آیا تو میں نے سوچا وہ تو پوچھتے بھی نہیں پھر میں ہی کیوں سر ماروں لطیفۂ غیبی نے اللہ کی طرف سے اس کو جواب دیا

گفت آں اللہ تو لبیک ماست — ویں نیاز و سوز و دردت پیک ماست

اللہ تعالیٰ نے فرمایا تیرا اللہ اللہ کرنا ہماری حاضری ہے۔ اور یہ عاجزی اور سوز اور درد تیرے واسطے ہمارا پیغام ہے۔

کہ تمہارا یہ اللہ اللہ کرنا ہی تو ہمارا جواب ہے۔ یہی علامت قبول ہے اگر تم مردود ہوتے تو ہم زبان کو اپنے ذکر سے روک دیتے۔ جیسا کہ بہت سی مخلوق کو اپنے ذکر سے محروم کر رکھا ہے۔

اعمال صالحہ کے قبولیت کی علامت:

ہمارے حاجی صاحبؒ اسی بنا پر فرمایا کرتے تھے کہ جب صبح کی نماز پڑھ کر ظہر کی توفیق ہو جائے تو یہ نماز صبح کی قبول کی علامت ہے اگر ان کو تمہارا دربار میں آنا ناگوار ہوتا تو دوسرے وقت گھسنے نہ دیتے۔ جیسے ایک قصائی کا بچھڑا مسجد میں گھس گیا تھا وہ اس کو پکڑنے آیا موذن نے دھمکایا کہ لوگ مسجدوں میں جانور گھسا دیتے ہیں تو قصائی نے جواب دیا کہ کیوں بڑبڑ کرتا ہے جانور تھا گھس گیا کبھی ہم کو بھی مسجد میں دیکھا ہے۔ حضرت یہی حال آپ کا ہوتا کہ مسجد میں گھسنے کی بھی توفیق نہ ہوتی۔ مولانا نے ایک آقا اور غلام کی حکایت لکھی ہے کہ دونوں بازار میں کسی کام کو گئے کہ راستہ میں اذان ہوگئی تو غلام نے آقا سے نماز کے لئے اجازت مانگی وہ نمازی تھا اور آقا بے نمازی تھا۔ اس نے اجازت دے دی غلام تو مسجد میں جا کر وضو نماز میں لگ گیا اور آقا مسجد کے باہر بیٹھ گیا غلام نماز سے فارغ ہو کر وظیفہ میں لگ گیا جب بہت دیر ہوگئی اور سب نمازی چلے گئے تو آقا نے پکارا کہ میاں کہاں رہ گئے آتے کیوں نہیں۔ کہا آنے نہیں دیتا پوچھا کون نہیں آنے دیتا کہا جو تم کو مسجد کے اندر نہیں آنے دیتا وہ مجھ کو باہر نہیں آنے دیتا۔ واقعی جس کو وہ مردود کرتے ہیں وہ خود ہی مسجد سے بھاگتا ہے جیسے گوہ پانی سے بھاگتی ہے اور مچھلی پانی کی عاشق ہے وہ ہر دم پانی ہی میں رہنا چاہتی ہے اسی لئے علماء کا قول ہے۔

المومن فی المسجد کالسمک فی الماء والمنافق فی المسجد کالطیر فی القفص مومن مسجد میں پانی میں مچھلی کی طرح اور منافق مسجد میں پنجرہ میں پرندہ کی طرح۔ پس یہ بڑی دولت ہے کہ کسی کو ذکر اللہ کی توفیق ہو جائے ورنہ وہ نام تو ایسا ہے کہ اس کے لینے کی ہم جیسوں کو اجازت بھی نہ ہوتی جیسا کہا گیا ہے

ہزار بار بشویم دہن بمشک وگلاب ہنوز نام تو گفتن کمال بے ادبی ست

اگر منہ کو ایک ہزار بار مشک وگلاب سے دھوئیں۔ تب بھی آپ کا نام لینا بے ادبی ہے۔ اور

دیکھنے میں ہم آپس میں اپنے کسی بڑے کا نام بدوں القاب کے نہیں لے سکتے۔ کیونکہ صرف نام لینے سے ناخوش ہوتے ہیں۔ مگر اللہ تعالیٰ یا اللہ کہنے سے خوش ہوتے ہیں پس تم کو کیا ذوق وشوق لئے پھرتے ہو کام میں لگو۔ اور اس نعمت کی بے قدری نہ کرو کہیں یہ نعمت بھی سلب نہ ہو جائے۔ بلا بودے اگر اینہم نبودے۔ تم اپنا کام کرو دوسروں کے کام کے پیچھے کیوں پڑے ہو کار خود کن، کار بیگانہ مکن، ذوق وشوق عطا کرنا ان کا کام ہے یہ تمہارے اختیار سے باہر ہے تم اس کے درپے نہ ہو جو کام تمہارے اختیار کا ہے اس میں لگو یہ ہے مذہب اہل تحقیق کا اور راحت اسی میں ہے کہ حال ذوق مل جائے تو عنایت نہ ملے تو عنایت تم ہر حال میں ہر حال میں راضی رہو بعض عشاق تو یہاں تک راضی ہیں کہ ہم کو جہنم بھی بھیج دیا جائے تو اس پر بھی راضی ہیں مگر اس بات کا ہمارا منہ نہیں اس کے قائل عشاق ہی کا منہ ہے اور لسان عشق معذور ہوتی ہے جیسے ایک پرندہ حضرت سلیمانؑ کے زمانہ میں ایک مادہ سے کہہ رہا تھا کہ اگر تو میرے ساتھ مل جائے تو میں تجھ کو ملک سلیمان دیدوں گا۔ یہ بات حضرت سلیمانؑ نے سن لی اور منطق الطیر کے عالم تھے فوراً اس پرندہ کو بلایا اور فرمایا نالائق یہ کیا گستاخی تھی کہ میرا ملک دینے والے کون ہوتے ہیں اس نے کہا کہ نبی اللہ میں عاشق ہوں اور لسان عشق معذور ہوتی ہے اس پر حضرت سلیمانؑ نے اس کا قصور معاف کیا۔ اسی طرح یہ عشاق بھی وہاں معذور شمار ہوں گے۔ مگر ہر شخص کی زبان زبان عشق نہیں۔ تم ناز سے کام نہ لو اور عاشق کی نقل نہ کرو وہ تو اپنے کو مٹا کر فنا کر کے ناز کر رہا ہے۔ اس کو حق ہے تم کو حق نہیں ہے کیونکہ تم اپنے کو باقی رکھ کر ناز کرتے ہو۔

پیش یوسف نازش وخوبی مکن — جز نیاز و آہ یعقوبی مکن

یوسفؑ کے سامنے ناز و انداز اچھا نہیں معلوم ہوتا۔ یعقوبؑ کی طرح عاجزی وانکساری کر۔

زشت باشد روئے نہ زیبا و ناز — عیب باشد چشم نابینا و باز

ترجمہ: اچھا نہیں معلوم ہوتا بری صورت اور ناز۔ برا ہے آنکھیں نہ ہوں اور کھلی کرے۔

منشی محمد حسن صاحب تھانوی نے بھوپال کے ولی عہد سلطنت کو ایک دفعہ سادگی سے کہہ دیا کہ آپ تو سمجھتے نہیں ہیں ولی عہد کو یہ بات ان کے منہ سے ذرا ناگوار نہیں ہوئی۔ وزیر صاحب کی کم بختی آئی کہ انہوں نے بھی ولی عہد کو یہی کلمہ کہہ دیا ولی عہد کا چہرہ سرخ ہو گیا اور کہا بس اپنے درجہ پر رہو۔ تم منشی جی کی ریس کرتے ہو۔ ارے وہ تو تمہارے باپ کی جگہ ہیں نوکر اور ملازم نہیں اور تم ملازم ہو۔ ملازم کو گستاخی اور بدتمیزی کا کیا حق ہے۔ اگر اب سے ایسی بدتمیزی کی تو کان پکڑ کر کے

دربار سے نکلوا دیئے جاؤ گے۔ پس تم ناز نہ کرو۔ کیونکہ تم منشی محمد حسن نہیں ہو اور معیار فرق یہ ہے کہ تم اپنے آپ میں ہو اور عشاق آپے سے باہر ہیں۔

اسباب کے اختیاری ہونے کی بنا پر امور اختیاریہ کہلاتے ہیں:

اب ایک بات اور سمجھو کہ یہ جو میں نے کہا ہے کہ امور غیر اختیار غیر مطلوب ہیں یہ عام نہیں بلکہ احوال کے ساتھ خاص ہے کیونکہ جزا اعمال بھی غیر اختیاری ہے مگر وہ مطلوب ہے کیونکہ وہ احوال میں سے نہیں بلکہ جزاء ہے۔ ایک جواب تو یہ ہے۔ دوسرا جواب یہ ہے کہ جزاء بھی اختیاری ہے کیونکہ اس کے اسباب اختیاری ہیں یعنی اعمال صالحہ اور اس کی ایسی مثال ہے جیسے یوں کہا جائے کہ صحت اختیاری ہے کیونکہ اس کے اسباب اختیاری ہیں پس جنت وقرب ورضا اسی قبیل سے ہیں کہ فی نفسہ غیر اختیاری ہیں مگر بواسطہ اسباب کے اختیاری ہیں اور اگر نظر کو غائر کرو تو معلوم ہوگا کہ تمام اختیارات ایسے ہی ہیں کہ فی نفسہ غیر اختیاری ہیں مگر اسباب کے اختیاری ہونے کی وجہ سے ان کو اختیاری کہا جاتا ہے۔ مثلاً ابصار کو اختیاری کہا جاتا ہے۔ حالانکہ اس میں صرف فتح العین اختیاری ہے اور ادراک غیر اختیاری ہے مگر عادۃ اللہ یہ ہے کہ فتح العین پر اکثر ادراک کا ترتب ہو جاتا ہے اسی طرح شبع اور ری یعنی سیر ہونا اور سیراب ہونا یہ بھی محض اسباب کے واسطہ سے اختیاری ہیں ورنہ فی نفسہ غیر اختیاری بلکہ اور نظر کو غائر کرو جنت ابصار وغیرہ سے زیادہ اختیاری ہے کیونکہ فتح العین پر ترتب ادراک محض عادی ہے وعدی نہیں اور جنت کے ترتب کا اعمال صالحہ پر وعدی ہے اور عادت میں تخلف جائز ہے اور وعدہ میں جائز نہیں۔ پس اب اشکال مرتفع ہو گیا کیونکہ مبنی اشکال کا یہ تھا کہ جزا غیر اختیاری ہے اور اب معلوم ہو گیا کہ جزا اختیاری ہے۔ پس غیر مطلوب وہ ہے جو فی نفسہ بھی غیر اختیاری ہو اور اسباب کے لحاظ سے بھی غیر اختیاری ہو اور جو چیز اختیاری ہو خواہ بلا واسطہ یا بواسطہ وہ غیر مطلوب نہیں۔ اور احوال من کل وجہ اختیاری ہیں گو ان کے حصول میں بھی اعمال واسطہ ہیں مگر یہ واسطہ ایسا ہے جس پر احوال کا ترتب لازم نہیں نہ ان کا وعدہ ہے اس لئے ان کو بواسطہ بھی اختیاری نہیں کہہ سکتے پس ان کی طلب کے درپے نہ ہو بلکہ رضائے حق کے طالب بنو اور غیر حق سے نظر قطع کرو خوب کہا ہے۔

تو درو گم شو وصال این است وبس	گم شدن گم کن کمال این است وبس
تو اس میں فنا ہو جا یہی وصال ہے	اپنا گم ہونا بھول جا انتہاء کی کمال یہ ہے

گم شو کا مطلب یہ کہ جس چیز کے فنا کا امر ہے اس کو گم کرو یعنی اپنے ارادہ و تجویز کو فنا کردو۔ یہ مطلب نہیں کہ نماز روزہ کو بھی فنا کردو۔ اور گم شدن گم کن کمال ایں است و بس یہ بات ذرا مشکل سے سمجھ آئے گی۔ مگر اس کا اشکال لغوی ہے۔

صاحب فنا کون ہے:

اس کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی شخص سوتے ہوئے یہ جانتا ہو کہ میں سو رہا ہوں تو سونے والا نہیں سونے والا ہی ہے جس کو اپنے سونے کی بھی خبر نہ ہو اسی طرح صاحب فنا وہ ہے، جس کو اپنے فنا ہونے کی بھی خبر نہ ہو یعنی اس پر التفات نہ ہو۔ یہ معنی نہیں کہ وہ شخص بے وقوف ہوتا ہے کہ اس کو اپنے حال کی خبر ہی نہیں ہوتی۔ خبر تو ہوتی ہے مگر التفات نہیں ہوتا تو گم شدن گم کن امر معقول ہوا اور اس فن کا کوئی مسئلہ بھی خلاف عقل نہیں کیونکہ تصوف محض ہے اور علم صحیح موافق عقل کے ہوتا ہے۔ پس علوم تصوف میں کوئی اشکال عقلی و شرعی واقع نہیں ہوسکتا۔ اور وہ عشاق کے کلمات ہیں جن کے سچے اور رواں مختلف ہوتے ہیں سو وہ مغلوب الحال ہیں کلمات عشاق کا نام تصوف نہیں بلکہ محققین کے ارشادات کا نام ہے اور محققین کے کلام پر کسی کو انگلی رکھنے کی مجال نہیں وہ قرآن حدیث و عقل سب پر منطبق ہے۔

فناء الفنا کی حقیقت:

چنانچہ فناء الفنا کی حقیقت کو خود حکماء نے بھی تسلیم کیا ہے کیونکہ حکماء نے طے کردیا ہے علم کے لئے علم العلم کی ضرورت نہیں۔ دیکھئے آپ دھوپ میں کام کرتے ہیں چلتے پھرتے ہیں مگر دھوپ ہونے کی طرف التفات نہیں ہوتا۔ اس کو اہل علم زیادہ سمجھیں گے اسی لئے اہل علم کو صوفی ہونے کا زیادہ حق ہے کیونکہ جاہل مقرّب تو ہوسکتا ہے مقرّب نہیں ہوسکتا مقرب عالم ہی ہوسکتا ہے۔ غرض فناء الفناء میں محبوب کی طرف اس قدر توجہ ہوتی ہے خواہ بواسطہ صفات محض ذات کی طرف کہ اس میں سالک کو اپنی ذات و صفات کی طرف التفات نہیں ہوتا یہ ہے گم شدن گم کن اور یہ حالت عشاق مجاز کو بھی پیش آتی ہے۔ عاشق کو اپنے محبوب کو دیکھتے ہوئے اس طرف التفات بھی نہیں ہوتا کہ میں اس کو دیکھ رہا ہوں پس اب گم شدن گم کمال این ست و بس۔ پر کوئی اشکال نہیں۔ اور جو شخص اس قدر صاحب فنا ہوگا وہ شوق و ذوق کی طرف کیونکر التفات کریگا۔ حضرت حاجی صاحب فرماتے تھے کہ لا الہ میں سب کی نفی کردو کہ بجز ذات حق کے کسی طرف التفات نہ رہے۔ مولانا فرماتے ہیں۔

شاد باش اے عشق خوش سودائے ما — اے طبیب جملہ علت ہائے ما
اے اچھے خیال والے عشق تو خوش رہ — اے ہماری تمام بیماریوں کے حکیم
اے دوائے نخوت وناموس ما — اے تو افلاطون وجالینوس ما
اے دواہماری تکبر اور بدنامی کی — اے کہ تو ہی ہے افلاطون و جالینوس ہمارا
عشق آں شعلہ ست کو چوں برفروخت — ہر چہ جز معشوق باقی جملہ سوخت
عشق وہ شعلہ ہے جب بھڑک جائے — معشوق کے سوا سب کو جلادے
تیغ لا در قتل غیر حق براند — درنگر آخر کہ بعد لاچہ ماند
لا الٰہ کی تلوار اپنی غرض کے قتل کرنے پر چلاؤ — اور پھر دیکھ کہ آخر (نتیجہ) لا کے بعد کیا رہا
ماند الا اللہ وباقی جملہ رفت — مرحبا اے عشق شرکت سوز رفت

اللہ ہی رہ جائے گا اور باقی کچھ نہیں رہے گا اے عشق سخت شرکت جلانے والے تجھ کو خوشخبری ہو جب یہ خود ہی نہیں رہا تو دوسری چیزوں کی طرف کیونکر التفات کرے گا۔ غرض احوال غیر اختیاری ہیں اس لئے وہ غیر مطلوب ہیں اور اعمال اختیاری ہیں اس لئے مطلوب ہیں اور یہ مسئلہ میں نے خود نہیں گڑھا بلکہ نص میں موجود ہے جس کی میں نے تلاوت کی تھی چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔

ثواب اور عذاب کا مدار کسب واکتساب پر ہے:

لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ۔ اس آیت میں صاف تصریح ہے کہ اللہ تعالیٰ وسعت سے زیادہ کا مکلف نہیں کرتے بلکہ ثواب وعذاب کا مدار کسب واکتساب پر ہے معلوم ہوا کہ انسان اختیارات کا مکلف ہے۔ اور احوال اختیاری نہیں اس لئے ان کا مکلف نہیں۔ اور یہ بات اس آیت کے شان نزول سے زیادہ واضح ہو جائیگی کیونکہ اس کا نزول احوال کی تحقیق میں ہے شان نزول اس آیت کا یہ ہے کہ جب آیت اِنْ تُبْدُوْا مَا فِيْ اَنْفُسِكُمْ اَوْ تُخْفُوْهُ يُحَاسِبْكُمْ بِهِ اللّٰهُ ۔ نازل ہوئی تو صحابہ اس سے ڈر گئے کیونکہ مَا فِيْ اَنْفُسِكُمْ بظاہر عام ہے وسواس غیر اختیاریہ وعزائم اختیاریہ سب کو تو صحابہ یہ سمجھے کہ شاید ان سب پر مواخذہ ہوگا اور اس خیال کا منشا یہ صحابہ کی قلت علم نہ تھا بلکہ اس کا منشا غلبہ عشق تھا جس کی شان یہ ہے۔

باسایہ ترا نمی پسندم — عشق ست وہزار بدگمانی

عاشق کو ضعیف الاحتمالات پر بھی بڑی فکر رہتی ہے ورنہ صحابہ قواعد کا سمعیہ وعقلیہ سے جانتے

تھے کہ اللہ تعالیٰ امورِ غیر اختیاریہ پر مواخذہ نہ فرمائیں گے۔ کیونکہ مقتضائے رحمت کے خلاف ہے مگر عشق و محبت کی وجہ سے خشیت کا غلبہ تھا آیت میں عموم دیکھ کر ڈر گئے اور حضور علیہ السلام کو عرض کیا حضور علیہ السلام نے فرمایا کیا تم سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا کہنا چاہتے ہو۔ سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا کہو ہم نے سن لیا اور ہم اطاعت کریں گے۔ صحابہ نے ادب سے کام لیا اور سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا کہا گو زبان لڑکھڑاتی تھی کیونکہ اندیشہ تھا کہ وساوس غیر اختیاریہ میں شاید اس حکم کی تعمیل نہ ہو سکے مگر ادب کی وجہ سے اطاعت کا وعدہ کر ہی لیا۔ اللہ تعالیٰ کو ان کو یہ ادا پسند آ گئی اس پر اٰمَنَ الرَّسُوْلُ سے آخر سورۃ تک آیتیں نازل ہوئیں اور ادب کی برکت سے آیت کی تفسیر کر دی گئی۔ ادب بڑی چیز ہے مولانا نے ادب کے متعلق قصہ لکھا ہے کہ جب حضرت آدمؑ سے لغزش ہوئی اور ان پر عتاب ہوا۔ اور حضرت آدم نے رَبَّنَا ظَلَمْنَا اَنْفُسَنَا ۔ کہا اور اللہ نے ان کی توبہ قبول کی تو بعد میں ان سے پوچھا کہ اے آدم خالق افعال تو میں ہوں تم نے ظَلَمْنَا اَنْفُسَنَا کیونکر کہا۔ آدمؑ نے جواب دیا۔

گفت من ہم پاس آنت داشتم　　　　لیک من پاس ادب نگذاشتم

اسی طرح حضور علیہ السلام نے بھی یہاں ادب سے کام لیا کہ خود اس آیت کی تفسیر نہ کی ورنہ آپ خود بھی تفسیر کر سکتے تھے مگر آپ علیہ السلام نے وحی کا انتظار کیا۔ اس پر یہ آیات نازل ہوئی جن میں اول رسول علیہ السلام اور حضرات صحابہ کی تعریف ہے کہ سب نے ایمان پر استقامت ظاہر کی اور سمعنا و اطعنا کہا اور جس کوتاہی کا اندیشہ تھا۔ اس سے استغفار کیا غُفْرَانَكَ رَبَّنَا وَاِلَيْكَ الْمَصِيْرُ۔ اس تعریف کے بعد آیت سابقہ کی تفسیر کی گئی لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا ۔ میں جس کا حاصل یہ ہے کہ مدار تکلیف کا صرف اختیار ہے اور خطرات اختیاری نہیں تو عبد ان کا مکلف بھی نہیں۔ اب اس پر یہ سوال ہو سکتا ہے کہ اس سے یہ کیونکر معلوم ہوا کہ غیر اختیاری کا مکلف تو نہ ہو مگر اس پر مواخذہ ہو جاوے اس کا جواب آئندہ جملہ میں ارشاد فرمایا گیا۔

امور غیر اختیاریہ پر مواخذہ نہ ہوگا:

مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ کیونکہ کسب و اکتساب کے معنی عمل بالاختیار کے ہیں اور لہا و علیہا میں لام اور علی کا مدلول ثواب و عقاب ہے پھر دونوں میں مجرور کو مقدم کیا گیا جو مفید حصر ہے اس حصر سے معلوم ہو گیا کہ استحقاق ثواب و عقاب صرف امور اختیاریہ ہی پر ہے ۔ پس آیت بالا کی تفسیر ہو گئی کہ مراد مَا فِیْٓ اَنْفُسِكُمْ سے اعمال اختیاریہ ہیں اور سند کا منصوص ہونا

ثابت ہو گیا جس کا میں نے دعویٰ کیا تھا اسی مسئلہ پر اپنے مقصود کی پھر تصریح کرتا ہوں کہ جب ثواب عقاب کا مدار اختیار پر ہے اور مقصود عبد کا صرف حصول ثواب اور نجات عن العقاب ہے پھر غیر اختیاری کے فکر میں کیوں پڑے یہاں ایک اور سوال کے جواب پر بھی متنبہ کرتا ہوں وہ سوال یہ ہے کہ بعض مصائب ایسے آتے ہیں جو تحمل سے زیادہ ہوتے ہیں۔ جواب یہ ہے کہ یہاں تکلیف سے مراد تکلیف شرعی ہے تکلیف تکوینی مراد نہیں سو اس کی یہاں نفی نہیں پس امور تکوینیہ میں فوق طاقت کا وقوع ہوسکتا ہے شاید اس پر یہ سوال کہ جب تشریعات میں رحمت کی وجہ سے یہ قاعدہ ہے لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَھَا تو تکوینیات میں بھی رحمت کا یہ مقتضا کیوں ظاہر نہ ہوا اس کا جواب یہ ہے کہ تکوینیات میں بوجہ زیادت اجر کے فوق طاقت کا وقوع خلاف رحمت نہیں رہا یہ سوال کہ پھر تشریعیات میں بھی زیادت اجر کے لئے ایسا کیا جاتا اس کا جواب یہ ہے کہ تشریع سے عمل مقصود ہے اور فوق طاقت کا صدور کیونکر ہوتا اور تکوینیات میں صدور اس کا فعل نہیں ایک دوسری بات مطلوب ہے جو وہ اختیاری ہے یعنی صبر کہ خدا تعالیٰ کی شکایت نہ کرے اور اس میں بھی اتنی توسیع ہے کہ حقیقی شکایت نہ کرے گو صورتاً شکایت ہو جائے تو وہ معاف ہے۔

بیماری میں آہ کا منہ سے نکلنا خلاف صبر نہیں:

جیسے یعقوبؑ کا قول ہے اِنَّمَآ اَشْکُوْبَثِّیْ وَحُزْنِیْٓ اِلَی اللّٰہِ اسی طرح آنسو بہانا آہ آہ منہ سے نکلنا بھی خلاف صبر نہیں ورنہ حضور ﷺ سب سے زیادہ اسکے مستحق تھے بلکہ رو لینے سے صبر حقیقی زیادہ آسان ہو جاتا ہے کیونکہ دل کا غبار نکل جاتا ہے تو دل میں خدا سے شکایت پیدا نہیں ہوتی بعض لوگوں کو تقویٰ کا ہیضہ ہو جاتا ہے وہ بیماری میں آہ آہ کرنے کو خلاف صبر سمجھتے ہیں اس لئے اللہ اللہ کرتے ہیں تاکہ قوت قلب ظاہر ہو مگر یہ معرفت کے خلاف ہے اس پر مولانا مفتی الٰہی بخش صاحب کی حکایت مجھے یاد آئی کہ ایک بار وہ بیماری میں وہ اللہ اللہ کر رہے تھے کہ اس کے بھائی آ گئے وہ بھی بڑے بزرگ تھے انہوں نے فرمایا بھائی جی آہ آہ کرو کیونکہ اللہ اللہ مظہر الوہیت ہے اور آہ آہ مظہر عبدیت ہے اور اس وقت وہ عبدیت کو دیکھنا چاہتے ہیں چنانچہ انہوں نے آہ آہ شروع کی اور بہت جلد صحت ہو گئی کیونکہ مقصود پورا ہو گیا تھا۔ اللہ تعالیٰ کو عجز و نیاز اور تضرع وزاری بہت پسند ہے۔ اور یہ بات بھی آہ ہی میں ہے اللہ اللہ کرنے میں نہیں۔ مولانا فرماتے ہیں۔

تا نگرید کودک حلوا فروش بحر بخشائش نمی آید بجوش

جب تک حلوائی کا لڑکا نہ روئے اسکی بخشش کا دریا جوش میں نہیں آتا

اور فرماتے ہیں۔

اے خوشا چشمے کہ آں گریان اوست اے خوشاں آں دل کہ آں بریان اوست
در پس ہر گریہ آخر خندہ ایست مرد آخر بین مبارک بندہ ایست

ہر غم کے بعد خوشی ہوتی ہے انجام پر نظر رکھنے والا مرد بہت اچھا ہے۔

اسی لئے ایک بار حضرت عمر سے بیماری میں جب کسی نے یہ پوچھا کہ کیسی طبیعت ہے فرمایا اچھی نہیں سائل نے کہا کیا آپ شکایت کرتے ہیں فرمایا کیا میں خدا کے سامنے اپنی بہادری ظاہر کروں کہ وہ تو بیمار کریں اور میں کہوں نہیں میں تو اچھا ہوں۔ اس سے معلوم ہو گیا کہ شکایت منافی صبر وہ جو خود مقصود ہو اور جو کسی حکمت سے ہو وہ عبدیت ہے ان مقامات کو عارفین سمجھتے ہیں کہ اس وقت کیا مطلوب ہے اور دوسرے وقت کیا مطلوب۔ حضرت عمرؓ کی ایک اور حکایت ہے جس کو مناسبت مقام کی وجہ سے بیان کرتا ہوں وہ یہ کہ۔

کسریٰ کے خزائن مفتوح ہونے پر حضرت عمرؓ کی دعا:

جب عمرؓ کے پاس کسریٰ کا خزانہ مفتوح ہو کر آیا تو سونے چاندی اور جواہرات کا بڑا انبار تھا آپ نے اس کو دیکھ کر اللہ تعالیٰ سے اس طرح دعا کی خداوندا آپ کا ارشاد ہے۔ زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوَاتِ مِنَ النِّسَاءِ وَالْبَنِينَ وَالْقَنَاطِيرِ الْمُقَنْطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ وَالْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ وَالْأَنْعَامِ وَالْحَرْثِ۔ کہ لوگوں کے دلوں میں خواہشوں کی محبت آراستہ کر دی گئی ہے۔ جن میں عورتیں بھی ہیں اور اولاد بھی اور سونے چاندی کے ڈھیر بھی اور گھوڑے نشان کردہ چوپائے اور کھیتی بھی۔ زین صیغہ مجہول ہے جس کا فاعل یہاں مذکور نہیں علماء میں اس کے فاعل کے بارے میں اختلاف ہوا ہے بعض نے اس کا فاعل شیطان کو مانا ہے کہ شیطان نے ان چیزوں کی محبت قلوب میں آراستہ کر دی ہے اور حضرت عمرؓ نے اللہ تعالیٰ کو فاعل مانا ہے۔ دونوں میں منافات کچھ نہیں دونوں صحیح ہیں کیونکہ تزیین کے دو درجے ہیں ایک وہ درجہ معصیت کی طرف مفضی ہو اس کا فاعل تو شیطان ہے اور ایک طبعی تزیین کا ہے جو کسی حکمت سے ودیعت رکھی گئی ہے۔ اس کے فاعل اللہ تعالیٰ ہیں کیونکہ طبعیات سب خدا کی پیدا کردہ ہیں آخر آپ کو کھانے پینے کی محبت نہیں ہے؟ یقیناً ہے پھر طبعاً مال و زر کی محبت بھی ہو تو کیا حرج ہے اور جس طرح طبیعت کے درجہ میں طعام و شراب کی محبت قبیح

نہیں اسی طرح درجہ میں مال واولاد کی محبت بھی قبیح نہیں اب اللہ تعالیٰ اس کے فاعل ہوں تو کچھ اشکال نہیں ہاں جو درجہ مفضی الی المعصیت ہے اس کا فاعل شیطان ہے۔ غرض حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ مال کی محبت آپ نے ہمارے دلوں میں مزین کی ہے اس لئے ہم یہ تو نہیں چاہتے کہ ہم کو مال سے محبت نہ ہو اور نہ یہ کہتے ہیں کہ اس سے ہم کو خوشی نہیں ہوئی ہاں یہ درخواست کرتے ہیں کہ اس محبت کو اپنی رضا کی طرف منعطف کر دیجئے اور اس کو اپنے دین کے کام میں صرف کر دیجئے سبحان اللہ! یہ حضرات ہیں عارف کامل! یہ حکایت میں نے اسی واسطے ذکر کی ہے تاکہ یہ معلوم ہو جائے کہ جس طرح لوگوں نے صبر کی حقیقت سمجھنے میں غلطی کی ہے کہ صورت شکایت کو بھی خلاف سمجھتے ہیں اسی طرح ترک دنیا اور زہد کی حقیقت کو سمجھنے میں بھی غلطی کی ہے لوگ محبت مال کو مطلقاً زہد کے خلاف سمجھتے ہیں حالانکہ طبعی محبت زہد کے خلاف نہیں بلکہ خلاف زہد وہ درجہ ہے جو معاصی کی طرف مفضی ہو اور یہ جو صوفیہ کے واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کو مال کی محبت مطلقاً نہ تھی ان میں طبعی محبت دوسری محبت سے مغلوب ہو جاتی ہے۔ جو بوجہ مغلوبیت کے کالمعدوم معلوم ہوتی ہے اور کبھی اس کے بعض آثار محسوس بھی ہوتے ہیں۔ مگر وہ مقصود بالذات نہیں ہوتی۔ مقصود بالغیر ہوتی ہے تو صورت اس کے تعلق کا ہوتی ہے۔ حقیقی تعلق نہیں ہوتا۔

حضرت خواجہ عبید اللہ احرارؒ اور مولانا جامیؒ کی حکایت:

اس پر مجھے حضرت مولانا جامی کی حکایت یاد آئی کہ جب وہ حضرت خواجہ عبید اللہ احرارؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور وہاں امیرانہ ٹھاٹ دیکھا تو بہت جھلائے کہ یہ کیسے بزرگ ہیں جن کے پاس اس قدر دنیا بھری ہوئی ہے آپ نے اسی وقت جھلا کر یہ مصرع پڑھا۔

نہ مرداست آنکہ دنیا دوست دارد

اور یہ کہہ کر چل دیئے اور ایک مسجد میں آ کر سو رہے خواب میں دیکھا کہ قیامت قائم ہے اور ایک شخص ان کے سر ہو گیا کہ میرے پیسے دلواؤ جو تمہارے ذمہ ہیں مولانا جامیؒ بڑے پریشان ہوئے کہ یہاں اس کو کہاں سے پیسے دوں اس نے کہا نیکیاں دلواؤ۔ یہ اسی کشمکش میں تھے کہ ایک طرف سے حضرت خواجہ عبید اللہ احرارؒ کی سواری بڑی شان سے آتی ہوئی نظر پڑی خواجہ صاحب نے مولانا جامی کو پریشان دیکھ کر سواری روکی قرض خواہ کو دھمکایا کہ فقیر کو کیوں تنگ کرتے ہو جاؤ جو کچھ تمہارا مطالبہ ہو ہمارے خزانہ سے وصول کر لو جو ہم نے یہاں پہلے سے جمع کر رکھا

ہے یہ کہہ کر مولانا جامی کو اپنے ساتھ سوار کر لیا یہ دیکھ کر آنکھ کھل گئی۔ اب تو ان کو متنبہ ہوا کہ خواجہ صاحب بڑے درجہ کے درویش ہیں اور میں نے سخت غلطی کی جو ان پر اعتراض کیا ہے اسی سوچ میں تھے کہ اتنے میں خواجہ صاحب نماز کے لئے مسجد میں تشریف لائے یہ دوڑ کر قدموں میں گر پڑے اور خطا معاف کرائی خواجہ صاحب نے فرمایا کہ ذرا وہ اپنا مصرع تو پھر سناؤ جو آتے ہی سنایا تھا مولانا جامی نے شرمندہ ہو کر عرض کیا کہ حضرت وہ تو میری حماقت تھی فرمایا کہ ایک بار تم نے اپنی خواہش سے حماقت کی تھی اب ہماری خوشی کے لئے وہ حماقت کر لو چنانچہ آپ نے پڑھا کہ ۔

نہ مردست آنکہ دنیا دوست دارد

تو حضرت خواجہ صاحب نے فرمایا ۔

اگر دارد برائے دوست دارد غرض مال کی محبت کا یہ درجہ خلاف زہد

نہیں اور نہ مال کا جمع کرنا مطلقاً خلاف زہد ہے البتہ اس کو ذریعہ معاصی بنانا یہ خلاف زہد ہے اگر یہ نہ ہو تو پھر کچھ حرج نہیں بلکہ بعضوں کے لئے مالدار ہونا ہی مفید ہے اللہ تعالیٰ جانتے ہیں کہ کس کو مال سے قرب ہوگا اور کس کو افلاس سے ۔ اس لئے کسی کو مال دیتے ہیں کسی کو مفلس رکھتے ہیں ۔ میں نے حضرت عمرؓ کی عبدیت ظاہر کرنے کو ان کی حکایت بیان کی تھی ۔ اس کے بعد بوجہ مناسبت کے دوسری حکایات ضمناً بیان ہو گئیں اس سے پہلے میں یہ کہہ رہا تھا کہ بیماری وغیرہ میں صورت شکایت کا حرج نہیں بس شکایت حقیقت نہ ہونا چاہئے اور یہ امر اختیاری ہے اور تکوینیات میں انسان اسی کا مکلف ہے اس کے سوا کسی عمل وغیرہ کا مکلف نہیں پس تکوینیات میں فوق الطاقت کا وقوع جائز ہے اور تشریعیات میں ایسا نہیں ہو سکتا۔ ہاں تکوینیات کے بارہ میں آگے دعا کی تعلیم ہے کہ فوق الطاقت مصائب سے بچنے کی بھی دعا مانگا کرو۔ چنانچہ رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْ عَلَيْنَا اِصْرًا کے بعد جو کہ تشریعیات کے باب میں ہے اس کا اضافہ بھی فرمایا گیا۔ رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلْنَا مَالَا طَاقَةَ لَنَا بِهٖ ۔ ایک نکتہ اس مقام میں قابل غور یہ ہے کہ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ میں دو عنوان کیوں اختیار کئے گئے ۔ حالانکہ دوسری جگہ ارشاد ہے ۔ وَلٰكِنْ يُّؤَاخِذُكُمْ بِمَا كَسَبَتْ قُلُوْبُكُمْ اور ایک مقام پر ارشاد ہے لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُمْ مَّا كَسَبْتُمْ ۔

شر کے لئے اکتساب اور خیر کے لئے کسب فرمانے کا سبب :

ان جگہوں میں اکتساب نہیں فرمایا اس کا جواب یہ ہے کہ یہ تو ظاہر ہے کہ اکتساب میں کسب

سے زیادت ہے کیونکہ افتعال کی خاصیت تکلف ہے۔ اب خیر کیلئے کسب اور شر کے لئے اکتساب اختیار کرنے میں نکتہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ معاصی کے لئے انسان کو اہتمام زیادہ کرنا پڑتا ہے گو وقوع اس کا سہولت سے ہو جائے مگر اہتمام شر کے لئے زیادہ ہوتا ہے اور خیر کے لئے اس قدر اہتمام کی ضرورت نہیں کیونکہ انسان کی اصلی فطرت خیر ہے جیسا کہ حدیث **کل مولود یولد علی الفطرۃ**۔ سے معلوم ہوتا ہے کہ فطرت کے لئے زیادہ اہتمام کی ضرورت نہیں ہوتی نیز خیر سے مانع کوئی قوی قوت انسان کے اندر موجود نہیں رکھی گئی اور شر سے مانع ایک قوی قوت اس کے اندر موجود ہے یعنی عقل عقل خود معاصی سے روکتی ہے اسی لئے بعد معاصی کے انسان کو ندامت بے حد ہوتی ہے اس لئے شر کے واسطے اکتساب فرمایا اور خیر کیلئے کسب اور جو حدیث میں ہے **حفت الجنۃ بالمکارہ وحفت النار بالشھوات** وہ اس تقریر کے منافی نہیں کیونکہ شر میں فی نفسہ سہولت نہیں ہاں عادت کے غلبہ سے وہ سہل اور مرغوب ہو جاتی ہے او خیر میں فی نفسہ دشواری نہیں ہاں عادت نہ ہونے سے اس میں عارضی دشواری ہو جاتی ہے اور اسی درجہ کے لحاظ سے ان کو مکارہ کہا گیا ہے اب کچھ اشکال نہ رہا (میں کہتا ہوں کہ یہاں کسب و اکتساب میں تبدیل عنوان توجیہہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ خیر میں مطلق کسب پر اجر ملے گا خواہ اتفاقاً خیر کا صدور ہو جائے اور شر میں مطلق کسب پر عذاب نہیں بلکہ تعمد کسب پر مؤاخذہ ہوتا ہے چنانچہ خطا و نسیان عفو ہے واللہ اعلم ۱۲ ظ) ایک سوال و جواب یہاں حصر کے متعلق ہے جو لہا اور علیھا کی تقدیم سے حاصل ہوا ہے وہ یہ کہ اس حصر سے لازم آتا ہے کہ جیسے عقاب بلا کسب نہیں ہوتا چاہیے کہ ثواب بھی بلا کسب نہ ہو حالانکہ ثواب کبھی بلا عمل محض فضل سے بھی مل جاتا ہے جیسا کہ نصوص میں وارد ہے۔ جواب یہ ہے کہ حصر باعتبار حصول کے نہیں بلکہ باعتبار استحقاق کے ہے یعنی استحقاق تو ثواب کا بھی بدوں کسب نہیں گو عطا ہو جاوے اور اوپر میرے کلام میں بھی اس طرف اشارہ ہے ایک نکتہ اس مقام پر قابل حل یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَا اِنْ نَّسِیْنَا اَوْ اَخْطَاْنَا۔ کی ہم کو تعلیم فرمائی ہے۔ اور حدیث میں ہے کہ یہ دعا قبول ہو چکی ہے۔

نسیان و خطا امر غیر اختیاری ہے:

چنانچہ حضور ﷺ فرماتے ہیں **رفع عن امتی الخطاء والنسیان** ۔ اب سوال یہ ہوتا ہے کہ نسیان و خطا امر اختیاری ہے یا غیر اختیاری ہے۔ ظاہر یہ ہے کہ غیر اختیاری ہے اور لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَھَا سے معلوم ہو چکا ہے کہ غیر اختیاری پر مؤاخذہ نہیں پھر بعد رفع مؤاخذہ

آئندہ کیلئے دعائے عدم مواخذہ کی تعلیم کے کیا معنی جبکہ مواخذہ کا احتمال ہی نہیں دوسرا اشکال یہ ہے کہ حدیث سے معلوم ہوتا ہے رفع خطاونسیان اس امت کے ساتھ مخصوص ہے جس سے مفہوم ہوتا ہے کہ دوسری امتوں پر مواخذہ تھا اور یہ عقل کے خلاف ہے کہ دوسری امتوں کو تکلیف مالا یطاق دی گئی ہو۔ نیز نص لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفْسًا میں نفسا عام ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ تشریعیات میں تکلف مالا یطاق کسی کو نہیں دیگئی اور عقل بھی عموم کو چاہتی ہے اس کے جوابات علماء نے مختلف دیئے ہیں مگر میرے ذہن میں جواب آیا ہے میں اس کو عرض کرتا ہوں وہ یہ کہ خطرات وو سواس میں دو درجے ہیں ایک درجہ حدوث کا ہے۔ وہ تو غیر اختیاری ہے اور ایک درجہ بقا کا ہے۔ یہ بعض اوقات اختیاری ہوتا ہے مثلاً کسی اجنبیہ کا دل میں بلا قصد خیال آ گیا یہ تو غیر اختیاری ہوا۔

وسوسہ کا کچھ دیر تک باقی رہنا بعض اوقات اختیاری ہوتا ہے:

مگر اس وسوسہ کا کچھ دیر تک باقی رہنا بعض اوقات اختیاری ہوتا ہے اور یہ بقاء کبھی قصیر ہوتا ہے کبھی طویل اور یہ بقاء اکثر ہوتا ہی ہے کیونکہ وسوسہ کا ایسا وقوع نادر ہی ہے کہ حدوث کے ساتھ ہی فنا ہو جائے زیادہ بھی ہے کہ وسوسہ کچھ دیر کو ضرور باقی رہتا ہے مگر انسان کو اکثر بقاء قصیر کا احساس کم ہوتا ہے۔ بقاء طویل ہی کا احساس ہوتا ہے کہ کیونکہ ابتدا میں اس کو اس پر التفات نہیں ہوتا کہ وسوسہ درجہ حدوث سے تجاوز کر کے درجہ بقاء حاصل کر چکا ہے جب یہ سمجھ میں آ گیا تو اب سمجھو کہ درجہ حدوث پر تو کسی سے مواخذہ نہیں وہ تو من کل وجہ غیر اختیاری ہے اور تیسرے درجہ پر سب سے مواخذہ ہے یعنی بقاء طویل پر کیونکہ وہ من کل وجہ اختیاری ہے اب ایک درجہ بیچ کا ہے یعنی جبکہ وسوسہ کو بقاء قصیر ہو یہ امت محمدیہ سے عفو ہے اور پہلی امتوں سے اس پر مواخذہ تھا کیونکہ یہ درجہ فی نفسہ اختیاری ہے اس لئے محل مواخذہ ہونے کے قابل ہے مگر مشابہ غیر اختیاری کے ہے اس لئے امت محمدیہ سے اس کے متعلق مواخذہ مرتفع ہو گیا رہا یہ سوال کہ جب یہ درجہ مشابہ غیر اختیاری کے ہے تو پہلی امتیں اس سے کس طرح بچتی ہوں گی اس کا جواب یہ ہے کہ جب فی نفسہ اختیاری ہے تو وہ اہتمام مزید کر کے بچتے ہوں گے اور نہ بچتے ہوں تو ان پر اس سے استغفار واجب ہوگا اور امت محمدیہ پر اس سے استغفار کا وجوب نہ ہوگا گو استحباب ضرور ہے۔ اور یہی دو درجے خطاونسیان میں ہیں کہ خود خطاونسیان تو غیر اختیاری ہے مگر اس کا منشاء یعنی عدم استحضار یا ذکر اختیاری ہے اگر ذکر کا استحضار کامل ہو تو پھر خطاونسیان کا صدور نہیں ہو سکتا ان کا صدور جب بھی ہوگا عدم استحضار و

غفلت ہی سے ہوگا چنانچہ اگر دن میں ہر وقت روزہ کا دھیان رہے تو نسیان طاری نہ ہوگا۔

افعال صلوٰۃ پر توجہ سے نماز میں سہو نہیں ہوتا:

نماز میں اگر افعال صلوٰۃ پر پوری توجہ ہو تو سہو نہ ہوگا اور یہ امر اختیاری ہے کہ توجہ رکھو تو اس کے ترک پر مواخذہ ہو سکتا ہے اب آیت وحدیث رفع عن امتی الخ پر تو اشکال نہ رہا۔ لیکن ایک مستقل اور اشکال وارد ہوگا کہ رسول اللہ ﷺ کو جو نماز میں سہو ہوا ہے کیا اس کا منشاء بھی عدم استحضار افعال صلوٰۃ تھا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ ہاں سہو نبوی کی علت بھی یہی ہے۔ لیکن علت عدم استحضار افعال صلوٰۃ ہم میں اور ہے اور حضور ﷺ میں اور۔ یعنی ہماری عدم توجہ الی الصلوٰۃ کا منشاء تو یہ ہے کہ ہم کو ایسی چیز کی طرف توجہ ہوتی ہے جو نماز سے ادنیٰ ہے یعنی دنیا۔ اور حضورؐ کی توجہ الی الصلوٰۃ کا منشاء یہ ہے کہ آپ کو ایسی چیز کی طرف توجہ ہوتی تھی جو نماز سے اعلیٰ ہے یعنی ذات حق خوب سمجھ لو۔ بحمد اللہ اب یہ مسئلہ ہر طرح منقح ہو گیا کہ امور غیر اختیاریہ قابل اہتمام نہیں ان کا اہتمام چھوڑ دینا چاہئے اور غیر اختیاری مراد صرف احوال وکیفیات ہیں جز امر او نہیں بلکہ وہ تو مطلوب و مقصود ہے اور احوال مقصود نہیں گو محمود ہوں مگر اب تو ستم یہ ہے کہ لوگ نماز ہی اس لئے پڑھتے ہیں تاکہ حضور ﷺ قلب ہوا اس لئے اگر حضور نہ ہو تو نماز بے کار سمجھتے ہیں حالانکہ حضور کی سعی اس لئے ہونا چاہئے تھی۔ کہ نماز کامل ہو۔ ہاں احوال کیلئے دعا کرنا جائز ہے بس دعا کرو۔ لیکن شیخ سے ان کے عدم حصول کی شکایت نہ کرو۔ اور اگر وہ اجازت دے اور اس کا طریقہ بتلا دے تو اس کا تبرع ہے اس پر یہ بات لازم نہیں۔ پس عدم حصول احوال کی ایسی مثال ہے جیسے اولاد نہ ہوتا کہ اس لئے دعا جائز ہے او توقع کی درجہ میں تدبیر بھی جائز ہے لیکن یہ لازم ہے کہ اگر ترتب ہو جائے تو خوش ہو جاؤ اور ترتب نہ ہو تو جب بھی خوش رہو پریشان نہ ہو بلکہ سمجھو کہ میرے لئے عدم حصول ہی مصلحت مگر خود دعا میں یہ قید نہ لگا دیں کہ یا اللہ اگر حال محمود مجھے نافع ہو تو عطا ہو ورنہ نہیں عقیدہ اور عزم تو یہی رکھے کہ اگر عطا نہ ہوگا تو میں یہی سمجھوں گا کہ میرے واسطے حصول میں حکمت نہ تھی مگر دعا میں اس قید کی ضرورت نہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس کا ذمہ خود لے لیا ہے کہ اگر حصول مضر ہوگا تو ہم خود ہی نہ دیں گے۔ چنانچہ اولاد ورزق کے واسطے بھی دعا مشروع ہے مگر اس میں کہیں اس قید کی تصریح نہیں۔ اور دعائے استخارہ سے شبہ نہ کیا جائے کہ وہاں یہ تعلیم ہے کہ اگر یہ میرے واسطے خیر ہو تو میرے لئے آسان ہو جائے ورنہ میرے دل کو اس سے پھیر دیا جائے کیونکہ استخارہ کا محل ایسا امر ہے جس میں ظاہرا بھی نفع وضرر

دونوں کا احتمال ہے اور یہاں ایسی دعا کا ذکر ہے جو بظاہر نافع ہی ہے فافترقا۔ بعض لوگوں کو خود دعا میں ایک اشکال واقع ہو گیا ہے کہ دعا کرنا بظاہر خلاف تفویض ہے تفویض اسی میں ہے کہ خود کچھ نہ مانگے جو وہ چاہیں گے خود ہی عطا فرما دیں گے۔

چہ حاجت ست بہ پیش تو حال دل گفتن　　　　کہ حال خستہ دلاں را تو خوب می دانی

اے اللہ تیرے سامنے دل کے بیان کرنے کیا ضرورت ہے۔ اس لئے کہ زخمی دلوں کا حال تو خوب جانتا ہے۔

دعا تفویض کے منافی نہیں:

اس کا جواب یہ ہے کہ دعا تفویض کے خلاف جب ہو کہ داعی عدم اجابت پر راضی نہ ہو اور جب عدم اجابت پر بھی راضی ہے تو عین دعا کے وقت تفویض حال ہے۔ بہر حال غیر اختیاریہ میں دعا کی ممانعت نہیں ہاں تصدی واہتمام کی ممانعت ہے کہ اگر حاصل نہ ہوں تو شکایت پیدا ہو۔

خلاصہ وعظ:

خلاصہ یہ ہوا کہ ایک تو اعمال اختیاریہ ہیں ان کا اہتمام واجب ہے اور ثمرات آجلہ یعنی جزا کے لئے دعا بھی جائز ہے اور اہتمام بھی واجب ہے اور ایک احوال غیر اختیارہ ہیں یعنی ثمرات عاجلہ ان کے لئے صرف دعا جائز ہے اس کے علاوہ کسی قسم کا اہتمام جائز نہیں اور دعا بھی اس شرط سے جائز ہے کہ عدم عطا پر بھی راضی رہے۔ اب میں ختم کرتا ہوں اللہ تعالیٰ ہم کو فہم و عمل کی توفیق عطا فرمائیں۔ آمین۔

وصلی اللہ علیٰ سیدنا و مولانا محمد و علیٰ الہ واصحابہ اجمعین ٥



شفاء العیّ

پریشان حال کی شفاء

یہ وعظ ۱۷ جمادی الاولیٰ ۱۳۳۱ھ شب جمعۃ المبارک بمقام چوک متصل کمبوہ ہال شہر انبالہ جو حضرت والا نے بیٹھ کر ارشاد فرمایا سامعین کی تعداد تقریباً آٹھ سو تھی۔ مولوی عبدالکریم صاحب گمتھلوی نے قلم بند فرمایا۔

خطبہ ماثورہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للہ نحمدہ ونستعینہ ونستغفرہ ونؤمن بہ و نتوکل علیہ ونعوذ باللہ من شرور انفسنا و من سیئات اعمالنا من یھدہ اللہ فلا مضل لہ ومن یضللہ فلاھادی لہ.

ونشھد ان لا الہ الا اللہ وحدہ لا شریک لہ ونشھد ان محمدا عبدہ ورسولہ صلی اللہ علیہ وعلیٰ الہ واصحابہ وسلم تسلیما کثیرا کثیرا

اما بعد فقد قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم انما شفاء العی السوّل .

تمہید

جہالت کا علاج:

یہ بسلہ جس کو میں نے پڑھا ہے حدیث ہے یعنی ارشاد ہے حضور نبی کریم افضل الصلوٰۃ والتسلیم کا اس میں حضور ﷺ نے ایک نہایت ضروری مضمون ارشاد فرمایا ہے جس کی ضرورت عام اہل اسلام کو ہے جو غور کرنے سے معلوم ہوگی اور تعیین اس کی ترجمہ سے ہو جاویگی ترجمہ اس کا یہ ہے کہ بات یہی ہے کہ جہل کی شفاء سوال ہے جہل کے معنی ہیں ناواقف ہونا یعنی ناواقف ہو اس اس کی شفا سوال کرنا ہے یعنی پوچھ لینا۔ تحقیق کر لینا اس کا ترجمہ سے مقصود کی اجمالی تعیین تو ہو گئی کہ مقصود ازالہ جہالت کا طریقہ بتلانا اور اس کی ترغیب دینا ہے یعنی جہل جو ایک مرض ہے۔ حضور ﷺ اس کے زائل کرنیکی ترغیب دے رہے ہیں اور اس کا طریقہ ارشاد فرماتے ہیں اور ضرورت اس کی غور کرنے سے معلوم ہوگی اور غور کرنے کی ضرورت اس لئے ہے کہ بعض امور واقع میں ضروری ہوتے ہیں لیکن ہماری نظروں میں ضروری معلوم نہیں ہوتے اس لئے ہم ان کی تحقیق نہیں کرتے اس لئے غور کی ضرورت ہوگی تا کہ غور کرنے سے اس کا ضروری ہونا معلوم ہو جاوے۔ سو غور کی تقریر یہ ہے کہ خیال کرنا چاہئے کہ ہر مسلمان مسلمان ہونیکی حیثیت سے اطاعت الٰہیہ کو ضروری سمجھتا ہے۔ ایک مقدمہ تو یہ ہوا۔ دوسرا مقدمہ یہ کہ اطاعت بدون علم کے کیسے ہو سکتی ہے۔

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

ہے چاہے معطی کو طیب قلب ہو یا نہ ہو اور دین کے لئے چندہ کی غرض رضائے خداوندی ہے اور وہ جب نصیب ہوتی ہے کہ قواعد شرعیہ کے موافق کام کیا جاوے ورنہ بجائے رضائے باری تعالیٰ کے غضب الٰہی کا اندیشہ ہے پس اس کی کوشش بالکل ہی اکارت گئی۔ اور مقصود سے بالکل ہی محرومی ہوئی اور بڑا فرق ہے۔ اس میں جو کامیاب ہوا اور اس میں جو نا کامیاب رہا۔ البتہ گناہگار دونوں ہوئے اور فرق یہ ہوا کہ ایک کو دنیا کا تو فائدہ حاصل ہو گیا اور دوسرے کو دنیا کا بھی فائدہ نہ ہوا جس کی وجہ سے بالکل محروم ہوا پس ثابت ہوا کہ دینی چندہ میں احکام کی زیادہ رعایت کرنا چاہئے۔

مردہ کی چارپائی اور لباس وغیرہ کو منحوس سمجھ کر صدقہ کرنا:

اسی طرح احکام کی تحقیق نہ ہونے سے یہ ہوتا ہے کہ جب کوئی مرتا ہے تو دو طرح کی چیزیں ہوتی ہیں۔ ایک معمولی چیزیں جیسے چارپائی چادر وغیرہ تو عادت یہ ہے کہ ان کو للہ دیا جاتا ہے اور قیمتی چیزوں کو تقسیم کیا جاتا ہے اور دونوں چیزوں میں کوتاہی برتی جاتی ہے اس صدقہ میں تو دو خرابیاں ہوتی ہیں اول یہ کہ عموماً ان مستعمل چیزوں کو منحوس سمجھا جاتا ہے مثلاً جس چارپائی پر انتقال ہو اس کو استعمال کرنا معیوب خیال کرتے ہیں جن کپڑوں میں انتقال ہوا ہو ان کو گھر میں رکھتے ہوئے عار آتی ہے غضب ہے کہ منحوس سمجھتے ہوئے خدا کے نام پر دیتے ہیں کیونکہ نعوذ باللہ وہی اس کے لائق ہیں افسوس لوگوں کو شرم نہیں آتی جب کھانا سڑ گیا تو اللہ کے واسطے ہو گیا ورنہ اپنے کھانے کا تھا نیا کپڑا اپنے لئے تھا جب پھٹ گیا تو اللہ کے نام پر تھوپ دیا۔ غرض کہ جو شے نکمی ہو جاتی ہے وہ اللہ کے نام دی جاتی ہے حالانکہ ادھر یہ ارشاد ہے۔ لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ خیر کامل کو تم کبھی نہ حاصل کر سکو گے یہاں تک کہ اپنی پیاری چیز کو خرچ نہ کرو گے۔ حضرات صحابہؓ کی یہ حالت تھی کہ جب یہ آیت شریفہ نازل ہوئی تو ایک صحابی رسول ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ یا رسول اللہ ﷺ مجھے سب سے زیادہ محبوب باغ ہے اس کو اللہ کے راستہ میں خرچ فرما دیجئے ان کی یہ حالت تھی کہ سب سے عمدہ شے اللہ کیلئے خرچ کرتے تھے تا کہ رضائے مولا حاصل ہو اور درحقیقت یہ اللہ کی رحمت ہے کہ صدقات کو اپنی طرح منسوب کیا ورنہ وہ کسی کا محتاج نہیں اس نے مخلوق کو اپنا کوئی نفع حاصل کرنے واسطے پیدا نہیں کیا اور نہ اس کو کچھ فائدہ پہنچ سکتا ہے اس نے مخلوق کو اس لئے پیدا کیا ہے تا کہ ان کو انعام بخشے۔

من نہ کردم خلق تا سودے کنم بلکہ تا بر بندگان جودے کنم

میں نے مخلوق اس لئے نہیں پیدا کی کہ میں کوئی نفع حاصل کروں بلکہ اس لئے پیدا کیا تا کہ

اپنے بندوں پر عنایت کروں۔

وہ سب کو نفع پہنچاتا ہے سب چیزیں اور خود ہم بھی اسی کے پیدا کیے ہوئے ہیں ایسی حالت میں کتنی ستم کی بات ہے کہ اس کے پسندیدہ مواقع میں خراب چیزیں خرچ کی جاویں۔ البتہ ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا ان پرانی چیزوں کو پھینک دیں۔ جواب یہ ہے کہ پھینکو نہیں بلکہ مساکین ہی کو دے دو مگر اس نیت سے دو کہ ان کی حاجت رفع ہو اور خاص خوشنودی حق کے لئے دو تو وہ اچھی سے اچھی چیز ہونی چاہئے۔

ہدیہ کا مقصد:

اور فرق ان دونوں میں اس سے معلوم ہوگا کہ حضور رسول مقبولؐ کا معمول تھا کہ ہدیہ قبول فرماتے تھے اور صدقہ قبول نہیں فرماتے تھے پھر دریافت کرنے پر آپؐ نے فرمایا کہ صدقہ تو اللہ تعالیٰ کے خوش کرنے کے لئے جس کا مصرف فقراء ہیں اور ہدیہ میرے خوش کرنے کے لئے ہے۔ ہدیہ میں محض مہدی الیہ کا دل خوش کرنا مقصود ہوتا ہے۔ ثواب کی نیت اس میں نہیں ہوتی گویا بالواسطہ ثواب مل جاتا ہے کیونکہ تطییب قلب مسلم بھی عبادت ہے۔ لیکن براہ راست ثواب مقصود نہیں ہوتا اور صدقہ میں براہ راست ثواب ہی مقصود ہوتا ہے اور اسی واسطے اگر کسی کے پاس صدقہ بھیجیں اور وہ نہ لے تو دوسرے کو دیدیا جاتا ہے اور ہدیہ جس کے پاس بھیجا جاوے اگر وہ نہ لے تو خود کھا پی لیتے ہیں۔ یا مستقل قصد سے اور کسی کو ہدیہ دیتے ہیں جب ہدیہ اور صدقہ میں فرق سمجھ لیا تو ایسا ہی فرق گھٹیا اور بڑھیا چیز کے دینے میں بھی ہے کہ اعلیٰ شے اللہ کے نام پر ثواب کے لئے دو۔

ادنیٰ شئے مسکین کو کس نیت سے دینا جائز ہے:

اور ادنیٰ شئے کسی مسکین کو رفع حاجت کے لئے دے دو۔ گو اجر اس سے بھی مل جاوے گا مگر اللہ کے نام پر خراب شئے دینے میں جو بے ادبی تھی اس سے احتراز ہو گیا کیونکہ تم نے وہ اللہ کے نام پر نہیں دی بلکہ مسکین کو رفع حاجت کے لئے دی ہے۔ اب سب اشکالات رفع ہو گئے۔ اور سب نصوص جمع ہو گئے۔ دیکھئے احکام نہ جاننے سے اتنی کوتاہیاں ہوتی ہیں۔ اسی لئے علم کی بہت ضرورت ہے یہ تو صدقہ کی دو خرابیوں میں سے ایک خرابی کا بیان تھا کہ مردہ کے ایصال ثواب کے لئے وہ چیز دی جاتی ہے جس کو منحوس سمجھتے ہیں۔ اب اسی صدقہ کے متعلق دوسری کوتاہی بتلاتا ہوں جو عام طور پر ہوتی ہے مگر نہ دینے والوں کو اس کی خبر ہے نہ لینے والوں کو۔ افسوس بڑی غفلت ہے۔

احکام شرعیہ سے سنئے حکم شرعی یہ ہے کہ کل ترکہ میت کا مشترک ہے درمیان ورثہ کے اور مشترک مال کو بلا اجازت دیگر شرکاء کے صرف کرنا جائز نہیں۔ پس ترکہ میں کا ایک کرتہ یا پاجامہ حتی کی ٹوپی کمر بند رومال بلکہ ایک سوئی تک بھی قبل از تقسیم بلا رضامندی سب ورثہ کے کسی کو دینا جائز نہیں ہو گا مگر آج کل اس کی مطلق پرواہ نہیں۔ دیتے ہیں ثواب کیلئے اور ہوتے ہیں گناہ گار خدا بچاوے جہالت سے اور توفیق فرماوے علم وعمل کی۔ (آمین ثم آمین)

مشترکہ مال خرچ کرنے کے چند شرائط:

مشترکہ مال خرچ کرنے کی چند شرائط ہیں ایک اجازت دوسرے اجازت دینے والے کا عاقل بالغ ہونا۔ تیسرے طیب خاطر سے اجازت دینا۔ یہ شرطین یہاں بھی ملحوظ رہیں یا تینوں باتوں کو خوب دیکھنے کے بعد خرچ کیا جاوے تو جائز ہوگا ورنہ حرام یعنی سب ورثہ سے اجازت لی جاوے اور ان میں کوئی نابالغ نہ ہوں مجنون نہ ہو اور اجازت خوشی سے دے دیں اگر کسی دباؤ سے یا بنا بر رواج کے اجازت دی گئی تو وہ معتبر نہیں کیونکہ اس میں طیب خاطر نہیں ہوتی۔ بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ کسی وارث کا دل نہیں چاہتا مگر انکار میں سبکی ہوتی ہے اس لئے اجازت دی جاتی ہے۔ یادرکھو حدیث شریف میں صاف وارد ہے الا لایحل مال امرئ مسلم الا بطیب نفس منہ یعنی کسی مسلمان کا مال بدون اس کے دلی خوشی کے لینا حلال نہیں۔ پس اصل صورت تو اس کی یہی ہے کہ ترکہ تقسیم کر کے ہر شخص کا حصہ اس کو پہنچا دیا جاوے۔ سب منقول وغیر منقول کو باہم تقسیم کرلو اس طرح کہ جو چیزیں ذوات الامثال ہیں مثلاً غلہ ان کو بجنسہ بانٹ لو اور جو متماثل نہ ہوں اس کی آسان صورت یہ ہے کہ اس کی قیمت لگا لو اور اگر اختلاف ہو تو قرعہ ڈال لو۔ یا نیلام کر کے دام تقسیم کرلو غرض سب کی رضامندی سے جب پورا ترکہ تقسیم ہو چکا تو پھر جس کا دل چاہے اپنے اپنے حصہ میں سے خیرات کر دے۔ یہ بیان تھا صدقہ کی کوتاہیوں کا۔

ترکہ کی تقسیم میں چند عظیم کوتاہیاں:

اب تقسیم ترکہ کی کوتاہی سنئے اول تو جس جس وارث کو شریعت نے مستحق ٹھہرایا ہے۔ اس کے مطابق آج کل ورثہ کے حقوق ہی نہیں سمجھتے بلکہ رواج عام جس کو وارث کہے وہی حقدار قرار دیا جاتا ہے یہ پورا اور صریح مقابلہ شریعت کا جس سے کفر کا اندیشہ ہے اس سے توبہ کرو اور شریعت کے مطابق میراث تقسیم کیا کرو۔ چنانچہ آج کل بہنوں کا ترکہ میں کچھ نہیں شمار کیا جاتا اور اگر کسی نے

بہن کو حقدار سمجھا بھی تو اس سے معافی کرانے کی فکر کی جاتی ہے۔ معافی کی صورت یہ ہوتی ہے کہ وہ جانتی ہے کہ مجھے کچھ ملتا تو ہے نہیں (کیونکہ ظالموں نے قانون میں بہن کو محروم الارث کر رکھا ہے) تو بھائی صاحب سے بری کیوں بنوں وہ تو مجبور ہو کر اپنا حق معاف کر دیتی ہے اور جہاں قانونا اسے حق مل سکتا ہے (جیسا کہ اضلاع سہارنپور و مظفر نگر وغیرہ میں) وہاں بھائی صاحب سے حصہ لینے میں بدنامی سمجھی جاتی ہے اور دعویٰ کرتے ہیں متبع شریعت ہونے کا کہ ہم نے تو بہن سے کہا تھا اس نے خود ہی اپنا حق چھوڑ دیا۔

شرعاً معافی معتبر ہونے کا طریق:

پس جاننا چاہئے کہ یہ معافی معتبر نہیں البتہ اگر ہمشیرہ کو اسکا حق سپرد کر دیا جاوے پھر وہ قبضہ کے بعد بلکہ چند روز اس سے منتفع ہونے کے بعد جس سے اس کو اس کی حقیقت منکشف ہو جاوے طیب خاطر سے ہبہ کر دے تو جائز ہو سکتا ہے ورنہ بلا طیب خاطر کے یہ رسمی اجازت ہرگز معتبر نہیں (و نیز بلا تقسیم کئے ہوئے نہ ہبہ صحیح ہے اور نہ معافی معتبر کیونکہ ھبتہ المشاع اور ابراء عن الاعیان باطل ہے کما ھو مصرح فی کتب الفقہ ۱۲ جامع) اس کی وجہ بھی یہی ہے کہ اکثر لوگ ان مسائل سے یا تو ناواقف ہیں یا واقف ہیں مگر ضروری العمل نہیں سمجھتے۔ نیز یہ احکام جس درجہ اہتمام کے قابل ہیں وہ درجہ ان کے ذہن نشین نہیں۔

معاملات میں کوتاہیاں:

اس کے علاوہ اور بہت سے معاملات ہیں جنہیں احکام شرعیہ کی تحقیق نہ ہونے سے ایسا ہی برتاؤ ہو رہا ہے چنانچہ نوکری اور تجارت میں حلال و حرام کا کچھ امتیاز نہیں حتیٰ کہ بہت لوگ ناجائز کے جواز کی تمنا کرتے ہیں۔ چنانچہ ایک بیرسٹر صاحب الٰہ آباد میں کہتے تھے کہ آج کل مسلمانوں کا افلاس حرمت سود کی وجہ سے ہو رہا ہے علماء کو چاہئے کہ سود کے جواز کا فتویٰ دے دیں۔ ایک مولوی صاحب نے فرمایا کہ جب قرآن شریف میں سود کو حرام قرار دیا گیا ہے تو اہل علم کو کیا اختیار ہے جائز کہدینے کا وہ تعجب کے ساتھ بولے کہ کیا قرآن شریف میں اس کی حرمت آئی ہے مولوی صاحب نے کہا جی ہاں۔ اس نے کہا مجھے خبر نہیں میں سمجھتا تھا کہ علماء نے خود ہی حرام کر رکھا ہے۔ ان مجموعی حالات سے پتہ لگتا ہے تعلیم احکام شرعیہ کی ضرورت کا میں تو کہتا ہوں کہ اگر کوئی عمل بھی نہ کرے تب بھی مسائل کا جاننا اور پوچھنا لازم ہے

احکام کا علم نہ ہونا قابل قبول عذر نہیں:

بعض لوگ کہتے ہیں کہ احکام پوچھنا نہ چاہئے کیونکہ معلوم ہونے پر پھر خلاف کیا تو سخت گناہ ہوگا۔ اور بلا معلوم ہوئے جو کوتاہی ہو جاوے وہ قابل گرفت نہیں مگر یہ محض من گھڑت لغویات ہے کیا نعوذ باللہ خدا تعالیٰ ایسے بھولے ہیں کہ آپ کے بہلانے میں آ جاویں گے۔ کیونکہ صاحب اگر اللہ تعالیٰ یہ دریافت فرمائیں کہ تم نے خبر کیوں نہیں حاصل کی۔ جواب کیا دو گے۔ یہ عذر بے علمی کا جب مقبول ہو سکتا ہے جبکہ باوجود کوشش کے معلوم نہ ہو سکے اور جب دل میں ایک بات کے متعلق شک ہے اور بتلانے والے موجود ہیں تو پھر یہ عذر کیسے معتبر ہو سکتا ہے۔ اور ایسے باطل خیالات اور مقالات لوگوں کے ذہن اور دماغ میں دین ہی کے باب میں آتے ہیں۔ دنیا کے معاملات میں کبھی نہیں آتے چنانچہ دنیا کے احکام کو دیکھتے ہیں کہ اگر مجرم عدم علم قانون کا عذر کرے تو یہ ان کے نزدیک معتبر نہیں ہوتا۔ وہاں کوئی بھی چون و چرا نہیں سکتا وہاں تو خود ہی فتویٰ لگا دیتے ہیں کہ وکیل اور بیرسٹر موجود ہیں ملزم کو ان سے دریافت کرنا چاہئے تھا اور یہ سمجھنا کہ جان کر گناہ کرنا زیادہ عذاب کا باعث ہے من وجہ صحیح ہے مگر علی الاطلاق من کل الوجوہ غلط ہے۔

بے علم دو گناہوں کا مرتکب ہے:

کیونکہ مسلمان کے دو فرض ہیں علم اور عمل پس فرض علم کو ادا کر کے وہ ایک فرض سے تو سبکدوش ہو گیا اور بے علم دو گناہوں کا مرتکب ہے۔ پس بتلایئے دو گناہ زیادہ ہیں یا ایک یقیناً دو گناہ زیادہ ہیں البتہ جاننے والے کا عملی گناہ نہ جاننے والے کے عملی گناہ سے اشد ہوگا مگر جاننے والا بے علمی کے گناہ سے محفوظ ہوگا اور جاہل بلا عذر کو بے علمی کا گناہ بھی ہوگا۔ پس لازم ہے کہ عزم عمل کا انتظار نہ کرے بلکہ احکام دریافت کرتا رہے جب عمل کی توفیق ہوگی اس وقت یہ علم کام آوے گا۔ جیسا کہ کسی خارشی نے علاج تو نہیں کیا مگر مجرب نسخہ یاد کر لیا ہے۔ سو یہ بھی مفید ہے کیونکہ جب کبھی اس کو علاج کی طرف توجہ ہوگی تو نسخہ پاس موجود ہے علاج کر لے گا اور اگر نسخہ بھی یاد نہیں تو مشقتیں اٹھانا پڑیں گی۔ ایک نسخہ تلاش کرنے کی اور دوسرے دوا استعمال کرنے کی۔ پس اسلم یہی ہے کہ ہر حال میں احکام شرعیہ معلوم ہو جاویں۔

مسائل دریافت کرتے رہنے کی ضرورت:

صاحبو! عمل میں تو دشواری بھی ہے مگر دریافت کرنے میں کیا مشقت ہے۔ جس کو حرمت

رشوت کا اجمالاً علم ہے اس کو ترک رشوت تو بے شک کسی قدر دشوار ہے لیکن اس کے تفصیلی مسائل پوچھنے میں کیا تکلیف ہوگی۔ جان کر گناہ کرنا بے شک زیادہ برا گناہ ہے مگر جو پوچھ پاچھ کر کے قادر ہو جانے پر وہ بھی جاننے والے کے برابر ہے اس کے گناہ کے کمی پر کوئی دلیل نہیں اس کی مثال ایسی ہے کہ کوئی شخص قصداً رمضان کا چاند نہ دیکھے تو کیا جب تک یہ اپنی نظر سے چاند نہ دیکھے گا اس پر روزہ فرض نہ ہوگا۔ البتہ اگر انتیس کو بوجہ ابر وغیرہ کے باوجود تلاش کے نظر نہ آیا تب معذور ہے پس جو شخص دریافت کر سکتا ہے اس پر دریافت کرنا واجب ہے اور اگر نہ کرے گا تو اس کو ایسا ہی گناہ ہوگا جیسا مسئلہ جان کر عمل نہ کرنے میں گناہ ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ حیثیت میں مختلف ہوں ایک حیثیت سے بے علمی کا گناہ زیادہ ہو اور دوسری حیثیت سے جان بوجھ کر معصیت کرنے کا زیادہ گناہ ہو۔ بعض لوگ وعظ میں اس لئے نہیں جاتے کہ مسئلہ سنکر عمل کرنا پڑے گا۔ سبحان اللہ اور کیا باوجود قدرت علی تحصیل العلم کے تم کو عدم علم کا گناہ ہوگا غرض کہ لوگ تحقیق کو یعنی مسائل پوچھنے کو ضروری نہیں سمجھتے اس بلا میں سب مبتلا ہیں اسی واسطے اس بیان کی ضرورت ہوئی۔ الحمدللہ کہ اب مضمون کی تعیین بھی ہو گئی اور اس کی ضرورت بھی ثابت ہو گئی۔ اب حدیث کی شرح عرض کرتا ہوں سو حدیث کے تین اجزا ہیں اور ہر ایک میں جداگانہ فائدہ ہے اور ہر فائدہ ایک علم مستقل ہے۔

جہالت ایک مرض ہے:

چنانچہ اول فائدہ یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ نے شفاء کی اضافت جہل کی فرمائی ہے جس سے جہل کا مرض ہونا معلوم ہو گیا۔

امراض باطنی کو مرض نہ سمجھنا جہالت ہے:

یہ بات اس لئے بتلانا ضروری ہے کہ لوگ عموماً اس مرض سے غافل ہیں۔ امراض جسمانی کو تو لوگ مرض سمجھتے ہیں مگر روحانی مرض کو مرض ہی نہیں جانتے۔ اگر کسی کو دق یا سل ہو جائے تو مزاج پرسی کے جواب میں مریض ہونا ظاہر کیا جاوے گا اور اگر ان امراض مذکورہ سے محفوظ ہوں تو ہمیشہ یہی کہتے رہتے ہیں کہ الحمدللہ اچھا ہوں چاہے باطن میں کتنے ہی امراض ہوں۔ امراض باطنہ کی تو پرواہ ہی نہیں کی جاتی۔ ایک بزرگ فرماتے ہیں

چند خوانی حکمت یونانیاں ۔۔۔ حکمت ایمانیاں راہم بخواں

صحت ایں حس بجوئید از طبیب ۔۔۔ صحت آں حس بجوئید از حبیب

یونانی حکمت کی کتابیں کب تک پڑھتے رہو گے۔ کچھ حکمت ایمانی یعنی معرفت پڑھو۔ اس حس جسمانی کی درستی چاہتے ہو تو طبیب جسمانی سے رجوع کرو۔ اور اگر حس روحانی کی درستی منظور ہے تو مرشد کامل سے رجوع کرو۔

امراض روحانی زیادہ مہلک ہیں:

یعنی ایک حواس ظاہری ہیں ایک باطنی پس باطنی یعنی قلب کی اصلاح اہل اللہ سے ڈھونڈو حق تعالیٰ فرماتے ہیں شِفَآءٌ لِّمَا فِي الصُّدُوْرِ ۔ کہ قرآن پاک شفاء ہے۔ امراض قلب کے واسطے اس سے بھی امراض باطنہ کا اثبات ہوتا ہے۔ غرض یہ جہل بھی ایک مرض ہے اور مرض بھی شدید بلکہ اشد کیونکہ امراض جسمانی کا انجام تو صرف ہلاک دنیوی ہی ہے۔ اور ہلاک دنیوی کی حقیقت کیا ہے کچھ بھی نہیں بلکہ وہ تو دراصل جملہ امراض سے فارغ ہو جاتا ہے اسی کے بعد وہ حیات ہے جو بناپر اخبار صادق منقطع ہی نہیں ہو سکتی بخلاف مرض روحانی کی کہ اس کا انجام اخروی ہے جو یا ابدی ہے یا غیر ابدی ممتد ارشاد ہے۔ اِنَّ يَوْمًا عِنْدَ رَبِّكَ كَاَلْفِ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ ۔ وہاں تو ایک دن کی سزائے قید ہزار برس کے برابر ہے اور پھر امتداد کے ساتھ وہاں کی قید میں اشتداد بھی ہے چنانچہ حدیث میں ہے کہ وہاں کی آگ یہاں کی آگ سے ستر حصہ زیادہ تیز ہے جب اسی آگ کی برداشت نہیں ہو سکتی تو اس کی کیسے ہوگی تمام بدن تو درکنار ایک دیا سلائی کی آگ انگلی تک پہنچ جائے تو تحمل نہیں ہوتا اور وہ آگ تو محیط ہوگی کہ انسان اس میں غرق ہوگا اور رگ و پے تک آگ پہنچے گی اس کی برداشت کیسے ہو سکتی ہے اور کون برداشت کر سکتا ہے۔ اور کافر کیلئے تو عذاب ابدی ہے یعنی ہمیشہ جہنم میں رہیں گے ہرگز ہرگز کسی طرح رہائی نہ ہو سکے گی۔

دین کا مذاق اڑانا بھی کفر ہے:

اور یہ بات بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ کافر وہ ہے جو کفر کا کام کرے یا کفر کی بات کہے اگرچہ عقائد کفریہ نہ ہوں پس اگر کوئی مسلمان کفر کا کام کرے گا جیسے بلا عذر زنار پہن لینا وہ بھی کافر ہو جاوے گا۔ یا جب زبان سے کلمہ کفر کہا فوراً کفر عائد ہو جاوے گا۔ اس سے بھی آج کل نہایت بے پرواہی ہو رہی ہے مثلاً بعض لوگ کہہ دیتے ہیں کہ روزہ وہ رکھے گا جس کے پاس کھانے کو نہ ہو اور کچھ خیال نہیں ہوتا کہ ہم نے کس درجہ کا گناہ کیا حالانکہ وہ کافر ہو گیا۔ اب یا تو اس کو اپنے کفر کی خبر نہیں یا خبر ہے مگر کفر کو خفیف خیال کرتا ہے اور درحقیقت یہ کلمہ بہت شدید اور

سخت ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ ہم نے تو مذاق میں کہا تھا تو سن لو کہ دین سے مذاق کرنا بھی کفر ہے حق تعالیٰ کا ارشاد ہے قُلْ اَبِاللّٰهِ وَاٰيٰتِهٖ وَرَسُوْلِهٖ كُنْتُمْ تَسْتَهْزِءُوْنَ (کہہ دیجئے کہ تم اللہ تعالیٰ اس کی نشانیوں اور اس کے رسولوں کا مذاق اڑاتے تھے) اس سے صاف معلوم ہوا کہ احکام شرعیہ کے ساتھ تمسخر کرنیوالا بھی کافر ہے۔

کافر بنانا اور کافر بتانا میں فرق:

پھر اس پر ایک اور ستم ہے وہ یہ کہ آج کل کوئی عالم یہ فتویٰ دیتا ہے کہ تم کافر ہو گئے تو اس پر لوگ اعتراض کرتے ہیں یہ کیسے مولوی صاحب ہیں جو مسلمانوں کو کافر بناتے ہیں اے صاحب خبر بھی ہے کہ بنانے کے کیا معنی ہیں بنانے کی معنی ہیں تعلیم دینا چنانچہ مسلمان بنانے کے معنی سب کے نزدیک یہی ہیں کہ کافر کو اسلام کی تعلیم دینا تم جو مولویوں پر اعتراض کرتے ہو کہ یہ مسلمانوں کو کافر بناتے ہیں تو کیا وہ کسی کو کفر کی تعلیم کرتے ہیں ہرگز نہیں ہاں وہ دلیل کی بناء پر کسی کو کافر ضرور کہتے ہیں کہ کافر کہنا کافر بنانا نہیں دیکھو کافروں کو مسلمان کہہ دینے پر کسی کے نزدیک بھی مسلمان بنانا صادق نہیں آتا بلکہ کافروں کو اسلام کی تعلیم دینے سے البتہ کہا جاوے گا کہ اس نے فلاں کافر کو مسلمان بنایا ہے اسی طرح کافر بنانے کے یہی معنی ہوں گے کہ کسی شخص کو کفر کی بات سکھادیں تو ایسا کسی عالم کو دیکھا ہے اور اگر فتویٰ دیا تو اس کو کافر بنانا (نون سے) نہیں کہہ سکتے البتہ یہ تو کافر بتانا (تا سے) ایک نقطہ کا فرق ہے (اس نکتہ کو یاد رکھنا) پس یہ الزام علماء پر خوانخواہ کا ہے بلکہ وہ تو خیر خواہی کرتے ہیں کہ تمہارے قول و فعل کا انجام بتلا کر اس سے محفوظ رہنے کا طریقہ سکھاتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ تم مسلمان رہو تو درحقیقت وہ مسلمان بناتے ہیں اور یہی ان کا کام ہے تاکہ مسلمان اس کفر سے محروم رہیں خصوصاً وہ لوگ جو علوم معاش میں ترقی کر رہے ہیں ان کا تو رات دن یہی شیوہ ہے کہ شریعت کا استہزا و استخفاف کرتے رہتے ہیں۔

شریعت کی بے تمیزی پر علماء کا غصہ بجا ہے:

چنانچہ ایک بڑی لیاقت کے تعلیم یافتہ نے میرے سامنے ایک حدیث شریف کا مضمون سنکر کہا کہ مسلمانوں کو جولاہوں جیسے عقیدے سکھائے جاتے ہیں اس کا کفر ہونا تو بالکل ہی ظاہر ہے اور بعض تعلیم یافتہ استہزاء و استحقار کے عنوان سے تو نہیں بلکہ رفع شبہ کے طور پر علماء کے سامنے مسائل شرعیہ پر اعتراض کرتے ہیں۔

رفع شبہ کی دو صورتیں:

مگر سن لو کہ رفع شبہ کی دو صورتیں ہیں ایک ادب کے عنوان سے اور ایک عناد کے ساتھ آج کل اکثر عناد اور استخفاف کے شبہات پیش کرتے ہیں۔

شریعت کی بے تمیزی پر علماء کا غصہ بجا ہے:

اور جب علماء کو ان کی بے تمیزی کی باتوں پر غصہ آتا ہے تو پھر کہتے ہیں کہ غصہ کرنے لگے ہم کو جواب نہیں دیا۔ سبحان اللہ جب شریعت کے ساتھ گستاخی سن کر علماء کو غیرت آتی ہے تو اس کو بد مزاج کہا جاتا ہے۔ صاحبو! جب اپنے اپنے ماں باپ کی شان میں کسی کو گالی دیتے ہوئے سن کر جامہ سے باہر ہو جاتے ہو تو کیا خدا کی اتنی وقعت بھی علماء کے قلوب میں نہ ہو کہ ان کی بے ادبی سن کر انہیں غصہ آ جاوے۔ غرض ان سب واقعات کی وجہ وہی مرض جہالت ہے مگر اس پر بھی لوگوں کو تندرست ہونے کا دعویٰ ہے پھر مگر غور سے سن لو کہ عذاب نار کی ابدیت اسی کے ساتھ خاص نہیں جس کو سب لوگ کافر سمجھتے ہوں بلکہ جو شخص بھی کفر کرے اس کی یہ سزا ہے کہ ہمیشہ جہنم میں رہے گا۔ جب امراض روحانی کا یہ انجام ہے تو بتلاؤ مرض جسمانی اشد ہوا یا روحانی۔

امراض جسمانی سے گناہ معاف ہوتے ہیں:

بلکہ مرض جسمانی پر تو ثواب دیا جاتا ہے بخار سے گناہ اس طرح جھڑتے ہیں جیسے خزاں میں درختوں سے پتے گرتے ہیں۔ حتیٰ کہ اگر کسی کے کانٹا لگ جاوے اس پر بھی حق تعالیٰ اجر عطا فرماتے ہیں بخلاف اس مرض روحانی کے کہ اس میں ثواب تو درکنار الٹا خدا کے غضب اور عذاب کا مستحق ہو جاتا ہے مگر افسوس کہ اسکو بیماری ہی نہیں سمجھتے حتیٰ کہ اس کی سزا کو دیکھ کر ذہن میں یہ بات نہیں آتی چنانچہ جب کوئی جسمانی بیماری ہم کو لاحق ہوتی ہے تو یہ خیال بھی نہیں ہوتا کہ یہ ہمارے افعال کا نتیجہ ہے بلکہ آب و ہوا خراب ہونے کی طرف گمان کیا جاتا ہے اور اسی کی صفائی کا اہتمام ہوتا ہے اور امراض باطنہ کی طرف اور اصلاح اعمال کی جانب اصلا توجہ نہیں کرتے حالانکہ بعض امراض جسمانیہ مسبب ہو جاتے ہیں امراض روحانیہ یعنی معاصی اور سبب نہیں ہوتے امراض روحانیہ کے کیونکہ وہ اپنی ذات میں رحمت ہیں۔ البتہ اگر سوء فہم سے مرض میں شکایت کی تو اس عارض کے سبب گناہ نہ ہوگا۔ باقی فی نفسہ مرض جسمانی سبب رحمت ہی ہے۔ عدم تحمل سے کوئی سخت

کلمہ کہ دیا۔ سو یہ قح بالواسطہ ہے کہ جو اس کے تصرف سے پیدا ہو گیا غرض امراض جسمانی اور امراض روحانی میں ایک طرف سے سببیت و مسببیت کا خاص علاقہ ہو جاتا ہے جیسا کہ خود امراض جسمانی بھی ایک دوسرے مرض میں علاقہ قائم کیا جاتا ہے مثلاً زکام کو بخار کا سبب قرار دیکر زکام کا علاج کرتے ہیں مگر روحانی اور جسمانی مرض میں علاقہ کا اعتقاد نہیں کرتے حالانکہ حق تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں وَمَآ اَصَابَكُمْ مِّنْ مُّصِيْبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ اَيْدِيْكُمْ. یعنی تم کو جو مصیبت پہنچتی ہے وہ تمہارے ہاتھوں کے کرتوت کی بدولت ہے پس معلوم ہو گیا کہ امراض روحانی یعنی معصیت کبھی سبب ہو جاتا ہے امراض تکالیف جسمانی کا بعض روایا تکا ترجمہ کرتے ہوئے مولانا رومی کا ارشاد ہے۔

ابر نا ید از پئے منع زکوت　　　　وز زنا افتد وبا اندر جہات

زکوۃ ادا نہ کرنے سے بادل نہیں آتے اور زنا سے پورے اطراف میں مصیبت آجاتی ہے۔
لوگ کہتے ہیں کہ اس میں جوڑ نہیں۔

امراض جسمانی وروحانی میں تعلق:

صاحبو! جوڑ اچھا خاصہ ہے مگر جو علم شریعت اور حقیقت سے بے بہرہ ہو اس کی سمجھ میں نہیں آتا۔ اس کی توضیح ایک مثال سے ہو جاوے گی وہ یہ کہ جس شخص کو یہ معلوم ہو کہ پھانسی کسی جرم کی وجہ سے ہوا کرتی ہے اس نے کسی کو پھانسی پر لٹکا ہوا دیکھا اور کسی کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ اس نے ایک خون کر دیا تھا وہ سبب ہوا اس کی موت کا وہ کہتا ہے یہ بالکل غلط ہے بلکہ میں بتلاتا ہوں میں نے خود دیکھا ہے کہ اسکے گلے میں ایک رسی ڈال کر پاؤں کے نیچے سے تختہ کھینچ دیا تھا اسکا گلا گھٹا اور مر گیا یہ سبب ہے اسکی موت کا اور کسی کو مار دینے اور اس کی جان جانے میں کچھ علاقہ اور جوڑ نہیں ہے اس وقت عقلمند اور قانون اس پر ہنستا ہے اور کہتا ہے کہ دراصل اس کے جرم ہی پر حاکم نے حکم دیا کہ گلے میں رسی ڈال کر تختہ کھینچ لو اصل سبب یہی جرم ہے کہ اس نے خون کیا تھا پس جس طرح اس ناواقف کو سب بیوقوف بنائیں گے اور خون کرنے اور پھانسی دیے جانے میں جوڑ کا پختہ یقین کرتے ہیں اسی طرح طاعون وغیرہ میں اور گناہوں میں پورا جوڑ ہے وہاں حکم حاکم سے یہ سب کچھ ہوا تو یہاں بھی معاصی کی سزا میں حاکم حقیقی کے حکم سے جراثیم پیدا ہوئے اور اس سے طاعون پھیلا اس میں کونسی باریکی ہے جو آپکو سمجھ نہیں آتی۔ دیکھا آپ نے کہ مرض روحانی اور

مرض جسمانی میں کیسا علاقہ ہے تعجب ہے کہ اس کی طرف اصلاً التفات نہیں اور ناخواندہ حضرات کی تو کیا شکایت افسوس یہ ہے کہ تعلیم یافتہ طبقہ بھی اس سے غافل ہے (خصوصاً طالبان علم دین کی غفلت زیادہ قابل تاسف ہے) بہر حال ایک تو یہ حالت ہے کہ مطلقاً باطنی امراض کو مرض ہی نہیں سمجھا جاتا اور اگر سمجھتے بھی ہیں تو سب امراض کو امراض نہیں سمجھتے چنانچہ اختلال فی العمل یعنی بدعملی کو تو گناہ سمجھتے ہیں مثلاً نماز نہ پڑھے تو اس کو گناہ گار جانتے ہیں لیکن اختلال فی العلم یعنی ترک علم کو گناہ ہی نہیں خیال کیا جاتا مثلاً ایک شخص نماز پڑھتا ہے اور اس کے مسائل نہیں سیکھتا تو اس کو کوئی گناہ نہیں جانتا حتیٰ کہ (خطا معاف) جو علم دین حاصل کر رہے ہیں ان کے ذہن میں بھی یہ بات نہیں کہ ہم کو مرض جہل سے شفا حاصل کرنے کی قصد علم حاصل کرنا چاہیے مگر تاہم ان کو مرض جہالت سے شفا تو ہو جاوے گی کیونکہ دوا پینے والا تندرست ہو جاتا ہے گو نیت کچھ ہی ہو۔ البتہ اس نیت سے پڑھتا کہ مرض جہل دور کرنے کیلئے خدا تعالیٰ نے تحصیل علم فرض کردی ہے اور میں اس فرض کو ادا کر رہا ہوں تو اور زیادہ اہتمام کرتا ہے بخلاف اس شخص کے جو مقتداء وغیرہ بننے کیلئے پڑھتا ہے اس کو علم کا اتنا اہتمام نہ ہوگا دوسرے یہ کہ اس کو ضروری اور غیر ضروری علوم میں امتیاز ہوگا اور اس کو نہ ہوگا پس اس کا انجام یہ ہوگا کہ ؎

مولوی گشتی و آگاہ نیستی | خود کجا و از کجا و کیستی

مولوی بن گئے اور واقفیت حاصل نہیں خود کہاں سے کہاں کون ہے؟

اور فرماتے ہیں ؎

ایہا القوم الذی فی المدرسہ | کل ما حصلتموہ وسوسہ
علم نبود غیر علم عاشقی | ماقبی تلبیس ابلیس شقی
علم رسمی سربسر قیل ست وقال | نے ازو کیفیتی حاصل نہ حال
علم چہ بود آنکہ رہ بنمایدت | زنگ گمراہی زدل بزدایدت
ایں ہوسہا از سرت بیروں کند | خوف وخشیت دردلت افزوں کند
تو ندانی جز یجوز و لا یجوز | خود ندانی کہ تو حوری یا عجوز

اے وہ لوگوں جو مدرسہ میں علم حاصل کرتے ہو جو کچھ بھی تم نے حاصل کیا ہے وہ وسوسہ ہے۔ سوائے علم عاشقی کے اور کوئی علم کارآمد نہیں باقی تمام علوم ابلیس کی تلبیس ہے۔ رسمی علم سراسر قیل وقال ہے اس سے نہ تو کوئی کیفیت حاصل ہوتی ہے اور نہ کسی قسم کا حال پیدا ہوتا ہے۔ علم وہ

ہے جو تجھے راستہ دکھلائے۔ اور تیرے دل میں سے گمراہی کے زنگ کو دور کردے۔ یہ علم تمام خواہشات نفسانی کو باہر نکال دیتا ہے اور خوف وعاجزی کو تیرے دل کے اندر زیادہ کرتا ہے تو سوائے جائز اور ناجائز کے کچھ نہیں جانتا اور تو نہیں جانتا کہ دوشیزہ ہے یا بوڑھی عورت۔

علماء کے غیر مقصود میں مشغول ہونے پر اظہار افسوس:

اگر زواہد ثلثہ میں سے (جو کہ دراصل زوائد ہیں) ایک بھی کم ہو جاوے تو اس کو قلق ہوتا ہے اور اگر دینیات میں سے جلالین آدھی ہوئی اس وقت یہ خیال نہیں ہوتا کہ ہم پورے مولوی نہیں ہوئے بلکہ مطالعہ ہی کو کافی سمجھتے ہیں (اور اکثر تو مطالعہ کو بھی لازم نہیں جانتے) حالانکہ تفسیر بالرائے کی سخت ممانعت آئی ہے ہاں اگر منقولات میں تبحر کے باوجود قواعد کو ملحوظ رکھتے ہوئے ذوق سے کچھ بیان کرے تو وہ مقبول ہے لیکن جس کو قرآن کی خبر ہی نہیں حالت یہ ہے کہ ترجمہ بھی درست نہ ہوسکے مگر تفسیر کرنے کو تیار ہیں وہ تفسیر بالرائے اور محل وعید ہے۔ علم دین میں یہ کیفیت اور زوائد ثلثہ سب کو یاد کرنا لازمی ہے افسوس یہ ہماری حالت ہے کہ جو عالم دین کہلاتے ہیں۔ وجہ یہ کہ غایت کو پیش نظر نہیں رکھا بلکہ غیر مقصود میں مشغول ہوگئے۔ اسی واسطے فرماتے ہیں

جملہ اوراق وکتب درنارکن　　　سینہ را از نور حق گلزار کن

اس میں علوم زائدہ اور مضرہ مراد ہیں اور استغراق عرفی ہے حقیقی نہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ ہم جہل کو مرض اور معصیت نہیں جانتے اس لئے علوم کی طرف توجہ نہیں اور توجہ کے بعد ہی ضروری اور غیر ضروری میں امتیاز نہ کرنے کا مرض تو عوام وخواص سب ہی میں ہے۔ چنانچہ عوام کی یہ حالت ہے کہ جب کوئی عالم آیا تو اختلافی مسئلوں میں اس کا امتحان شروع کردیتے ہیں۔

گیارہویں کے سائل کو حضرت حکیم الامتؒ کا جواب:

میں ایک جگہ گیا تو ایک شخص نے گیارہویں کے متعلق سوال کیا میں نے جواب دیا کہ استفادہ مقصود ہے یا امتحان اگر استفادہ کی ضرورت ہے تو اس کے لئے اعتماد شرط ہے کیونکہ جس پر اعتماد نہیں ممکن ہے کہ وہ مسئلہ بتلا دے۔ اور اعتماد کے لئے واقفیت شرط ہے اور آپ میری اصلی حالت سے ناواقف ہیں۔ پس جن حضرات سے آپ کی واقفیت ہے ان سے دریافت کیجئے اور اگر امتحان مقصود ہے تو میرا امتحان میرے اساتذہ لے چکے ہیں۔ آپ کو اس کا کوئی حق نہیں (یہ جواب حضرت والا نے اس واسطے دیا کہ قرائن سے اس سائل کی نیت معلوم کرلی تھی کہ محض امتحان

مقصود ہے ورنہ یہ مطلب نہیں کہ ناواقف کو بالکل مسئلہ نہ بتلایا جائے) ایسے ہی واقعات کی بنا پر میں سخت مزاجی میں بدنام ہوں مگر میں کیا کروں جبکہ ایسے لوگوں کو تحقیق ہی مقصود نہیں ہوتی بلکہ محض یہ معلوم کرنا مقصود ہوتا ہے کہ اس کا مسلک کیا ہے اور جب جواب ملنے سے مسلک کا علم ہو گیا تو پھر مجیب سے کہتے ہیں کہ فلاں عالم تو اس کے خلاف کہتے ہیں پھر اس مجیب نے اتفاقاً اس کو برا بھلا کہہ دیا۔ اس کو وہاں پہنچاتے ہیں اب دونوں میں لڑائی پیدا ہو گئی یہ نتیجہ ہے کہ ان کی تحقیق کا حالانکہ جس سے تحقیق کی جاوے اس کے اعتقاد کی یہ حالت ہونا چاہئے۔

دلا را ئے کہ داری دل درو بند   دگر چشم از ہمہ عالم فرو بند

اگر تم محبوب رکھتے ہو تو دل کا تعلق اسی سے رکھو اور اپنی نگاہ کو سارے عالم سے بند ہی کرلو

ہمہ شہر پر زخوباں منم وخیال ما ہے   چہ کنم کہ چشم بدخونکند بکس نگاہے

سارا شہر حسینوں سے بھرا ہوا ہے اور میں ایک چاند کے خیال میں مست ہوں کیا کروں کہ چشم بدخو کی نظر کسی پر بھی نہ پڑی۔

ایسا تعلق ہو تب دریافت کرنا مفید ہوگا مگر بات یہ ہے کہ ضروری وغیر ضروری میں امتیاز جب کریں جب کہ جہل کو معصیت سمجھتے ہوں جو شخص بیمار ہوگا اس کو فضول باتوں کی کب فرصت ہو گی بلکہ وہ تو اپنے مرض کی دوائیں حکیم سے پوچھے گا نہ یہ کہ شلجم کا اچار کیسے بنتا ہے اور اگر کسی کو اچار ہی کی ترکیب معلوم کرنا ہو تو باورچی سے دریافت کرو طبیب سے کیوں پوچھتے ہو۔ اب علماء کے ساتھ یہ برتاؤ ہو رہا ہے جیسا کہ سنارے کے پاس کھرپا بنوانے جاویں اور علماء سے تو یہی برتاؤ ہے کہ ان سے کوئی فضول مسئلہ ہی پوچھے گا لیکن ہوگا تو وہ ظاہر میں مسئلہ ہی۔

صوفیاء سے بالکل لایعنی سوال:

مگر صوفیہ سے تو ایسی باتیں پوچھتے ہیں جو ظاہر میں بھی دین نہیں مثلاً یہ کہ ہمارے باپ کی نوکری کب لگے گی چنانچہ مجھے ایک شخص نے خط لکھا کہ میں دوا کی دکان کروں یا نانوں کی۔ میں نے جواب میں لکھا کہ میرا باپ نہ عطار تھا نہ کھٹ بنا جو میں اس میں مشورہ دوں

ما قصہ سکندر ودارا نخواندہ ایم   از ما بجز حکایت مہر ووفا مپرس

ہم نے سکندر اور دارا کا قصہ نہیں پڑھا ہے ہم سے سوائے مہربانی اور وفا کے کچھ نہ پوچھ۔
ہم سے تو محبوب حقیقی کے راضی کرنے کا طریقہ دریافت کرو۔ بعض لوگ یہ خیال کرتے ہیں

[illegible]

[illegible] [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] [illegible]

[illegible]

[illegible]

خواب کی حقیقت:

حالانکہ حقیقت محض یہ ہے کہ وہ مبشرات سے ہے یعنی ایک دل خوش کرنے والی بات ہے۔ باقی قرب تو اعمال سے بڑھتا ہے کہ وہ مبشرات سے نہیں اکثر لوگ گو خواب کو عقیدۃً ظنی سے جانتے ہیں لیکن حالاً اس کے یقینی کا سا برتاؤ کرتے ہیں اور خوابوں پر صاحب کمال ہونے کا دعویٰ کرنے لگتے ہیں میرا معمول ہے کہ جب کوئی اس خیال کا آدمی تعبیر دریافت کرتا ہے تو جواب میں یہ شعر لکھ دیتا ہوں

نہ شبم نہ شب پرستم کہ حدیث خواب گویم چو غلام آفتابم ہمہ زآفتاب گویم

نہ میں رات ہوں نہ شب پرست ہوں کہ خواب کی بات کروں جبکہ میں اپنے محبوب حقیقی کا غلام ہوں اس لئے محبوب حقیقی کے بارے میں بات کرتا ہوں یہ تو اس خواب کا حکم ہے جو واقع میں خواب ہو اور ایسا خواب خود بہت کم ہوتا ہے اگر فقط خیال ہی ہے جب تو اس کی طرف متوجہ ہونا محض ہی بے کار ہے بعض دفعہ عوام کو خواب کے متعلق یہ شبہ ہو جاتا ہے کہ پہلے سے ایسی شئے نہ دیکھی اس لئے یہ خیال کا کام نہیں خواب ہی ہے حالانکہ قوت متخیلہ جو کام بیداری میں کرتی ہے اس سے کہیں زیادہ خواب میں کرسکتی ہے۔ اس کی تو یہ حالت ہے کہ کہیں کی اینٹ کہیں کا روڑا بھان متی نے کنبہ جوڑا۔ مثلاً کبھی دوسر کا آدمی خواب جوڑ کر کھڑا کر دیا اس لئے اصل بات یہ ہے کہ خواب تو ہوتا ہے اولیاء و اتقیاء و صلحا کا اور ہمارا خواب تو محض خیالی گھوڑ دوڑ ہوتی ہے۔ پس معمول یہ چاہئے کہ اگر اچھا خواب دیکھے تو خوش ہو اور شکر کرے اور اگر برا دیکھے تو آنکھ کھلنے پر تین بار بائیں طرف تھتکار دے اور اعوذ باللہ پڑھے حدیث شریف میں آیا ہے۔ لن تضرہ ابداً کہ اس کہ بعد وہ خواب ہرگز اس کو نقصان نہ پہنچاوے گا اور ایسے خواب کی نسبت یہ بھی ارشاد ہے کہ لاتحدث بہ احد یعنی کسی سے اس کا ذکر نہ کرو اور دعا کرو کہ خدا اس کے شر سے محفوظ رکھے اور اگر کوئی انوکھا خواب دیکھو تو ذکر کر دینے میں مضائقہ نہیں اگر ساتھی بے تکلف ہے تو پہلے یہ عرض کر دیا جاوے کہ اگر خیال مبارک میں کوئی تعبیر آوے تو بتلا دیجئے ورنہ خیر۔

شیخ کا فرض منصبی خواب کی تعبیر دینا نہیں:

کیونکہ ان کا فرض منصبی یہ نہیں ہے کہ تعبیریں دیا کریں بلکہ ان کا اصلی کام تو قرب خداوندی کا طریق تعلیم کرنا ہے اس کے سوا اور کسی قسم کا عقیدہ خواب کے متعلق نہ رکھنا چاہئے۔ اسی طرح

آجکل بزرگوں سے سفارش کراتے ہیں اور اس باب میں بھی عام غلط فہمی ہو رہی ہے۔

سفارش کی حقیقت:

سفارش کی حقیقت تو یہ ہے کسی کے واسطے کلمۃ الخیر کہہ دیا وہ مانے یا مانے اور اگر انکار کرے تو سفارش کرنے والا برا نہ مانے چنانچہ حدیث سے اس کا پتہ چلتا ہے۔ حضرت بریرہؓ ایک لونڈی تھیں جن کو حضرت عائشہ صدیقہؓ نے آزاد کر دیا تھا اور یہ مسئلہ ہے کہ جب باندی آزاد ہو جاوے تو اس کو اختیار ہے کہ نکاح سابق کو باقی رکھے یا فسخ کر دے پس اس اختیار کی بنا پر حضرت بریرہؓ نے نکاح سابق کو فسخ کر دیا۔ ان کے خاوند کو نہایت محبت کے سبب بہت رنج ہوا حضرت رسول اکرم ﷺ نے بریرہؓ سے ان کے خاوند کے متعلق فرمایا کہ اے بریرہ تم اپنے خاوند سے رجوع کرو تو اچھا ہے بریرہؓ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ ﷺ یہ آپ کا حکم ہے یا سفارش حضورؐ نے فرمایا کہ میں سفارش کرتا ہوں عرض کیا کہ اگر محض سفارش ہے تو منظور نہیں کرتی وہ جانتی تھیں کہ سفارش کا قبول کرنا ضروری نہیں اور اگر حکم ہوتا تو ضرور عمل کرتیں اسی لئے تو جواب دینے سے پیشتر دریافت کیا یہ ہے حقیقت سفارش کی اور آپ نے ذرا برا نہیں مانا مگر آج کل اگر کوئی سفارش کو نہ مانے تو پیر صاحب پیٹ بھر ناراض ہو جاتے ہیں اس لئے مریدوں کو ان کی سفارش ضروری پوری کرنی پڑتی ہے چاہے کتنی ہی مشقت اٹھانا پڑے تو اس حالت میں سفارش اپنی حقیقت پر کہاں رہی جب کہ اس کی یہ حالت ہو گئی کہ اگر سفارش پر عمل ہو تو عمل کرنیوالے کو کلفت اور اگر عمل نہ ہو تو سفارش کرنے والے کو کلفت ایسی سفارش کے تو جواز میں بھی کلام ہے۔ بعض لوگ ان شبہات کو سن کر بھی کہتے ہیں کہ کسی کا کام ہو جاوے تو اچھا ہی ہے۔ میں کہتا ہوں کہ آپ کا کام کرنا جو کہ مستحب تھا اور دوسرے کو تکلیف دینا جو کہ حرام ہے کونسی اچھی بات ہے کہ حرام کا ارتکاب کیا جاوے یہ خرابی اسی کی ہے کہ ضروری اور فضول یا مضر میں لوگوں کو امتیاز نہیں۔ بزرگوں سے بجائے تحقیق دین کے کہ ان کا اصل منصب ہے فضول یا ناجائز کام لیتے ہیں چنانچہ ایک عالم سے کسی نے حضور ﷺ کے والدین شریفین کے ایمان کی نسبت سوال کیا۔ انہوں نے فرمایا کہ نماز کے فرض تم کو یاد ہیں جواب دیا کہ نہیں فرمایا فرائض نماز یاد کرو جن میں سے اگر کوئی متروک ہو جائے تو نماز ہی نہ ہو اور نماز وہ چیز ہے کہ قیامت میں سب اول اسی کی باز پرس ہو گی اور حضورؐ کے والدین کے متعلق تو کچھ سوال بھی نہ ہو گا۔ جناب رسول اللہ ﷺ ارشاد فرماتے ہیں من حسن اسلام المرء ترکہ مالا یعنیہ

یعنی اسلام کی خوبی یہ ہے کہ آدمی فضول کو ترک کردے اور کوئی وجہ تو ہے کہ حضورؐ نے مسئلہ تقدیر میں گفتگو کرنے کی ممانعت فرمائی کیا حضرات صحابہؓ اس کو سمجھ نہ سکتے تھے۔ حالانکہ ہم جیسے بھی کچھ تفصیل سمجھ لیتے ہیں وجہ یہی ہے کہ حضور ﷺ نے دیکھا کہ مسئلہ تقدیر کی تحقیق پر کوئی کام اٹکا ہوا نہیں جو اعمال کرنے کے ہیں ان کی تحقیق چاہئے تقدیر پر مجملاً ایمان بالکل کافی ہے اور دیکھو قرآن شریف میں ہے یَسْئَلُوْنَکَ عَنِ الْاَهِلَّةِ یعنی صحابہ دریافت کرتے ہیں کہ چاند چھوٹا بڑا کیوں ہوتا ہے۔ جواب ملا قُلْ هِیَ مَوَاقِیْتُ لِلنَّاسِ وَالْحَجِّ۔ یعنی چاند کے یہ حالات مختلفہ حج وغیرہ کے اوقات معلوم کرنے کے واسطے ہیں تو سوال علت سے تھا مگر جواب میں حکمت بیان کی اس میں یہی اشارہ ہے کہ کام کی بات پوچھو اور غیر ضروری سے پرہیز کرو۔ یہ جواب علیٰ اسلوب الحکیم کہلاتا ہے اور دیکھئے ایک جگہ میں تصریح ہے وَالَّذِیْنَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ۔ (اور جو لوگ اعراض کرتے ہیں لغو را مور سے) لغو کے معنی ہیں مالا نفع فیہ اور یہ عام ہے خواہ مضر ہو یا نہ ہو۔ پس کتاب و سنت تو لا یعنی کے ترک کرنے کا حکم دے رہی ہے مگر آج کل عموماً اسی میں ابتلاء ہو رہا ہے اس کی وجہ یہی ہے کہ جہل کو مرض نہیں سمجھتے اور ضروری و غیر ضروری میں امتیاز نہیں کرتے اور اس عدم امتیاز کا منشاء بھی جہل ہے۔ اگر لوگ جہل کو مرض سمجھتے تو اس کے رفع کرنے کی فکر میں لگتے فضول قصوں میں وقت ضائع نہ کرتے اور دین کی ضروری بات کو ضرور دریافت کرتے اسی واسطے حضور ﷺ نے اس حدیث میں جس کی میں نے تلاوت کی ہے متنبہ فرما دیا کہ جہل مرض ہے۔ پس ایک فائدہ تو یہ ہے جو کہ حدیث شریف میں ہے لفظ شفاء سے مستنبط ہوا۔ دوسرا فائدہ لفظ سوال سے معلوم ہوا وہ یہ کہ جب مرض ہوا تو ظاہر اس کی شفاء علم کو فرمانا چاہئے تھا۔

سوال کرنا شفا ہے:

لیکن حضور ﷺ نے بجائے علم کے لفظ سوال فرمایا (اس تعبیر کیلئے کسی مصحح اور مرجح کی ضرورت ہے پس مصحح تو یہ ہے کہ سوال سبب ہے علم کا پس حقیقت میں مقصود علم ہی ہے اور مرجح یہ ہے کہ حضور ﷺ نے مَا جَعَلَ عَلَیْکُمْ فِی الدِّیْنِ مِنْ حَرَجٍ اور یُرِیْدُ اللّٰهُ بِکُمُ الْیُسْرَ اور الدین یسر۔ تم پر دین میں کسی قسم کی تنگی نہیں۔ اللہ تعالیٰ کو تمہارے ساتھ آسانی منظور ہے۔ دین آسان ہے) کے موافق بوجہ شفقت کے لفظ سوال فرما کر یہ بتلا دیا کہ تم سوال کر کے سبکدوش ہو جاؤ گے خواہ علم حاصل ہو یا نہ ہو۔ پس شفاء العی السوال اور شفاء العی العلم میں فرق یہ ہے کہ اگر کسی سائل

نے مسئلہ پوچھا لیکن مسئول عنہ نے جواب نہ دیا یا غلط جواب دیا پس اگر علم فرماتے تو شفاء ہونے کا حکم ان صورتوں کو شامل نہ ہوتا بلکہ شفا کی صرف ایک ہی صورت ہوتی یعنی جب مسئول عنہ جواب دے اور صحیح جواب دے اور اب یعنی لفظ سوال ارشاد فرمانے میں تینوں صورتوں کو یہ حکم شفاء شامل ہو گیا پس خدا تعالیٰ کے نزدیک یہ سائل ہر حال میں شفایابوں میں داخل ہو گیا اور اس میں ایک قاعدہ فقہیہ القادر بقدرۃ الغیر غیر قادر. کی طرف اشارہ ہو گیا جس کو فقہاء نے سمجھ لیا۔ اور واقعی فقہاء سمجھتے ہیں ان نکات کو بس فقیہ وہ ہے جو اجتہادی شان رکھتا ہو۔ خواہ مطلق خواہ مقید ہم اس سے محروم ہیں غایت یہ کہ ہم اصول سے بعض فروع کو مستنبط کر سکتے ہیں مگر قرآن حدیث سے خود اصول فقہ کا مستنبط کرنا یہ انہیں حضرات کا کام ہے ہر شخص چار کتابیں پڑھکر اجتہاد کا دعویٰ کرنے لگے تو مقبول نہ ہوگا۔

نہ ہر کہ چہرہ برافروخت دلبری داند نہ ہر کہ آئینہ دارد سکندری داند

ہزار نکتہ باریک تر زمو ایں جاست نہ ہر کہ سر بتراشد قلندری داند

یعنی جو شخص چہرہ آراستہ کرے یہ لازم نہیں کہ دلبری جانتا ہو اور جو شخص آئینہ بناتا ہو یہ لازم نہیں کہ سکندری بھی جانتا ہو۔ اس جگہ ہزاروں باریکیاں بال سے زیادہ باریک ہیں جو شخص بھی سر منڈالے ضروری نہیں کہ قلندری بھی جانتا ہو۔

اجتہاد کے لئے ذوق صحیح شرط ہ فقط پڑھنے سے کچھ نہیں ہوتا۔

شاہد آں نیست کہ موئے و میانے دارد بندہ طلعت آں باش کہ آنے دارد

محبوب وہ نہیں جو پتلی کمر اور عمدہ بال رکھتا ہو بلکہ محبوبیت ایک آن اور ادا میں ہوتی ہے۔

علم تو موئے و میان ہے اور ذوق آن ہے حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے سوال کیا گیا هل خصكم رسول الله بشئی یعنی آپ کو حضورؐ نے کوئی ایسی شے دی ہے جو اوروں کو نہیں دی جواب دیا لا الافهما اوتيه الرجل فی القران. یعنی حضورؐ نے ہم کو کوئی خاص بات نہیں بتلائی ہاں ہم کو دین کی ایک خاص سمجھ عطا کی گئی ہے۔ غرض اس حدیث سے یہ ایک اصل فقہی مستنبط ہو گئی کہ القادر بقدرۃ الغیر غیر قادر چنانچہ ظاہر ہے کہ سوال کے بعد کیا جواب صحیح معلوم کر لینا اس کی قدرت میں ہے ہر گز نہیں اسکا تو اتنا ہی اختیار ہے کہ کامل سے (یعنی عالم کامل سے) سوال کرے اگر وہ انکار کر دے یا غلط جواب دے تو یہ کیا کر سکتا ہے۔ البتہ حضورؐ نے عالم کو تاکید فرمائی ہے کہ سائل کو ضرور جواب دو بشرطیکہ وہ عمل کے لئے سوال کرے یا جن علوم کا حاصل کرنا

شرعاً فرض ہے ان میں محض علم کے لئے نہ کہ بحث کے لئے چنانچہ ارشاد ہے۔ من سئل عن علم علم ثم کتمه الجم بلجام من النار۔ جس شخص سے کوئی ایسی علمی بات پوچھی جائے جس کو وہ جانتا ہو لیکن اس کو چھپائے تو اس کو دوزخ کی لگام ڈالی جائے گی۔ اسی طرح حضور نے صحیح جواب دینے کی بھی تاکید اور اس کے خلاف پر وعید فرمائی ہے چنانچہ ارشاد ہے۔ من افتی بغیر علم فانما اثمه علی من افتاہ۔ پس آپ نے مجیب کے لئے افادہ علم کا بھی پورا انتظام کیا ہے مگر کوئی اس کے بعد بھی انکار کرے یا غلط بتلادے تو اگر شفاء العی العلم فرمایا جاتا تو اس صورت میں سائل کو حسرت ہوتی کہ مرض جہل میں مبتلا اور شفاء نہ ہوتی اس حسرت کو دور کرنے کے لئے فرماتے ہیں کہ سوال کرنا ہی شفاء ہے چاہے جواب ملے یا نہ ملے چاہے غلط ملے کیونکہ جو کام تیرے قبضہ کا تھا وہ تو کر چکا (ہاں اگر پھر دریافت کرنے کی قدرت ہو تو دریافت کرے۔ ایک مرتبہ سوال کرنے سے جواب نہ ملے تو خاموش ہو کر نہ بیٹھ رہے بلکہ اسی عالم سے یا اور کسی عالم سے پھر دریافت کرے البتہ اگر یہ کوشش کرتا رہا اور جواب نہ ملا یا غلط ملا تو اس کو گناہ نہ ہوگا بلکہ دونوں صورتوں میں مفتی کے ذمہ گناہ رہا جیسا کہ دونوں حدیثیں ابھی گذریں ۱۲ جامع) اسی کی طرف اشارہ کرنے کے واسطے لفظ سوال فرمایا لفظ علم نہیں فرمایا پس معلوم ہوا کہ تینوں صورتوں میں شفاء کی نعمت حاصل ہوگی اگرچہ بظاہر صرف جواب صحیح ملنے کے وقت شفاء کا حصول معلوم ہوتا ہے اسی کو مولانا فرماتے ہیں۔

گر مرادت را مذاق شکرست ۔۔۔ بے مرادی نے مراد دلبرست

اگر تیری مراد کا مذاق اچھا ہے نامرادی سے امید مت رکھ مراد حاصل ہونے والی ہے۔
گو اس میں بظاہر خطاب اہل سلوک کو ہے مگر سائل احکام بھی سالک ہی ہے۔

ذکر اللہ سے بہر صورت نفع:

حضرت حاجی صاحب قدس سرہ سے جو کوئی یہ کہتا کہ مجھ کو ذکر سے کچھ نفع نہیں ہوا تو دو جواب ارشاد فرمایا کرتے کبھی تو یہ فرماتے کہ کیا یہ نفع نہیں کہ تم نے اس کا نام لے لیا۔

بلا بودے اگر ایں ہم نبودے

اور کبھی ارشاد فرماتے

یابم اورا یا نیابم جستجوئے میکنم ۔۔۔ حاصل آید یا نیاید آرزوئے میکنم

میں اس کو پاسکوں یا نہ پاسکوں اس کی جستجو کرتا رہوں گا۔ حاصل ہو یا نہ ہو اس کی تمنا کرتا رہوں گا۔

حضرت مولانا جامی فرماتے ہیں ؎

ہمینم بس کہ داند ماہرویم — کہ من نیز از خریداران اویم
ہمینم بس اگر کاسد قماشم — کہ من نیز از خریدارانش باشم

ہمارے لئے ہی کافی ہے کہ میرا معشوق یہ جان لے کہ میں ان کے خریداروں میں سے ہوں۔ ہمارے لئے بس اتنا کافی ہے کہ اگر کھوٹا مال واسباب ہو پھر بھی میں اس کے خریداروں سے ہوں۔

کوشش اور طلب بھی کامیابی کے حکم میں ہے:

مولانا رومیؒ نے اس مسئلہ پر قرآن شریف سے استدلال کیا ہے کہ کوشش اور طلب بھی کامیابی ہی کے حکم میں ہے اور ان کے استدلال کے بھروسہ پر ہم کو بھی اس مسئلہ کے بیان کی ہمت ہوئی ہے ورنہ وہ کھٹرت ہوتی ہے۔ وہ استدلال یہ ہے کہ سورۃ اِنَّا فَتَحْنَا لَکَ فَتْحًا مُّبِیْنًا. واقعہ حدیبیہ میں نازل ہوئی ہے جبکہ حضور ﷺ عمرہ کو تشریف لے گئے تھے مگر عمرہ نہ ہوسکا بلکہ حدیبیہ ہی سے واپس آگئے تھے تو اکثر مفسرین نے اس فتح سے فتح مکہ مراد لی ہے اور فتحنا کو سنفتح کے معنی میں لیا ہے اور یہ مضمون بھی صحیح ہے مگر مولانا رومیؒ فرماتے ہیں کہ اس فتح سے خود صلح حدیبیہ ہی مراد ہے کیونکہ گو ظاہر میں ناکامی ہوئی مگر باطنی دولتیں اس ناکامی میں اتنی عطاء ہوئیں کہ ان کے اعتبار سے یہ واقعہ فتح مبین ہوگیا پس ہم نے اس عدم فتح میں ہی آپ کو فتح عطا کردی۔ چنانچہ ایک بڑی دولت تو یہی ہے کہ اس مشقت پر ثواب عظم ملا اسی کو محققین نے مختلف عبارات میں ادا کیا ہے ایک بزرگ کا قول ہے ؎

ارید وصاله ویرید هجری — فاترک ما ارید لما یرید

میں اس کے وصال کا خواہش مند ہوں اور وہ فراق چاہتا ہے تو اسکی خاطر میں اپنی خواہش چھوڑ دیتا ہوں۔

عارف شیرازی کہتے ہیں ؎

میل من سوئے وصال و میل او سوئے فراق — ترک کام خود گرفتم تا برآید کام دوست

میرا میلان وصل کی طرف ہے اور محبوب کا خیال فراق کی طرف، میں نے اپنی مراد کو ترک کردیا تاکہ محبوب کی مراد پوری ہو جائے۔

سب کا خلاصہ یہ ہے کہ طلب کے بعد ناکامی بھی کامیابی ہی ہے اسی پر راضی رہنا چاہئے

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible] [illegible]

[illegible]
[illegible]

[illegible]

[illegible] [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible] [illegible]

[illegible] [illegible]

[illegible]
[illegible]
[illegible]

نگر دو قطع ہرگز جادۂ عشق از دویدنہا ۔۔۔ کہ می بالد بخود ایں راہ چوں تاک از بریدنہا

راہ عشق بھاگنے سے طے نہیں ہوتی بلکہ یہ خود بخود بغیر دوڑے طے ہو جاتی ہے تو پھر عشاق نامراد کیوں نہ رہیں اسی کو فرماتے ہیں ۔

اے برادر بے نہایت در گہیست ۔۔۔ ہر چہ بروے میرسی بروئے مایست

اے برادر یہ بے نہایت درگاہ جس درجہ پر پہنچو اس پر مت ٹھہرو۔ بلکہ آگے کو ترقی کرو۔ پس عاشق ہر منزل پر نامراد اور ناکام ہی ہوا یہ مطلب تھا حاجی صاحب کا جو ان کے بتلانے سے معلوم ہوا اسی لئے میں کہا کرتا ہوں کہ عارفوں کے قول پر جلدی سے اعتراض نہ کرنا چاہئے ۔

در نیابد حال پختہ ہیچ خام ۔۔۔ پس سخن کوتاہ باید والسلام

ناپختہ کبھی پختہ تجربہ کار کے حال کو نہیں پا سکتا اس لئے زبان کو اعتراض سے بند کرنا چاہئے۔ شاید کوئی یہ شبہ کرے کہ وہ حضرات پہلے ہی سے کیوں نہیں بتلا دیتے کہ ہمارا یہ مطلب ہے تاکہ اعتراض کا موقع ہی نہ ہو۔ سو جواب یہ ہے کہ ان کا دستور العمل ہی یہ ہے

با مدعی مگوئید اسرار عشق و مستی ۔۔۔ بگذار تا بمیرد در رنج خود پرستی

مدعی کو اسرار عشق و مستی سے آگاہ نہ کرو اسے اپنی حالت پر چھوڑ دو تا کہ وہ خود پرستی کے رنج میں مر جائے ۔ یعنی وہ اہل کو بتلاتے ہیں نا اہل کو نہیں بتلاتے گو نا اہل ان پر اعتراض کرتے ہیں مگر اس کی ان کو پرواہ نہیں ہوتی ۔

صوفیاء اور اہل ظاہر کے مذاق میں فرق:

اہل ظاہر کا یہ مذاق ہے کہ اگر ان پر اعتراض ہو تو خفا ہوتے ہیں اور آستینیں چڑھا کر جواب دینے پر تیار ہو جاتے ہیں اور وہ لوگ اعتراض پر خوش ہوتے ہیں۔ حضرت گنگوہیؒ نے فرمایا تھا کہ اگر کوئی مجھ سے کسی مرید کو بدگمان کر دے تو میں انعام دوں اور اگر عالم مرید کو بدگمان کر دے تو زیادہ انعام دوں ۔ بات یہ ہے کہ معتقدین سے ان کو تو وحشت ہوتی ہے اہل ظاہر خوش ہوتے ہیں بلکہ وہ معتقدین سے ذاتی تعلق رکھتے ہیں اور اہل اللہ محض محبوب کا حکم سمجھ کر خدمت کرتے ہیں لوگ ان کو بدنام کرتے ہیں کہ وحشی ہیں بد خلق ہیں تم کو کیا خبر ہے کہ ان کی کیا حالت ہے تمہیں مزہ آتا ہے ان خرافات میں اور ان کو گھبراہٹ ہوتی ہے ۔ ان کو ایک وحدہٗ لاشریک لہ سے علاقہ ہے ان کو گوارا نہیں کہ وہ کسی کی طرف توجہ کریں یوں وہ خدمت تو کرتے ہیں خلق کی مگر اس

میں ان کو نفسانی لطف نہیں آتا یہ درمیان میں جواب تھا ان حضرات کے اپنے کلام کی شرح نہ کرنے کا اصلی مضمون یہ تھا کہ اس طریق میں ناکامی بھی کامیابی ہے۔ پس حدیث میں گویا ارشاد ہے کہ اگر تم کو سوال کے بعد جواب نہ ملے تو حسرت نہ کرنا کیونکہ تم کو تو شفاء حاصل ہو گئی ہمارے نسخہ میں ہر حال میں شفا ہی ہے اسی واسطے حضور ﷺ نے بجائے علم کے سوال کا لفظ اختیار فرمایا ہے۔

انسان صرف امور اختیاری کا مکلّف ہے:

اور تیسرا فائدہ حدیث میں وہ ہے جو ضمناً مذکور ہو چکا یعنی یہ کہ قادر بقدرۃ غیر قادر نہیں اور یہ کہ انسان امور اختیار یہ کا مکلف ہے کہ غیر اختیاری کا۔ سبحان اللہ ذرا سے جملہ میں کتنے علوم بھرے ہوئے ہیں۔ میں حدیث کی شرح کر چکا۔ اب اس سے سبق لینا چاہئے یعنی اس پر عمل کرنا چاہئے کہ مسائل ضرور یہ دریافت کیا کرو۔ دیکھئے حضورؐ نے کتابیں پڑھنے کو واجب نہیں فرمایا بلکہ بے حد سہولت کر دی کہ پوچھتے ہی رہا کرو سوال کرتے رہنے سے بہت جلد مسائل یاد ہو جاویں گے اور وقت بھی نہ ہو گی۔ پس میرا مقصود یہی تھا کہ۔

بے علمی بد عملی کی جڑ ہے:

اصل مرض بد علمی اور بے علمی ہے اور بے علمی بد عملی کی جڑ ہے اگر کوئی شبہ کرے کہ جڑ کس طرح ہے ہم تو دیکھتے ہیں کہ بعض عالم بھی بے عمل ہوتے ہیں تو وہاں بد عملی بدوں بے علمی پائی گئی حالانکہ بدوں جڑ کے شاخ کا وجود نہیں ہوتا۔ جواب یہ ہے کہ آپ نے علم کے معنی فقط دانستن کے لئے ہیں حالانکہ قرآن شریف سے مستنبط ہوتا ہے کہ رفع جہالت کیلئے محض دانستن کافی نہیں کیونکہ قرآن مجید میں ایک جگہ تو اِنَّمَا التَّوْبَةُ عَلَى اللّٰهِ لِلَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السُّوْٓءَ بِجَهَالَةٍ (توبہ جس کا قبول کرنا اللہ تعالیٰ کے ذمہ ہے وہ تو ان ہی کی ہے جو حماقت سے کبھی گناہ کر بیٹھتے ہیں پھر قریب ہی وقت میں توبہ کرتے ہیں۔ سو ایسوں پر خدا تعالیٰ توجہ فرماتے ہیں) سے بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ علم کے ساتھ گناہ کرنے سے توبہ قبول نہیں ہوتی اور دیگر نصوص سے معلوم ہوتا ہے کہ عمداً بھی گناہ کرے تب بھی توبہ قبول نہیں ہوتی تو محققین نے رفع تعارض کیلئے فرمایا ہے کہ بِجَهَالَةٍ قید واقعی ہے احترازی نہیں جب قید واقعی ہے تو آیت اس پر دال ہو گی کہ گناہ ہمیشہ جہل سے ہوتا ہے اور علم کے ہوتے ہوئے معصیت ہو ہی نہیں سکتی۔

علم کی حقیقت:

تو معلوم ہوا کہ علم کی حقیقت کوئی ایسی چیز ہے جس کے ساتھ معصیت جمع نہیں ہوئی اور وہ حقیقت یہ ہے کہ اعتقاد یہ ہے کہ اعتقاد جازم مطابق واقع مع غلبۃ الحال والاستحضار اور ظاہر ہے کہ اس غلبہ واستحضار کے ہوتے ہوئے گناہ ہونا ممکن نہیں۔ پس گناہ کرنیوالے کو علم بمعنی دانستن ہوتا ہے مگر اعتقاد جازم مع الاستحضار وغلبۃ الحال نہیں ہوتا۔ پس ثابت ہو گیا علم کے ساتھ بدعملی نہیں ہوسکتی۔ پس میرا دعویٰ صحیح رہا کہ بدعملی کی جڑ بے علمی ہے۔

حدیث لایزنی الزانی وھو موٴمن کا مفہوم:

اور یہی تفسیر لا یزنی الزانی وھو مؤمن میں بھی جاری ہوگی اس طرح سے کہ ایمان کے معنی ہیں تصدیق علم ہے پس موٴمن کے معنی عالم بعذاب المعصیۃ کے ہوں گے تو معلوم ہوا کہ علم اور زنا جمع نہیں ہوتے جس کی تفسیر مذکور کی تائید نکل آئی۔ اور علماء ظاہر کو بھی لفظ بدل کر یہی تفسیر کرنا پڑی یعنی انہوں نے موٴمن کامل مراد لیا ہے اور کمال ایمان کا وہی حاصل ہے جو اعتقاد جازم مع غلبۃ الحال کا ہے۔ پس ان دلائل سے اصل مرض بے علمی ٹھہرا اور بدعملی اس کی فرع (اور بدیں معنی تحصیل علم کے لئے ایسے ہی حضرات کی صحبت کی ضرورت ہے جنہوں نے علم کی حقیقت سمجھی ہے ایسے ہی صحبت کی ترغیب مولاناؒ فرماتے ہیں ؎

قال را بگذار مرد حال شو　　　　پیش مرد کاملے پامال شد

بات کو چھوڑ کر صاحب حال بنو اور کسی بزرگ کے سامنے پامال ہو جاؤ۔

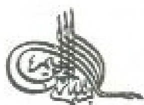
رزقنا اللہ وایاکم۔ (۱۲ جامع)

ناواقف کو احکام دریافت کرنا ضروری ہے:

رسول اللہ ﷺ نے اس بے علمی، و بدعملی کا علاج بہت ہی سہل اور مختصر فرما دیا ہے چونکہ اسکی تفصیل واہتمام کی ضرورت تھی اس لئے کسی قدر بیان طویل ہو گیا تا کہ اس کا مہتم بالشان ہونا ظاہر ہو ورنہ بات صرف اتنی ہے کہ ناواقف کو احکام کا دریافت کرنا ضروری ہے۔ اب دعا کرو کہ اللہ تعالیٰ سب کو توفیق عطا فرما دیں۔

واخر دعوٰنا ان الحمد للہ رب العالمین

وصلی اللہ علی سیدنا محمد وآلہ واصحابہ اجمعین



العمل للعلماء

علماء کیلئے عمل

یہ وعظ ۱۵ رجب ۱۳۳۰ھ وقت شب بمقام مدرسہ عربیہ دیوبند جو کہ حضرت والا نے کھڑے ہو کر ۲ گھنٹہ ارشاد فرمایا۔ سامعین کی تعداد ۳۰۰ تھی جس کو مولٰنا سعید احمد تھانوی صاحب نے قلم بند فرمایا۔

خطبہ ماثورہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للہ نحمدہ و نستعینہ ونستغفرہ ونؤمن بہ ونتوکل علیہ ونعوذ باللہ من شرور انفسنا ومن سیات اعمالنا من یھدہ اللہ فلامضل لہ ومن یضللہ فلاھادی لہ ونشھد ان لاالہ الا اللہ وحدہ لا شریک لہ ونشھد ان سیدنا ومولانا محمد اعبدہ ورسولہ صلی اللہ علیہ وعلیٰ الہ واصحابہ وازواجہ وبارک وسلم .

اما بعد فاعوذ با للہ من الشیطن الرجیم .بسم اللہ الرحمن الرحیم قال اللہ تبارک وتعالیٰ .اِنَّھُمْ کَانُوْ یُسَارِعُوْنَ فِی الْخَیْرَاتِ وَیَدْعُوْنَنَا رَغَبًا وَّرَھَبًا وَّکَانُوْ اَلَنَا خٰشِعِیْنَ .

(وہ لوگ نیک کاموں میں مستعدی کرتے تھے اور ہم کو نہایت ہی شوق اور خوف سے پکارتے تھے اور ہم سے ڈرتے تھے)

یہ آیت کا ایک جزو ہے۔

علماء انبیاء کے وارث ہیں:

اس سے قبل حق سبحانہٗ تعالیٰ نے حضرات انبیاءؑ کا ذکر اور حسب ضرورت مقام کے خاص خاص اغراض کے لئے ان کے کچھ حالات بیان فرمائے ہیں ان حالات کے بعد ان حضرات کے مشترک اوصاف کو اس آیت میں ذکر فرمایا ہے جس کا ترجمہ آپ کو معلوم ہے یہ حاصل ہے اس آیت کا اور مقصود اس آیت سے اس وقت ایک خاص امر کو ظاہر کرنا ہے اور وہ امر کوئی نئی بات نہیں ہے بلکہ آپ لوگوں کی جانی ہوئی بات ہے لیکن بعض بات ایسی ہوتی ہے کہ باوجود اس کے معلوم ہونے کے وہ ملتفت الیہ (جس کی طرف توجہ کی جائے) نہیں ہوتی اور اس لئے اس امر کو جدید بھی کہدیا جاتا ہے تو یہ بھی چونکہ ملتفت الیہ نہیں ہے اس واسطے اس کو بھی اس خاص اعتبار سے امر جدید کہنا درست ہوگا اور التفات نہ ہونے کے اسباب مختلف ہوتے ہیں کبھی تو کسی امر کے غایت درجہ بین (صاف واضح) ہونے کی وجہ سے اس کو معمولی سمجھا جاتا ہے اور اس کی طرف التفات نہیں ہوتا اور کبھی کسی امر کا غیر بین ہونا اس کے غیر ملتفت الیہ ہونے کا سبب ہوتا ہے اور جب یہ ہے تو یہ امر

مقصود بالبیان بھی ممکن ہے کہ بعض افراد کے اعتبار سے تو غایت درجہ بین ہونے کی وجہ سے معمولی بات ہو کر غیر ملتفت الیہ ہو گیا اور بعض افراد کے اعتبار سے غیر بین ہو کر غیر ملتفت الیہ ہو گیا غرض چونکہ بعض امور غیر ملتفت الیہ (جس کی طرف توجہ نہ کی جائے) ہو جاتے ہیں اور واقع میں ان کی طرف التفات کرنا ضروری ہوتا ہے اس لئے ان کو بیان کیا جایا کرتا ہے۔ اوران کا بیان کرنا باوجود ان کے معلوم للمخاطب ہونے کے عبث نہیں ہوتا بیان اور شرح اس امر کی یہ ہے کہ اس مقام پر انبیاؑ کا ذکر ہے اور آپ حضرات بوجہ دولت علم کے ان حضرات کے وارث ہیں چنانچہ ارشاد ہے العلماء ورثۃ الانبیاء (علماء انبیاء کے وارث ہیں) اور یہ ایسا مسئلہ ہے کہ اس کو ہر ذی علم نے بڑی خوشی سے تسلیم کر لیا ہے اور سب کا اتفاق اس وراثت پر ہو گیا ہے۔ جس اتفاق کی وجہ یہ ہے کہ اس مسئلے کے ماننے میں اہل علم کا نفع ہی نفع ہے وہ یہ کہ اس سے ایک عظیم الشان فخر حاصل ہوتا ہے اور کسی قسم کی مؤنت اور مشقت اس میں ہے نہیں اس لئے اپنا لقب وارث قرار دیکر بیٹھ رہے

صرف کمال علمی وراثت انبیاءؑ نہیں:

حالانکہ اس میں اس بات پر غور کرنے کی ضرورت تھی کہ حضرات انبیاءؑ میں کمال علمی کے ساتھ کوئی دوسرا کمال یعنی کمال عملی بھی تھا یا نہیں ظاہر ہے کہ اس کا جواب اثبات میں دیا جائیگا کیونکہ اگر انبیاءؑ میں بھی کمال عملی نہ مانا جائے تو پھر کس کے اندر مانا جائے گا کیونکہ وہ حضرات تو افضل المخلوقات ہیں پس یہ کہنا ضروری ہوگا کہ انبیاءؑ میں اس درجہ کمال عملی تھا کہ کسی دوسرے میں ہونا ممکن نہیں جب یہ بات ثابت ہو چکی تو اب دیکھنے کی بات یہ ہے کہ وجہ وراثت آیا صرف کمال علمی ہے یا کمال عملی بھی اس میں داخل ہے ہم جو غور کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ صرف کمال علمی وجہ وراثت نہیں ہو سکتا اس لئے کہ جو عالم بے عمل ہیں ہم ان میں کوئی شان مقبولیت کی نہیں پاتے حالانکہ وراثت نبی کے لئے مقبول ہونا ضروری ہے مثلاً ابلیس کہ وہ بہت بڑا عالم ہے اور دلیل اس کے عالم ہونے کی یہ ہے کہ وہ علماء کے اغوا کی تدبیر کرتا ہے اور بسا اوقات اس میں کامیاب بھی ہو جاتا ہے۔ اور یہ امر ظاہر ہے کہ کسی شخص کے خیالات کو وہی بدل سکتا ہے جو کہ خود بھی ان خیالات میں کم از کم اس کے برابر اور ماہر ہو جس کے خیالات بدلنے کی کوشش ہے۔ قانون کے سمجھنے میں قانون دان کو وہی شخص دھوکہ دے سکتا ہے جو کہ خود بھی قانون کو جانتا ہو۔ تو شیطان کا علماء کے اغواء میں کامیاب ہونا صاف بتلا رہا ہے کہ وہ بھی بہت بڑا عالم ہے لیکن اس کا جو انجام ہے وہ سب کو

معلوم ہے۔علی ہذا علماء بنی اسرائیل جن کی نسبت اَنْتُمْ تَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ (تم لوگ کتاب کی تلاوت کرتے ہو) ارشاد ہے گمان کی رخامت عاقبت کا ذکر خود قرآن شریف میں مذکور ہے اور جگہ جگہ ان لوگوں کی مذمت فرمائی گئی ہے حتیٰ کہ کسی فرقے کی اتنی مذمت قرآن میں نہیں جتنی بنی اسرائیل کی ہے پس معلوم ہوا کہ صرف کمال علمی وجہ وراثت نہیں ہے بلکہ عملی کی بھی ضرورت ہے کیونکہ بدون عمل کے قبولیت نہیں ہوتی اور غیر مقبول وارث انبیاء نہیں ہوسکتا۔

علم بلا عمل وبال جان ہے:

اس کو رسول مقبول ﷺ نے ایک حدیث میں نہایت واضح فرمادیا ہے فرماتے ہیں العلماء ورثۃ الانبیاء وان الانبیاء لم یورثوا دینارا ولا درھما ولکن ورثوا العلم فمن اخذہ اخذ بحظ وافر (علماء انبیاء کے وارث ہیں اور انبیاءؑ اپنے ورثہ میں نہ تو کوئی دینار چھوڑتے ہیں اور نہ درہم بلکہ وہ علم چھوڑتے ہیں لہٰذا جس شخص نے علم کو اپنالیا اسے بہت بڑا حصہ دستیاب ہوا)۔ اس حدیث میں علم کو حظ وافر فرمایا ہے اور علم حظ وافر اس وقت ہوسکتا ہے کہ جب مقرون بالعمل ہو نری صفت علم کو حظ وافر نہیں کہہ سکتے کیونکہ اس کا وبال جان ہونا خود حدیث میں مذکور ہے ارشاد ہوتا ہے۔ ان من العلم لجھلا (بے شک علم کے اندر جہالت بھی ہے۔) اسی طرح کلام مجید میں ارشاد ہے۔ وَلَقَدْ عَلِمُوْا لَمَنِ اشْتَرٰهُ مَا لَهٗ فِی الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ وَلَبِئْسَ مَا شَرَوْا بِهٖٓ اَنْفُسَهُمْ لَوْ كَانُوْا یَعْلَمُوْنَ (وہ جان چکے ہیں کہ جو کوئی اس کا خریدار ہو اس کے لئے آخرت میں کوئی حصہ نہیں اور بہت بری چیز ہے وہ جس کے بدلہ میں اپنی جانوں کو دے رہے ہیں کاش ان کو (اتنی) (عقل ہوتی) تو حدیث میں ایسے علم کو جہل فرمانا اور آیت میں عَلِمُوْا کے بعد لَوْ كَانُوْا یَعْلَمُوْنَ صاف جتلاتا ہے کہ یہ علم کسی درجہ میں بھی قابل اعتبار نہیں۔ اور اس سے بھی زیادہ واضح لیجئے حدیث میں ہے کہ قیامت کے روز ایک شخص کو دیکھا جائے گا کہ اس کی آنتیں باہر نکلی پڑی ہیں اور وہ ان کے گرد گھوم رہا ہے لوگ اس سے اس کا سبب پوچھیں گے کہے گا کہ میں اپنے علم پر عمل نہ کرتا تھا پس ان آیتوں اور حدیثوں سے اچھی طرح واضح ہوگیا کہ علم بلا عمل حظ وافر نہیں ہوسکتا کیونکہ جو علم عقاب (عذاب) سے نہ بچاسکے وہ حظ وافر کیا ہوگا۔

حظ وافر علم:

پس حظ وافر وہی علم ہوگا جو کہ مقرون بالعمل ہو پس وجہ وراثت بھی وہی علم ہوگا جو کہ مقرون

بالعمل ہو مطلق علم وجہ وراثت نہ ہوگا مگر باوجود اس کے ہم لوگ جو اپنے کو اہل علم کہتے ہیں ذرا اپنے قلوب کو ٹٹول کر دیکھیں تو معلوم ہوگا کہ ہمارے قلوب میں محض صفت علم ہی پر ایک ناز پایا جاتا ہے اور ہم اپنے کو اس صفت کی وجہ سے بہت بڑا سمجھتے ہیں اور عمل کی کمی سے ہم کو اپنے کمال میں نقص کا شبہ ہی نہیں ہوتا اور یہ ایسا بدیہی امر ہے کہ اس پر کسی قرینے کے قائم کرنے کی ضرورت نہیں ہر شخص ذرا غور سے خود معلوم کر سکتا ہے اور اگر قرینہ اس کا یہ ہے کہ باوجود عمل نہ کرنے کے عوام الناس سے اپنے کو برتر سمجھتے ہیں اور اپنی حالت کو ان سے ارفع خیال کرتے ہیں چنانچہ اگر عوام الناس ہماری تعظیم میں کمی کریں تو ہم کو سخت تعجب ہوتا ہے اور بہت ہی غصہ آتا ہے یہ صاف دلیل اس کی ہے کہ ہم لوگ محض علم کی وجہ سے اپنے کو ارفع سمجھتے ہیں۔ اسی طرح اگر ہم کہیں چلے جا رہے ہوں اور کوئی عام آدمی ہم کو راستے میں ملے تو خود سلام کرنا تو درکنار اس کے سلام کا جواب دیدینا بھی اپنا احسان سمجھتے ہیں کیوں کہ صاحب کیا قرآن مجید میں ایسے ہی لوگوں کی بابت فَرِحُوْا بِمَا عِنْدَهُمْ مِنَ الْعِلْمِ (وہ اپنے علم کی وجہ سے جو کہ ان کے پاس ہے شاد و مسرور ہو گئے) ارشاد نہیں ہوا اور جب یہ ہے تو کیا نرا علم قابل ناز یا فخر کرنے کے ہو سکتا ہے۔ کبھی نہیں جیسا کہ حدیث شریف میں صاف مذکور ہے ایک علم بندے کے لئے حجت ہے اور ایک علم خدا کی حجت ہے بندے پر ایسا علم کیا مایہ ناز ہو سکتا ہے اور ہم جو اپنے کو انبیاء کا وارث سمجھتے ہیں تو کیا ہمارا نرا علم حاصل کر لینا اس وراثت کے لئے کافی ہو گیا۔ ہرگز نہیں چونکہ ہم لوگ اس مرض میں مبتلا ہیں خواہ وہ ابتلاء اعتقاداً ہو یا عملاً یا حالاً اور یہ آیت اس خیال کا باطل ہونا بتلا رہی ہے اس لئے اس آیت کو اس وقت اختیار کیا گیا جس میں انبیاءؑ کے وصف علم کے اثبات کے بعد شان عملی کو بیان کیا گیا ہے تاکہ ہم متوجہ ہوں اور غور کریں کہ جن کے ہم وارث بنتے ہیں ان میں کیا کیا اوصاف تھے۔ اور یہی غور کرنا غرض ہے قرآن شریف میں متعدد جگہ حضرات انبیاءؑ کے قصص مذکور ہوں گی تاکہ ہم غور کیا کریں پس ہم کو متوجہ ہونا چاہئے آیا کہ ہم میں وہی شان عمل میں پائی جاتی ہے یا نہیں اگر نہیں پائی جاتی تو وراثت کا دعویٰ ہم کو چھوڑ دینا چاہئے تو گویا یہ آیت ہمارے اس مرض کا علاج ہے پس بیان آیت کا یہ ہے کہ اس میں اول حضرات انبیاءؑ کے علم کو بیان کیا گیا ہے جس کی برابر کسی کا علم بھی نہیں ہے کیونکہ ایسے علم کامل کے لئے نبوت لازم ہے یا یوں کہیں کہ ایسا علم کامل کیلئے نبوت لازم ہے یا یوں کہیں کہ علم کامل نبوت کیلئے لازم ہے یا دونوں طرف تلازم مانا جائے بہر حال جو کچھ کہا جائے اتنا قدر مشترک ماننا پڑتا ہے کہ نبوت کمال علم میں انفکاک نہیں ہوتا تو باوجود علم کے اس کامل مرتبہ پر ہوں گے پھر بھی ان کی مدح کا مدار صرف اس علم کو قرار نہیں دیا۔

صرف کمال علمی مدح نہیں:

بلکہ اس کے ساتھ اِنَّھُمْ کَانُوْا یُسَارِعُوْنَ فِی الْخَیْرَاتِ (یہ سب نیک کاموں میں دوڑتے ہیں) مجموعہ جزئین پر مدح کو ختم فرمایا جس کا حاصل یہ ہوا کہ کمال علمی بھی اگرچہ کمال ہے لیکن وہ کمال نہیں تمام اس وقت ہوتا ہے کہ اس کے ساتھ عمل بھی مقرون ہو کیونکہ اگر عمل کو مدح میں داخل نہ مانا جائے اور صرف صفت علم پر مدح کو مقصود مانا جائے تو صفت علم کو معرض مدح میں ذکر کرنا ایک امر زائد ہوگا۔ پس معلوم ہوا کہ باعث مدح صرف کمال علمی نہیں بلکہ اس کے ساتھ کوئی دوسرا کمال بھی ہے اور وہ کمال کمال عملی ہے جس کو اس مقام پر ذکر کیا گیا ہے۔ اور اس وقت آپ حضرات کو وہی سنایا جارہا ہے اگرچہ آپ کو سنانے کی ضرورت نہیں تھی کیونکہ آپ خود متکلم سے زیادہ جانتے ہیں لیکن اسی قاعدہ مذکورہ کی بنا پر کہ کبھی باوجود معلوم ہونے کے بعض امور ملتفت الیہ نہیں ہوتے سنانا مفید معلوم ہوا اور گو اس وجہ سے کہ مقصود بالذات علم سے عمل ہے اور مقصود بالذات کا ملتفت الیہ ہونا ضروری ہے اس اعتبار سے اس مقصود بالذات پر متنبہ کرنیکی حالت نہ ہونا چاہئے لیکن کبھی مقصود بالغیر میں اس قدر انہماک ہو جاتا ہے کہ اصل مقصود بالذات نظر سے غائب ہو جاتا ہے اگرچہ یہ ہے بڑی غلطی کیونکہ اس سے اکثر خود طریق میں بھی غلطی واقع ہو جاتی ہے توضیح اس کی یہ ہے کہ اگر مقصود پیش نظر نہ ہو تو یہ پتہ نہیں چلتا کہ کس طریق کو مقصود سے تعلق ہے کہ وہ قابل اہتمام ہو اور کس طریق کو اس سے تعلق نہیں کہ وہ قابل ترک ہو تو سعی کا مفید یا طائل ہونا معلوم نہیں ہوتا مثلاً اگر کوئی شخص دہلی جانا چاہے تو ریل میں بیٹھنا وہاں پہنچنے کا ایک ذریعہ ہے لیکن اگر دہلی پیش نظر ہے تو اس کو اہتمام ہوگا کہ وہ گاڑی تلاش کرے جس کے ذریعہ سے دہلی پہنچ جائے اور اگر دہلی پیش نظر نہیں بلکہ محض چلنا ہی پیش نظر ہے تو عجب نہیں کہ اس میں غلطی ہو اور بجائے دہلی کے کلکتہ پہنچ جائے یہی حالت ہر طریق اور مقصود میں ہے کہ اگر خود طریق ہی کو مثل مقصود بالذات کے سمجھ لیا اور بالذات کو پیش نظر نہیں کیا تو اس میں گا ہے انہماک ہو کر ضرور غلطی ہو گی لہذا طریق کے اہتمام میں مقصود کو بھلانا بڑی کمی ہے مگر پھر بھی تحصیل علم میں یہ کوتاہی بکثرت واقع ہو رہی ہے کہ محصلین کو یہ یاد ہی نہیں کہ اس علم کی غایت عمل ہے اسی وجہ سے باوجود آپ کے جاننے کے پھر بھی آپ کو متنبہ کرنے کا خیال پیدا ہوا سو اس باب میں انبیاءؑ کی حکایت ہمارے لئے کافی نمونہ ہے کیونکہ ہم انبیاءؑ کے جانشین ہیں جو ان کی حالت تھی وہی ہم کو اختیار کرنا چاہئے

اور وہ حالت اس آیت میں مذکور ہے اور اس میں کئی قسم کے حکم بیان کئے گئے ہیں اور سب کا حاصل مشترک یہ ہے کہ اس میں شان عملی کو ذکر کیا گیا ہے۔

ہر جملہ ہر نوع عمل کے لئے:

جس میں سے مختلف انواع کو ایک ایک جملہ میں بیان فرمایا ہے کہ ان کا حاصل کرنا ضروری ہے فرماتے ہیں اِنَّهُمْ كَانُوْا يُسَارِعُوْنَ فِي الْخَيْرٰتِ کہ وہ لوگ مستعدی کرتے تھے نیک کاموں میں یہ ایک جملہ ہے جس میں ایک نوع عمل کو ذکر کیا ہے آگے ارشاد ہے وَيَدْعُوْنَنَا رَغَبًا وَّرَهَبًا یعنی ہم کو پکارتے تھے شوق سے اور خوف سے یہ دوسرا جملہ ہے جس میں دوسری نوع کا ذکر کیا گیا تیسرا جملہ ہے وَكَانُوْا لَنَا خٰشِعِيْنَ جس میں ایک خاص نوع عمل کا بیان کیا ہے۔ اگرچہ یہ بھی ممکن ہے کہ ہر ہر جملہ میں تینوں قسم عمل کے مجموعے کو مراد لیا جائے لیکن پھر بھی اتنا ضرور معلوم ہوتا ہے کہ ہر جملہ کو کسی ایک نوع سے زیادہ تعلق ہے یعنی عمل تین قسم کے ہوتے ہیں اعمال جوارح اعمال لسان اعمال قلب مثلاً نماز ہاتھ پاؤں کے متعلق ہے ذکر اللہ زبان کے متعلق ہے خشوع قلب کے متعلق ہے تو ان انواع اعمال میں اگرچہ ہر ہر جملہ کو سب ہی اقسام کے ساتھ ایک طرح کا تعلق ہے لیکن زیادہ تعلق ایک ایک جملہ کو ایک ایک ہی عمل کے ساتھ ہے چنانچہ پہلا جملہ اعمال جوارح کے ساتھ زیادہ تعلق رکھتا ہے۔ دوسرا جملہ عمل لسان کے ساتھ اور دوسرے جملے یعنی يَدْعُوْنَنَا میں جو رَغَبًا وَّرَهَبًا کی قید ہے وہ تابع ہے لہذا اصل مقصود بِالذِّكْرِ يَدْعُوْنَنَا ہی ہوا اگرچہ اس جملہ میں دوسرا احتمال بھی ہے کہ قید زیادہ مقصود ہوا اور اسی بنا پر میں نے کہا تھا کہ ہر جملہ کو ہر ہر نوع عمل کے لئے بھی کہا جا سکتا ہے تیسرا جملہ اعمال قلب کے ساتھ متعلق ہے اور اسی پر ختم کر دیا گیا ہے پس اس جمع کرنے سے لازم آیا کہ عمل کی تینوں قسموں کے جمع کرنے سے عمل کا کمال ہوتا ہے اور اگر ایک جزی بھی کمی رہی تو عمل ناقص رہے گا اس کی مثال ایسی ہے کہ ایک شخص گھر بنائے تو اس گھر کو کامل گھر اس وقت کہا جائے گا کہ اس میں تمام ضروری حصے ہوں کمرہ سہ دری باورچی خانہ وغیرہ وغیرہ اور اگر ایک جز بھی کم ہو تو اس گھر کو کامل گھر نہ کہیں گے بس یہی حالت عمل کی بھی ہے اگر ایک نوع بھی چھوٹ گئی تو عمل کامل نہ ہوا بلکہ ناقص رہا اب ہم اپنی حالت کو غور کر کے دیکھیں کہ اول تو مسلمانوں میں نفس عمل ہی کی کمی ہے اور اگر کچھ عمل کیا بھی جاتا ہے تو وصف میں بالکل ناقص اور زیادہ افسوس علماء کی جماعت پر ہے اس لئے کہ جانتے ہیں اور پھر کوتاہی کرتے ہیں۔

فان کنت لا تدری فتلک مصیبۃ
وان کنت تدری فالمصیبۃ اعظم

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]

[illegible]

اس کے حاصل کرنے کے لئے تقویٰ کی ضرورت ہے مگر ہم لوگ اکثر بے باک ہیں تمام تر انہماک اس میں ہے کہ کسی طرح کتابیں ختم ہو جائیں بہت لوگوں کی تو ایسی حرکتیں ہیں کہ ان کی وجہ سے تمام قوم بدنام ہوتی ہے اور چونکہ ان لوگوں کی عادت ہو گئی ہے لہذا اس کے ساتھ توبہ بھی ان کو نصیب نہیں ہوتی یعنی بشر سے غلطی تو ہو ہی جاتی ہے۔ لیکن اگر چار دن تقویٰ رہے اور ایک دن ٹوٹ جائے اور گناہ ہونے پر پھر توبہ کر لی جائے تب بھی اس قدر خراب حالت نہ ہو اور تھوڑے دنوں میں گناہ چھوٹ جائیں۔

ترک عمل کی مضرتیں:

لیکن بعض لوگوں کو تو مبالات ہی نہیں رہتی اور اس سے عوام الناس پر بہت برا اثر پڑتا ہے یعنی ان کو یہ کہنے کی گنجائش ملتی ہے کہ علماء ایسے ہوتے ہیں پس اگر خلوص سے تقویٰ کو اختیار نہ کیا جائے تو اسی مصلحت سے اختیار کر لیا جائے کہ اس سے عوام بگڑیں گے ورنہ ایسے لوگ یَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰہِ (وہ لوگ اللہ کے راستہ سے روکتے ہیں) کے مصداق کہے جا سکتے ہیں کیونکہ روکنا جس طرح مباشرۃ ہوتا ہے کہ زبان سے روکے یا ہاتھ سے روکے اسی طرح تسبب بھی ایک قسم کا روکنا ہے تو اس کو بھی صد عن سبیل اللہ کہا جائیگا کیونکہ سبب معصیت بھی معصیت ہوتا ہے اور اسی معصیت کے ساتھ اس کا بھی شمار ہوتا ہے حتیٰ کہ بعض ایسے امور جو فی نفسہ طاعت ہیں جب کسی معصیت کا سبب بن گئے تو ان کی بھی ممانعت ہو گئی چنانچہ ارشاد ہے۔ لَا تَسُبُّوا الَّذِیْنَ یَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ فَیَسُبُّوا اللّٰہَ عَدْوًا بِغَیْرِ عِلْمٍ (جو لوگ غیر اللہ کو پکارتے ہیں ان کو گالی مت دو اس وجہ سے کہ پھر دشمنی میں بغیر جانے بوجھے اللہ کو گالی دینگے تو دیکھئے بتوں سے نفرت کا ظاہر کرنا اور ان کو برا کہنا ایک حد تک طاعت تھا لیکن چونکہ وہ مفضی تھا ایک معصیت کی طرف اس لئے اس سے بھی ممانعت ہوئی پس معلوم ہوا معصیت کی مباشرت معصیت ہے اس طرح تسبب بھی معصیت ہے تو اگر ایک شخص نے عمل نہ کیا تو دیکھنے والوں کیلئے درجہ تسبب میں یصدون کا مصداق بن گیا غرض ترک عمل میں یہ مضرتیں ہیں اس لئے اگر خلوص سے بھی عمل نہ ہو تو کم سے کم دین کی احتیاط اور حفاظت کے لئے ہو اسی کو ہمارے حضرت نور اللہ مرقدہ فرماتے تھے کہ ریاء الشیخ خیر من اخلاص المرید (شیخ اور پیر کی ریا کاری مریدوں کے اخلاص سے بہتر ہے) یعنی چونکہ شیخ کا عمل دوسروں کیلئے باعث ہو جاتا ہے اس لئے اگر اس کے عمل میں ایک درجہ کی ریاء بھی ہو تو

کچھ مضائقہ نہیں ہے۔ اور یہ مقولہ حضرت کا میں نے قیاس کے لئے کہا ہے ورنہ مدلول اس کا یہ نہیں ہے کیونکہ اس مقولہ میں ریاء سے مراد ریا لغوی ہے نہ کہ شرعی اور میں درخواست کر رہا ہوں ان بدعملوں سے علی سبیل التنزل ریاء شرعی کی۔ اور حکم مشترک یہ ہے کہ اگر دوسرے کی حفاظت دین کے لئے کوئی عمل کرے تو اس میں بھی خیریت کم سے کم یہی کہ سبب عمل بد کا نہ بنا تو دین کی حفاظت چونکہ ضروری ہے اس لئے یہی سمجھ کر اپنے کو بدعملی سے روکنا چاہئے۔

عامل بالشریعت کہلانے کا مستحق:

الحاصل ارشاد ہوتا ہے کہ انبیاءؑ تمام انواع عمل کے جامع تھے اور چونکہ اخبار سے مقصود کوئی انشاء ہوتی ہے اس لئے مطلب یہ ہوگا کہ ہم کو بھی ایسا ہونا چاہیے کہ انواع عمل کے جامع ہو مگر ہم لوگوں میں اس کے متعلق چند کوتاہیاں ہیں چنانچہ ایک کوتاہی تو یہ ہے کہ عمل ہی کی طرف التفات نہیں کرتے اور اگر کچھ عمل کرتے بھی ہیں تو غضب یہ کیا ہے کہ ہم نے اس میں انتخاب کر لیا ہے اور اپنے اس انتخاب کو کافی سمجھ کر اپنے کو عامل باشریعت اور دیندار سمجھتے ہیں۔ صاحبو! ظاہر ہے کہ حسین وہ شخص کہلائے گا کہ اس کی آنکھ ناک چہرہ سب خوبصورت ہوں گے ورنہ اگر کسی کی آنکھیں تو نہایت اچھی ہوں اور ناک بالکل خراب چپٹی ہو یا برعکس ہو یا دانت باہر کو نکلے ہوئے ہوں تو وہ حسین نہ کہلائے گا بس اسی طرح دین بھی ایک حسن معنوی ہے تو حسین معنوی یعنی دیندار بھی اسی کو کہیں گے جو تمام وجوہ دین وانواع عمل کا جامع ہو اور جس نے ایک کو لیا اور دوسرے کو چھوڑ دیا مثلاً اعمال جوارح کو لے لیا اور اعمال لسان کو چھوڑ دیا یا اعمال قلب کو لیا اور دوسرے دونوں کو چھوڑ دیا یا اعمال لسان کو لے لیا اور بقیہ دو کو چھوڑ دیا وہ شخص ہرگز اس حسن کے معنوی کے ساتھ متصف نہ سمجھا جائے گا آجکل ہم لوگوں میں اکثر افراد جو کچھ عمل کرتے بھی ہیں تو وہ اعمال جوارح مثلاً روزہ نماز حج وغیرہ کر لیتے ہیں ورنہ اکثر تو عمل ہی نہیں کرتے کہ نماز ہو رہی ہے اور وہ پڑے سو رہے ہیں۔

لاتفریط فی النوم کا صحیح مصداق:

ممکن ہے کہ ایسے لوگ اپنے عذر میں وہ حدیث پیش کریں کہ **لا تفریط فی النوم** (نیند میں کمی نہیں) لیکن یہ حدیث ان کے لئے کچھ مفید نہیں کیونکہ یہ عدم تفریط اس وقت ہے کہ اپنی طرف سے تو پورا انتظام کر کے سوئے لیکن باوجود اہتمام اور انتظام کے پھر بھی آنکھ نہ کھلے اور اگر ایسے وقت سویا کہ غالب گمان یہ ہو کہ نماز کے وقت آنکھ نہ کھلے گی اور کچھ انتظام بھی نہیں کیا تو یہ

ضرور تفریط میں داخل ہے قرینہ اس تقیید کا یہ ہے کہ ارشاد ایک خاص قصے کے متعلق ہے وہ یہ کہ حضور ﷺ کو ایک مرتبہ ایسے وقت سونے کی نوبت آئی تو حضور ﷺ نے حضرت بلالؓ کو بٹھلا دیا تھا کہ جب صبح ہو ہم کو جگا دو مگر اتفاق سے ان کی بھی بیٹھے بیٹھے آنکھ لگ گئی اور پھر اٹھے تو صحابہؓ بے حد گھبرائے تو اس موقع پر حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا تھا کہ **لا تفریط فی النوم** ۔یعنی چونکہ ہم لوگوں نے جاگنے کا پورا انتظام کیا لیکن باوجود کوشش کے پھر بھی آنکھ لگ گئی اس لئے اس سونے میں تفریط نہیں ہوئی یہ تو ان کا ذکر تھا جو بیدار ہی نہیں ہوئے اور بعض لوگ باوجود بیدار ہونے کے محض سستی کی وجہ سے پڑے رہتے ہیں سو اول تو نماز وغیرہ میں بھی ٹوٹا ہے لیکن خیر اگر بڑی دوڑ دوڑی تو نماز کے پابند ہو گئے لیکن دوسرے اعمال یا تقویٰ کے شعبے اکثر ندارد۔

بدنظری اور اس کا علاج:

چنانچہ بعض لوگ نظر میں مبتلا ہوتے ہیں یعنی غیر محرموں کی طرف بیباکانہ دیکھتے ہیں اور اس کی ذرا پرواہ نہیں کرتے بلکہ یہ ایسا مرض ہے کہ اس سے بہت کم لوگ پاک ہیں کیونکہ اکثر ان گناہوں سے لوگ بچتے ہیں جن کے ارتکاب میں فوت جاہ یا رسوائی کا خیال ہو اور اس گناہ میں جاہ فوت نہیں ہوتی اس لئے کہ اول تو دوسرے کو نظر کی خبر ہی کیونکر ہو سکتی ہے دوسرے اگر نظر کی اطلاع بھی ہو جائے تو نیت کی کیا خبر اس کا امتیاز کسی کو بھی نہیں ہو سکتا کہ یہ نظر بشہوت ہے یا بہ شفقت و محبت کیونکہ یہ ایک امر مبطن ہے خاص کر جبکہ شریعت نے دوسروں کو بدگمانی کی ممانعت بھی فرما دی تو اور بھی بدنظری کا گمان نہ کیا جائے گا اور جاہ فوت نہ ہو گی۔ اس گناہ سے چونکہ جاہ فوت نہیں ہوتی اس واسطے اس میں اکثر وہ لوگ مبتلا ہیں جو بظاہر ثقہ معلوم ہوتے ہیں۔ اس لئے اس گناہ کی نسبت خاص طور سے خدا تعالیٰ نے اپنے علم کی اطلاع دی فرماتے ہیں۔ يَعْلَمُ خَائِنَةَ الْأَعْيُنِ اگر کسی دوسرے کو اس خیانت کی اطلاع نہیں ہوتی تو ہم کو اطلاع ہے اور ہماری اطلاع قابل نظر ہے اس کے بعد فرماتے ہیں وَمَا تُخْفِي الصُّدُوْرُ (جو کہ امر سینوں میں پوشیدہ ہے وہ بھی ہم جانتے ہیں یہ اس لئے بڑھا دیا کہ بعض لوگ محض وقوع نظر کی اطلاع کو مفوت جاہ سمجھ کر اس سے بھی بچتے ہیں کیونکہ سمجھتے ہیں کہ ممکن ہے اس کے وقوع ہی سے کسی کو بدگمانی پیدا ہو جائے اس لئے اس سے بھی بچتے ہیں لیکن ان کے قلب میں یہ مرض شہوت ہوتا ہے اور لطف یہ کہ باوجود اس مرض قلبی کے یہ شخص اپنے کو متقی سمجھتا ہے حالانکہ خیالات اس کے نہایت گندے ہوتے ہیں کہ وہ اکثر حدیث نفس

میں مبتلا ہوتا ہے بلکہ بعض اوقات عزم بھی ہو جاتا ہے یعنی اگر اس کو موقع مل جائے تو یہ ہرگز نہ بچے تو ان لوگوں کے علاج کے لئے یہ بڑھا دیا کہ ہم دلوں کی پوشیدہ بات کو بھی جانتے ہیں۔

بدنظری سے متعلق شیطان کا دھوکہ:

غرض نظر کی معصیت اتنی مہتم بالشان معصیت ہے کہ خدا تعالیٰ نے اس کو مستقل طور پر ذکر فرمایا اور جب اس کی عادت ہو جاتی ہے تو اس کا چھوٹنا نہایت دشوار ہو جاتا ہے اور بعض اوقات اس میں یہ ہوتا ہے کہ شیطان بہکاتا ہے کہ ایک دفعہ نظر بھر کر دیکھ لو تو جی بھر جائیگا اور یہ شیطان کا ایسا دھوکہ ہے کہ صغائر کبائر سب میں اس کے ذریعے سے کام لیتا ہے یہ دھوکا بظاہر نظر خفیف سا معلوم ہوتا ہے لیکن غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ کتنا بڑا دھوکہ ہے اور کس قدر قبح میں اشد ہے خلاصہ اس کا یہ ہے کہ شیطان نے ایک معصیت کو بصورت طاعت اس کے سامنے پیش کیا اور طرح اس میں مبتلا کر دیا اور صورت طاعت اس لئے ہوئی کہ شیطان نے دل میں یہ ڈالا کہ ارتکاب ایک گناہ کے چھوٹنے کا ذریعہ ہے اور ترک گناہ کا ذریعہ سبب اول تو طاعت واجبہ یا کم از کم ایک امر مستحب تو ضرور ہوگا اگر مستحب بھی نہ ہوگا جائز تو ضرور ہوگا تو گو شیطان نے ایک معصیت کو طاعت یا جائز اس کے ذہن میں ڈالا تو کس درجہ کا قبیح اعتقاد ہوا اور باوجود اس خرابی کے پھر وہ مقصود بھی جس کا شیطان نے وعدہ کیا ہے حاصل نہیں ہوتا۔ کیونکہ خاصیت اس کی یہ ہے کہ القليل يفضي الى الكبير (قلیل کثیر تک پہنچا دیتا ہے) یعنی جب تک انسان بچا رہے اس وقت تک محفوظ رہتا ہے اور جب ایک مرتبہ مبتلا ہو جائے اور پھر ترک بھی کر دے اگرچہ دو چار دن کے لئے ترک میں کامیاب ہو جائے اور اس مدت تک پھر طبیعت ادھر متوجہ نہ ہو لیکن دو چار دن گزرنے کے بعد پھر تقاضا شروع ہوتا ہے اور چونکہ ایک مرتبہ ارتکاب ہو جانے سے وہ رکاوٹ رہی نہیں اس لئے بہت جلد اس میں مبتلا ہو جاتا ہے اور ساری عمر اسی میں گزر جاتی ہے اور پھر وعدہ ترک کی وہ حالت ہوتی ہے کہ

ہر شبے گویم کہ فردا ترک ایں سودا کنم　　　باز چوں فردا شود امروز را فردا کنم

(ہر رات کو یہ وعدہ کرتا ہوں کہ کل یہ دھندا ترک کر دوں گا اور جب کل آتی ہے اسے پھر کل پر ڈال دیتا ہوں)۔

اور یہ دو چار دن کے لئے معاصی کی کامیابی بھی علی سبیل الفرض مان لی ہے۔ ورنہ اصل تو یہ ہے کہ گناہ پر کبھی یہ اثر ترک معصیت کا مرتب ہی نہیں ہوتا شیخ سعدیؒ فرماتے ہیں۔

شکم صوفی را زبوں کرد و فرج　　　دو دینار بر ہر دو آں کرد خرچ

صوفی سے ظاہری صوفی مراد ہے۔ یعنی ایک دینار سے اس نے شہوت کو پورا کرلیا اور دوسرے دینار سے پیٹ کو بھر لیا اور سمجھا کہ اب اطمینان ہوگیا آگے فرماتے ہیں کہ پیٹ جس کو بھرا تھا وہ تو پھر خالی ہوگیا اور فرج جس کو خالی کیا تھا وہ پھر بھر گیا خواہش نہ پیٹ کی کم ہوئی نہ فرج کی اور دینار دونوں برباد کئے۔ تو واقعی یہی حالت ہے تو اول تو گمان ہی غلط ہے کہ ایسا کر لینے سے یکسوئی ہوجائے گی اور اگر کسی کو شاذ و نادر ہو بھی جائے تو اس سے صرف یہ ثابت ہوگا کہ اس گناہ میں یہ منفعت (نفع) ہے لیکن کسی گناہ میں منفعت ثابت ہوجانے سے بھی وہ گناہ گناہ ہی رہتا ہے دیکھئے شراب میں بھی منافع ہیں۔

گناہ میں منفعت ہونے سے حلال نہیں ہوتا:

چنانچہ اہل تجربہ نے لکھا ہے کہ اس کے پینے سے سخاوت بڑھتی ہے اور بہادری پیدا ہوتی ہے نیز اور بھی بعضے اخلاق کہ ان کا حصول شرعاً مطلوب ہے اس سے حاصل ہوتے ہیں بلکہ خود قرآن میں اس کے اندر منافع مان لئے گئے ہیں فرماتے ہیں۔ یَسْئَلُوْنَکَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَیْسِرِ قُلْ فِیْهِمَآ اِثْمٌ کَبِیْرٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَاِثْمُهُمَآ اَکْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا ۔ (وہ آپ سے شراب اور جوئے کے بارہ میں دریافت کرتے ہیں اور آپ ان سے کہدیں کہ ان دونوں میں لوگوں کے لئے بہت بڑا گناہ بھی ہے اور بہت بڑا نفع بھی ہے لیکن ان کا گناہ ان کے نفع سے کہیں زیادہ ہے) لیکن ان منافع کے ہونے سے شراب کو حلال نہیں کردیا گیا بلکہ اس کی حرمت ویسی ہی باقی رہی پس اسی طرح اگر کسی دوسری معصیت میں بھی کچھ منافع ثابت ہوجائیں تو ان کے منافع کی وجہ سے وہ حلال اور جائز ہوجائے گی بلکہ ان منافع کو کالعدم قرار دیں گے اور اس فعل کو معصیت ہی کہیں گے پھر ان سب باتوں کے ماسوا اگر عین ارتکاب کے وقت دم نکل جائے کیونکہ موت حیات کسی کے اختیار میں نہیں ہے۔ تو بتلایئے کہ کس روی حالت میں انتقال ہوگا اور اگر نہ بھی مرے تو ممکن ہے کہ ارتکاب کے بعد توبہ نصیب نہ ہو۔

کثرت معاصی سے بے باکی بڑھ جاتی ہے:

بلکہ ایسے لوگوں کو اکثر توبہ نصیب نہیں ہوتی کیونکہ جب بے باکی بڑھ جاتی ہے تو ان افعال پر ندامت نہیں ہوتی اور جب ندامت نہیں ہوتی تو یہ بھی نصیب نہیں ہوتی کیونکہ ہر چند توبہ مقولہ فعل میں سے ہے لیکن اس کا جزو اخیر انفعال ہے جیسا کہ حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ ارشاد ہے

التوبہ ندم (توبہ پشیمانی اور ندامت ہے) اور یہ جزو پورے طور سے اختیار میں نہیں اور جب کثرت معاصی سے بے باکی ہو جاتی ہے تو ندم پھر مشکل سے پیدا ہوتی ہے اور جب یہ حالت ہے تو ذرا غور کر لیجیے کہ ہم لوگ کس برتے پر گناہ کی جرات کرتے ہیں یہ لکھے پڑھے لوگوں کے گناہ ہیں کہ تاویلیں کر کر کے ان کے مرتکب ہوتے ہیں۔

عجب کا علاج معصیت سے کرنے کی مثال:

علیٰ ہذا اہل دل کو بھی بسا اوقات اسی قسم کا دھوکہ ہوتا ہے چنانچہ اگر عجب پیدا ہوتا ہے تو اس کا علاج کسی معصیت سے کیا جاتا ہے اور مصلحت یہ سمجھی جاتی ہے کہ ایسا کرنے سے ہم اپنی نظروں میں ذلیل رہیں گے اور اس سے عجب کی جڑ کٹ جائے گی۔ صاحبو! یہ ایسا علاج ہے جیسا کہ کوئی شخص بدن سے پاخانے کو بذریعہ پیشاب دھونے لگے نیز درپردہ یہ لوگ شریعت محمدیہ ﷺ پر اعتراض کرتے ہیں اور شریعت محمدیہ ﷺ کو ہنوز کامل نہیں سمجھتے کیونکہ شریعت محمدیہ ﷺ نے گناہ سے بچنے کی ترکیب یہ کہیں نہیں بتلائی کہ ایسا گناہ میں مبتلا ہو جاؤ اور یہ لوگ اس ترکیب کو علاج سمجھتے ہیں تو معلوم ہوا کہ شریعت محمدیہ ﷺ کو امراض باطن کے علاج میں ناقص سمجھتے ہیں اور یہ مقابلہ ہے۔ اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ (آج کے دن تمہارے لئے تمہارے دین کو میں نے کامل کر دیا اور میں نے تم پر اپنا انعام تمام کر دیا) اور کہتے کہ بعض بزرگوں نے بھی اس کو علاج بتلایا ہے تو ہم کہیں گے اگر حکایت صحیح ہے تو انہوں نے غلطی کی اور یہ کوئی ضروری نہیں۔ ہے کہ جس شخص کا نام کتاب میں لکھا ہو وہ ضرور شیخ قابل تربیت ہو یا اس قابل ہو جائے کہ اس کی تقلید کریں۔

زبان کا گناہ:

اسی طرح زبان کا گناہ ہے کہ شاید طالب علم سے زیادہ اس میں کوئی شخص مبتلا نہیں ہوتا اور یہ گناہ نہایت ہی شدید ہے۔ حدیث میں ہے الغیبة اشد من الزنا (غیبت زنا سے بھی زیادہ سخت گناہ ہے) اور پھر غیبت بھی دو قسم کے لوگوں کی ہوتی ہے ایک تو برے کو برا کہنا اور ایک اچھے کو برا کہنا عوام الناس اگر غیبت میں مبتلا ہیں تو وہ اکثر ایسے لوگوں کو برا کہتے ہیں جو کہ واقع میں برے ہیں اور ہم لوگ ایسے لوگوں کو برا کہتے ہیں جو کہ نہایت صالح متقی عالم فاضل ہیں اکثر طالب علموں کی زبان سے سنا ہوگا کہ فلاں شخص کو آتا ہی کیا ہے فلاں میں یہ عیب ہے اگرچہ ان فضلاء میں بعض ایسے لوگ بھی جو کہ فضول سے مشتق ہیں اور ان کی غیبت جائز بھی ہے یہ وہ لوگ ہیں جو کہ

خلق اللہ کو گمراہ کر رہے ہیں لیکن بہتر یہ ہے کہ ان کی غیبت سے بھی بچا جائے کیونکہ جب غیبت کی عادت ہو جاتی ہے تو پھر اچھے اور برے کی تمیز نہیں رہتی اور حفظ حدود نہیں ہو سکتا۔ یہ حالت ہوتی ہے کہ جس کی طرف سے ذرا بھی کدورت ہوئی فوراً اس کا تذکرہ برائی کے ساتھ شروع کر دیا۔ اسی طرح قلب کی یہ حالت ہے کہ اس میں کینہ، حسد، بغض عداوت غرض تمام امراض بھرے ہوئے ہیں اسی لئے میں نے کہا تھا کہ اگر عمل کا تھوڑا بہت اہتمام ہے بھی تو صرف اعمال جوارح کا باقی زبان اور قلب اکثر تباہ ہے اور اکثر تو ہم میں سے تینوں ہی قسم کے گناہوں میں خوب اچھی طرح سے مبتلا ہیں غرض بیباکوں کو تو سب میں ابتلا ہے اور محتاط قدرے جوارح کی حفاظت کرتے ہیں مگر زبان کی حفاظت نہیں کرتے اور جو بہت ہی متقی ہیں وہ زبان کی بھی حفاظت کر لیتے ہیں قلب کی حفاظت وہ بھی بہت کم کرتے ہیں اور معاصی قلوب سے ان کو بہت کم نجات ہوتی ہے تو مرض قلب وہ مرض ہوا کہ قریب قریب سب کے سب ہی اس میں مبتلا ہیں۔ اس لئے خدا تعالیٰ نے اس آیت میں تینوں نوعوں کی طرف اشارہ کر دیا کہ انبیاء جوارح کو بھی بچاتے تھے کہ يُسَارِعُونَ فِي الْخَيْرَاتِ ان کی حالت تھی اور زبان کو بھی معاصی سے روک کر اس کو طاعت میں لگاتے تھے يَدْعُونَنَا ان کی شان تھی اور پھر ان کی دعا بھی رغبت اور رہبت کے ساتھ تھی یعنی ظاہر یہ ہے کہ رغبت اور رہبت کو بہ طور شرط فرمایا ہے اور مقصود يَدْعُونَنَا معلوم ہوتا ہے اگرچہ دوسری تفسیر بھی اس کی ممکن ہے جیسا کہ میں نے پہلے اشارہ بھی کیا ہے لیکن مجھے اختیار ہے کہ میں اس تفسیر کو اختیار کر لوں۔ اور قلب کو معاصی سے پاک رکھتے تھے کہ ان میں خشوع پایا جاتا تھا۔

خشوع عمل قلب ہے:

مجھے زیادہ تر اس وقت یہی بیان کرنا بھی ہے کہ یہ تیسرا جزو یعنی خشوع کہ عمل قلب ہے ہم میں بہت کم پایا جاتا ہے حالانکہ یہ ساری طاعت کا راس ہے مگر ہم لوگ اس کی ذرا فکر اور اہتمام نہیں کرتے اور ہماری اس حالت فقدان خشوع کی شکایت نہایت صاف لفظوں میں قرآن شریف میں بھی ہے فرماتے ہیں۔ اَلَمْ يَأْنِ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُهُمْ لِذِكْرِ اللّٰهِ یعنی کیا مسلمانوں کیلئے ہنوز وہ وقت نہیں آیا کہ ان کے قلب خشوع کرنے لگیں اور ظاہر ہے کہ شکایت اس امر کے ترک پر ہوتی ہے جس کا کرنا نہایت ضروری اور واجب ہو۔ تو معلوم ہوا کہ خشوع نہایت ضروری عمل ہے اور اس کا مقابل قساوت ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے اَفَمَنْ شَرَحَ اللّٰهُ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ فَهُوَ عَلٰى نُوْرٍ مِّنْ رَّبِّهٖ فَوَيْلٌ لِّلْقٰسِيَةِ قُلُوْبُهُمْ مِّنْ ذِكْرِ اللّٰهِ الخ (بھلا

جس کا سینہ کھول دیا اللہ تعالیٰ نے اسلام کیلئے سو وہ اجالے پر ہے اپنے رب کی طرف سے سو خرابی ہے ان لوگوں کیلئے جن کے دل اللہ تعالیٰ کی یاد سے قاسی ہیں۔) اور آگے فرماتے ہیں۔ اَللّٰهُ نَزَّلَ اَحْسَنَ الْحَدِيْثِ كِتٰبًا مُّتَشَابِهًا مَّثَانِيَ تَقْشَعِرُّ مِنْهُ جُلُوْدُ الَّذِيْنَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ ثُمَّ تَلِيْنُ جُلُوْدُهُمْ وَقُلُوْبُهُمْ اِلٰى ذِكْرِ اللّٰهِ (اللہ تعالیٰ نے نازل فرمائی بہتر بات (یعنی کتاب جو کہ آپس میں ملتی جلتی ہے دہرائی ہوئی ہے اس سے ان لوگوں کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں جو کہ اللہ تعالیٰ سے ڈرتے ہیں پھر نرم ہوتی ہے ان کی کھالیں اور ان کے دل اللہ تعالیٰ کے ذکر کی طرف مائل ہو جاتے ہیں) تو اس آیت میں قساوت کا مقابل لین کو فرمایا ہے اور لین وہی خشوع ہے تو معلوم ہوا کہ خشوع کا مقابل قساوت ہے۔

قساوت کی مذمت:

اور قساوت کے بارے میں حدیث میں ارشاد ہے ان ابعد شیء من اللّٰہ القلب القاسی تو خشوع کی تاکید کرنا جیسا کہ سابق آیت میں ہے اور قساوت کی مذمت کرنا جس کا حاصل خشوع کے ترک پر مذمت کرنا ہے جیسا مابعد کی آیت میں ہے اس سے زیادہ اور اس کے ضروری اور واجب ہونے کیلئے کیا چاہیے پس ہر عالم اور طالب کیلئے لازم ہے کہ وہ قلب میں خشوع پیدا کرے اور اس کے ظاہری آثار یہ ہیں کہ جب چلے گردن جھکا کر چلے بات چیت میں معاملات میں سختی نہ کرے غیظ اور غضب میں مغلوب نہ ہو۔ انتقام کی فکر میں نہ رہے علیٰ ہذا اور ان کو آثار اس لئے کہا کہ جب قلب میں خشوع کی صفت ہوگی تو جوارح پر اس کا اثر ضرور پڑے گا حضرت قاضی ثناء اللہ صاحبؒ نے اپنی تفسیر میں ایک حدیث نقل فرمائی ہے کہ حضور علیہ ﷺ نے ایک شخص کو دیکھا کہ وہ نماز پڑھ رہا تھا اور اپنی داڑھی سے کھیل رہا تھا۔ حضور علیہ ﷺ نے فرمایا کہ اگر اس کے قلب میں خشوع ہوتا تو یہ ایسا ہرگز نہ کرتا اب اس کی ضرورت اور آثار معلوم ہو جانے کے بعد دیکھئے کہ آیا ہمارے قلب میں خشوع ہے یا نہیں اور ہمارے قلوب میں اَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُهُمْ کے مضمون میں داخل ہے یا نہیں اور ہمارے قلوب میں ترفع اور شیخی تو نہیں پائی جاتی پس اگر ہمارے قلوب میں خشوع ہے تو کیا وجہ کہ اس کے آثار نہیں پائے جاتے اس کی کیا وجہ کہ ہم کو اپنا کام خود کرنے سے یا کسی مسلمان کا کام سے عار آتی ہے۔ صاحبو! حضور علیہ ﷺ سے زیادہ تو مخدوم نہیں ہے پھر دیکھ لیجئے کہ حضور علیہ ﷺ کی کیا حالت تھی فرماتے ہیں۔ انی اکل کما یاکل العبد (کہ میں کھاتا اس طرح کھاتا ہوں کہ جیسے کوئی غلام کھاتا ہے جس میں تجبر اور اکڑ اور اپنے کو بڑا سمجھنا اور تکبر کا نام نہیں ہوتا۔

حضور علیہ الصلوۃ والسلام کے اقوال وافعال دونوں متبوع ہیں:

حدیثوں سے معلوم ہوتا ہے کہ حضور پرنور ﷺ اکثر دن بیٹھ کر کھانا کھاتے تھے چلنے پھرنے کی یہ حالت تھی کہ حضور ﷺ کبھی آگے نہ چلتے تھے بلکہ کچھ صحابہؓ آگے ہوتے تھے اور کچھ برابر میں ہوتے تھے اور کچھ پیچھے ہوتے تھے اور یہ کسی کا آگے اور کسی کا پیچھے چلنا بھی کسی خاص نظم اور ترتیب سے نہیں تھا جیسا آج کل بادشاہوں اور بڑے بڑے لوگوں کی عادت ہے کہ جب چلتے ہیں تو باقاعدہ کچھ لوگ ان کی عزت وشان بڑھانے کو ان کے آگے پرا جمائے ہوتے ہیں اور کچھ لوگ ان کے پیچھے ہوتے ہیں سو یہ نہ تھا بلکہ جس طرح بے تکلف احباب ملے جلے چلتے ہیں کہ کبھی کوئی آگے ہوگیا اور کبھی کوئی آگے ہوگیا اس طرح چلتے تھے لباس کی یہ شان تھی کہ ایک ایک کپڑے میں کئی کئی پیوند لگا کر پہنتے تھے آرام کرنے کی یہ حالت تھی کہ ٹاٹ کے اوپر آرام کرتے تھے۔ معاشرت کی یہ حالت تھی کہ اپنا کاروبار خود کرتے تھے بازار سے ضرورت کی چیزیں جا کر خرید لاتے تھے۔ غرض یہ سب افعال جو حضور ﷺ کے منقول ہیں تو کس لئے کیا اس لئے ہم سنیں اور پرواہ بھی نہ کریں۔ صاحبو! جس طرح حضور ﷺ کا قول متبوع ہے اسی طرح آپ کا فعل بھی متبوع (جنکی پیروی کی جائے) ہے جب تک تخصیص کی کوئی دلیل نہ ہو۔ ارشاد ہے۔ لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ (تمہارے لئے اللہ تعالیٰ کے رسول ﷺ کے اندر اچھی اور عمدہ عادتیں ہیں) تو یہ افعال بھی سب اتباع ہی کیلئے ہیں کہ ہماری بھی وہی وضع ہو وہی چال ڈھال ہو وہی معاشرت ہو۔ ایک صحابیؓ بیان کرتے ہیں کہ میں ایک مرتبہ حضور پرنور ﷺ کو کھانا کھاتے دیکھا تو کانپ اٹھا کہ حضور ﷺ تواضع کی کس حیثیت سے بیٹھے ہیں۔ ایک بار حضور ﷺ سے کوئی باہر کا ایلچی ڈر گیا تو آپ نے فرمایا کہ مجھ سے مت ڈرو میں ایک غریب عورت کا بیٹا ہوں جو کہ سوکھا گوشت کھاتی تھی۔ حضور ﷺ کے ان حالات کو دیکھئے اور پھر اپنے کو تو معلوم ہوگا۔

ببیں تفاوت رہ از کجاست تا بکجا

(راستے کا فرق دیکھو کہ کہاں سے کہاں تک ہے)

اہل علم کو سادگی اختیار کرنے کی ضرورت:

حدیث میں وارد ہے کہ البذاذة من الایمان (کہ سادگی ایمان کا ایک شعبہ ہے) سو دیکھ لیجئے کہ ہم میں بذاذة اور سادگی پائی جاتی ہے یا نہیں میرے خیال میں جہاں تک غور کیا جائے

گا ہم میں سادگی کا پتہ بھی نہیں ملے گا اور نہایت افسوس اس امر کا ہے کہ اس وقت خود اکثر اہل علم میں عورتوں کی سی زینت آ گئی ہے۔ صاحبو! یہ ہمارے لئے دین کے اعتبار سے بھی اور دنیا میں بھی سخت نقص ہے۔ اس سے بجائے عزت بڑھنے کے اور ذلت بڑھتی ہے ہمارا کمال تو یہ ہے کہ ؎

اے دل آں بہ خراب از مے گلگوں باشی　　　　بے زر و گنج بصد حشمت قاروں باشی

(اے دل بہتر یہ ہے کہ تو مئے گلگوں کو پی کر مست ہو جائے اور بغیر کسی مال اور بغیر کسی خزانے کے قارون کی حشمت اور اس کا رعب پیدا کرے)

در رہ منزل لیلیٰ کہ خطرہاست بجاں　　　　شرط اول قدم آنست کہ مجنون باشی

(منزل لیلیٰ کے راستہ میں جس میں جان کے خطرے میں پہلی شرط یہ ہے کہ تو مجنون بنے۔ ہمارے لئے کمال یہی ہے کہ نہ لباس میں کوئی شان و شوکت ہو نہ دوسرے سامان میں مگر اس وقت یہ حالت ہے کہ اکثر طالب علموں کو دیکھ کر یہ نہیں معلوم ہوتا کہ یہ طالب ہیں یا کسی نواب کے لڑکے اور یہ کوئی دیندار ہیں یا دنیا دار کسی نے خوب کہا ہے ؎

یا مکن با پیلباناں دوستی　　　　یا بنا کن خانہ برانداز پیل

یا مکش بر چہرہ نیل عاشقی　　　　یا فرو شو جامہ تقویٰ بہ نیل

(یا تو ہاتھی ہانکنے والوں کے ساتھ دوستی مت کرو یا اگر کرتے ہو تو ہاتھی کے برابر اپنا مکان بھی بناؤ۔ یا تو چہرے پر عاشقی کا رنگ مت لگاؤ اور اگر لگاتے ہو تو پھر تقویٰ کے لباس کو بھی اسی رنگ میں رنگو)

یعنی یا تو آدمی کسی جماعت میں داخل نہ ہو اور اگر داخل ہو تو پھر وضع قطع سب اسی کی سی ہونا چاہیے۔

زینت علم:

علم کی یہی زینت ہے کہ اہل علم کی وضع پر رہے میں کہتا ہوں کہ اگر اس کا بھی خیال نہیں تو کم از کم اس کا خیال تو ضرور کیجئے کہ آپ کس کے وارث ہونے کے مدعی ہیں اور ان مورث کی کیا حالت تھی۔ واللہ ہماری حالت سے یہ صاف معلوم ہوتا ہے کہ ابھی دین کا ہم پر کامل اثر نہیں ہوا دین ہمارے قلب میں پوری جگہ نہیں کی ہمارے سلف صالحین کی تو یہ حالت تھی کہ انہوں نے بعضے مباح امور کو بھی جبکہ وہ مفضی بہ تکلف یا فساق کا شیوہ ہو گئے تھے ترک کر دیا تھا چنانچہ بناء اول پر باریک کپڑا پہننا چھوڑ دیا تھا۔ اور اسی بناء پر حدیث شریف میں ہے کہ من رق ثوبہ رق دینہ (جس نے اپنے لباس کو باریک بنایا اس کا دین بھی رقیق اور کمزور ہوگا) دوسری بناء کے متعلق ایک

واقع ہے کہ کسی صحابی یا تابعی نے (میں اس وقت بھولتا ہوں) ایک مرتبہ کسی خلیفہ کو مہین لباس پہنے دیکھ کر یہ کہا تھا کہ انظروا الیٰ امیرنا ھذا یلبس ثیاب الفساق (ہمارے سردار کو دیکھو یہ فاسقوں کا لباس پہنتے ہیں) اور بناء ثانی بھی درحقیقت ناشی بناء اول سے تھی یعنی چونکہ سلف میں سادگی بہت زیادہ بڑھی ہوئی تھی اس لئے اس وقت صلحاء باریک کپڑے نہ پہنتے تھے بلکہ فساق ہی پہنتے تھے اس لئے امیر کو فساق کا لباس پہنے دیکھ کر یہ اعتراض کیا پس اس وقت بھی جو امور وضع اہل باطل یا اہل کبر کی ہیں گوفی نفسہ مباح ہی ہوں ان کو ترک کرنا چاہیے جیسے انگریزی بوٹ جوتے پھندے دار ٹوپی وغیرہ۔ کیونکہ اس قسم کے امور اول تو من تشبہ میں داخل ہیں دوسرے اگر ان کو تشبہ سے قطع نظر کر کے مباح مطلق بھی مان لیا جائے تب بھی چونکہ ثقہ لوگوں کی وضع نہیں اس لئے بھی وہ قابل ترک ہوں گے۔ ہماری وضع ایسی ہونا چاہیے کہ لوگوں دیکھتے ہی معلوم ہو جائے یہ ان لوگوں میں ہیں جن کو وحشی و ناکارہ سمجھا جاتا ہے جو کہ ہمارے لئے مایہ فخر ہے کیوں کہ

تابدانی ہر کرا یزداں بخواند	از ہمہ کار جہاں بیکار ماند
اوست دیوانہ کہ دیوانہ نہ شد	مرعسس را دید و در خانہ نہ شد
ما اگر قلاش و گر دیوانہ ایم	مست آں ساقی و آں پیمانہ ایم

(تجھے معلوم ہونا چاہیے کہ جسے یزداں بلا لیتا ہے وہ دنیا کے سارے دھندوں سے بیکار ہوتا ہے۔ وہ پاگل ہے جو کہ دیوانہ نہیں ہوا محافظ کو دیکھا اور گھر میں نہ رہا اگر ہم محتاج اور دیوانے ہیں تو اس ساقی اور اس پیمانے کے مست بھی ہیں۔)

اور اہل تکلف کی وضع کی نسبت فرماتے ہیں

عاقبت سازد ترا از دیں بری	ای تن آرائی وایں تن پروری

(تو اپنی عاقبت سنوار) تجھ کو یہ تکلف اور تصنع انجام کار تجھے دین سے دور کر دیگا۔

زینت اور نظافت میں حد اعتدال:

حقیقت میں اس کا انجام بہت ہی برا ہے کیونکہ اس میں قطع نظر اس کے کہ یہ بذات کے بالکل خلاف ہے ایک بڑی مضرت یہ ہے جب ہر وقت یہی شغل رہے گا تو با قاعدہ النفس لاتتوجہ الیٰ شیئین فی ان واحد (نفس ایک ہی وقت میں دو چیزوں کی طرف متوجہ نہیں ہوتا) یہ ضروری ہے کہ علم کی توجہ نہ رہے گی اور علم سے بالکل بے بہرہ رہے گا چنانچہ مشاہدہ ہے کہ جو لوگ ہر وقت اپنے بناؤ سنگار میں رہتے ہیں نہ ان میں کوئی استعداد ہوتی ہے نہ مناسبت اور یہ یقینی ہے کہ جو شخص

امور عظام (بڑے کاموں) میں مشغول ہوتا ہے اس کی نظر امور صغار (چھوٹے کاموں) پر نہیں رہا کرتی حتی کہ یہ بھی خبر نہیں ہوتی کہ غسل کب کیا تھا اور کپڑے کب بدلے تھے۔ اور یہی سبب ہے کہ شریعت مطہرہ نے یہ قانون مقرر کر دیا کہ ایک ہفتے میں ایک مرتبہ ضرور غسل کر لیا کرو ورنہ یہ تو خود امر طبعی تھا مگر کام کرنے والے لوگوں کو اس طرف التفات نہیں رہتا اس لئے قانون کی ضرورت پڑی۔ سبحان اللہ کس قدر رعائتیں شریعت مطہرہ نے مرعی رکھی ہیں کہ ایک طرف تو بذاذت کا حکم ہو رہا ہے تا کہ زینت اور تکلف نہ آجائے اور چونکہ بعض لوگوں سے اس پر ایسا عمل کرنے کا احتمال تھا کہ وہ اپنے تن بدن کی خبر نہ رکھنے کیوجہ سے حد نظافت سے بھی خارج ہو جاتے اس لئے دوسرے موقع پر یہ بھی ارشاد فرمایا ہے کہ ہفتے بھر میں ایک مرتبہ غسل کر لیا کرو۔ تا کہ نظافت بھی بھی فوت نہ ہو جائے کیونکہ نظافت مطلوب ہے چنانچہ اس کی اس قدر ترغیب دی ہے کہ یوں ارشاد فرمایا۔ نظفوا افنيتكم ولا تتشبهوا باليهود (یعنی اپنے فناء دار کو صاف رکھا کرو اور اس کو میلا کچیلا رکھ کر یہود جیسے نہ بنو فناء دار اس حصہ زمین کو کہتے ہیں جو کہ گھر سے باہر دروازے کے سامنے ہو اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ جب فناء دار تک کی نظافت مطلوب ہے تو خود دار کی اور اس سے بڑھ کر لباس اور بدن کی نظافت کس درجہ مطلوب ہو گی۔ سو شریعت کی تو یہ تعلیم ہے کہ دونوں امر میں اعتدال بتلایا مگر اس کے بعد اپنے اوپر نظر کر کے وہ شعر یاد آتا ہے کہ۔

چوں گرسنہ میشوی تو سگ شوی　　　چونکہ خوردی تند و بدرگ میشوی

(جب تم بھوکے ہوتے ہو تو کتا ہو جاتے ہو اور جب کھاتے ہو تو سرکش اور کمینے ہو جاتے ہو)

یعنی ہماری بھوک بھی ایک آفت اور سیری بھی ایک مصیبت۔ یعنی اگر نظافت اختیار کریں گے تو اس درجہ کہ نواب معلوم ہوں اور بذاذت پر اتریں گے تو اس حد تک کپڑے بھی سڑے ہوئے بدن بھی سڑا ہوا وہ تعدیل کی شان جو شریعت نے سکھلائی ہے اس کا کہیں کوسوں بھی پتہ نہیں حالانکہ ضرورت اس کی ہے کہ نظافت اور بذاذت دونوں کو ہاتھ سے نہ جانے دے یہ تو شرعی پہلو سے بذاذت پر گفتگو تھی۔

تکلفات ترک کرنے کی ضرورت:

اب حسی اعتبار سے لیجئے تو ہم دیکھتے ہیں کہ حسا بھی یہی حالت ہے کہ جو آدمی کسی بڑے کام میں مشغول ہوتا ہے اس کو چھوٹے کاموں کی طرف توجہ نہیں ہوتی مثلاً شادی کے موقع پر جن لوگوں کے سپرد شادی کا انتظام ہوتا ہے ان کو اپنے کپڑوں کی خبر ہوتی ہے نہ بدن کی اور وہ اس کو کچھ عار نہیں سمجھتے بلکہ اپنی کارگزاری پر ناز کرتے ہیں بلکہ جو زیادہ مشغول ہوتے ہیں ان کو اس طرف بھی التفات نہیں ہوتا کہ اس سے کارگزاری کا اظہار ہو گا۔ پس معلوم ہوا کہ انہماک فی الامور العظام کے

لئے بذاقت او عدم الالتفات الی صغار الامور لازم ہے۔ پس جو طالب علم اپنے علم کے شغل میں لگا ہوگا اس کو کبھی اس کی فکر نہ ہوگی کہ میرے پاس بوٹ بھی ہے یا نہیں اور رومال بھی ہے یا نہیں۔ اس کی بناپر محققین نے کہا ہے کہ رفارمر ہونے کیلئے عادۃً لازم ہے کہ وہ بالکل سادہ زندگی بسر کرے گا اور بڑے لوگوں کی سوانح عمری دیکھنے سے بھی اگر چہ وہ دنیا ہی کے بڑے ہوں صاف معلوم ہوسکتا ہے کہ انہوں نے زندگی نہایت بے تکلف بسر کی پس جو شخص ہر وقت مانگ پٹی میں مشغول رہے اس کی نسبت سمجھ لینا چاہیے کہ لیس من الکمال فی شئی (اسے کوئی کمال حاصل نہیں ہے) ایک شخص کو میں نے دیکھا کہ ان کی یہ حالت تھی کہ جب کوئی ان کو گھر پر جا کر آواز دیتا تو کم از کم نصف گھنٹہ میں باہر آتے اس کی وجہ تحقیق کی گئی تو معلوم ہوا کہ جس وقت پکارنے کی آواز گھر میں پہنچتی ہے تو وہ آئینہ اور کنگھا طلب کرتے ہیں اور نہایت تکلف سے بالوں کو درست کر کے مانگ نکال کر داڑھی میں کنگھا کر کے ایک ایک بال کو موزوں بنا کر غرض دولہا بنکر باہر تشریف لاتے تھے۔

(ع) جنوں و خبط شہ کہیے اسے تو کیا کہیے۔ (جامع)

اسی طرح اکثر متکلفین (تکلف کرنے والے) کو دیکھا ہے کہ ان کے پاس ایک دو جوڑے محض اس کام کیلئے رہتا ہے کہ جب باہر نکلیں تو اس کو زیب تن کر کے نکلیں اور جب واپس آجائیں تو پھر وہی لنگوٹی یا سڑے ہوئے کپڑے ان لباس گویا ہاتھی کے دانت ہیں کھانے کے اور دکھانے کے اور ان لوگوں کو شیطان نے یہ دھوکا دیا ہے کہ ان اللّٰہ جمیل ویحب الجمال (اللہ تعالیٰ خوبصورت ہیں اور خوبصورتی کو پسند فرماتے ہیں) اور جب خدا تعالیٰ کو جمال پسند ہے تو ہم کو بھی جمیل بن کر رہنا چاہیے۔ لیکن میں ان سے یہ سوال کرتا ہوں کہ اگر یہ تزین محض جمال کی وجہ سے ہے تو اس کی کیا وجہ کہ محض جلوت میں یہ تکلف کا لباس پہنا جاتا کیا خلوت میں خدا تعالیٰ کو جمال پسند نہیں۔ صاحبو! یہ سب نفس کی توجیہات اور نکات بعد الوقوع ہیں اور خود آثار سے پتہ چل جاتا ہے کہ اصل مقصود کیا چنانچہ ہم نے بعض لوگوں کو دیکھا ہے کہ نہایت کم قیمت کپڑا معمولی کپڑا نہ پہنیں گے لیکن وضع ایسی اختیار کریں گے کہ دوسرے کو نہایت قیمتی معلوم ہو نیز تراش ایسی ہوگی کہ یہ بڑے لوگوں میں شمار ہوں اور وضع و تراش کا ذکر تکلف کی مثال میں اس لئے کیا کہ کپڑے میں ایک مادہ ہوتا ہے اور ایک صورت اور ہیئت۔ سو تکلف میں اکثر زیادہ دخل ہیئت کو ہوتا ہے یعنی اگر کسی قیمتی کپڑے کی سادہ ہیئت بنالی جائے تو وہی معمولی اور سادہ معلوم ہونے لگتا ہے ہم نے بعض امراء کو دیکھا ہے کہ وہ نہایت قیمتی کپڑا پہنتے ہیں لیکن اس کی وضع سادہ ہوتی ہے کہ وہ بالکل معمولی معلوم ہوتا ہے اسی طرح بعض غرباء کو دیکھا ہے کہ وہ کپڑا کم قیمت پہنتے ہیں مگر بہت خوبصورت بنا

کر۔ تو اگر خدا تعالیٰ نے وسعت دی ہو کپڑا اچھا پہنو لیکن اس کی وضع بالکل سادہ رکھو اس میں بناوٹ اور تزئین ہرگز نہ ہونے دو مگر یہ اسی سے ہو سکے گا جو کسی بڑے کام میں مشغول ہوگا۔ پہلے طالب علموں کی یہ کیفیت ہوتی تھی کہ وہ بالکل اول جلول رہتے تھے کہ نہ کرتے کی خبر ہے نہ پاجامے کی پھر دیکھ لیجئے کہ ان میں جواب موجود ہیں وہ اپنے وقت کے مقتدا ہیں اور جو شخص کرتے پاجامے کی زیب و زینت میں مشغول رہے گا اس کو کبھی یہ بات کہاں میسر ہوگی نیز لوگوں کو یہ بھی غور کرنا چاہیے کہ ہم جو تکلف اور فیشن کے پیچھے پڑے ہیں آخر اس کی غرض کیا ہے ظاہر ہے کہ اپنی قدر بڑھانا اور لوگوں کی نظروں میں عزیز بننا یہی اس کی غرض ہوتی ہے سو علماء کی جماعت میں تو اس سے کچھ قدر نہیں ہوتی اس جماعت کی نظروں میں قدر بڑھانے کی تو صورت یہ ہے کہ علم میں کمال حاصل ہو۔ اگر چہ پیجامہ نصف ساق تک ہو اور اگر چہ کرتہ بالکل بھی نہ ہو کانپور میں جس زمانہ میں میرا قیام تھا ایک مرتبہ مدرسہ میں پڑھاتا تھا کہ ایک شخص آ کر بیٹھے ان کے بدن پر صرف ایک لنگی اور ایک چادر تھا۔ اس ہیئت کو دیکھ کر کسی نے ان کی طرف توجہ نہ کی لیکن جب انہوں نے گفتگو شروع کی تو معلوم ہوا کہ بہت بڑے فاضل ہیں۔ پھر تو ان کی اس قدر وقعت ہوئی کہ ہر ہر طالب ان پر جھکا جا رہا تھا اور تتبع حالات وخیالات عوام سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی نظروں میں بھی اہل علم کی وقعت وضع لباس سے نہیں غرض آپ لوگوں کی وقعت علم اور تقویٰ وطہارت سے ہے نہ کہ لباس سے یہ ظاہری زیب وزینت صرف ان لوگوں کے لئے ذریعہ حصول وقعت ہے۔ جو کمال سے عاری ہیں ورنہ خوب سمجھ لو کہ

زعشق ناتمام ما جمال یار مستغنی ست   بآب ورنگ خال وخط چہ حاجت روی زیبا را

(ہمارے ناقص عشق کی جمال یار کو کوئی ضرورت نہیں آب ورنگ تل وخط کی حسین چہرے کو کیا حاجت ہو سکتی ہے)

اور یہ بھی اس وقت ہے کہ وقعت کو کسی درجے میں قابل شمار کہا جائے۔

خشوع کے آثار:

ورنہ اگر غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ خود یہ وقعت ہی کوئی چیز قابل اہتمام نہیں غرض یہ آثار ہیں کپڑے میں خشوع تجمز کے۔ اسی طرح چلنے اور بولنے میں بھی اس کے کچھ آثار ہیں جن کی نسبت ارشاد خداوندی ہے۔ وَاقْصِدْ فِیْ مَشْیِکَ وَاغْضُضْ مِنْ صَوْتِکَ (اپنی رفتار میں میانہ روی پیدا کرو اور آواز کو پست کرو) پس معلوم ہوا کہ جب قلب میں خشوع ہوتا ہے تو رفتار میں بھی خشوع کا اثر ہوتا ہے اور آواز میں بھی اس کا اثر ہوتا ہے اور جیسے خشوع کے لئے یہ

آثار لازم ہیں اسی تجربہ نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ ان آثار کے لئے بھی خشوع لازم ہے۔ بلکہ ہر ظاہری ہیئت کا اثر باطن پر پڑتا ہے۔ دیکھئے اگر کوئی شخص غمگین صورت بنا کر بیٹھ جائے تو قلب میں بھی اضمحلال کا اثر محسوس ہوگا۔ یا اگر کوئی شخص متکبرانہ وضع بنالے تو دل میں بھی ایک تجبر اور تکبر کی شان پائی جائے گی تو جیسے باطن ظاہر میں مؤثر ہے کہ باطن سوافق آثار ظاہر میں پائے جاتے ہیں اس طرح ظاہر بھی باطن میں مؤثر ہے۔ جب ایسا ہے تو جن لوگوں کو اس وقت تک صفت خشوع حاصل نہیں ہو سکی ان کو چاہیے کہ متواضعین کے افعال اختیار کریں انشاء اللہ تعالیٰ اس سے قلب میں بھی تواضع صفت پیدا ہوگی اور صاجو کوئی تو وجہ ہے کہ رسول مقبول ﷺ نے متکبرین کے افعال سے ممانعت فرمائی اور قرآن شریف میں. وَاقْصِدْ فِيْ مَشْيِكَ وَاغْضُضْ مِنْ صَوْتِكَ ارشاد ہوا۔ ذرا آپ اپنے اسلاف کے حالات دیکھئے کہ ان کی کیا شان تھی بلکہ میں کہتا ہوں کہ حضرات اکابرین اس وقت موجود ہیں ان ہی کے حالات کو دیکھ لیجیے کیا ان کے افعال قابل اتباع نہیں ضرور ہیں پس ہم کو لازم ہے کہ ہم وہی وضع اختیار کریں جو کہ ان کو مرغوب ہو اور جس کو وہ اختیار کر چکے ہیں۔ کیا عجب ہے کہ ہم اس تشبہ ظاہری کی بدولت اپنے باطن کو درست کر سکیں اہل اللہ کے ساتھ یہ ظاہر کا تشابہ بھی وہ چیز ہے کہ اس کی بدولت کفار پر فضل ہو گیا۔

ساحران موسیٰ علیہ السلام کے ایمان لانے کا سبب:

سیر کی روایت ہے کہ جب فرعون نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے مقابلہ کے لئے ساحرین کو جمع کیا تو وہ لوگ ایسے لباس میں آئے تھے جو موسیٰ علیہ السلام کا لباس تھا آخر مقابلہ ہوتے ہی تمام ساحرین مسلمان ہو گئے حضرت موسیٰ علیہ السلام۔ نے حضرت خداوندی سے عرض کیا کہ الٰہی یہ سامان فرعون کے اسلام کے لئے ہوا تھا کیا سبب اس پر فضل ہوا اور ساحرین کو توفیق ایمان ہوگئی ارشاد ہوا کہ اے موسیٰ یہ لوگ تمہاری سی صورت بن کر آئے تھے ہماری رحمت نے پسند نہ کیا کہ ہمارے محبوب کے ہم وضع لوگ دوزخ میں جائیں اس لئے ان کو توفیق ہوگئی اور فرعون تو چونکہ اتنا مناسبت نہیں تھی اس لئے اس کو یہ دولت نصیب نہ ہو سکی۔ اس حکایت سے احتجاج مقصود نہیں کہ اس کے ثبوت میں کلام کرنے لگو بلکہ صرف تائید منظور ہے اگر یہ حکایت صحیح نہ ہو اور اس لئے تقریر سے حذف بھی کر دی جائے تو بھی اصل مضمون دلائل سے ثابت ہے کہ کسی حکایت عدم ثبوت مضر نہیں غرض ہے خشوع اور اس کے آثار کی اب ہم کو دیکھنا چاہیے کہ اگر ہم میں صفت خشوع موجود ہے تب تو ہم کو اس کے مناسب وضع اختیار کرنا لازم ہے اور اگر یہ صفت موجود نہیں ہے تو خود اس کی تحصیل کے لئے ایسا کرنا یعنی اسکے آثار کا اختیار کرنا ضروری ہے کیونکہ تحصیل خشوع کی علت کے اجزا میں سے ایک جزو یہ بھی ہے اور دوسرا جزو یہ ہے کہ اہل خشوع کی صحبت اختیار کی جائے تیسرا جزو یہ ہے کہ خدا تعالیٰ کی خشیت کو دل میں جگہ دی جائے۔

خشیت اللہ پیدا کرنے کی تدبیر:

اور اس خشیت کو پیدا کرنے کیلئے تدبیر کی جائے کہ کوئی وقت مناسب تجویز کر کے اس میں تنہا بیٹھ کر اپنی حالت عصیاں اور پھر خدا تعالیٰ کے نعم اور نیز اس کے عذاب آخرت اور قیامت کے اہوال پل صراط میزان دوزخ کی حالت وغیرہ کو سوچا جائے اگر دس منٹ روزانہ بھی اس کو معمول کر لیا جائے تو انشاء اللہ بہت کچھ فائدہ ہو کیونکہ اس کو خشیت کے پیدا ہونے میں بڑا دخل ہے اور پھر خشیت سے خشوع ہوگا نیز دوسرے طور پر بھی اس کو حصول آثار خشوع میں دخل ہے وہ یہ کہ سب سے پہلا اثر جو اس سے ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ دنیا سے دل بالکل اٹھ جاتا ہے اور جب دنیا سے دل اٹھ جائے تو تکلف اور زینت اور اسی طرح دل بستگی کے سب آثار آ جاتے ہیں اور اس قسم کی تمام باتوں سے نفرت ہو جاتی ہے اس لئے کہ اس شخص کے پیش نظر ہر وقت سفر آخرت رہیگا اور دنیا میں اپنے تئیں مسافر سمجھے گا اور ظاہر ہے کہ مسافر کو سفر میں دل بستگی نہیں ہوا کرتی۔ اس کو منزل کا خیال ہر وقت سوہان روح رہتا ہے۔

بعد، فراغ درسیہ علماء کیلئے دستور العمل:

چوتھا جزو علت خشوع کا یہ ہے (اور یہ بعد فراغ کتب درسیہ آپ کے ذمہ واجب العمل ہے) کہ اگر ظاہری علوم کی تحصیل میں دس سال ختم کئے ہیں تو باطن کی درستی میں کافی سال تو کیا چند ماہ ہی خرچ کر دیجئے یعنی کم سے کم دس مہینے ہی کسی کامل کی خدمت میں صرف کیجئے اور اس کے ارشاد کے مطابق چلئے۔ خداوند تعالیٰ کی عادت ہے کہ اس کی برکت سے دولت خشوع عطا فرماتے ہیں اور علم کا اثر قلب کے اندر پیوست ہو جاتا ہے۔ خوب کہا ہے ؂

علم چوں برتن زنی مارے بود　　علم چوں بر دل زنی یارے بود

(علم کو اگر بدن سے لگاؤ گے تو وہ تمہارے لئے سانپ ہو جائیگا اور اگر دل سے لگاؤ گے تو وہ تمہارا دوست ہوگا)

ایک جگہ اس کی تدبیر بتلاتے ہیں ؂

قال را بگذار مرد حال شو　　پیش مرد کاملے پامال شو

(بات کو چھوڑ کر مرد حال ہو اور کسی بزرگ کے سامنے پامال ہو جاؤ)

صحبت نیکاں اگر یکساعت　　بہتر از صد سالہ زہد و طاعت

(اگر ایک ساعت کیلئے بھی نیک لوگوں کی صحبت میسر آجائے تو وہ سو سال کی عبادت اور پرہیزگاری سے بہتر ہے۔

یک زمانہ صحبت با اولیا — بہتر از صد سالہ طاعت بے ریا

اولیاء کی تھوڑی صحبت سو سال کی — پر خلوص عبادت سے بڑھ کر ہے

نفس نتواں کشت الاظل پیر — دامن آں نفس کش راسخت گیر

علاوہ کسی پیر کے سائے کے نفس کو اور کوئی نہیں مار سکتا تم نفس مارنے والے پیر کا دامن مضبوطی کے ساتھ پکڑ لو)

گر ہوائے ایں سفر داری دلا — دامن رہبر بگیر و پس برآ

(اے دل اگر تجھے اس سفر کی خواہش ہے تو رہبر کا دامن تھام کے چلا آ)

در ارادت باش ثابت اے فرید — تا بیابی گنج عرفاں را کلید

(ارادت میں اے فرید ثابت اور اٹل رہو تا کہ معرفت کے خزانے کی کنجی تمہیں دستیاب ہو جائے)

شاید کسی کو ناز ہو کہ ہمارے پاس تو کتابیں ہیں ان کو دیکھ کر ہم سب کچھ حاصل کر لیں گے اس لئے آگے فرماتے ہیں

بے رفیقی ہر کہ شد در راہ عشق — عمر بگذشت و نشد آگاہ عشق

(جس نے کہ بغیر کسی رفیق سفر کے عشق کے راستے میں قدم رکھا عمر گذرنے کے باوجود بھی اسے عشق سے آگاہی نہیں ہو سکتی)

اس شعر کو سن کر یہ شبہ ہو سکتا ہے کہ ہم نے متعدد حضرات کی نسبت سنا ہے کہ وہ بغیر مرید ہوئے اس راہ میں کامیاب ہو گئے اس لئے اس کا جواب دیا جاتا ہے

یار باید راہ را تنہا مرو — بے قلاوز اندریں صحرا مرو

ہر کہ تنہا نادر ایں رہ را برید — ہم بعون ہمت مرداں رسید

(راستے کے لئے ساتھی کی ضرورت ہے تنہا مت جا جس نے تنہا اور اکیلے اس راستے کو اختیار کیا وہ بھی بزرگوں کی توجہ سے ہی پہنچا ہے)

یعنی اگر کہیں ایسا ہوا بھی ہے تو وہ بھی محض ظاہرا ہوا ہے ورنہ واقع میں وہ بھی کسی کامل کی توجہ اور مدد ہی سے مقصود تک پہنچا ہے اگرچہ اس کو اس مدد کی خبر بھی نہ ہو تو اس کی مثال ایسی ہے جیسے بچے کی پرورش کہ بدون ماں باپ کی مدد اور اعانت کے وہ پرورش نہیں پا سکتا لیکن اس کو خبر نہیں

ہوتی تو اگر چہ وہ بچہ بڑا ہو کر کہنے لگے کہ بغیر کسی مدد کے اتنا بڑا قوی الجثہ ہو گیا ہوں تو جس طرح اس کا یہ قول غلط اور قابل مضحکہ ہے اسی طرح اس راہ کے قطع کرنے والے کا قول بھی غلط ہوگا بات یہ ہے بعض مرتبہ ظاہراً ایک شخص کو کسی کے سپرد نہیں کیا جاتا لیکن واقع میں بہت سے حضرات بامر خداوندی اس کی طرف متوجہ رہتے ہیں اور وہ اس کو غلطیوں میں پھنسنے سے بچاتے ہیں۔ قطع راہ میں مدد فرماتے ہیں بہر حال اس جزو کی بھی سخت ضرورت ہے۔ لیکن اس پر اسی وقت عمل کرنا مناسب ہے کہ جب کتب درسیہ سے فراغ ہو چکے اور اساتذہ ادھر متوجہ ہونے کی اجازت دے دیں اور اگر اساتذہ ختم درسیات کے بعد بھی چندے درسیات ہی میں مشغول رہنے کا حکم فرمائیں تو ان کے ارشاد پر عمل کرے اور جب تک کافی مناسبت نہ ہو جائے اس وقت تک درسیات ہی میں مشغول رہے اور جب کافی مناسبت ہو جائے تو چند روز کسی کے پاس رہ کر اصلاح باطن کرلے اور پھر درس و تدریس کا مشغلہ بھی جاری کر دے یہ ہے تدبیر خشوع کے پیدا ہونے کی چونکہ اس کا اہتمام بہت ضروری تھا اس لئے اس وقت اس کو عرض کیا گیا۔

سادگی کا مفہوم:

اس کے بعد مناسب معلوم ہوتا ہے بذاذۃ جس کو اوپر بیان کیا گیا ہے اس کے متعلق کچھ تھوڑی تو ضیح عرض کر دوں کیونکہ ممکن ہے کوئی صاحب بذاذۃ کے وہ معنے سمجھ لیں جیسے غالب نے سمجھے تھے مشہور ہے کہ غالب نے ایک دوست کو اپنے گھر بلانا چاہا اس نے جواب میں کہلا بھیجا کہ تم تکلف زیادہ کرتے ہو اور اس سے مجھے اور تمہیں دونوں کو تکلیف ہوتی ہے اس واسطے آنے کی ہمت نہیں ہوئی آپ نے اس کے جواب میں کہلا بھیجا کہ میں وعدہ کرتا ہوں کہ اس مرتبہ کچھ تکلف نہ ہوگا اور اس کے بعد محلہ بھر کے گھر کا راکھ جمع کر کے اپنے گھر میں ایک ٹیلہ لگا دیا جب دوست کے آنے کا وقت آیا تو آپ اس پر چڑھ بیٹھے اور نہایت ہی مفلسانہ وضع بنائی مہمان نے آکر یہ وضع دیکھی تو اس کو سخت رنج ہوا سمجھا کہ آج کل غالب کسی سخت مصیبت میں ہے قریب پہنچ کر حال دریافت کیا تو آپ فرماتے ہیں کہ میں بہت اچھا ہوں لیکن تم نے تکلف رد کر دیا تھا اس لئے میں نے یہ بے تکلفی کی وضع اختیار کی ہے تو جیسے غالب نے بے تکلفی کے معنی سمجھے تھے اسی طرح بعض لوگ شاید بذاذۃ کے یہ معنی سمجھ جائیں کہ نہ صفائی ہو اور نہ نظافت ہو بالکل میلی کچیلی حالت میں رہے حالانکہ میلے پن سے بذاذۃ کو کوئی علاقہ نہیں اور یہ بات بھی ضروری بیان کرنے کے قابل بھی کیونکہ ہماری جماعت جو کہ علماء طلبہ کی جماعت کہلاتی ہے اس کے لئے اس کی بھی ضرورت ہے کہ یہ نظافت کی طرف متوجہ ہوں

جہاں تک دیکھا جاتا ہے ان لوگوں کو اسکا ذرا خیال نہیں ہے بعض لوگ تکلف خوگر ہوتے ہیں لیکن صفائی ان میں بالکل نہیں ہوتی حالانکہ ضرورت اس کی ہے کہ تکلف نہ ہو اور صفائی ہو۔

نظافت کی ضرورت:

مثلاً آج کل گرمی کا موسم ہے اسی موسب میں علی العموم کپڑوں میں جلدی بدبو ہو جاتی ہے اس لئے ضرورت اس کی ہے کہ ہفتے میں دو مرتبہ ضرور غسل کر کے کپڑے بدلے جائیں۔ اور اگر کسی کے پاس اتنی گنجائش نہ ہو تو وہ یہ کرے کہ اپنے انہی کپڑوں کو جن کو پہنے ہوئے ہے دھو کر صاف کر لے۔ صاحبو! کپڑے میں کلف اور استری کی ضرورت نہیں۔ ضرورت صرف اس کی ہے کہ میلا نہ ہو پسینے کی بدبو نہ آتی ہو کیونکہ بدبو سے دوسروں کو بے حد تکلیف ہوتی ہے خصوصاً اساتذہ کو ایسے لوگوں سے سخت تکلیف پہنچتی ہے۔ ایسے لوگوں کو اس کا خود خیال ہونا چاہئے اور اگر کسی کے ذہن میں اب تک خود یہ بات نہیں آئی تھی تو اب سننے کے بعد ضرور خیال رکھنا چاہئے آپ لوگوں نے حدیث میں پڑھا ہے المسلم من سلم المسلمون من لسانہ ویدہ (مسلمان وہ ہے جس کے ہاتھ اور زبان سے دوسرے مسلمان محفوظ رہیں) اور پسینے کی بدبو سے اذیت ہوتی ہے۔ چنانچہ حدیث قصہ سنیت غسل جمعہ میں آیا ہے کان یؤذی بعضہم بعضا (ان میں کا ایک دوسرے کو تکلیف پہنچاتا تھا) یعنی ایک دوسرے سے بوجہ پسینے کے تکلیف ہوتی تھی اس لئے غسل کا حکم ہوا۔ اور لیجئے فقہا نے کہا ہے اور حدیث میں بھی ہے کہ کچی پیاز کھا کر مسجد میں نہ جائے علیٰ ہذا یہی حدیث نظفوا افنیکم (اپنے گھر کے سامنے کا حصہ صاف رکھو) سن چکے ہو جس میں یہ بیان کیا تھا کہ جب دار کے صاف کرنے کا حکم ہے تو خود حجرہ اور لباس و بدن صاف کرنے کا حکم کیوں نہ ہوگا۔ اور علاوہ دوسرے کی تکلیف کے صفائی نہ رکھنے سے طرح طرح کی بیماریوں کا بھی اندیشہ ہوتا ہے اور صفائی کو صحت میں بہت زیادہ دخل ہے کیونکہ صفائی سے نشاط پیدا ہوتا ہے اور نشاط معین صحت ہے۔ اب طالب علموں کی یہ حالت ہے کہ چاہے دو بالشت کوڑا ان کے حجرے میں ہو جائے لیکن یہ کبھی صاف نہ کریں گے مجھے تھانہ بھون کی ایک حکایت یاد آئی کہ ایک طالب علم کے حجرے میں چوہے نے زمین کھود کر بہت سی مٹی نکال دی تھی اور وہ کئی روز تک اسی طرح رہی لیکن اس کو بھت بند کرنے یا مٹی پھینکنے کی توفیق نہ ہوئی اتفاق سے ایک صاحب جو حاجی بھی ہیں اس طرف کو جو گزرے تو انہوں نے اس کو درست کر دیا چند روز کے بعد چوہے نے پھر مٹی کھود ڈالی اور پھر مٹی اسی طرح جمع ہو گئی کسی شخص نے دیکھ کر اس طالب علم سے کہا کہ اس کو ٹھیک کر دو تو آپ فرماتے ہیں کہ حاجی جی ٹھیک کر دیں گے۔ گویا حاجی صاحب ان کے نوکر ہیں کہ وہ آ کر ان کے حجرے کو صاف کیا کریں۔ اسی طرح آج کل آموں کی فصل ہے مدرسے میں جس جگہ دیکھئے چھلکا

گندگی پھیلا پڑا ہے میں نے تھانے بھون میں یہ انتظام کیا ہے کہ ایک جگہ ایک بڑا ٹوکرہ رکھ دیا ہے اور سب سے کہہ دیا ہے کہ اس میں چھلکے وغیرہ ڈالو لیکن باوجود اس کے بھی کسی کو اس کی توفیق نہیں ہوتی وجہ یہی ہے کہ مزاج میں صفائی اور نظافت نہیں۔ علی ہذا گرمی کی وجہ سے سب لوگ صحن میں سوتے ہیں لیکن ایسے بہت کم ہیں کہ صبح اٹھ کر چارپائی کو کسی ٹھکانے کی جگہ رکھ دیں بلکہ جس جگہ پڑی ہیں وہیں دن چڑھے تک پڑی رہے گی۔ اکثر طالب علم اپنی ضرورت سے مسجد کے لوٹے حجرے میں لے جاتے ہیں لیکن پھر مسجد میں لا کر کون رکھے۔ اول تو مسجد کا لوٹا اپنے حجروں میں لے جانا ہی جائز نہیں اور کسی جگہ مسجد و مدرسے کا خرچ مشترک ہونے کی وجہ سے جائز بھی ہو تو حجرے میں رکھ لینا تو پھر بھی جائز نہیں۔ غرض ہم لوگ تکلف کریں گے تو نوابوں کی طرح اوبذاذۃ اختیار کریں گے تو بالکل ہی بدنظم بن جائیں گے اس لئے میں نے عرض کر دیا ہے کہ نظافت بذاذت کے خلاف نہیں ہے بلکہ جس طرح طہارت ضروری ہے نظافت بھی ضروری ہے۔

ہماری بدمذاقی:

اب تو ہماری بدمذاقی کی یہ حالت ہوگئی کہ مدارس میں ایک انگریز مسلمان ہوا مسجد میں آکر دیکھا کہ نالی میں بہت سارینٹھ وغیرہ پڑا ہے۔ اس نے منتظمین سے کہا کہ مسجد کو صاف رکھنا ضروری ہے۔ اس کی حالت ایسی خراب نہ رکھنی چاہئے اس کو سن کر وہ لوگ کہنے لگے کہ تجھ میں ابھی عیسائیت باقی ہے۔ ابھی صفائی کی بو دماغ سے نہیں نکلی گویا مسلمانوں کے لئے میلا کچیلا خراب خستہ رہنا لازم ہے اور اس قدر برہم ہوئے کہ اس کو مار کر مسجد سے نکال دیا۔ بعض داناؤں کو اس حرکت کی اطلاع ہوئی تو وہ اس انگریز کے پاس آئے اور تسلی تشفی کرنے لگے۔ اس نے کہا کیا آپ کو یہ اندیشہ ہے کہ میں ان لوگوں کی اس حرکت سے اسلام چھوڑ دوں گا۔ میں ان لوگوں پر ایمان نہیں لایا بلکہ حضور پرنور ﷺ پر ایمان لایا ہوں اور میں جانتا ہوں کہ حضور ﷺ ایسے نہ تھے۔ تو بعض آدمی ستھرائی کو ہی اسلام کے خلاف کیوں سمجھتے ہیں۔ استغفر اللہ حالانکہ دوسری قوموں نے صفائی اور ستھرائی اسلام ہی سے سیکھی ہے۔ اب میں اپنے بیان کو ختم کرتا ہوں۔

خلاصہ وعظ:

خلاصہ وعظ سارے بیان کا یہ ہے کہ ہم کو صرف علم حاصل کر لینے پر بس نہ کرنا چاہئے بلکہ اس کے ساتھ عمل کرنا بھی ضروری ہے اور بالخصوص صفت خشوع اور اسکے آثار و تدابیر کا اختیار کرنا اور اہل علم کے لئے زیادہ خصوصیت کے ساتھ ضروری ہے کہ انکے لئے زینت اور زیور ہے۔ اب خدا تعالیٰ سے دعا کیجئے کہ وہ توفیق عمل عطا فرمائیں۔ اللھم وفقنا لما تحب وترضی۔ اے اللہ ہمیں ان کاموں کی توفیق عطا فرما جنہیں آپ پسند فرماتے ہیں اور جس سے آپ خوش ہوتے ہیں۔ آمین یا ارحم الراحمین۔



التیسیر للتیسیر

دین ودنیا کے کاموں کے چلانے میں آسانی

یہ وعظ ۱۵ جمادی الاخریٰ ۱۳۴۷ھ بمقام جامع مسجد خانقاہ امدادیہ تھانہ بھون جو کہ حضرت والا نے منبر پر بیٹھ کر ۳ گھنٹہ ارشاد فرمایا، سامعین کی تعداد تقریباً پچاس تھی جس کو مولانا ظفر احمد صاحب نے قلم بند کیا۔

خطبہ ماثورہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للہ نحمدہٗ ونستعینہ ونستغفرہ ونومن بہ ونتوکل علیہ ونعوذ باللہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا من یھدہ اللہ فلامضل لہ ومن یضللہ فلاھادی لہ ونشھد ان لا الہ الا اللہ وحدہ لاشریک لہ ونشھد ان سیدنا محمدًا عبدہ ورسولہ .صلی اللہ تعالیٰ علیہ وعلیٰ الہ واصحابہ وبارک وسلم.

اما بعد فاعوذ باللہ من الشیطان الرجیم بسم اللہ الرحمن الرحیم وتحمل اثقالکم الیٰ بلدلم تکونوا بالغیہ الا بشق الانفس ط ان ربکم لرؤف رحیم ہ والخیل والبغال والحمیر لترکبوھا وزینۃ ط ویخلق مالا تعلمون ہ

تمہید

یہ وہ آیت ہے جس کے متعلق دس روز پہلے کچھ بیان کیا گیا تھا اور آیت کی تفسیر بیان کرنے کے بعد چند فوائد زائدہ کا بھی بیان ہوا تھا مگر بعد ختم بیان کے ایک خاص فائدہ کی تفسیر اس آیت کے متعلق ذہن میں آئی تھی جس کے بارے میں اول یہ ارادہ ہوا کہ اسی دن دوسرے وقت بیان کر دی جائے۔ مگر وعظ ضبط کرنے والے وقت پر نہ آسکے اس لئے پھر یہ قصد ہوا کہ نظر ثانی میں اس کو بڑھا دیا جائے گا۔ چنانچہ یاداشت میں لکھ لیا گیا تھا مگر ابھی پہلے بیان پر نظر ثانی کی بھی نوبت نہ آئی تھی کہ کیونکہ وعظ کی تسوید اجمالی کے بعد تسوید تفصیلی میں کچھ تاخیر ہو جاتی ہے اور تسوید تفصیلی کے بعد میری نظر ثانی بھی فوراً نہیں ہوتی بلکہ نظر ثانی میں اہم اور اقدام کو مقدم کیا جاتا ہے اس لئے اس وعظ پر نظر ثانی ہنوز نہ ہوئی تھی کہ دوسرے وعظ کی تحریک ہوئی جس کے جواب میں اول تو میں نے عذر کیا اور عذر کی وجہ یہ تھی کہ...... کوئی خاص مضمون ذہن میں نہ تھا اور یوں تو تمام مضامین شریعت نافع ہیں مگر مجمع قریب کا اہتمام رہتا ہے جو وقتی ضرورت کا ہو دور دراز کے نفع کے لئے وقت صرف کرنے کی ہمت نہیں ہوتی اور مضمون درخواست کے وقت ذہن میں حاضر نہ ہوا تھا جو اس آیت کے متعلق پہلے بیان میں رہ گیا تھا اس لئے میں نے دوسرے وعظ سے عذر کیا پھر اس شرط کے ساتھ منظور کیا کہ اگر کوئی مضمون ذہن میں آگیا تو بیان کر دوں گا پھر شام کو خیال آیا کہ وہ فائدہ جو رہ گیا ہے اس کو بیان کر دیا جائے نہ محض اس واسطے کہ اس وعظ کی تتمیم ہو جائے کیونکہ اس کی

صورت یہ بھی ممکن تھی کہ نظر ثانی میں اس کو اضافہ کر دیا جاتا بلکہ اس واسطے کہ وہ مضمون فی نفسہ بہت ضروری ہے کیونکہ اس کے مستحضر نہ ہونے سے ہمارے بھائیوں کی پریشانی بڑھ رہی ہے اور شاید بعض لوگ سمجھتے ہوں گے کہ پریشانی کا زیادہ ہونا تو مجاہدہ ہے تو پریشانی کا بڑھنا اچھا ہے۔ استغفر اللہ استغفر اللہ ہر پریشانی مطلوب نہیں۔

پریشانی کی دو اقسام:

بلکہ پریشانی کی دو قسمیں ہیں ایک وہ جو با اختیار ہو کہ انسان کے کسب کو اس میں دخل ہو دوسرے وہ جو بلا اختیار ہو کہ انسان کے کسب کو اس میں دخل نہیں۔ پھر جس میں کسب کو دخل ہے اس کی بھی دو قسمیں ہیں ایک وہ جس کا جلب وسلب دونوں اختیاری ہیں یعنی اس کے پیدا ہونے میں بھی کسب کو دخل ہے اور دفع کرنے میں بھی اور ایک وہ جس کا جلب تو اختیاری نہیں مگر دفع اختیاری ہے یہ بھی کسبیہ میں داخل ہے، پس جس جلب وسلب اختیاری ہوں اس کے اسباب کو خود پیدا کرنا سخت مضر ہے اور جس کے اسباب جلب اختیاری نہیں مگر دفع اختیاری ہے اس کے اسباب مدافعت کو اختیار نہ کرنا اور پریشانی میں مبتلا رہنا بھی مضر ہے۔ اور ایک پریشانی وہ ہے جس کا نہ جلب اختیار میں ہے نہ سلب یہ واقعی خیر ہے اور اس کی نسبت یوں کہا جائے گا۔

درد از یارست و درمان نیز ہم　　　دل فدائے او شد جان نیز ہم

درد دوست کی طرف سے ہے اور علاج بھی اسی کی جانب سے ہے میرا دل اور جان بھی اسی پر قربان ہے۔

یعنی اس کیلئے درمان کی بھی طلب نہیں کی جائے گی اور یہی وہ پریشانی ہے جس کے بارے میں عارف شیرازی فرماتے ہیں۔

در طریقت ہر چہ پیش سالک آید خیر اوست　　　بر صراط مستقیم اے دل کسے گمراہ نیست

(طریقت میں سالک پر جو پیش آتا ہے اسی میں خیر ہے اے دل جو صراط مستقیم پر ہے وہ گمراہ نہیں ہے)

یعنی طریقت میں جو امیر طریقت کے متعلق پیش آئیں وہ تو خیر ہیں ہی جو امور طریقت کے علاوہ بھی بدون اس کے کسب واختیار کے پیش آئیں وہ بھی اس کیلئے خیر ہیں رہا یہ سوال کہ ہم صاحب طریقت کہاں ہیں۔

ہر مسلمان صاحب طریقت ہے:

اس کا جواب یہ ہے کہ سب مسلمان صاحب طریقت ہیں کیونکہ طریقت کہتے ہیں طریق ولایت کو اور ولایت کا ایک درجہ ہر مسلمان کو حاصل ہے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔ اَللّٰهُ وَلِيُّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ. تو جو شخص ایک ظلمت سے بھی نکل گیا اور یہی وہ طریق ہے اس پر یہ آیت صادق ہے۔ اور یقیناً ہر مسلمان ظلمت کفر سے نکلا ہوا ضرور ہے تو اس کو ولایت حاصل ہے گو بڑے درجہ کی ولایت حاصل نہ ہو جیسے شیخ سعدیؒ نے ایک شخص کو دیکھا کہ زمین پر بے ہوش پڑا ہے لوگ اس کے گرد کھڑے ہوئے ہیں پوچھا کیا حال ہے لوگوں نے کہا یہ عاشق ہے عشق میں دو منزلہ مکان سے کود پڑا ہے وہاں قریب ہی ایک زینہ تھا شیخ سعدی اس کی ایک سیڑھی پر چڑھ کر کود پڑے اور کہا ہم بھی عاشق ہیں مگر عشق سعدی تا بزانو۔ یعنی عشق کے مراتب مختلف ہیں۔ ایک درجہ ہم کو بھی حاصل ہے گو بڑا درجہ حاصل نہ ہو۔ یہ تو شیخ سعدیؒ کی ظرافت تھی۔

ادنیٰ درجہ کی قدر:

مگر حق تعالیٰ کے یہاں یہ حقیقت ہے وہاں ادنیٰ درجہ کی بھی قدر ہے حتیٰ کہ صلحا کی صورت بنانے کی بھی قدر ہے۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے۔ من تشبه بقوم فهو منهم. کہ جو شخص جس قوم کی مشابہت اختیار کرے گا وہ انہی میں سے ہوگا چنانچہ صوفیہ فرماتے ہیں کہ جو شخص ریا سے بھی صوفیوں کی وضع بناتا ہو اسکی بھی قدر کرو۔ کیونکہ اس کے اس فعل سے تو معلوم ہوا کہ اس کے دل میں صوفیہ کی قدر ہے جب ہی تو وہ ان کی وضع وصورت سے باقدر ہونا چاہتا ہے بس تم اس کے عیب (ریا) پر نظر نہ کرو بلکہ اس خوبی پر نظر کر کے اس کی قدر کرو اور یہ سمجھو کہ یہ چند روز کے بعد ریا نہ رہے گی تو جب اللہ تعالیٰ کے یہاں صورت کی بھی قدر ہے تو تو حقیقت کی گو وہ ادنیٰ ہی درجہ کی ہو قدر کیوں نہ ہوگی بس۔ ثابت ہو گیا کہ سب مسلمان صاحب طریقت کو جو حالت بھی پیش آتی ہے وہ سب خیر ہی خیر ہے۔

کونسی پریشانیاں خیر ہیں:

خلاصہ یہ کہ جن پریشانیوں کا نہ سلب اختیار میں ہے نہ جلب وہ واقعی مجاہدہ ہیں اور وہ سب خیر ہی خیر ہیں جن کا جلب وسلب دونوں یا محض سلب اختیاری ہو وہ پریشانی مجاہدہ نہیں۔

کونسی پریشانی کا سر لینا مجاہدہ نہیں:

جیسے کسی نے خواہ مخواہ بلا ضرورت ایسے شخص کا مقابلہ شروع کر دیا جس کے مقابلہ کا تحمل نہیں اب نتیجہ یہ ہوا کہ پریشان پھرتا ہے اپنے بچاؤ کے لئے لوگوں سے مدد مانگتا پھرتا ہے تیری میری خوشامد کرتا ہے ایسی پریشانی کا سر لینا مجاہدہ نہیں بلکہ شریعت نے ایسی پریشانیوں کے مول لینے سے منع کیا ہے۔ حدیث میں ہے لاینبغی للمؤمن ان یذل نفسہ قالوا یارسول اللّٰہ وکیف یذل نفسہ قال یتحمل من البلاء مالا یطیق۔

(کسی کو مناسب نہیں کہ اپنے کو ذلیل کرے صحابہؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ اور وہ کیسے اپنے کو ذلیل کرتا ہے۔ حضور ﷺ نے فرمایا کہ اپنے اوپر ایسی بلا کو لادے جس کی اس کو طاقت نہیں)

اور ایک پریشانی وہ ہے جس کے اسباب تو غیر اختیاری ہیں مگر وہ اس کی مدافعت پر قادر ہے مثلاً کسی نے خواہ مخواہ اسکے اوپر دعویٰ کر دیا اگر مدافعت کی قدرت ہی نہیں تو مجبوری ہے اور یہ پریشانی قسم اول میں داخل ہے جو خیر ہی خیر ہے۔ اور ایک صورت یہ ہے کہ اس کے پاس مال ہے دعویٰ کو رفع کر سکتا ہے تو اب اس سے تقاعد عجز و حمق ہے حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے دربار میں ایک مقدمہ دائر ہوا فریقین میں سے ایک ہارا تو اس نے کہا حسبی اللّٰہ ونعم الوکیل جس کا حاصل ترجمہ محاورے میں یہ ہے کہ مرضی خدا کی۔ حضور ﷺ نے فرمایا ان اللّٰہ یلوم علی العجز وعلیک بالکیس فاذا علیک امر فقل حسبی اللّٰہ ونعم الوکیل۔ یعنی اللہ تعالیٰ کم ہمتی کو پسند نہیں فرماتا عقل و تدبر سے کام لینا چاہیے۔ پھر جب بالکل ہی مغلوب و عاجز ہو جاؤ اس وقت حسبی اللّٰہ ونعم الوکیل کہو۔ مطلب یہ ہے تم نے حسبی اللّٰہ ونعم الوکیل بے موقع کہا یا اس کا موقع نہ تھا۔ اور یہ مطلب میں نے اس واسطے بتلا دیا کہ بعض اس سے شاید یہ سمجھے ہوں گے کہ مطلب یہ ہے کہ جب تک تدبیر سے کام چلے اس وقت تک تقدیر پر نظر نہ کرنا چاہئے۔ یہ مطلب ہرگز نہیں بلکہ قواعد شرعیہ سے مطلب وہی ہے جو میں نے بیان کیا۔ اگر قواعد شرعیہ کا لحاظ نہ کیا جائے اور محض ترجمہ حدیث کا دیکھ کر عمل کیا جائے تو ایسی غلطیاں بہت ہوں گی بلکہ لفظی غلطیاں بھی ہوں گی۔

حکایت عامل بالحدیث:

جیسے ایک عامل بالحدیث کی حکایت ہے کہ وہ امامت کے وقت نماز میں بہت ہلا کرتے تھے

اور تنہا نماز پڑھتے ہوئے نہ ہلتے تھے کسی نے پوچھا کہ امامت کے وقت تم کو کیا ہو جاتا ہے جو اس قدر ہلتے ہو کہا کہ حدیث میں آیا ہے کہ امام کو ہلنا چاہئے لوگوں نے کہا ذرا ہم بھی وہ حدیث دیکھیں تو آپ مترجم کتاب اٹھا لائے اس میں حدیث من ام منکم فلیخفف کا ترجمہ یہ لکھا تھا کہ جو شخص امام بنے ہلکی نماز پڑھائے یعنی طویل نہ کرے آپ نے ہلکی کو ہل کر پڑھا۔ کیسا ناس کیا۔ اسی طرح ایک شخص کا دوست پٹ رہا تھا اور خود بھی کچھ کچھ ہاتھ چلا رہا تھا آپ نے دوڑ کر دوست کے ہاتھ پکڑ لئے دشمن نے اور زیادہ مرمت کی جب اس سے فراغت ہوئی تو دوست نے جھلا کر پوچھا کہ یہ کیا حرکت تھی میری امداد کرنے سے تو رہے الٹے میرے ہاتھ بھی پکڑ لئے کہ میں خود بھی مدافعت نہ کر سکوں کہا میں نے شیخ سعدیؒ کے ارشاد کے موافق حق دوستی ادا کیا تھا وہ فرما گئے ہیں ؎

دوست آں باشد کہ گیرد دست دوست   در پریشان حالی و درماندگی

(دوست وہ ہے جو اپنے دوست کے پریشانی اور مصیبت میں ہاتھ پکڑ لے)

صرف ترجمہ دیکھنا کافی نہیں:

اگر قواعد شریعت سے کام نہ لیا جائے تو محض ترجمہ دیکھنے سے ایسا عمل ہوگا جیسا اس شخص نے شیخ سعدی کے قول پر عمل کیا تھا آج کل جو لوگوں کو قرآن و حدیث کے ترجمہ کا شوق ہے یہ شوق بہت اچھا ہے میں اس کی قدر کرتا ہوں کیونکہ ؎

چونکہ گل رفت و گلستان شد خراب   بوئے گل را از کہ جوئیم از گلاب

چونکہ شد خورشید و مارا کرد داغ   چارہ نبود در مقامش از چراغ

چونکہ موسم گل ختم ہو گیا اور چمن اجڑ گیا گلاب تو رہا ہی نہیں جس سے خوشبو حاصل ہو اب عرق گلاب سے ہی خوشبو حاصل کرو۔ چونکہ آفتاب چھپ گیا اور ہم کو داغ دے گیا اس لئے اس کی جگہ اب چراغ ہی سے کام لو۔

عورتوں کا مضامین اور غزلیں اخبار میں شائع کرانا بے حیائی ہے:

چنانچہ ایک صاحب نے ایک رسالہ اپنی بیٹی کے نام سے شائع کیا ہے اور آج کل یہ بھی مرض ہو گیا ہے کہ عورتوں کے نام سے رسائل چھاپتے ہیں اور بعضے تو نام کیساتھ پورا پتہ بھی لکھ دیتے ہیں نہ معلوم اس میں کیا مصلحت ہے؟ کیا لوگوں کو اس کی ملاقات کا رستہ بتلانا مقصود ہے جو

ملنا چاہے۔ وہ اس پتہ سے تلاش کر کے مل لے یا اس پتہ پر بیگم صاحبہ سے خط و کتابت کر سکے۔ استغفر اللہ. واللہ غیرت مند آدمی تو بلا ضرورت اپنی گھر کی مستورات کا نام بھی ظاہر کرنا پسند نہیں کرتا چہ جائیکہ پورا پتہ لکھنا اور اس کے نام سے کتابیں اور غزلیں شائع کرنا یا اخباروں میں مضامین دینا یہ سخت بے حیائی ہے اور یہ بالکل ایسا ہے جیسے بیوی کو سر بازار بٹھلا دیا تو اس رسالہ میں اول تو اسی کا رونا رویا تھا کہ مسلمان تنزل میں ہیں افلاس میں ہیں ان کو ترقی کرنا چاہئے جو آج کل عام رسالوں میں ہوتا ہے اس کے بعد لکھا تھا کہ آج کل بڑا اتم یہ ہے کہ مسلمان تقدیر کے بھروسہ پر رہتے ہیں تدبیر کچھ نہیں کرتے بس جہاں ان پر کوئی مصیبت آئی لگے ہاتھ پھیلا پھیلا کر دعا کرنے مگر اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ بھائی مجھے کوئی اور بھی کام ہے یا بس تمہاری دعائیں سنا کروں میں نے تمہیں ہاتھ پیر عقل دیدی ہے اس سے کیوں نہیں کام لیتے (نعوذ باللہ، نعوذ باللہ.) یا اپنے خدا پر افترا باندھا گویا معاذ اللہ ان کو دوسرے مشاغل اتنے رہتے ہیں کہ وہ بندوں کی دعاؤں سے گھبرا گئے تو ایسے جاہل لوگ اس حدیث سے سمجھیں گے جب تک تدبیر سے کام چل سکے اس وقت تک تقدیر پر نظر نہ کرو۔

حدیث توکل کا مفہوم:

اس لئے میں نے عرض کر دیا کہ مطلب حدیث کا یہ ہے کہ جس قصد سے اس وقت تم نے حَسْبِیَ اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَکِیْل کہا ہے یہ بے موقع ہے بلکہ مغلوبیت کاملہ کے بعد حَسْبِیَ اللّٰهُ کہنا چاہئے (مقدمہ میں ناکامی اس وجہ سے ہوئی کہ مدعی نے بینہ قائم کر کے ثبوت نہیں دیا۔ سو یہ مغلوبیت کاملہ نہیں بلکہ اس میں مدعی کی کوتاہی کو دخل ہے اس کو چاہئے کہ گواہ تلاش کرے اور اپنے دعویٰ کا ثبوت دے اور اس تدبیر کے بعد بھی اگر مغلوب ہو جاوے تو اب حَسْبِیَ اللّٰهُ کہنے کا موقع ہے۔ یہی مطلب ہے اذا اعلیک امر فقل حَسْبِیَ اللّٰهُ کہ جب تم پر کوئی ایسی افتاد پڑے جس میں تمہاری کوتاہی کو اصلاً دخل نہ ہو اس وقت حَسْبِیَ اللّٰهُ کہو اور جہاں تمہاری کوتاہی کی وجہ سے تمہارے خلاف فیصلہ ہوا ہو وہاں عقل و تدبیر سے کام لینا چاہئے خلاصہ یہ کہ حدیث میں قدرت ہوتے ہوئے قدرت سے کام نہ لینے کی ممانعت ہے اور یہ مطلب ہرگز نہیں کہ جب تک تدبیر سے کام چل سکے اس وقت تک تقدیر پر نظر نہ کرو بعض نادانوں کا خیال ہے کہ تقدیر کے اعتقاد نے مسلمانوں کو کاہل بنا دیا۔

تقدیر کے اعتقاد کی برکت:

میں کہتا ہوں کہ یہ بالکل غلط ہے بلکہ تقدیر نے مسلمانوں کو بہادر و شیر دل بنادیا ہے جو شخص تقدیر کا معتقد ہے وہ ادنی درجہ کی تدبیر سے بھی کام شروع کر دیتا ہے اور کہتا ہے کہ کَمْ مِّنْ فِئَةٍ قَلِيْلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيْرَةً بِاِذْنِ اللّٰهِ۔ چنانچہ حضرات صحابہؓ کے واقعات میں سے اس کی کافی دلیل موجود ہے کہ وہ کسی بڑی سے بڑی جماعت کے مقابلہ میں اس کے منتظر نہ رہتے تھے کہ ان کی برابر ساز وسامان اور جمعیت ہو تو جب ہی مقابلہ کیا جائے بلکہ ادنیٰ سے سامان و جمعیت کے ساتھ ان کا مقابلہ شروع کر دیتے تھے اور کامیاب ہوتے تھے (بتلایئے کہ وہ کونسی چیز تھی جس نے ادنیٰ سے سامان کے ساتھ بڑی بڑی مسلح و مکمل و بیشمار جماعتوں کے مقابلہ پر آمادہ کر دیا وہ تقدیر ہی کا اعتقاد تو تھا) بخلاف صاحب تدبیر کے کہ وہ جب تک مکمل تدبیر نہ کرے گا اس وقت تک ہرگز کام شروع نہ کرے گا میں یہ کہہ رہا تھا کہ جس پریشانی کی مدافعت اختیاری ہو وہاں مدافعت کرنا چاہئے اور ترک مدافعت سے اپنے سر پریشانی نہ لینا چاہئے ہاں جب مصیبت کا ایسا غلبہ ہو جائے کہ اسکی مدافعت پر بھی قادر نہ ہو سو یہ واقعی مجاہدہ ہے اور اب اس پریشانی سے کچھ ضرر نہ ہوگا بلکہ اس میں نورانیت ہوتی ہے۔ وہ سراسر محمود ہے اور اس وقت اہل اللہ کی یہ حالت ہوتی ہے کہ وہ یوں کہتے ہیں۔

زندہ کنی عطائے تو ور بکشی فدائے تو
جاں شدہ مبتلائے تو ہر چہ کنی رضائے تو

زندہ کریں یہ آپ کی عطا ہے اور اگر قتل کریں آپ پر فدا ہوں دل آپ پر مبتلا ہے جو کچھ کریں آپ کی رضا ہو۔

اور یوں کہتے ہیں

نشود نصیب دشمن کہ شود ہلاک تیغت
سر دوستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی

دشمن کا ایسا نصیب نہ ہو کہ آپ کی تیغ کا کشتہ بنے دوستوں کا سر ہی سلامت رہے کہ اس پر آپ کا خنجر رہے۔

ہر پریشانی محمود نہیں:

ایسے پریشانی میں اہل اللہ کا توکل واطمینان بڑھ جاتا ہے جیسا کہ حدیث میں ہے کہ حضور ﷺ ایک غزوہ میں ایک درخت کے نیچے تنہا سو رہے تھے اور آپ کی تلوار درخت میں لٹکی ہوئی تھی حضرات صحابہؓ دوسرے درختوں کے سایہ میں ذرا فاصلے سے سو رہے تھے کہ اس حالت میں ایک

کافر نے درخت سے تلوار اتار کر نیام سے باہر کی اور سوت کر کھڑا ہوا گیا۔ رسول اللہ ﷺ کی آنکھ کھل گئی تو اس نے للکار کر پوچھا من یمنعک منی کہ بتلایئے کہ آپ کو مجھ سے کون بچا سکتا ہے آپ نے نہایت اطمینان سے فرمایا اللہ آپ کے چہرہ پر بل بھی تو نہ پڑا نہ کچھ خوف و ہراس ظاہر کیا بس آپ کا کہنا تھا کہ کافر کے ہاتھ میں رعشہ پڑ گیا کانپنے لگا اور تلوار ہاتھ سے گر پڑی اب حضور ﷺ نے تلوار ہاتھ میں لے کر اس سے پوچھا من یمنعک منی کہ تجھے میرے ہاتھ سے کون بچائے گا کہا انت آپ ہی بچائیں گے آپ نے اس پر رحم کیا اور قتل نہیں کیا اور جو پریشانی اختیار سے لائی جاتی ہے اس میں نور نہیں ہوتا بلکہ ظلمت ہوتی ہے اور جیسے کسی کا بچہ بیمار ہے اور وہ اس کا علاج نہیں کرتا اس لئے پریشان ہے تو اس میں نور نہ ہوگا اور ایک صورت یہ ہے کہ بچہ بیمار تھا اس کا علاج کیا گیا اور علاج کے بعد وہ مر گیا تو اس سے پریشانی نہ ہوگی۔ عارف ایسی مصیبت میں دل میں شاد ہوتا ہے اور ظاہر میں مغموم نواب شیفتہ اسی کو فرماتے ہیں

تو اے افسردہ دل زاہد یکے در بزم رندان شو　　　　که بینی خنده بر لبها و آتش پاره در دلہا

تو اے افسردہ دل زاہد ذرا بزم رنداں میں جا کر تو دیکھو کہ ان لبوں پر ہنسی ہے مگر ان کے دل رو رہے ہیں۔

ہر حال میں تفصیل سے یہ معلوم ہو گیا کہ پریشانی مطلقاً مطلوب نہیں اور نہ ہر پریشانی محمود ہے حق جل شانہ اپنے بندوں کو پریشانی میں ڈالنا نہیں چاہتے بلکہ ہر امر میں ان کو راحت دینا چاہتے ہیں تشریعاً بھی تکویناً بھی۔ اگر اللہ تعالیٰ کو بندوں کی پریشانی پسند ہوتی تو یہ دعا تعلیم نہ کی جاتی۔ ربنا ولا تحملنا مالا طاقة لنا به۔ (اے پروردگار ہمارے اوپر ایسا بوجھ نہ لادیے جس کے تحمل کی ہم کو طاقت نہیں کیونکہ جس عرضی کا مسودہ خود حاکم تجویز کر دے وہ ضرور پوری ہوگی پس یقیناً جو دعائیں حق تعالیٰ کی فرمودہ ہیں اور اسی طرح جو رسول اللہ ﷺ کو فرمودہ ہیں وہ ضرور مقبول ہیں کیونکہ رسول اللہ ﷺ کی شان یہ ہے۔

گفتۂ او گفتۂ اللہ بود　　　　گرچہ از حلقوم عبداللہ بود

آپ (ﷺ) کا فرمان گویا اللہ کا فرمان ہے اگرچہ ایک اللہ کے بندے محمد ﷺ کے منہ سے ادا ہوا ہے۔

اور یہ شان ہے

در پس آئینہ طوطی صفتم داشتہ اند　　　　آنچہ استاد ازل گفت بگو می گویم

پس پردہ مجھے طوطے کی طرح بیٹھا دیا ہے مجھے تو حکم استاد ازل سے ملا تھا وہی کہہ رہا ہوں۔

آپ وہی فرماتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کو منظور ہے۔

حضور اکرم ﷺ کا اجتہاد:

مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ حضور ﷺ اجتہاد نہیں کرتے تھے بلکہ مطلب یہ ہے کہ آپ کا اجتہاد بھی امر حق سے ہوتا ہے کیونکہ حضور ﷺ کو اس کا امر تھا کہ جب کوئی واقعہ ایسا پیش آئے جس کے متعلق نص موجود نہیں تو ایک وقت محدود تک وحی کا انتظار کر کے اجتہاد کیجئے تو آپ اجتہاد میں بھی امر حق پر عامل تھے جیسے مقلد احکام میں مقلد ہے مگر نفس تقلید میں محقق ہے کیونکہ عامی کیلئے تقلید حکم نص میں منصوص ہے تو نفس تقلید میں وہ نص پر عمل کر رہا ہے اس لئے محقق ہے۔ اسی طرح یہاں سمجھو کہ حضور ﷺ اجتہاد میں بھی وحی پر عامل تھے گو اجتہاد سے جو حکم بیان فرمائیں گے وہ اجتہادی ہوگا حقیقی وحی نہ ہوگا گو حکماً وہ بھی وحی ہے۔ جب اس کے خلاف وحی نازل نہ ہو کیونکہ اللہ تعالیٰ کا یہ وعدہ ہے کہ آپ سے اگر اجتہاد میں خطا ہوگی تو فوراً اس پر متنبہ کیا جائے گا تو جب آپ نے اجتہاد کیا اور اس کے خلاف وحی نازل نہ ہوئی تو تقریر الٰہی کی وجہ سے وہ بھی حکماً وحی ہے۔ اور بعض لوگ جو ما ینطق عن الھوی ان ھو الا وحی یوحی. سے نفی اجتہاد پر استدلال کرتے ہیں یہ استدلال صحیح نہیں کیونکہ یہاں اول تو قرآن کے متعلق کلام ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی زبان سے جو قرآن نکل رہا ہے یہ آپ کا گھڑا ہوا نہیں بلکہ محض وحی ہے دوسرے اس کو عام بھی رکھا جائے تو یہاں ان ھو الا وحی یوحی. سے نفی ہوا کی مطلوب ہے نفی اجتہاد کی مطلوب نہیں مطلب یہ ہے کہ آپ ہوائے نفس سے تکلم نہیں فرماتے بلکہ جو کچھ فرماتے ہیں اس میں وحی کا اتباع فرماتے ہیں خواہ حقیقتاً یا حکماً جس کی تفصیل اوپر گزر چکی ہے۔ میں یہ کہہ رہا تھا کہ حق تعالیٰ کی اور رسول اللہ ﷺ کی بیان فرمودہ دعائیں ضرور قبول ہیں اور حق تعالیٰ نے ہم کو خود یہ دعا تعلیم فرمائی ہے۔ ربنا ولا تحملنا مالا طاقة لنا به. تو معلوم ہوا کہ حق تعالیٰ ہم کو پریشانی میں ڈالنا نہیں چاہتے ورنہ یہ دعا کیوں تعلیم کی جاتی۔

احکام تشریعیہ اور احکام تکوینیہ انسانی قوت سے زائد نہیں:

اس پر شاید یہ سوال ہو کہ ہم تو دیکھتے ہیں کہ بعض لوگوں پر ایسی مصائب نازل ہوتی ہیں جن کا تحمل ان سے نہیں ہو سکتا اس کے دو جواب ہیں ایک یہ کہ آیت احکام تکوینیہ کے بارہ میں نہیں ہے

بلکہ احکام تشریعیہ کے بارہ میں ہے۔ اور احکام تشریعیہ میں کوئی حکم مافوق الطاقۃ نہیں۔ میں اس کو ابھی ثابت کروں گا۔ اور اگر اس کو عام رکھا جائے تو دوسرا جواب یہ ہے کہ احکام تکوینیہ میں بھی کوئی شے طاقت سے خارج نہیں بشرطیکہ طاقت سے کام لیا جائے۔ اس کی ایسی مثال ہے جیسے پندرہ بیس سیر اناج ہو اور کسی مزدور سے اس واسطے نہ اٹھتا ہو کہ اس نے کپڑے کے اندر اس کو نہیں باندھا بلکہ یوں ہی ہاتھوں میں اٹھانا چاہتا ہے تو اس سے کہا جائے گا کہ بوجھ اٹھانے کا طریقہ اختیار کرو یہ بوجھ زیادہ نہیں اسی طرح یہاں کہا جاتا ہے کہ مصائب تکوینیہ کے تحمل کا طریقہ اختیار کرو پھر کوئی شے طاقت سے زیادہ نہیں وہ طریقہ کیا ہے؟ وہ یہ ہے کہ تعلق مع اللہ پیدا کر کے دیکھو پھر سب مصائب طاقت کے اندر ہیں کوئی بھی مافوق الطاقت نہیں کیونکہ کام تو وہ خود کرتے ہیں تم صرف طریق اور سڑک اور مظہر ہو کہ فعل تم سے ظاہر ہو جاتا ہے ورنہ کرنے والے وہ خود ہیں تو اب تحمل اس لئے ہو جائے گا کہ وہ تمہارے قلب میں قوت تحمل پیدا کر دینگے اور اگر خدا سے تعلق نہیں تو پھر قلب میں قوت کہاں سے آئے اس صورت میں واقعی دل ضعیف ہوگا اور اس کے بعض واقعات طاقت سے زائد معلوم ہوں گے۔ صاحبو! اللہ تعالیٰ کے معاملات واقوال میں غور کر کے دیکھو تو معلوم ہوگا کہ اللہ تعالیٰ بندوں کو پریشان کرنا نہیں چاہتے۔ چنانچہ ارشاد ہے۔ **یرید اللّٰہ ان یخفف عنکم** ۔ اللہ تعالیٰ تم پر تخفیف کرنا چاہتے ہیں آگے اس کی وجہ ارشاد ہے۔ **وخلق الانسان ضعیفا** کہ انسان کمزور پیدا کیا گیا ہے جب تکوینی ضعف کا تشریع میں لحاظ کیا گیا ہے تو کیا تکوینیات میں لحاظ نہ ہوگا ضرور ہوگا۔ بس یہ آیت بھی تکوین وتشریع دونوں میں رعایت تخفیف کو ظاہر کر رہی ہے۔ ایک مقام پر ارشاد ہے۔ **یرید اللہ بکم الیسر ولا یرید بکم العسر** (اللہ تعالیٰ تمہارے ساتھ آسانی کرنا چاہتے ہیں۔ دشواری نہیں چاہتے) اگر کوئی اس کو بھی شرائع کے ساتھ خاص کرنا چاہے تو اول عموم لفظ اس سے آبی ہے اور تسلیم بھی کر لیا جائے تو اور نصوص تو دونوں کو عام ہیں مگر میں اول اس اشکال سے فارغ ہونا چاہتا ہوں جو بعض لوگوں کو تشریع کے یسر پر پیش آتا ہے وہ کہتے ہیں کہ ہم کو تو تشریعیات میں بہت تنگی معلوم ہوتی ہے۔

دین میں ذرا تنگی نہیں:

مثلاً کوئی شخص معاملات فاسدہ سے بچے اور بالکل شریعت کے موافق معاملات کرنا چاہے تو اس کی عافیت تنگ ہو جائے گی۔ اور وہ نہ ملازمت کر سکے گا نہ تجارت نہ زراعت کیونکہ سب میں ایسوں ہی سے سابقہ پڑتا ہے۔ جن کو اس کا اہتمام نہیں تو لامحالہ اس کو اہتمام میں تنگی ہونا لازم ہے

اس کا جواب ایک مستقل وعظ میں دیا گیا ہے جس کا نام نفی الحرج ہے جس میں ما جعل علیکم فی الدین من حرج ۔ کا بیان ہے یہ ایک آیت اور یاد آ گئی ہے جو پہلے ذہن میں نہ آئی تھی اس کو بھی پہلی آیات کے ساتھ اضافہ کر لیا جائے اس میں من حرج نکرہ تحت النفی ہے جو استغراق کو مفید ہے مطلب یہ ہوا کہ دین میں ذرا بھی تنگی نہیں یہ قرآن کا دعویٰ ہے اور ایسے وقت میں کیا گیا ہے جبکہ تمام عالم کو قرآن کے مقابلہ کی دعوت دی گئی تھی اور تمام کفار اس بات کی کوشش کرتے تھے کہ قرآن کی کسی بات کو غلط ثابت کر دیں۔ اگر دین اسلام کے احکام میں ذرا بھی تنگی ہوتی تو ایسا زوردار دعویٰ ہرگز نہ کیا جاتا اور اگر کیا گیا تھا تو کفار ضرور اس میں کچھ کلام کرتے مگر تاریخ شاہد ہے کہ کفار کو اصلاً قرآن پر حرف گیری کا موقع نہیں ملا۔ معلوم ہوا کہ کفار کو بھی یہ بات تسلیم تھی کہ واقعی اسلام میں کچھ تنگی نہیں۔

شریعت کو تنگی کا الزام دینے کی مثال:

رہا یہ کہ آپ کو آج کل کی تنگی نظر آتی ہے تو اس کی ایک مثال اسی وعظ سے نقل کرتا ہوں وہ مثال یہ ہے جیسے ایک گاؤں والا کسی حکیم کے پاس گیا اور نبض دکھلا کر اپنے مرض کا علاج حکیم صاحب سے پوچھا حکیم نے نسخہ لکھا جس میں ایسی دوائیں لکھیں جو اس گاؤں میں نہیں ملتی پھر غذا کا پوچھا تو حکیم نے شوربا یا پالک کے ساگ اور مونگ کی دال کی اجازت دی مگر وہ دیہاتی ایسے گاؤں کا رہنے والا ہے جہاں نہ مونگ کی دال نہ پالک ملتا ہے حکیم نے کہا اچھا کدو کھا لیا کرو اس نے کہا وہاں تو یہ بھی نہیں ملتا۔ حکیم نے پوچھا پھر کچھ وہاں ملتا بھی ہے۔ کہا وہاں تو مسور کی دال چنے کی دال اور کریلے اور بینگن ملتے ہیں حکیم نے کہا یہ ہرگز مت کھانا۔ اب اگر یہ دیہاتی یوں کہے کہ اس طبیب کا مطب بہت تنگ ہے تو بتلایئے عقلاً کیا کہیں گے یقیناً سب یہ کہیں گے کہ مطب تو تنگ نہیں بلکہ تیرا گاؤں تنگ ہے جہاں معمولی دوائیں معمولی غذائیں بھی نہیں ملتیں اسی طرح صاحبو! شریعت میں تنگی نہیں بلکہ آپ کی معاشرت تنگ ہے کہ آپ ایسی باغی جماعت کے اندر پھنسے ہوئے ہیں جو اعمال قبیحہ وافعال ظلم کی عادی اور جرائم کی خوگر ہے۔ شریعت میں بجز معاملات ربویہ کے تمام صورتیں بیع وشراء کی جائز ہیں مگر اس کا کیا علاج کہ آج کل جس قوم کے ہاتھ میں تجارت ہے اس نے جائز صورتیں چھوڑ کر ناجائز ہی ناجائز اختیار کر رکھی ہیں۔ پس یہ تو آپ کی معاشرت میں تنگی ہوئی اور اس وقت شریعت کو الزام دینا حقیقت میں اپنے کو الزام دینا ہے ؎

حملہ بر خود مے کنی اے سادہ مرد — ہمچو آں شیرے کہ بر خود حملہ کرد

اے سادہ لوح انسان تم اپنے پر خود حملہ کرتے ہو جس طرح اس شیر نے خود اپنے پر حملہ کیا تھا۔
اور آپ کے اس الزام کی ایسی مثال ہے جیسے ہمارے قصبہ میں ایک واقعہ ہوا کہ ایک عورت اپنے بچہ کو ہگا رہی تھی اتنے میں لوگ چاند دیکھنے لگے اس نے کپڑے سے پائخانہ پونچھ کر چاند دیکھنا شروع کیا مگر اس کی انگلی میں پائخانہ لگا رہ گیا اور وہ ناک کے اوپر انگلی رکھ کر چاند دیکھنے لگی اس کی جو بدبو آئی تو آپ کہتی ہیں اوئی اب چاند کیسا سڑا ہوا نکلا۔

احکام شرعیہ پر غصہ آنے کی مثال:

اسی طرح آپ کو جو علماء کے اس جواب سے کہ سود حرام ہے رشوت حرام ہے اجارہ مجہولہ حرام ہے۔ غصہ آتا ہے اس غصہ کی ایسی مثال ہے جیسے مولانا نے حکایت لکھی ہے کہ ایک بوڑھا آدمی حکیم صاحب کے پاس جا کر کہنے میری آنکھوں میں کمزوری ہے۔ کہا بڑھاپے سے کہا میرا دماغ خالی سا ہو گیا ہے۔ کہا بڑھاپے سے۔ کہا میرے ہاتھ پاؤں میں درد رہتا ہے۔ کہا یہ بھی بڑھاپے سے۔ بڈھے نے جھلا کر حکیم کے ایک دھول رسید کی کہ نامعقول تو نے بڑھاپے کے سوا حکمت میں کچھ اور بھی پڑھا ہے۔ حکیم نے ہنس کر کہا کہ میں آپ کے غصہ کا برا نہیں مانتا یہ غصہ بھی بڑھاپے ہی سے ہے۔ اسی طرح آپ کو جو مولویوں کے فتووں پر غصہ آتا ہے اس کا سبب وہی جہل اور معاشرت کی تنگی ہے ورنہ شریعت میں کوئی بھی اشکال نہیں جیسے قرآن بے دھڑک کہتا ہے۔ ذالک الکتاب لا ریب فیه حالانکہ آگے چل کر اسی صورت کے تیسرے رکوع میں ہے وان کنتم فی ریب مما نزلنا علی عبدنا جس سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض لوگوں کو قرآن میں شک بھی تھا۔ مگر قرآن اس کے باوجود بے دھڑک لا ریب فیه کہہ رہا ہے کیونکہ ان لوگوں کے شک کی ایسی مثال تھی جیسے یرقان والا کہتا ہے ھذا الثوب اصفر. یہ کپڑا زرد ہے اور تندرست آدمی اس کے جواب میں کہتا ہے ھذا لا صفرۃ فیه کہ اس میں زردی نہیں تو وہ صحیح کہتا ہے کیونکہ وہ زردی تو اس کی آنکھوں میں ہے۔ اسی طرح اس آیت کا مطلب ہے کہ قرآن میں تو ریب نہیں تم خود ریب میں جا گھسے ہو اور وہ ریب بھی تم کو خود نہیں لپٹا کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ہر شخص کو ریب سے پاک پیدا کیا ہے چنانچہ حدیث میں ہے کل مولود یولد علی الفطرۃ. مگر یہ خدائی باغ ہے اس میں پھول بھی ہیں اور جھاڑ بھی ہیں۔ ایمان بھی ہے اور کفر بھی ہے تم کو تو اللہ تعالیٰ نے جھاڑوں سے الگ رکھا تھا تم خود ان میں جا پھنسے رہا یہ کہ خدا تعالیٰ نے اپنے باغ میں جھاڑ کیوں رکھے ہیں تو اس سوال کا کسی کو حق نہیں اور اجمالی

جواب یہ ہے کہ اس میں بھی حکمتیں ہیں مولانا رومیؒ فرماتے ہیں

کفر ہم نسبت بخالق حکمت ست — در بما نسبت کنی کفر آفت ست

کفر کی نسبت خالق کی طرف حکمت ہے اور نسبت دوسرے کیساتھ ہو تو کفر کی آفت ہے۔

اور عارف شیرازی فرماتے ہیں

در کارخانہ عشق از کفر ناگزیر ست — آتش کرا بسوزد گر بولہب نباشد

دنیا میں کفر کا وجود ضروری ہے اگر ابولہب نہ ہو تو دوزخ کی آگ کس کو جلائے۔ یہ تو اشکال کا رفع تھا۔

مصیبت اور غم کے وقت تعلیم شریعت:

میں یہ کہہ رہا تھا کہ نصوص یہ معلوم ہو رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ پریشانی سے ہم کو بچانا چاہتے ہیں۔ چنانچہ اوپر نصوص کا ذکر آ چکا ہے اب میں اللہ تعالیٰ کے معاملات دکھلانا چاہتا ہوں ان معاملات سے بھی یہی معلوم ہوگا کہ اللہ تعالیٰ ہم کو پریشانی سے نجات دینا چاہتے ہیں دیکھئے ایک مقام پر ارشاد ہے۔ اذا اصابتھم مصیبۃ قالو انا للہ و انا الیہ راجعون. یہاں اللہ تعالیٰ نے مصیبت کے متعلق ہم کو ایک تعلیم فرمائی ہے مگر اس تعلیم کی حقیقت معلوم کرنا چاہئے اور کوئی تصوف راز نہیں بلکہ عربیت میں غور کرنے کی ضرورت ہے اور بات یہ ہے کہ شریعت کی تعلیم کا پورا لطف بدوں علم عربیت کے حاصل نہیں ہوتا۔ ہم لوگوں میں بہت سے امراض اس وجہ سے پیدا ہو گئے ہیں کہ ہم تعلیم شریعت میں غور نہیں کرتے۔ پس ہم کو تفکر و تدبر کی عادت ڈالنا چاہئے۔ اب سنئے کہ انا للہ کے معنی بنا بر دلالت لام کے یہ ہیں کہ ہم اللہ تعالیٰ کی ملک ہیں ایک مقدمہ تو یہ ہوا دوسرا مقدمہ اس کے ساتھ یہ ملاؤ کہ مالک کو ہر قسم کے تصرف کا حق ہے یہ مقدمہ ظاہر تھا اس لئے اسے بیان نہیں کیا گیا دونوں کا نتیجہ یہ نکلا کہ حق تعالیٰ کو ہمارے اندر ہر طرح تصرف کرنے کا اختیار ہے پھر پریشانی کیوں ہے یہ کیا ظلم ہے کہ تم کو برائے نام مالکیت کی وجہ سے اپنے مملوکات میں تصرف کا اختیار ہو۔ اور اللہ تعالیٰ کو باوجود ملکیہ حقیقیہ کے اپنے مملوکات میں تصرف کا اختیار نہ ہو پس ہم کو یہ تعلیم ہے مصیبت و غم کے وقت کہ اس مضمون کو پیش نظر رکھیں کہ اللہ تعالیٰ نے یہ مصیبت اور غم اس لئے دیا ہے تاکہ بندہ کا عاجز ہونا اور حق تعالیٰ کا مالک و مختار ہونا مشاہد ہو اگر انسان پر مصیبت و غم نہ آئے تو یہ فرعون ہو جائے خلاصہ یہ کہ غم کا سبب یہ ہے کہ تم خدا کی مملوکات میں اپنی تجویز لگاتے ہو حالانکہ دوسرے کی ملک میں تم کو تجویز کا کوئی حق نہیں بالخصوص احکم الحاکمین

کی مملوکات میں اپنی تجویز لگانا سخت بے ادبی ہے۔ پس معلوم ہوا کہ ہم کو غم اس واسطے ہوتا ہے کہ ہم غم کی حقیقت سے بے خبر ہیں اگر ہم غم کی حقیقت سے خبردار ہو جائیں تو اس سے خبردار ہونا ہی زوال غم ہے چنانچہ حقیقت غم کی تجویز ہے اگر ہم اس کو سمجھ جائیں تو یقیناً اس کو قطع کر دیں اور جب اس کو قطع کر دیں تو پھر غم پاس کو نہ آئے یعنی غلبہ نہ ہو۔

مگر آج کل تو یہ حالت ہے کہ ایک شخص لڑکے کو انگریزی پڑھاتا ہے اور بہت سے امتحان پاس کراتا ہے اور حقیقت میں اس کو خدا سے دور کراتا ہے دفعۃً حرکت قلب بند ہونے سے لڑکا سوتا رہ گیا تو اب یہ خاک اڑاتا پھرتا ہے اور کہتا ہے کہ ہائے میری امیدوں کا خاتمہ ہو گیا۔

حیف در چشم زدن صحبت یار آخر شد　　روئے گل سیر ندیدیم و بہار آخر شد

افسوس آنکھ جھپکتے ہی محبوب کی صحبت ختم ہو گئی۔ ابھی دل بھر کر پھول کو دیکھا بھی نہ تھا کہ موسم بہار ختم ہو گیا۔

اگر اس کو معرفت ہوتی تو اس غم سے پار ہو کر اس بہار میں لگ جاتا جو اس کے اندر موجود ہے وہ کیا؟ وہ وہ دولت ہے جس کو ایک عارف فرماتے ہیں

ستم ست اگر ہوست کشد کہ بہ سیر سرو چمن درآ　　تو ز غنچہ کم ندمیدۂ در دل کشا بچمن درآ

تمہارے اندر خود چمن ہے اس کا پھاٹک تمہارے ہاتھ میں ہے جب جی چاہے سیر کر لو۔

اور مولانا فرماتے ہیں۔

اے برادر عقل یکدم با خود آر　　دم بدم در تو خزاں ست و بہار

اے بھائی تھوڑی دیر کے لئے ذرا عقل کو درست کر کے دیکھو خود تمہارے اندر خزاں و بہار موجود ہے۔

طبعی غم کی حکمتیں:

ارے تم کو اس تجویز کا کیا حق ہے کہ یہ لڑکا سو سال زندہ رہے گا اور اس طرح روپیہ جمع کرے گا۔ یوں گھر کو چلا جائے گا۔ عارف سب سے اول تجویز ہی کو قطع کرتا ہے اسی لئے وہ کسی مصیبت سے پریشان نہیں ہوتا کیونکہ وہ حق تعالیٰ کے ہر تصرف کے لئے آمادہ ہوتا ہے وہ بچہ کی دوا اور اس کا حق سمجھ کر کرتا ہے مگر دل سے اس پر بھی راضی رہتا ہے یہ اللہ کی امانت ہے وہ جب چاہیں لے لیں ان کو اختیار ہے۔ اس کو بچہ کے مرنے سے رنج بھی ہوتا ہے مگر محض طبعی رنج ہوتا ہے عقلی رنج نہیں ہوتا۔ آنحضور ﷺ کی صفائی دیکھئے کہ حضور ﷺ نے اپنے صاحبزادے

حضرت ابراہیم (علیہ وعلیٰ ابیہ فداہ روحی افضل الصلوۃ والتسلیم ۱۲) کی وفات کے وقت صاف فرمادیا (انا بفراقک یا ابراھیم لمحزونون حضور علیہ کو غم بھی ہوا پھر اس کو ظاہر بھی فرمادیا تاکہ کوئی معتقد اس غم کو کسی باطنی حال پر محمول نہ کرے آپ نے صاف فرمادیا کہ بچہ کی مفارقت کا غم ہے اب جو چاہے معتقد رہے اور جس کا جی چاہے معتقد نہ رہے۔ حضرت باہوا آدمی اس موقع پر ہرگز غم کو ظاہر نہ کرتا کہ معتقدین یوں کہیں گے کہ یہ کیسے نبی ہیں کہ بچہ کے غم میں رو رہے ہیں مگر حضور علیہ نے اس کی پرواہ نہیں کی عملاً بھی آپ نے رنج ظاہر کیا اور قولاً بھی تاکہ امت کو معلوم ہوجائے کہ طبعی غم کا مضائقہ نہیں بلکہ یہ تو ہونا چاہئے ورنہ غموم و ہموم میں جو حکمتیں ہیں (مثلاً رفع درجات واظہار عجز عبد واظہار اختیار حق ۱۲) وہ باطل ہوجائیں گی اسی لئے محققین نے کہا ہے کہ جو لوگ اولاد کے مرنے کے وقت ہنستے ہیں وہ ناقص تھے اور جو روئے ہیں وہ کامل تھے۔ کیونکہ اس نے اولاد کا بھی حق ادا کیا اور خالق کا بھی۔ اولاد کا یہ بھی حق ہے کہ ان کی مفارقت کا رنج کیا جائے اور خالق کا یہ حق ہے کہ عقلاً اس کے تصرف سے راضی رہے۔ اور اس نقصان وکمال کی نظیر صاف یہ ہے کہ ایک شخص کے تو آپریشن کیا گیا کلوروفارم سنگھا کر اس نے نشتر لگانے کے وقت اف تک نہیں کیا اور دوسرے بدون کلوروفارم سنگھائے نشتر لگایا گیا اس نے آہ کی مگر اسی طرح پڑا رہا ناواقف پہلے شخص کو بہادر سمجھے گا مگر حقیقت شناس دوسرے کو بہادر کہے گا کیونکہ وہ جانتا ہے کہ پہلے شخص کے حواس معطل تھے اس لئے اس کو نشتر کا احساس ہی نہیں ہوا اور دوسرے کے حواس معطل نہ تھے اس کو تکلیف کا پورا احساس ہوا اس لئے ایک آہ نکل جاتا یہ بہادری کے خلاف نہیں بلکہ بڑی بہادری یہ ہے کہ باوجود احساس کے از جارفتہ نہیں ہوا۔

پریشانی کی جڑ رنج عقلی ہے:

اسی طرح جو لوگ اولاد کے مرنے پر ہنس دیئے ہیں ان کو کلوروفارم سنگھایا گیا تھا۔ یعنی وہ مغلوب الحال تھے اور جو روئے وہ مغلوب الحال نہ تھے۔ گفتگو بہت طویل ہوگئی۔ میں کہہ رہا تھا کہ عارف کو طبعی رنج تو ہوتا ہے مگر اس کی عمر زیادہ نہیں۔ نہ اس سے پریشانی ہوتی ہے۔ عقلی رنج اس کو نہیں ہوتا اور پریشانی کی جڑ یہی ہے۔ عارف کو عقلی رنج اس واسطے نہیں ہوتا کہ وانا للہ کے مضمون کو پیش نظر رکھتا ہے۔ غرض عدم تفکر کی وجہ سے ہم لوگوں کو انا للہ کے معنی ہی معلوم نہیں اس لئے ہم پریشان ہیں ورنہ یہ تعلیم غم کی زائل کرنے والی ہے وانا الیہ راجعون یہ بعض حضرات کی تسلی کے لئے پڑھایا گیا ہے جس کو مفارقت کے غم سے نجات ہی نہیں ہوتی۔ تو ان کو بتلاتے ہیں کہ تم بھی

وہیں جاؤ گے جہاں وہ گیا ہے۔ یہ سوچ کر ان کو تسلی ہو جائے گی کی مفارقت دائمی نہیں ہے بلکہ چند روزہ ہے۔ شاید کوئی کہے کہ اچھا مراقبہ بتلایا کہ تم بھی مرو گے۔ موت سے تو ویسے ہی وحشت ہے اس سے تسلی کیونکر ہو گی۔ سو بات یہ ہے کہ جس کا محبوب مر چکا ہے اس کو موت سے وحشت نہیں رہتی وہ تو دل سے چاہتا ہے کہ کاش میں مر جاؤں اور وہ زندہ رہے تو ایسے شخص کو موت کا مراقبہ دشوار نہیں بلکہ اس کو یہ مراقبہ آسان ہو گا۔ اور مفید بھی ہو گا دوسرے ہم لوگوں کو نصوص کے معلوم نہ ہونے سے آخرت سے وحشت ہے ورنہ وہ تو حقیقت میں قابل تمنا ہے۔ مولانا جامی فرماتے ہیں۔

دلا تاکے دریں کاخ مجازی	کنی مانند طفلاں خاکبازی
توئی آں دست پرور مرغ گستاخ	کہ بودت آشیاں بیروں ازیں کاخ
چرا ازاں آشیاں بیگانہ گشتی	چو دوناں چغداین ویرانہ گشتی

اے دل اس مجازی مکان (دنیا) میں کب تک لڑکوں کی طرح خاک سے کھیلتا رہے گا۔ تو ہی وہ ہاتھ کا پلا ہوا مرغ گستاخ ہے کہ تیرا آشیاں اس مکان سے باہر تھا تو اس آشیانہ سے کیوں بیگانہ ہو گیا کمینوں کی طرح اس ویرانہ کا الو بنا ہوا ہے۔

عارف شیرازی فرماتے ہیں ؎

خرم آں روز کزیں منزل ویراں بروم	راحت جاں طلبم وز پئے جاناں بروم
نذر کردم کہ گر آید بسر ایں غم روزے	تا در میکدہ شاداں و غزلخواں بروم

وہ دن بہت اچھا ہے کہ اس ویرانہ مکان (دنیا) سے جان کو آرام مل جائے اور محبوب کے پاس پہنچ جاوے۔ میں نے نذر کی ہے کہ اگر یہ دن نصیب ہو جائے تو خوش و خرم اور غزل پڑھتا ہوا جاؤں۔

یہ تو موت کی نذریں مانتے ہیں کیونکہ وہاں کی راحت کا مشاہدہ کئے ہوئے ہیں۔ لوگ یوں سمجھتے ہیں کہ مردہ قبر میں جا کر اکیلا تنہا پڑ جاتا ہے یہ غلط ہے احادیث میں واقعات موت دیکھو تو معلوم ہو گا کہ اگر انشاء اللہ ایمان پر خاتمہ ہو گیا اور انشاء اللہ ایمان ہی پر خاتمہ ہو گا تو دوسری ارواح استقبال کو آئیں گی پھر وہ اس شخص سے دنیا والوں کے حالات دریافت کرتے ہیں کہ فلاں کیسا ہے فلاں کیسا ہے افسوس ہم کو ان کی یاد نہیں آتی اور وہ ہم کو یاد کرتے ہیں۔ افسوس وہ ہم سے ملنا چاہتے ہیں اور ہم ان سے ملنا نہیں چاہتے۔ صاحبو! یہ کس قدر بے انصافی ہے اور جب اجنبی ارواح سے بھی ملاقات ہو گی تو کیا اپنا بیٹا اور بھائی بیوی وغیرہ نہ ملیں گے ضرور ملیں گے۔ حدیث میں ہے کہ ادھورا بچہ بھی اپنی آنول نال سے والدین کو جنت میں لے جائے گا۔ نیز حدیث میں

ہے کہ اللہ تعالیٰ بچوں کے ناز نخرے ماں باپ سے زیادہ اٹھاتے ہیں یہاں تک کہ بچہ کو جب کہا جائے گا کہ جنت میں داخل ہو تو وہ جنت کے دروازہ پر اڑ کر کھڑا ہو جائے گا کہ ہم تو اندر نہیں جائیں گے پوچھا جائے گا کیوں؟ کہے گا کہ پہلے ہمارے ماں باپ کو لاؤ ہم ان کو اپنے ساتھ جنت میں لے جائیں گے تو ارشاد ہو گا۔ ایھا الطفل الراغم ربہ ادخل ابویک الجنۃ کہ اے لڑکے اپنے رب کے ساتھ ضد کرنے والے جا اپنے والدین کو جنت میں لے جا۔ تو حضرات مرنے بعد اس طرح کے واقعات ہوں گے ان معاملات کو یاد کر کے تو جی چاہتا ہے کہ ہم عالم ارواح ہی میں ہوتے یہ تماشا عجیب ہے جو مرنے کے بعد ہو گا اور جس کو زیادہ تفصیل کا شوق ہو تو وہ میرا رسالہ شوق وطن مطالعہ کریں۔ پس اب وہ شبہ جاتا رہا جو انا الیہ راجعون پر وارد ہوا تھا۔ اور ایک بات یہ بھی سمجھنی چاہئے کہ اللہ تعالیٰ نے یہاں قالوا فرمایا ہے اعتقدوا و تیقنوا نہیں فرمایا اس میں نکتہ یہ ہے کہ قول میں ایک خاص خاصیت ہے جو صرف اعتقاد سے حاصل نہیں ہوتی مجھے اس کا تجربہ ہو چکا ہے کہ جس امر کا دل میں اعتقاد ہو اس کو زبان سے بھی کہا جائے تو اثر دوبالا ہو جاتا ہے اسی کو ایک شاعر بیان کرتا ہے۔

الا فاسقنی خمرا وقل لی ھی الخمر ولا تسقنی سرا متی امکن الجھر

خبردار مجھے شراب محبت پلاؤ اور کہہ دو کہ یہ شراب ہے اور مجھے چھپ کر نہ پلانا جب تک کہ اس کا ظاہر کرنا ممکن ہو۔

زبان سے کہنے کا زیادہ اثر:

عشاق کو جذبات صحیحہ کا ادراک زیادہ ہوتا ہے اس لئے معاملہ میں ان کا قول حجت ہے اسی لئے چشتیہ ذکر لسانی اور ذکر جہر کی تعلیم کرتے ہیں۔ پس تقلیداً اس کو مان لیجئے کہ زبان سے کہنے میں زیادہ اثر ہوتا ہے یہ بات اہل سائنس کو مبارک ہو کہ وہ ہر بات میں کہتے ہیں کیوں؟ میں کہتا ہوں بہت اچھا تم میرے ایک کیوں کا جواب دیدو پھر میں تمہارے ہر کیوں کا جواب دوں گا۔ بتائیے مقناطیس لوہے کو کیوں جذب کرتا ہے۔ یہاں سب یہ کہتے ہیں کہ کہ بالخاصہ جاذب ہے تو ایسے ہی یہاں بھی مان لیجئے کہ ذکر لسانی بالخاصہ زیادہ موثر ہے۔ حضرت عاشق کو زبان سے محبوب کا نام لینے میں زیادہ حظ آتا ہے چنانچہ تجربہ کر لیا جائے اسی کو ایک حکایت کے ضمن میں اس طرح بیان کیا گیا ہے۔

دید مجنوں را یکے صحرانورد | در بیاباں غمش نشستہ فرد
ریگ کاغذ بود وانگشتاں قلم | مے نمود ے بہر کس نامہ رقم
گفت اے مجنون شیدا چیست ایں | می نویسی نامہ بہر کیست ایں
گفت مشق نام لیلےٰ می کنم | خاطر خود را تسلی می دہم

مجنوں کو کسی نے جنگل بیاباں میں دیکھا کہ بیٹھا ہے اور انگلیوں سے کچھ لکھ رہا ہے ریت کاغذ اور انگلیاں قلم ہیں کسی نے پوچھا یہ کیا کر رہے ہو یہ کسی کو خط لکھ رہے ہو۔ اس نے کہا لیلیٰ لیلیٰ لکھ رہا ہوں اور دل کو ٹھنڈا کر رہا ہوں یہی راز چشتیہ کا ذکر لسانی اور ذکر بالجہر میں ہے اور اسی لئے چشتیہ ریا کے ساتھ بدنام ہیں لوگ ان کو ریاکار سمجھتے ہیں مگر

اے ترا خارے بپا نشکستہ کے دانی کہ چیست | حال شیرانے کہ شمشیر بلا بر سر خورند

تمہارے پاؤں میں تو کانٹا بھی نہیں لگا تم کو ان لوگوں کی کیا خبر ہے جن کے سروں پر بلا اور مصیبت کی تلواریں چل رہی ہیں۔

خدا کی قسم وہ جس مقام پر ہیں وہاں سب چیزیں فنا ہو گئی ہیں ریا کا وہاں کہاں پتہ ہے۔

عشق آں شعلہ است کہ چوں برفروخت | ہرچہ جز معشوق باقی جملہ سوخت
تیغ لا در قتل غیر حق براند | در نگر آخر کہ بعد لا چہ ماند
ماند الا اللّٰہ وباقی جملہ رفت | مرحبا اے عشق شرکت سوز رفت

عشق وہ شعلہ ہے کہ جب روشن ہوتا ہے تو محبوب کے علاوہ سب کو فنا کر دیتا ہے لا الٰہ کی تلوار اپنی غرض فاسدہ پر چلاؤ اس کے بعد دیکھ کہ الا کے بعد کیا رہا الا اللّٰہ باقی رہ گیا۔ باقی سب فنا ہو گیا۔

وسوسہ ریا ریا نہیں:

اور اگر فرض کر لیا جائے کہ ذکر جہر میں ریا بھی ہو تو ہمارے امام الصوفیہ حضرت حاجی صاحب قدس سرہٗ کا ارشاد ہے کہ ریا اول ریا ہوتا ہے پھر عادت ہو جاتی ہے پھر عبادت ہو جاتی ہے اگر کوئی شخص ریا کی نیت سے بھی عمل کرے تو اس کے ساتھ ایک نیت یہ بھی کرے کہ میں اس لئے عمل کرتا ہوں کہ یہ ریا ایک دن اخلاص ہو جائے گی۔ بہر حال زبان سے ذکر کرنے میں یہ منافع ہیں۔ گو اس میں ریا کا وسوسہ بھی آتا ہے اس کی پروانہ کرنا چاہئے۔ اور یہاں ایک راز آپ کو

میں اور بتلاتا ہوں وہ یہ کہ ریا اور ہے وسوسہ اور ہے۔ اس سے اکثر اپنے اوپر بھی ریا کا شبہ ہو جاتا ہے۔ ریا وہ ہے جو بقصد اختیار ہو اور وسوسہ وہ ہے جو بلا قصد و اختیار کے آئے۔ سو وسوسہ ہرگز مضر نہیں۔ میں اکثر علماء سالکین سے جو کہ ریا کی شکایت کرتے ہیں اول یہ سوال کرتا ہوں کہ بتلاؤ ریا اختیاری ہے یا غیر اختیاری۔ اگر وہ کہیں اختیاری ہے تو میں کہتا ہوں کہ بس تم اپنے اختیار سے ریا کا قصد نہ کرو۔ اور اگر یہ کہیں کہ غیر اختیاری ہے تو میں کہتا ہوں کہ کیا شریعت نے امر غیر اختیاری سے نہی کو متعلق کیا ہے؟ اب وہ سمجھ جاتے ہیں کہ بلا اختیار جو چیز آتی ہے وہ ریا نہیں تو میں کہتا ہوں کہ اس سے بے فکر رہو اس کے بعد ان کو حقیقت سے مطلع کرتا ہوں کہ یہ ریا نہیں بلکہ وسوسۂ ریا ہے۔ اگر یہ حقیقت پہلے بتلا دی جائے تو اس قدر نہ ہو تسلی بھی نہ ہو جب سوالات وارد کرنے سے وہ خود حقیقت میں غور کرنے لگتے ہیں۔

وسوسہ ریا کی عجیب مثال:

تب بتلاتا ہوں کہ یہ وسوسہ ریا ہے جو دل کے اندر نہیں بلکہ باہر ہے گو اندر ہی محسوس ہوتا ہو خدا نے مجھے اس کی بھی ایک نظیر بتلائی ہے وہ یہ کہ جیسے آئینہ کے اوپر مکھی بیٹھی ہو تو وہ دور سے ایسی معلوم ہوتی ہے کہ گویا اندر ہے ایسے ہی یہاں سمجھو اور اس سے اندیشہ نہ کرو یہ تو ذرا لاحول پڑھنے سے بھاگ جائے گا مگر لاحول یہ نہیں ہے کہ لاحول لاحول پڑھو بلکہ اس کی لاحول یہ ہے کہ اس کی طرف التفات نہ کرو اور لاحول ولا قوۃ کی حقیقت بھی یہی عدم التفات ہے کیونکہ اس کے معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی میں کچھ طاقت وزور نہیں یعنی خدا کے سوا کسی چیز کا اندیشہ نہ کرنا چاہئے اور سب سے بے التفاتی برتنا چاہئے۔ تم یہ مت سمجھو کہ وسوسہ کے ساتھ تم خود تکلم کر رہے ہو بلکہ دراصل ابلیس تکلم کر رہا ہے تم تو صرف اس کی بات سن رہے ہو اور سماع کفر مضر نہیں ہاں تکلم جرم ہے۔ بس تم پر کوئی جرم عائد نہیں یہ عقلی وجہ ہے عدم التفات کی بلکہ التفات کرنا مضر ہے کیونکہ اس کی ایسی مثال ہے جیسے بادشاہ کو برا بھلا کہنا شروع کر دیا تو اگر ہم اس سے خفا ہو گئے تو حاسد کا مدعی پورا ہو جائے گا وہ اس جھگڑے میں ملاقات کا وقت نکال دے گا بس اس سے بچاؤ کا طریقہ یہ ہے کہ خاموش چلے جاؤ اور اپنے کو باب عالی پر ڈال دو وہاں حاسد کا گزر نہیں۔

شیطان کی مثال:

شیطان کی تار بجلی جیسی ہے کہ اس کو ہاتھ ہی نہ لگاؤ نہ جاب کیلئے نہ دفع کے لئے ورنہ تم کو

لپٹ جائے گا بلکہ اس کو منہ بھی نہ لگاؤ اس کی طرف التفات بھی نہ کرو۔ تم نے اس شیطان سے ڈر کر اس کا دماغ بگاڑ دیا ہے اس سے بالکل نہ ڈرو اور اس کو منہ ہی نہ لگاؤ۔ انه لیس له سلطان علی الذین امنو و علی ربهم یتو کلون انما سلطانه علی الذین یتولونه والذین هم به مشر کون. جن پر خدا کا بھروسہ ہے جو خدا پر نظر رکھتے ہیں ان پر شیطان کا ذرا بھی قابو نہیں اس کا قابو انہی پر چلتا ہے جو اس سے کچھ واسطہ رکھتے ہیں اس کو منہ لگاتے ہیں لیس له سلطان میں نکرہ تحت النفی ہے جس سے معلوم ہوا کہ اللہ پر نظر رکھنے والوں پر اس کا ذرا بھی قابو نہیں تم اس کو منہ لگا کر قبضہ اپنے اوپر بڑھاتے ہو پس ذکر لسانی و ذکر جہر میں وسوسۂ ریا کا اندیشہ نہ کرو اس پر التفات ہی نہ کرو اور اگر شیطان یہ کہے کہ ذکر ریائی بے فائدہ ہے تو کہہ دو کہ تو غلط کہتا ہے یہ بھی ایک واسطے سے مفید ہے۔ غالباً حضرت حاجی صاحب ؒ کی حکایت ہے کہ ان سے ایک شخص نے کہا کہ فلاں شخص ریا سے ذکر کرتا ہے فرمایا تجھ سے اچھا ہے اس کا یہی ذکر ریائی ایک ٹمٹماتا ہوا چراغ بن کر اسے پل صراط سے پار کر دے گا۔ اور تیرے پاس تو ٹمٹماتا ہوا چراغ بھی نہیں اور وہ واسطہ یہ ہے کہ ریا سے آگے چل کر اخلاص بھی پیدا ہو جاتا ہے اور یہ جواب پوری کامیابی نہ ہونے میں مگر پوری ناکامی بھی نہ ہونے میں ایسا ہے جیسا مولانا مظفر حسین صاحب کاندھلوی ؒ نے ایک معترض کو جواب دیا تھا۔ اس نے بعض اکابر دین پر جو ایک بڑے کام میں شریک ہوئے تھے مگر ناکام رہے اعتراض کیا تھا کہ ان لوگوں نے خوامخواہ اپنے کو تباہ کیا ان کو کیا حاصل ہوا مولانا نے فرمایا۔

سودا قمار عشق شیریں سے کوہ کن   بازی اگرچہ پانہ کا سر تو کھو سکا

کس منہ سے اپنے آپ کو کہتا ہے عشق باز۔ اے روسیاہ تجھ سے تو یہ بھی نہ ہو سکا

مگر اتنا کہے دیتا ہوں کہ ان حضرات کو اپنی سعی میں کامیابی کی توقع غالب تھی اس لئے ان کا وہ فعل موجب اجر تھا گو ناکام رہے اور اگر کامیابی کی توقع غالب نہ ہو جیسا کہ اس وقت حالت ہے تو ایسے افعال جائز نہیں نہ ان میں اجر ہے۔ یہ گفتگو اس بات پر طویل ہوگئی کہ حق تعالیٰ نے اس آیت میں قالو انا للہ ۔ فرمایا ہے اعملو او اعتقدو انہیں فرمایا تو میں نے بتلا دیا کہ قول میں خاص اثر ہے جو مجرد علم میں نہیں۔ تو اللہ تعالیٰ نے مصائب کے وقت ہم کو اس مضمون کے استحضار و تکرار کی تعلیم دی ہے تو اللہ تعالیٰ کا یہ معاملہ بتلا رہا ہے کہ وہ ہم کو راحت دینا چاہتے ہیں پریشانی میں رکھنا نہیں چاہتے بس احکام سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ وہ ہمارے لئے آسانی چاہتے ہیں اور معاملات سے بھی اور ان کی صفات سے بھی رحمت و شفقت و رافت کا غلبہ ہوتا ہے

چنانچہ جا بجا ان اللہ غفور رحیم . ان اللہ بکم لرؤف رحیم موجود ہے۔

ہر چہ می گویند آں بہتر زحسن　　　　یار ما ایں دارد و آں نیز ہم

جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ آن حسن سے بہتر ہے۔ ہمارا محبوب یہ آن بھی رکھتا ہے اور حسن بھی۔

اب تو اس میں کچھ شک نہیں کہ اللہ تعالیٰ ہم کو پریشانی سے بچانا چاہتے ہیں ایک مقام پر فرماتے ہیں لاتلقوا بایدیکم الی التھلکۃ اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو۔ حدیث میں ہے سددوا وقاربوا استقیموا ولن تحصوا ولن یشا دالدین احد الا علیہ او کما قال جو شخص مشقت میں پڑتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس پر مشقت ہی بڑھا دیتے ہیں اس کا ترجمہ فارسی میں کسی نے خوب کہا ہے۔

گفت آساں گیر خود کار کز روی طبع　　　　سخت می گیرو جہاں بر مرداں سخت کوش

نفس کے حقوق:

پھر آپ خواہ مخواہ کیوں مشقت میں پڑتے ہیں۔ ایک حدیث میں ہے کہ ایک صحابی راتوں کو سوتے نہ تھے اور دن میں کھاتے نہ تھے رات بھر نماز پڑھتے اور دن کو روزہ رکھتے تو حضور ﷺ نے ان کو اس سے منع فرمایا اور ارشاد فرمایا ان لنفسک علیک حقاً ولعینیک علیک حقا ولا ھلک علیک حقافقم ونم وصم وافطر ھذا من سنتی فمن رغب عن سنتی فلیس منی (تمہارے نفس کا بھی تم پر حق ہے تمہاری آنکھوں کا بھی تم پر حق ہے تمہاری بیوی کا بھی تم پر حق ہے۔)

رات کو کچھ وقت نماز میں کھڑے رہو کچھ سو رہو دن میں کبھی روزہ رکھو کبھی بے روزہ رہو یہ میرا طریقہ ہے اور جو میرے طریقے سے اعراض کرے وہ مجھ سے کچھ واسطہ نہیں رکھتا اگر مشقت میں ہر حالت میں فضیلت وثواب ہے تو حضور ﷺ نے ان صحابی کو مشقت سے کیوں منع فرمایا ظاہر میں یہ سمجھا جاتا ہے کہ حضور ﷺ نے ان صحابی کو تکثیر عمل سے منع فرمایا یہ غلط ہے بلکہ آپ نے تقلیل عمل سے منع فرمایا ہے کیونکہ اس تکثیر کا انجام تقلیل ہی ہے۔

تکثیر عمل کا طریقہ:

تکثیر عمل کا طریقہ یہ ہے کہ عمل مواظبت ومداومت کے ساتھ کیا جائے حدیث میں ہے خیر العمل ما دیم علیہ وان قل (بہتر عمل وہ ہے جس پر مداومت کی جاوے اگرچہ تھوڑا ہو۔ اور اعتدال

بھی میں نباہ ہو سکتا ہے اپنے کو مشقت میں ڈالکر ہم نباہ نہیں کر سکتے۔ صاحبو! اگر تم حضور ﷺ کے اعتدال کو نہ سمجھ سکو تو جو لوگ حضور ﷺ کے سچے جانشین ہوں ان کے اعتدال کا اتباع کرو۔ ان شاء اللہ سوائے اصل ونقل کے زیادہ فرق نہ ہوگا۔ پس خوامخواہ اپنے کو مشقت میں نہ ڈالو کہ ہر مشقت مجاہدہ اور ثواب نہیں۔ میرے ایک دوست کا دعویٰ تھا کہ جس عمل میں مشقت زیادہ ہو اس میں ثواب زیادہ ہے میں نے کہا یہ دعویٰ مطلقاً صحیح نہیں مشقت میں ثواب اس وقت ہے جبکہ مقاصد میں مشقت ہو نہ کہ طریق میں ورنہ تم کو چاہئے کہ وضو کے واسطے تھانہ بھون خانقاہ کے کنوئیں سے پانی نہ لو بلکہ دو میل جا کر جلال آباد سے پانی لایا کرو اس مثال سے ان کو اپنے دعوے کی غلطی واضح ہو گئی۔ اور مقاصد میں بھی مشقت برداشت کرنا اس وقت موجب اجر ہے جب کہ اس مقصد کا کوئی طریق مشقت کے سوا نہ ہو اور اگر وہ مقصد دوسرے طریق سے بسہولت حاصل ہو سکے تو مشقت برداشت کرنے میں اجر نہیں۔

عبدیت حضور ﷺ کا سب سے بڑا کمال ہے:

دلیل اس کی حدیث عائشہ ہے ماخیر رسول اللہ ﷺ بین امرین الا اختار اھونھا (متفق علیہ) جب رسول اللہ ﷺ کو دو باتوں کا اختیار دیا جاتا تو آپ آسان کو اختیار فرماتے تھے اس میں ایک حکمت تو یہ تھی تاکہ ضعفاء امت کا عمل بھی موافق سنت ہو جائے اور وہ آسان صورت کو اختیار کر کے بھی اتباع سنت کا ثواب حاصل کر سکیں اور ایک لطیف حکمت یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ میں جہاں تمام کمالات ہیں وہاں سب سے زیادہ عبدیت کی شان ہے اور یہ آپ کا سب سے بڑا کمال ہے۔ اور قوی شق کے اختیار کرنے میں گویا قوت کا دعویٰ ہے اور شق اھون کے اختیار کرنے میں عبدیت کا اظہار ہے کہ میں عاجز ہوں۔

حکایت حضرت شیخ بہاء الدین نقشبندیؒ:

حضرت شیخ بہاء الدین نقشبندی قدس سرہ کی مجلس میں ایک مرتبہ یہ حدیث بیان کی گئی کہ حضرات صحابہ کے زمانہ میں چھلنی نہ تھی بس آٹے کو پیس کر یوں ہی پھونک مار دیا کرتے تھے۔ جو بھوسی اڑ گئی اڑ گئی باقی گوندھ لیا اور پکا لیا۔ شیخ نے حدیث سن کر فرمایا کہ آج سے ہماری خانقاہ میں اسی کے موافق عمل ہونا چاہئے چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔ مگر رات کو سب کے پیٹ میں درد ہو گیا۔ اب عارفین کی عقل دیکھئے واللہ ان کی عقل بوجہ تعلق مع اللہ کے مطہر بھی ہو جاتی ہے اور معطر بھی اور منور بھی اور کیا کہوں سب قافئے ختم ہو گئے ہاں مدور بھی ہو جاتی کیونکہ مدور کی کوئی نہایت نہیں ہوتی

(لسان الامتحان ١٢٥) اگر اس وقت ہم وہاں ہوتے تو معاذ اللہ یوں کہتے اچھا اتباع سنت کیا مگر شیخ نے یوں فرمایا کہ ہم نے بڑی گستاخی کی حضور علیہ ﷺ اور صحابہ کے ساتھ مساوات کا قصد اور دعویٰ کیا بھائی ہم لوگ ضعیف ہیں ہم ان حضرات کے ساتھ مساوات نہیں کر سکتے بس آج سے چھلنی کا چھنا ہوا آٹا دستور سابق کے موافق پکایا کرو۔ سبحان اللہ کس قدر ادب کی رعایت کی اور کتنی جلدی عبدیت کی طرف مائل ہوئے۔ واللہ عشق نے ان کی عقول کو منور کر دیا ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ عشق سے عقل زائل ہو جاتی ہے مگر میں کہتا ہوں کہ محبت و عشق ہی سے عقل کامل ہوتی ہے ؎

اوست دیوانہ کہ دیوانہ نشد وہ دیوانہ ہے جو دیوانہ نہیں

حضرت خواجہ نقشبند کا یہ واقعہ میں نے ایک مجلس میں بیان کیا تو اس وقت ایک غیر مقلد صاحب بھی تشریف رکھتے تھے وہ خواجہ صاحب کا یہ ارشاد سن کر بولے کہ اتباع سنت سے مساوات لازم آتی ہے تو کیا اتباع سنت ہی چھوڑ دیا جائے۔ میں نے کہا بس خاموش بیٹھے رہو تم بے چھنا ہی آٹا کھایا کرو۔ تم نقشبند کے نکتہ کو کیا سمجھو گے ہاں کوئی نقشبند ہی ہو یعنی کسی کے دل پر نقش لگا ہوا ہو تو وہ ان نکات کو سمجھے گا۔ اور اس سے کوئی یہ نہ سمجھے کہ میں نقشبندیہ کو چشتیہ پر فضیلت دے رہا ہوں۔ یہ طریقہ ان لوگوں کا ہے جن کو مقصود کی ہوا نہیں لگی اور جو مقصود کو جانتا ہے اس کے نزدیک سب چشتیہ نقشبندی ہیں اور سب نقشبندیہ چشتی ہیں کیونکہ مقصود سب کا ایک ہے صرف لون اور مذاق کا فرق ہے وہ اس طرح کہ جو مذاق نقشبندیہ کا ہے اس سے چشتیہ بھی خالی نہیں اور جو مذاق چشتیہ کا ہے اس سے نقشبندیہ بھی خالی نہیں ہاں غلبہ وعدم غلبہ کا فرق ہے دیکھئے نواب شیفتہ حالانکہ نقشبندی ہیں مگر ان میں کس قدر سوزش و شورش ہے۔ فرماتے ہیں ؎

تو افسردہ دل زاہد یکے در بزم رنداں شو کہ بینی خندہ بر لبہا و آتشپارہ در دلہا

اے افسردہ دل زاہد ذرا بزم رنداں میں جا کر دیکھو کہ ان کے لبوں پر ہنسی ہے مگر ان کے دل بکھرے ٹکڑے ہیں۔

اس میں چشتیہ کا رنگ ظاہر ہو رہا ہے اور ایک شعر انہی کا یہ ہے ؎

چہ خوش ست با تو بزمے نہفتہ ساز کرن در خانہ بند کرن سر شیشہ باز کرن

کیا ہی اچھا ہو کہ محفل میں تنہا ہو، اور گھر کا دروازہ بند شراب کی بوتل کھلی ہوئی ہو یا پاس رکھی ہو۔

اس میں نقشبندیت جھلک رہی ہے اور بعضے چشتی ایسے ہیں کہ دیکھنے میں بالکل نقشبندی معلوم ہوتے ہیں چھکے پھاکے نہ سوزش نہ شورش ہے نہ حال ہے نہ قال ہے چنانچہ ابھی کچھ دن

ہوئے ہمارے ایک دوست آئے تھے ان کی بیٹی حضرت مولانا خلیل احمد صاحب سے بیعت ہے اور بڑی صاحب کشف ہے میں نام نہیں بتلاتا مبادا کسی کے دل میں پیغام نکاح دینے کی خواہش پیدا ہو کیونکہ وہ لڑکی ابھی تک ناکتخدا ہے اس کے باپ نے بہت سے واقعات اس کے کشف کے ظاہر کئے منجملہ ان کے ایک یہ واقعہ ظاہر کیا کہ حضرت خلیل احمد صاحب قدس اللہ سرہٗ کے ایک خلیفہ (جن نام بتلانا مناسب نہیں) ان کے گھر آئے اور پردہ کی آڑ میں اس لڑکی کو بٹھلا کر اس سے کچھ باتیں کیں آخر تو بچی ہی ہے اس کو کیا سوجھی کہ مراقب ہو کر ان حضرت خلیفہ صاحب کے قلب کی طرف متوجہ ہوئی اور اس کے بعد ہنس کر اپنے والد سے کہا کہ ان کا حضور کامل تو ہے مگر بالکل سادہ ہے کیفیت کا نام نہیں انہوں نے اپنی لڑکی کا مقولہ ان خلیفہ صاحب سے ذکر کیا تو وہ ہنسنے لگے اور کہا واقعی بالکل صحیح کشف ہے مجھ پر کیفیات کا ورود مطلق نہیں ہوتا اور میں نے حضرت شیخ سے بھی یہ بات عرض کی تھی فرمایا کہ تم کو کیفیات سے مناسبت نہیں اس کے درپے نہ ہو اور صرف حضور کے کامل کرنے میں لگے رہو یہی کافی ہے اور دوست یہاں پر اپنی بیٹی ہی کا حال کہنے آئے تھے کیونکہ اس کو طریق میں کچھ مشکل پیش آگئی تھی بحمد اللہ میں نے اسے حل کر دیا۔ پھر وہ کہنے لگے کہ میں لڑکی کو یہاں لاؤنگا میں نے کہا نہ بھائی یہاں نہ لانا کیونکہ ان صاحب میں حضور تو تھا۔ یہاں تو یہ بھی نہیں بس خواہ مخواہ مجھے اس کے سامنے کیوں فضیحت کرتے ہو واللہ میری یہ حالت ہے۔

طاؤس را بنقش ونگار یکہ ہست خلق　　　تحسین کنند و او خجل از زشت پائے خویش

مور کے بدن پر جو پھول بوٹے بنے ہوئے ہیں مخلوق اس کی تعریف کرتی ہے اور وہ اپنے بدصورت پیروں کو دیکھ کر شرمندہ ہوتا ہے۔

میں اپنی زشتی قدم سے شرمندہ ہوں کیونکہ میرے پاس عمل نہیں اور اس طریق میں قدم یعنی عمل ہی کی ضرورت ہے دم مارنے اور باتیں بنانے سے کچھ نہیں ہوتا

قدم باید اندر طریقت نہ دم　　　کہ اصلے ندارد دم بے قدم

طریقت میں قدم رکھنا چاہئے یعنی عمل کرنا چاہئے اس لئے کہ بغیر قدم رکھے (عمل کئے) دعویٰ کی کچھ اصل نہیں۔

تو اس حکایت سے معلوم ہوا ہوگا کہ بعضے چشتی بھی مثل نقشبندیوں کے افسردہ اور پھیکے پھاکے ہوتے ہیں پس نقشبندی اور چشتی کے جھگڑے کو چھوڑ کر یہ سب ایک ہی ہیں ایک مقصود کے طالب

ہیں۔غرض یہ کہہ رہا تھا کہ حضور نے شق اہون کو اظہار عبدیت کے لئے اختیار کیا ہے پس تم اس نیت سے اظہار عبدیت کے لئے شق اہون کو اختیار کیا کرو۔اب میں چند اور معاملات حق تعالیٰ کے دکھلانا چاہتا ہوں جس سے معلوم ہوگا کہ اللہ تعالیٰ راحت چاہتے ہیں پریشانی نہیں چاہتے۔

قلب کو نماز میں پابند کرنے کی کوشش کی ضرورت:

دیکھئے اللہ تعالیٰ نے ہم کو نماز کا حکم دیا ہے اور بظاہر نماز میں بڑی مشقت ہے کیونکہ اس میں پوری پابندی ہے اور قلب کو پابندی ہی گراں ہے کیونکہ اس کی تو شان یہ ہے **انھم فی کل واد یھیمون** یہ تو یوں چاہتا ہے کہ بھاگا بھاگا پھرے قلب کا نماز میں پابند ہو جانا بہت دشوار ہے مگر اس کا مطلب نہیں کہ اگر قلب پابند نہ ہوتا تو نماز ہی نہ پڑھو یا وہ نماز بے کار ہے ہر گز نہیں بلکہ پڑھتے رہو اور قلب کو پابند کرنے کی کوشش کرو۔

حکایت حضرت احمد غزالیؒ:

بعض اہل حال نے اس وجہ سے کہ جماعت میں یکسوئی نہیں ہوئی جماعت کی نماز ہی چھوڑ دی تھی یا اس لئے کہ امام کے قلب میں یکسوئی نہیں ہوتی ایسے امام کیساتھ نماز پڑھنا ترک کر دیا تھا مگر یہ غلطی ہے اس کے متعلق ایک حکایت ہے کہ امام غزالی کے بھائی احمد غزالی جو صاحب حال زیادہ تھے اور امام صاحب صاحب علوم زیادہ ہیں جماعت کی نماز نہیں پڑھتے تھے بلکہ تنہا پڑھتے تھے امام صاحب نے والدہ سے شکایت کی کہ احمد میرے پیچھے نماز نہیں پڑھتا جماعت ترک کرتا ہے والدہ نے ان کو جماعت کی تاکید کی تو وہ نماز میں آئے اس زمانہ میں امام غزالیؒ فقہ کی کوئی کتاب لکھ رہے تھے اور کتاب الحیض تک پہنچے نماز میں ان کو کتاب الحیض کے کسی مسئلہ پر خیال آگیا اور اس کو سوچتے رہے ان کے بھائی صاحب نے ان کا ساتھ چھوڑ دیا اور تنہا پڑھکر چلے آئے۔امام غزالی نے والدہ سے شکایت کی کہ آج تو انہوں نے بہت سخت حرکت کی کہ شرکت کر کے پھر جماعت سے الگ ہو گئے والدہ نے اس کا سبب پوچھا کہا کہ ان سے پوچھئے اگر کسی کا کپڑا خون آلود ہو تو نماز ہو گی یا نہیں۔کہا نہیں کہا اور دل کا درجہ کپڑے سے زیادہ ہے جب کپڑوں کا خون سے پاک ہونا شرط ہے تو دل کا پاک ہونا اس سے بھی زیادہ ضروری ہے اور تم نماز کے اندر حیض کے مسائل سوچ رہے تھے تمہارا دل خون آلودہ تھا اس لئے میں نے علیحدہ نماز پڑھی والدہ نے کہا احمد تمہارا دل بھی اس دھبہ سے محفوظ نہیں رہا تو تم نے ان کے دل پر توجہ ہی کیوں کی تم کو

چاہیے تھا کہ اپنے شغل میں لگے رہتے والدہ ان دونوں سے زیادہ عارفہ تھیں کیسا عجیب فیصلہ کیا۔
غرض بعض اہل حال اس مشقت حضور کو دیکھ کر نماز ہی چھوڑ دیتے ہیں کہ بدوں حضور نماز نہیں اور حضور ممکن نہیں مگر سخت یہ غلطی ہے چنانچہ ایسے ہی شخص کا قول ہے

برزبان تسبیح ودردل گاؤخر ایں چنیں تسبیح کے وارد اثر

زباں پر تسبیح، دل میں گاؤخر ایسی تسبیح کب اثر رکھتی ہے۔

میں نے اس کا رد کیا ہے اور کہا ہے ایں چنیں تسبیح ہم وارد اثر ایسی تسبیح اثر رکھتی ہے۔

نماز میں گرانی دور کرنے کا طریق:

بہر حال اس میں شک نہیں کہ نماز کے اندر جو پابندی ہے وہ نفس کو بہت گراں اور قرآن میں اس کی گرانی کو تسلیم کیا گیا ہے وانہا لکبیرۃ بے شک نماز بہت گراں ہے۔ مگر اب حق تعالیٰ کی رحمت دیکھئے کہ آگے اس گرانی کے زائل کرنے کی بھی تدبیر بتلاتے ہیں الا علی الخاشعین یعنی مگر خشوع کرنے والوں پر نماز گراں نہیں ظاہر ہے مقصود استثنا ہے مگر درحقیقت اس میں بتلانا مقصود ہے کہ نماز کی گرانی کے رفع کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ خشوع حاصل کرو۔ خشوع کے معنی عربی میں سکون ہیں اور سکون حرکت کا ضد ہے اور قاعدہ ہے کہ علاج بالضد ہوتا ہے۔ پس حاصل علاج کا یہ ہوا کہ نماز گراں اس لئے تھی کہ قلب متحرک رہنا چاہتا ہے تم اس کو سکون کا عادی کرو تو یہ گرانی باقی نہ رہے گی۔ اس جگہ میں یہ بھی کہہ دینا چاہتا ہوں کہ آیت کی اس عنوان سے تقریر کرنا ہمارے ذمہ ضروری نہیں صرف اتنا کہدینا کافی ہے کہ خشوع سے گرانی نہیں رہتی مگر ایسی تقریر کردینا محض سامعین کی خاطر ہے مگر شاید کوئی اس علاج پر یہ شبہ کرے کہ یہ تدبیر تو صحیح مگر یہ تو ایسی تدبیر ہوئی جیسے کسی نے کہا تھا کہ ایک منٹ میں سات دفعہ سورہ بقرہ پڑھ لو تو سلطنت ہفت اقلیم مل جائے گی۔ یا جیسے گاندھی نے کہا تھا کہ سب ہندوستانی اتفاق کرکے گورنمنٹ سے ترک موالات کردیں تو سوراج مل جائے گا یہ تو مسلم مگر سوال یہ ہے کہ کیا ہندوستان میں اتفاق ہو بھی ہوسکتا ہے۔ ہرگز نہیں یہاں کی آب وہوا میں خاصیت یہ ہے کہ یہاں اتفاق ہو نہیں سکتا اور ہو بھی جائے تو رہ نہیں سکتا تو یہ علاج بھی ایسا ہی ہوا کہ قلب کو سکون کا عادی کرلو نماز گراں نہ رہے گی یہ تو مسلم مگر سکون کیونکر حاصل ہو۔

خشوع قلب حاصل کرنے کا طریق:

تو صاحبو! اللہ تعالیٰ نے ایسی تدبیر نہیں بتلائی جو حاصل نہ ہوسکے چنانچہ آگے خشوع حاصل

کرنے کا بھی طریقہ بتلاتے ہیں۔ الذین یظنون انھم ملاقوا ربھم کہ خشوع قلب حاصل
کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ لقاء رب کا مراقبہ کرو کیونکہ لقاء رب کا مراقبہ قاطع جملہ افکار ہے۔ جس دل
میں یہ مراقبہ ہوگا وہاں اور کوئی فکر جم نہیں سکتا پس سکون قلب اور خشوع حاصل ہو جائے اسی کو
دوسری آیت میں فرماتے ہیں الا بذکر اللّٰہ تطمئن القلوب کہ اللہ کی یاد سے دلوں کو سکون
حاصل ہوتا ہے خشوع اور اطمینان اور سکون سب متحد ہیں اور یہاں سے یہ بھی معلوم ہوگیا کہ
اطمینان ایمان کے علاوہ کوئی اور شے ہے کیونکہ اطمینان خشوع کا مرادف ہے اور بغیر خشوع کے
ایمان حاصل ہو جاتا ہے۔ چنانچہ بہت لوگ ایماندار ہیں جن کو خشوع حاصل نہیں تو ایمان بھی
بدون اطمینان متحقق ہو سکتا ہے۔

حضرت ابراهیم علیہ السلام کا مشاہدہ احیاء موتی کی درخواست کا سبب:

پس حضرت ابراهیمؑ کے قصہ میں جبکہ انہوں نے مشاہدہ احیاء موتی کی درخواست کی تھی اور
بلی ولکن لیطمئن قلبی فرمایا تھا کوئی وہم اشکال نہیں رہا۔ اب یہ شبہ نہیں ہو سکتا کہ حضرت
ابراهیمؑ نے اطمینان کی نفی کی ہے تو معاذ اللہ ایمان کی بھی نفی ہوگئی۔ ہرگز نہیں۔ اسی وہم کو رفع کرنے
کے لئے اللہ تعالیٰ نے ہمارے حال پر رحم فرمایا کہ حضرت ابراهیمؑ سے خود ہی سوال فرمایا ولم تؤمن
کیا تم کو احیاء موتی پر ایمان نہیں تاکہ وہ یہ جواب دیں ولکن لیطمئن قلبی کہ ایمان کیوں نہ ہوتا
لیکن میں اطمینان قلب چاہتا ہوں یہاں بھی اطمینان سے سکون ہی مراد ہے یعنی چونکہ بدوں مشاہدہ
کے کیفیت متعین نہیں ہوتی اس لئے یہ خیال ہوتا ہے کہ معلوم احیا کی کیا صورت ہوگی اور مشاہدہ سے
کیفیت متعین ہو جائے گی۔ تو سکون ہو جائے گا کہ احیا موتی کی یہ صورت ہوگی تو اس سوال و جواب
کے بعد کسی کو حضرت ابراهیمؑ کے متعلق کسی قسم کا وہم پیدا نہ ہوگا۔ رہا یہ سوال کہ اس معاملہ میں طلب
اطمینان کی ضرورت ہی کیا تھی عام اجمالی کافی تھا گو ایک کیفیت ذہن میں متعین نہ ہوتی اور اگر اس
کی ضرورت تھی تو پھر ہر شخص کو اس کا مشاہدہ کرانا چاہئے تو اس کا جواب ہمارے ذمہ نہیں ممکن ہے
حضرت ابراهیم کو کسی خاص وجہ سے (جس کا ہم کو علم نہیں اس کی ضرورت پیش آئی ہو) مگر تبرعاً بتلا
دیتا ہوں کہ اہل تفسیر اس کی یہ وجہ بتلائی ہے کہ جب نمرود سے حضرت ابراهیمؑ کی گفتگو وجود صانع اور
توحید صانع کے مسئلہ میں ہوئی حضرت ابراهیمؑ نے فرمایا ربی الذی یحی ویمیت کہ
میرا پروردگار وہ ہے جو زندہ کرتا ہے اور مارتا ہے تو اس پر نمرود نے یہ سوال کیا کہ کیا تم نے احیاء

واماتت کا مشاہدہ کیا ہے حضرت ابراھیمؑ نے فرمایا کہ مشاہدہ تو نہیں کیا لیکن دلیل سے میں جانتا ہوں
کہ احیاء واماتت خدا ہی کا فعل ہے اس کے بعد حضرت ابراھیمؑ نے یہ درخواست کی کہ اے رب مجھے
احیاء واماتت کا مشاہدہ کرادے (تا کہ میں جاہلوں کے جواب میں یہ کہہ سکوں کہ ہاں میں نے اس
کا مشاہدہ کیا ہے) تو دیکھئے اللہ تعالیٰ نے نماز کی گرانی زائل کرنے کا کیسا عجیب طریقہ بتلایا اور نماز
میں بس خشوع ہی ایک گراں ہے باقی افعال اس کے سب آسان ہیں پھر نماز کے اوقات ایسے ہیں
جو عموماً فارغ اوقات میں صبح اٹھتے ہی دنیا کا کوئی کام شروع نہیں ہوتا نہ تجارت نہ زراعت نہ
ملازمت۔ اور دوپہر کو عموماً لوگ کھانا کھانے اور اپنے گھر پر آتے ہیں اسی وقت ظہر کی نماز فرض کی گئی
اور مغرب کے وقت عموماً سب کاروبار بند ہو جاتا ہے اور عشاء کا وقت تو فارغ ہی ہے البتہ عصر کا
وقت عموماً فارغ نہیں اس وقت ایک نماز فرض کر کے محبت کا امتحان کیا گیا ہے کیونکہ بعض اہل ہوس
بھی ہیں اور جو اسی وقت تک محبت کا دم بھرتے ہیں جب تک ان کی خواہش کیخلاف کوئی بات نہ ہو۔
جیسے ایک شاعر اپنے محبوب کو دعا دیتا ہے۔

بخت خویش برخوردار باشی ۔۔۔۔ بشرط آنکہ بامن یار باشی

اس کا اپنا بخت تابعداری میں ہے بشرطیکہ میرے ساتھ میرا ہمنشیں ہو۔

دعا میں یہ بھی شرط ہے کہ میرے ساتھ دوستی رکھے اور میرا کہنا مانے تو صاحب نصیب ہو
ورنہ نہیں تو ایسے بوالہوسوں کو عشاق کی صف سے باہر کرنے کے لئے عصر کے وقت ایک نماز فرض
کی گئی تا کہ لوگ دیکھ لیں کہ کون بوالہوس ہے جو اپنی منفعت کو عبادت محبوب پر مقدم کرتا ہے اور کون
عاشق صاحب ہے جو محبوب سے کسی وقت رخ نہیں پھیرتا سچے عاشق کی تو یہ شان ہوتی ہے۔

اس کے کوچہ سے کب اٹھ اہل وفا جاتے ہیں ۔۔۔۔ وہ ہوس ناک ہیں جو روبقضا جاتے ہیں

شاعر نے اس شعر میں ایک دوسرے شاعر کا رد کیا ہے جس نے کہا تھا

اس کے کوچہ سے جب اٹھ اہل وفا جاتے ہیں ۔۔۔۔ تا نظر کام کرے روبقضا جاتے ہیں

اس نے اس کا رد کیا کہ اہل وفا محبوب کے کوچہ سے اٹھتے ہی نہیں۔

نماز عصر فرض کرنے میں حکمت:

بہر حال عصر کے وقت ہر شخص مشغول ہوتا ہے اس لئے حق تعالیٰ نے امتحان محبت کے لئے اس
وقت کی نماز فرض کردی مگر اس کو بھی اس طرح آسان کردیا کہ حافظو اعلی الصلوات والصلوۃ

الوسطی فرما کر نماز عصر کی فضیلت ظاہر کر کے ہمت بڑھا دی کہ یہ نماز سب سے افضل ہے۔(فان خیر الامور اوسطھا) اس لئے اس کی خاص طور پر محافظت کرو۔اس ترغیب وتاکید سے مسلمانوں کو عصر کی نماز کا خاص اہتمام ہو گیا اور جس چیز کا خاص طور پر اہتمام ہو جاتا ہے وہ دشوار نہیں رہتی۔ پھر نماز کو اس طرح آسان کیا کہ اگر کھڑے نہ ہو سکو تو بیٹھ کر نماز پڑھ لو بیٹھ نہ سکو تو لیٹ کر اشارہ سے پڑھ لو بیماری میں وضو نہ ہو سکے تو تیمم کر لو یا سفر میں پانی نہ ملے تو تیمم کی اجازت ہے۔

شریعت اللہ تعالیٰ کی ہے:

اور اس سے بڑھ کر یہ کہ سفر میں پانی نہ پانے والے کو اس کی اجازت ہے کہ بیوی سے مقاربت کرلے اور غسل کی جگہ تیمم کر لے اگر یہ شریعت خدا کی نہ ہوتی تو حکم یہ ہوتا کہ اس حالت میں مقاربت حرام ہے کیونکہ جب سفر میں پانی نہیں ملتا تو ایسے سخت سفر میں اس مستی کی کیا ضرورت ہے۔ جماع کیا جاوے اپنے ہاتھوں ناپاکی میں مبتلا ہوا جائے۔اور اگر جماع جائز بھی کیا جاتا تو حکم یہ ہوتا کہ اس کو تیمم جائز نہیں جس طرح ممکن ہو مر بھر کو کہیں سے پانی ہی لا دے تاکہ مستی کی سزا بھگتے اور اگر تیمم بھی جائز ہوتا تو وضو اور غسل کے تیمم میں فرق ہوتا وضو کے تیمم میں ہاتھ منہ کا ملنا کافی ہے تو غسل کے تیمم میں شاید مٹی میں لیٹنے کا حکم ہوتا۔

لیڈران قوم کی احکام شریعت سے بے خبری:

جیسے ایک لیڈر نے جس کو تیمم کا طریقہ معلوم نہ تھا اپنی عقل سے یہ سمجھا کہ جن اعضاء پر وضو میں پانی ڈالا جاتا ہے شاید تیمم میں اس سب پر مٹی ڈالی جاتی ہوگی تو آپ نے اول دونوں ہاتھوں پر اوپر نیچے مٹی ملی پھر منہ میں کلی کیلئے بھی مٹی دی اور ایک دفعہ ان ہی صاحب نے موٹر ٹھہرا کر اسی میں بیٹھے نماز پڑھ لی اور پھر بھی وہ قوم کے پیشوا اور لیڈر رہی رہے ایسے ہی لیڈروں کے متعلق کسی نے کہا ہے۔

اذا کان الغراب دلیل قوم   سیھد یھم طریق الھا لکینا

جب کسی قوم کا لیڈر کوا ہو تو وہ عنقریب انہیں ہلاکت کی راہ پر لے جائے گا۔

اور کہا ہے۔

گربہ میر و سگ وزیر و موش را دیوان کنند   ایں چنیں ارکان دولت ملک را ویراں کنند

اگر بلی سردار، کتا وزیر اور چوہا دیوان ہو تو جب سلطنت کے ارکان ایسے لوگ ہوں تو یہ ملک کو ویران کر دیں گے۔

اس پر شاید کوئی یہ کہے کہ مولوی خود تو سیاسیات میں پڑیں نہیں اور کام کریں نہیں اور دوسروں کو بھی کرنے نہیں دیتے کہ ان کو برا بھلا کہتے ہیں اس شبہ کا جواب میں نے میرٹھ کے ایک جلسہ وعظ میں دیا تھا کہ ہم تسلیم کرتے ہیں اور اقرار کرتے ہیں کہ مسائل سیاسیہ میں یہ لال ٹوپی والے ہمارے امام ہیں کیونکہ واقعی ترکوں کو چندہ بھیجنے کی تدبیر کرنا ہمارا کام نہ تھا ہم تو دعا کے سوا کچھ نہ کر سکتے تھے ان لوگوں نے گورنمنٹ سے اس کی اجازت لی اور وہاں امداد پہنچانے کے وسائل معلوم کئے تو ہم نے بھی چندہ میں شرکت کر لی۔ بس ان مسائل میں ہم ان کو امام تسلیم کرتے ہیں مگر امام کو قرآن صحیح یاد نہیں اس لئے مقتدی کو لقمہ دینا واجب ہے، ورنہ سب کی نماز فاسد ہو جائے گی پس امام کو چاہئے کہ یا تو نماز سے پہلے وہ ہمارے پاس آ کر قرآن صحیح کر لے ورنہ جب غلطی کرے گا تو ہم نماز ہی میں لقمہ دیں گے اور اس کو غلطی پر ٹوکیں گے۔ یعنی مثلاً اگر تم چندہ بلقان کے لئے تجویز کرو کہ مسلمان قربانی کو ترک کر دیں اور ان کی قیمت چندہ میں دے دیں تو ہم اس کا رد کر دیں گے یا تم زکوٰۃ کا روپیہ بدوں تملیک کے بھیجنے لگے تو اس کی بھی مخالفت کریں گے تم کو چاہئے کہ ہم سے مل کر کام کرو اور مل کر کام کرنے کے معنی یہ ہیں جیسے بڑھئی اور معمار ولوہار مل کر مکان بناتے ہیں جس کی یہ صورت نہیں ہوتی کہ سب کے سب ایک ہی کام کو لپٹ جائیں بلکہ ایک لکڑی کا کام کرتا ہے اور ایک لوہے کا اور ایک اینٹ گارے کا اسی طرح یہاں مل کر کام کریں گے یہ معنی نہیں کہ مولوی صاحبان بھی جھنڈا لیکر سیاسیات کے میدان میں کود پڑیں۔ بلکہ صورت یہ ہے کہ جھنڈا تو لال ٹوپی والے اپنے ہاتھ میں رکھیں مگر جو کام کرنا چاہیں اور جو تجویز کریں اسکو شائع کرنے سے پہلے علماء سے پوچھ لیں کہ یہ شریعت کے خلاف تو نہیں پس آپ کی سمجھ میں آ گیا ہو گا کہ ہم لیڈروں کو کام کرنے سے منع نہیں کرتے ہاں تنہا کام کرنے سے منع کرتے ہیں اگر وہ ہم سے قرآن وحدیث پوچھ کر امامت کریں تو ہم ان کے مقتدی بننے کو تیار ہیں لیکن غلط قرآن پڑھ کر امامت کریں گے تو بے شک نہ ہم ان کی اقتدار کر سکتے ہیں نہ دوسروں کو اقتدار کرنے دیں گے بلکہ ان کی نماز کے فاسد ہونے کو ظاہر کر دیں گے۔ میں بقسم کہتا ہوں کہ جو کام مولوی کرتے ہیں وہ تم نہیں کر سکتے یعنی احکام کا سمجھنا اور جو کام تم کرتے ہو وہ مولوی بھی کر سکتے ہیں بلکہ تم سے اچھا کر سکتے ہیں چنانچہ جو مولوی جھنڈا لے کر سیاست کے میدان میں کودے ہیں وہ تم سے کچھ کم نہیں رہے بلکہ آگے ہی بڑھ گئے گو انہوں نے اس طرح اپنی علمی شان کو برباد کیا ہے الا ماشاء اللہ یہ شبہ کا جواب تھا میں کہہ رہا تھا کہ لیڈر صاحب اپنی عقل سے غسل جنابت کا تیمم کرتے تو وہ ضرور مٹی

میں گدھے کی طرح لیٹتے مگر یہ شریعت خدا کی بنائی ہوئی ہے ہر اس شخص کو بحالت سفر مقاربت کی بھی اجازت ہے کہ پھر غسل و وضو دونوں کا تیمم ایک ہی طرح سے ہے صرف نیت کا فرق ہے۔ اور جس حالت میں ان لیڈر صاحب نے بیٹھ کر نماز پڑھی تھی۔ اس حالت میں قعود جائز نہ تھا کیونکہ وہ قیام پر قادر تھے۔ موٹر سے نکل کر زمین پر قیام کے ساتھ نماز پڑھ سکتے تھے ہاں اگر کسی وقت قیام پر قدرت نہ ہو تو قعود بھی جائز ہے۔

فقہاء اور صوفیاء حکماء امت ہیں:

تو یہ احکام شرعیہ زبان حال سے حق تعالیٰ کی محبت وعنایت کو ظاہر کر رہے ہیں۔ روزہ میں غور کیجئے کہ کس قدر سہولت کی رعایت ہے اگر کسی شخص نے سفر میں رات کو خوب سیر ہو کر کھانا کھا لیا ہو اور دن میں اس کو بھوک پیاس کا اندیشہ نہ ہو مثلاً ریل کا سفر ہو جاڑے کا موسم تو اب سوال ہو گا کہ اس شخص کو افطار جائز ہے یا نہیں شریعت کہتی ہے کہ افطار جائز ہے اس کو حضرات فقہائے نے سمجھا ہے حالانکہ سفر میں جواز افطار کی وجہ مشقت ہے اور اس صورت میں کچھ مشقت نہیں ہے مگر حضرات فقہاء حکماء امت ہیں انہوں نے معیار رخصت کو سمجھا ہے اور وہ یہ کہ اصل مدار تو مشقت ہے مگر شریعت نے نفس سفر کو قائم مقام مشقت کے قرار دے دیا ہے اور فرقہ بھی حکماء امت ہے یعنی صوفیہ مگر باوجود دونوں فرقوں کے حکماء ہونے کے پھر جو یہ دونوں آپس میں لڑتے ہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ لڑنے والے دراصل حکماء امت نہیں ہیں بلکہ دونوں ناقص ہیں جو اس شعر کا مصداق ہیں۔

اگر از ہر دو جانب جاہلانند اگر زنجیر باشد بگسلانند

اگر دونوں طرف جاہل ہوں اگر ان کو زنجیر سے باندھ دیا جائے تو گدلا ہو جائیں۔

اور جو ان میں سے حکماء ہیں وہ کبھی نہیں لڑتے۔

حکیم کا معیار:

حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ نے حکیم کا معیار یہ لکھا ہے کہ صوفی بھی ہو فقیہ بھی ہو محدث بھی ہو اور یہ بھی لڑائی ان لوگوں میں ہوتی ہے جو نرے فقیہ یا نرے صوفی ہیں۔ غرض شریعت نے اس صورت میں افطار کو جائز کیا ہے اب اگر یہ کہو کہ اس میں تو بے حیائی سی معلوم ہوتی ہے کہ سب روزہ داروں کے سامنے بیٹھے کھا رہے ہیں سو اس کا جواب یہ ہے کہ اس کو تم خود دیکھ لو باقی شریعت میں تو تمہاری اس بے شرمی کی بھی اجازت ہے کیونکہ بے شرمی کی بھی شریعت میں تفصیل ہے ہر بے شرمی

حرام نہیں بس وہی حرام ہے جو واقعی بے شرمی ہو۔ خالی بے شرمی حرام نہیں۔ واللہ آپ نے شریعت کے حسن و جمال کو دیکھا نہیں لوگ اس کی حقیقت سے واقف نہیں اس لئے اس سے وحشت کرتے ہیں ورنہ اسکے حسن کی یہ حالت ہے۔

زفرق تا بقدم ہر کجا کہ می نگرم　　　کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا اینجاست

پیشانی سے پیر تک جہاں بھی دیکھتا ہوں کرشمہ اور رعنائی دامن دل کھینچتی ہے کہ سب سے زیادہ پر کشش جگہ یہی ہے۔

اور یہ لوگ شریعت سے تو کیا واقف ہوتے ہیں میں تو یہ کہتا ہوں کہ دنیا کی حقیقت سے بھی واقف نہیں جو کہ ان کی مطلوب ہے اسی لئے اس پر فریفتہ ہو رہے ہیں۔ صرف اوپر سے چادر کی بھڑک دیکھ لی ہے اور یہ سمجھ لیا ہے کہ اس کے اندر حسین صورت ہے اگر نقاب الٹ کر دیکھیں تو معلوم ہو کہ چڑیل ہے۔

پس قامت خوش کہ زیر چادر باشد　　　چوں باز کنی مادر باشد

بہت ہی خوش قد جو چادر میں ہے جب چادر کو ہٹاؤ تو نانی معلوم ہوگی۔

اسلئے شریعت نے جہاں آخرت میں تفکر کا حکم کیا ہے وہیں دنیا کی حالت میں بھی تفکر کا حکم کیا ہے۔ لعلکم تتفکرون فی الدنیا والاخرۃ. شریعت دنیا کی طرف سے متوجہ کرنے سے ڈرتی نہیں بلکہ بے دھڑک کہتی ہے کہ تم دنیا کی حالت میں اچھی طرح غور کرلو پھر اس کے مقابلہ میں آخرت کو دیکھ لو تو خود فیصلہ کر دوگے کہ قابل رغبت کون ہے یہ تو عبادات میں شریعت کی تیسیر کا نمونہ تھا۔

احکام معاشرت آسان تر ہیں:

اسکے بعد احکام معاشرت کو دیکھو تو جس چیز کو لوگوں نے سب سے گراں تر کر رکھا ہے وہ شریعت میں سب سے آسان تر ہے یعنی نکاح کیونکہ کھانے میں پینے میں پہننے میں کچھ تو صرف کرنا پڑتا ہے نکاح میں کچھ بھی حرج نہیں گواہ بلا فیس مل جاتے ہیں۔ قاضی بلا فیس مل جاتا ہے اور جو فیس لے اس سے نہ پڑھواؤ بلکہ خود ہی ایجاب و قبول کرلو۔ رہا مہر سو وہ ایسا ادھار ہے کہ بیچاری عورتیں ساری عمر بھی اس کا نام نہیں لیتیں اور جب میاں مرنے لگا تو اس کی کھٹولی کے پاس جا کر کہہ دیتی ہے کہ میں نے مہر معاف کیا۔ اور رامپور میں تو ایک عورت ایسی غریب تھی کہ اس کا مرد جب بیوی سے لڑتا یہ کہتا کہ لا میرا مہر وہ غریب ڈر جاتی اور سمجھتی تھی کہ مہر میرے ذمہ ہے وہ ظالم یہ

قبر کرتا تھا۔ رہے چھوارے سو وہ محض مستحب ہیں اگر ہوں تو ہم خرما ہم ثواب ورنہ خالص ثواب ہے اسی طرح غمی میں بھی شرعاً کچھ خرچ نہیں لوگوں نے خواہ مخواہ اس میں بھی خرچ خود ہی بڑھا لیا ہے چنانچہ دفن کرنے کی جگہ مہیا کرنے میں تو کچھ خرچ ہی نہیں بلکہ گورا میران میں تو کچھ خرچ ہوتا بھی ہے یا لیکن اکثر جگہ اس کو بھی آپ کے بزرگ ادا کر چکے ہیں کیونکہ آجکل اکثر قبرستان پہلے بزرگوں کے وقف کردہ ہیں اور گور غریباں میں تو کچھ بھی خرچ نہیں ہے قبر کھود دینے والے سو بعضے تو نادار مفلس سے کچھ لیتے ہی نہیں اور اگر لیں بھی تو غریب آدمی کو ان کی ضرورت ہی کیا ہے خود قبر کھود کر مردہ دفن کر دیں یا چندہ جمع کر کے مزدوری دیدیں یہی حال کفن کا ہے اگر وسعت ہو تو کفن خرید کر پہنا دو ورنہ وسعت ہو تو چندہ کا کفن ڈال دو۔ یہ بھی نہ ہو سکے تو معمولی کپڑوں میں جن میں مردہ مرا ہے انہی میں دفن کر دو۔ مجبوری کے وقت اس کی بھی اجازت ہے اور نماز جنازہ میں کچھ خرچ ہے ہی نہیں اور جو امام بدوں روپیہ لئے نماز جنازہ نہ پڑھائے (جیسا بنگال میں بعض لوگوں پر شامت سوار ہے) تو ان سے نماز پڑھوانے کی ضرورت ہی نہیں تو خود ہی چار دفعہ اللہ اکبر کہہ کر نماز پڑھ دو جنازہ کی نماز کی نیت نماز جنازہ اور چار تکبیریں ہی فرض ہیں اور باقی دعائیں سنت ہیں یاد نہ ہو تو کچھ ضرورت نہیں۔

فاتحہ تیجہ چالیسواں کے فضول ہونے کی دلیل:

بس غمی میں نماز دفن کفن یہی چیزیں ضروری ہیں ان میں کچھ بھی خرچ نہیں باقی سب غیر ضروری ہیں جیسے فاتحہ دلوانا تیجہ دسواں چالیسواں کرنا چنانچہ طاعون وہیضہ کے زمانہ میں یہ سب باتیں حذف ہو جاتی ہیں اور نماز جنازہ و کفن دفن حذف نہیں ہوتا یہ خود اس کی دلیل ہے کہ ضروری ہیں اور وہ فضولیات ہیں میں نے ایک جگہ لوگوں سے طاعون کے بعد یہی سوال کیا تھا کہ تم نے اپنے مردوں کی فاتحہ اور تیجہ (دسواں بھی کیا تھا سب نے کہا اجی اس کی کسے فرصت تھی میں نے کہا اور نماز و کفن دفن بھی کیا تھا کہا جی ہاں میں نے کہا کہ تم نے اپنے عمل سے خود بتلا دیا کہ یہ تو ضروری ہیں اور وہ غیر ضروری ہیں سب نے اقرار کیا کہ بات تو یہی ہے عام لوگ سچی بات کو جلدی سمجھ جاتے ہیں چنانچہ ایک گاؤں والے نے مجھ سے فاتحہ کی بابت سوال کیا تو میں نے کہا چودھری جی تم نے کبھی اللہ کے نام پر کپڑا یا مسجد میں سوختہ بھی دیا ہے کہا جی ہاں دیا ہے میں نے کہا کبھی اس پر بھی فاتحہ دی ہے کہا کبھی نہیں میں نے کہا پھر وہ بدون فاتحہ کیونکر قبول ہو گیا اور کھانا بدون فاتحہ کے کیوں نہ قبول ہوگا یہ سن کر وہ ہنسا اور کہا اور جی بس یہ سب ڈھکوسلے ہیں۔

شریعت میں مہمانی بھی سستی ہے:

معاشرت میں ایک چیز ضیافت و مہمانی ہے تو شریعت کی مہمانی بھی سستی ہے کہ اگر گھر میں کچھ ہو پکا دو جس حال میں میزبان ہو اسی حال میں مہمان رہے۔ چنانچہ ہمارے مولانا گنگوہیؒ ایک بار مولانا حکیم معین الدین صاحب نانوتویؒ کے مہمان ہوئے حکیم صاحب کے یہاں اس دن فاقہ تھا (اور قرض کرنے کی ضرورت نہ تھی) تو انہوں نے مولانا سے صاف عرض کر دیا کہ میرے یہاں تو آج فاقہ ہے۔ ہاں یہاں بعض لوگ آپ کے معتقد چاہا کرتے ہیں کہ آپ کی دعوت کریں۔ اگر آپ فرمائیں تو ان کو اجازت دے دوں فرمایا میں تو تیرا مہمان ہوں جو تیرا حال ہے وہی میرا حال ہے کسی سے کچھ نہ کہو شام تک سب فاقہ سے رہے شام کو ایک مریض حکیم صاحب کے پاس آیا اور شکرانہ صحت میں غالباً گیارہ روپے دے گیا حکیم صاحب نے مولانا سے عرض کہ حضرات اب خدا نے رزق بھیج دیا ہے اب میں ذرا تکلف کے کھانے پکواؤں گا۔ حضرت نے منع بھی کیا کہ تکلف نہ کرو مگر انہوں نے نہ مانا۔ اور کہا کہ دن بھر فاقہ رہا اب جو خدا نے دیا ہے تو کیا اب بھی عمدہ کھانے نہ کھائیں صاحبو! یہ ہے شریعت کی مہمانی جس میں ذرا بھی بار نہیں ہم لوگ تکلف کر کے پریشان ہوتے ہیں کہ چند قسم کے کھانے پکاتے ہیں اور اگر گھر میں وسعت نہ ہو تو محلے سے مختلف کھانے جمع کرتے ہیں پھر اس کو بلی کے گوہ کی طرح چھپاتے ہیں کہ مہمان کو خبر نہ ہو جائے کہ یہ سالن دوسرے گھر سے منگایا ہے۔ شریعت نے ان تکلفات کو مٹا دیا ہے ہمارے یہاں انسپکٹر مہمان ہوئے مگر بندۂ خدا نے پہلے سے خبر نہ کی کہ میں بے مرچ کھانا کھاتا ہوں جب کھانا سامنے آگیا تب کہا مگر اس وقت کیا ہو سکتا تھا مگر اتفاق سے ایک عزیز کے یہاں کسی بیمار کیلئے بے مرچا کھانا پکا تھا گھر والوں نے وہاں سے ایک پیالہ سالن منگا لیا جب وہ دستر خوان پر آیا میں نے بھانڈا پھوڑ دیا کہ یہ دوسرے گھر سے منگایا گیا ہے ہمارے یہاں اس وقت انتظام نہ ہو سکتا تھا گھر میں سے کہنے بھی لگیں کہ تم نے یہ بات کیوں ظاہر کی میں نے کہا اور کیوں ظاہر نہ کرتا دوسرے کے احسان کو چھپانے کی کیا ضرورت تھی اور یہ قصہ تو مولانا گنگوہی کا تھا جو اوپر مذکور ہوا اس سے عجیب ایک قصہ مولوی محمد صاحب وکیل الہ آبادی کا ہے یہ لفظ مولوی ان کے نام کا جزو تھا میرے ایک دوست ان کے یہاں مہمان ہوئے تو وہ کہتے تھے کہ شام کو مغرب کے بعد میں نے دیکھا کہ ان کے بچے خوشی میں یہ کہتے پھر رہے تھے کہ ابا جی ہمارے یہاں شیخ جی آئے یہ مہمان یہ سمجھے کہ شیخ جی

کوئی بزرگ ہوں گے اور شاید ان کے واسطے کھانے میں تکلف ہو رہا ہو گا جو کھانا اب تک نہیں آیا مگر جب عشا کا وقت بھی ہو گیا تو مہمان نے ایک ملازم سے پوچھا کہ بھائی وہ شیخ جی کہاں ہیں۔ جس کی آمد سے بچے خوش ہو رہے تھے وہ ہنسنے لگا اور کہا کہ وکیل صاحب کے گھر والے فاقہ کو شیخ جی کہتے ہیں کہ آج ان کے یہاں فاقہ ہے بچے اس کی خوشیاں منا رہے تھے مہمان کو بڑا تعجب ہوا کہ اس شیخ نے بچوں کو بھی فاقہ سے مانوس کر دیا ہے۔ رات بھر بچے بھی بھوکے رہے اور مہمان بھی۔ اب غور کیجئے کہ شریعت کے موافق مہمان داری کتنی بڑی راحت ہے۔

شریعت کا حکم استیذان بڑی راحت ہے:

معاشرت میں شریعت کی ایک تعلیم یہ ہے کہ استیذان کا حکم دیا ہے کہ بدوں اجازت لئے کسی مکان کے اندر قدم نہ رکھو افسوس یورپ اس سے منتفع ہے اور ہم اس سے محروم ہو کر تکلیف میں ہیں۔ شریعت میں اس کا اس قدر اہتمام ہے کہ ایک بار رسول اللہ ﷺ ایک صحابی کے یہاں مدینہ سے قبا تشریف لے گئے جو دو تین میل کے فاصلہ پر ہے وہاں پہنچ کر حضور ﷺ نے ان کے مکان پر تین دفعہ السلام علیکم ادخل فرمایا صحابی ہر دفعہ سلام کا جواب آہستہ دیتے رہے زور سے جواب نہ دیا تا کہ حضور ﷺ بار بار سلام فرمائیں اور آپ کی دعا سے برکت حاصل ہو۔ تین بار سلام کر کے بھی جب اندر سے اجازت کا جواب نہ آیا تو حضور ﷺ واپس مدینہ کی طرف لوٹ چلے۔ سبحان اللہ جن کی یہ شان ہو۔

گر بر سر و چشم من نشینی ۔۔۔ نازت بکشم کہ نازنینی

اگر تو میرے لئے سر اور آنکھوں پر بیٹھے تو تیرا ناز اٹھاؤں اس لئے کہ تو نازنین ہے۔

وہ دو میل جیسے ہی آئے تھے ویسے ہی واپس چلیں اور کسی قسم کا ملال وغیرہ کچھ نہ ظاہر کریں یہ ہے مساوات رسول بھی قانون پر عمل کرنے میں اپنے کو سب کے مساوی سمجھتے ہیں۔

مساوات شریعت:

اور مساوات یہ ہے کہ ایک دفعہ حضرت عمرؓ خطبہ کیلئے کھڑے ہوئے اور فرمایا اسمعوا واطیعوا۔ سنو اور اطاعت کرو۔ اسی وقت ایک شخص کھڑا ہوا اور کہنے لگا لا نسمع ولا نطیع نہ ہم سنتے ہیں اور نہ ہم اطاعت کرتے ہیں۔ حضرت عمرؓ نے پوچھا کیوں کہا یہ دو چادر جو آپ کے بدن پر ہیں مال غنیمت کی ہیں اور غنیمت میں سے ہر شخص کو ایک چادر ملی ہے آپ کے پاس دو کیوں

ہیں کہ ایک کو آپ نے لنگی کی جگہ باندھا ہے ایک کو اوڑھ لیا ہے حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ اے بھائی تم نے اپنے امیر کے ساتھ بدگمانی کرنے میں جلدی کی ۔ اے عبداللہ بن عمر اپنے بھائی ۔ کے سوال کا جواب دو اس وقت حضرت عبداللہ بن عمر کھڑے ہوئے اور فرمایا کہ آج امیر المومنین کے پاس جمعہ کی نماز کے واسطے کپڑے نہ تھے اس لئے میں نے چادر جو مجھے غنیمت سے ملی تھی امیر المومنین کو رعایۃً دے دی ہے ۔ اسی طرح ان کے پاس دو کپڑے جمع ہو گئے یہ سن کر وہ شخص رونے لگا اور کہا اما الآن فقل نسمع ونطیع لامیرنا. ہاں اب فرمائیں اب ہم اپنے امیر کی اطاعت کریں گے ان کے احکام کو سنیں گے ۔ حضرات یہ ہے مساوات جس کی نظیر اسلام کے سوا کہیں نہ ملے گی جس کی حقیقت ہے کہ اتباع قوانین شریعت میں حاکم ومحکوم غریب وامیر سب مساوی ہیں مساوات کے یہ معنی نہیں کہ اگر حضرت عمرؓ کسی کو یہ حکم دیں کہ تم مصر پر جاؤ اور تم ملک شام پر جاؤ ۔ تو وہ جواب میں یہ کہے کہ ہم تم دونوں مساوی ہیں ہم ہی تم کو حکم دیتے ہیں کہ تم چلے جاؤ ۔ جو لوگ آج کل مساوات کے مدعی ہیں ان سے یہی صورت پیش کر کے سوال کرتا ہوں کہ کیا وہ ایسی مساوات کو جائز کر سکتے ہیں ۔ ہرگز نہیں پھر وہ کس منہ سے مساوات کے مدعی ہیں اگر تم بلا قید مساوات کے مدعی ہو تو پھر کسی حاکم کی اطاعت کسی محکوم پر لازم نہ ہونا چاہئے اور پارلیمنٹ کو بھی عام رعایا پر حکومت کا حق نہ ہونا چاہئے کیونکہ اگر شخصی حکومت مساوات کے خلاف ہے تو جماعت قلیلہ کا جماعت کثیرہ پر حکومت بھی مساوات کے خلاف ہے آج کل اہل مساوات کی بڑی دوڑ یہاں تک ہے کہ عورتوں کو ہم نے مردوں کے مساوی کر دیا ۔ میں کہتا ہوں کہ پھر محکوم کو بھی حاکم ۔ کے مساوی کرنا چاہئے حاکم کو کیا حق ہے کہ وہ رعایا پر حکومت کرتا ہے اور باپ بیٹے میں اور شاگرد استاد میں بھی مساوات کرنا چاہئے ۔ اور اگر ان میں فرق کرنا مساوات کے خلاف نہیں تو پھر شریعت نے جو مرد وعورت میں فرق کیا ہے وہ مساوات کے خلاف کیوں ہے ہاں کسی ملک کے مرد ہی زنانے ہوں تو ان کو عورتوں کے ساتھ مردوں کی مساوات مبارک ہو ۔

اہل یورپ عورتوں کی مساوات سے تنگ ہیں:

صاحبو! اخبار دیکھئے تو آپ کو معلوم ہو گا کہ اہل یورپ عورتوں کی مساوات سے خود تنگ ہو گئے ہیں وہ تو اب کوشش میں ہیں کہ عورتوں کو پھر اصلی حالت پر لائیں ۔ تم خوامخواہ ان کی تقلید کر کے یورپین بننا چاہتے ہو وہ تو اب ایشیائی بننے کی فکر کر رہے ہیں ۔ بہت اچھا اب تم یہ کرو کہ تم یورپ میں بسو! اور یورپ والے ایشیاء میں آ جائیں ۔

پرسکون زندگی صرف شریعت پر چلنے سے نصیب ہوگی:

لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ یورپ کی تقلید ہی سے دنیا مل سکتی ہے یہ خیال بالکل غلط ہے واللہ تم شریعت پر چل کر بھی دنیا حاصل کر سکتے ہو بلکہ خوش گوار دنیا دین کے ساتھ میسر ہوتی ہے اور یہ دنیا دین کے ساتھ مثل سایہ کے ہے پرندہ کو پکڑ لو سایہ اس کے ساتھ ساتھ اور تنہا سایہ کو پکڑنا چاہو تو ممکن نہیں پس مسلمانوں کو تو شریعت سے الگ ہو کر دینوی ترقی نصیب نہیں ہو سکتی۔ اور یہ نسخہ مجرب ہے حضراب صحابہ اس سے کامیاب ہو چکے ہیں اور ایسے کامیاب ہوئے ہیں کہ دنیا میں ان کی کامیابی کی نظیر نہیں مل سکتی پھر تم یورپ کی تقلید میں کیوں اپنے کو برباد کرتے ہو تمہاری بالکل یہ حالت ہے۔

یک سبد پر نان ترا بر فرق سر	تو ہمی جوئی لب نان در بدر
تا بزانوئے میاں قعر آب	وز عطش وز جوع گشتی خراب

ایک ٹوکرا روٹیوں کا تیرے سر پر رکھا ہے اور تو ایک روٹی ٹکڑے کے لئے در بدر مارا پھرتا ہے زانو تک پانی میں کھڑا ہے اور بھوک او پیاس سے خراب ہوتا ہے۔

آپ کے پاس ترقی کے اسباب وذرائع سب سے زیادہ موجود ہیں مگر اپنے گھر سے بے خبر ہو کر آپ دوسروں کے در پر گداگری کرتے ہیں خلاصہ یہ کہ شریعت کی یسر وسہولت کے یہ چند نمونے ہیں جو اس مختصر جلسہ میں اجمالاً ظاہر کئے گئے ہیں اس سے آپ کو بخوبی معلوم ہو گیا ہوگا کہ مشقت و پریشانی میں پڑنا مطلقاً مجاہدہ نہیں اور نہ اسی میں مطلقاً ثواب ہے بلکہ شریعت نے ہم کو مشقت و پریشانی سے ہر طرح بچانا چاہا ہے۔ بس مجاہدہ وہ مشقت و پریشانی ہے جس میں ہمارے قصد واختیار کو دخل نہ ہو۔

اہل سلوک کی چند غلطیاں:

اب میں چند جملے اہل سلوک کے متعلق کہہ کر بیان کو ختم کرتا ہوں کیونکہ اہل سلوک اس غلطی میں زیادہ مبتلا ہیں کہ وہ ہر مشقت و پریشانی کو مجاہدہ سمجھتے ہیں۔ میں ان کو متنبہ کرتا ہوں کہ اعمال ظاہرہ کی طرح اعمال باطنہ میں بھی یسر ہی مطلوب ہے عسر مطلوب نہیں مثلاً ذکر میں نیند غالب ہوگئی تو اول تو توجہ الی الذکر سے اس کو دفع کرو اگر دفع ہوگئی تو سمجھ لو کہ وہ نوم کاذب تھی اور دفع نہ ہو تو پڑھ کر سو رہو اور مشقت برداشت کر کے نہ جاگو ورنہ مرض لگ جائے گا۔ حدیث میں حضرت زینبؓ کی رسی کا قصہ موجود ہے کہ انہوں نے اپنی نماز کی جگہ ایک رسی باندھ رکھی تھی کہ جب نیند کا غلبہ ہوتا اس سے سہارا لیتیں تا کہ نیند جاتی رہے تو حضور ﷺ نے اس کو کاٹ ڈالا اور فرمایا علیکم من الاعمال

ماتطيقون فان الله لا يمل حتى تملوا کام اتنا ہی کرو جتنا ہو سکے اللہ تعالیٰ تمہاری عبادت (ثواب دینے) سے نہیں گھبرائیں گے بلکہ تم ہی (مشقت سے) گھبرا جاؤ گے اور حضرت عبداللہ بن عمرو کا قصہ بھی موجود ہے کہ وہ راتوں کو نوافل پڑھتے اور دن بھر روزہ رکھتے تھے تو حضور علیہ السلام نے منع فرمایا اور ارشاد فرمایا قم ونم وصم وافطر۔ کہ تہجد بھی پڑھو اور سویا بھی کرو اور روزہ بھی رکھو اور افطار بھی کرو ایک بات تو اہل سلوک سے یہ کہنی تھی دوسرا مسئلہ یہ بتلاتا ہے کہ اگر کوئی مشقت و پریشانی تم کو پیش آئے تو اس کو اپنے لئے عقوبت ہی نہ سمجھو جب کہ قصد کو ان میں دخل نہ ہو بلکہ قصد و اختیار آئی ہو تو یہ خیال نہ کرو کہ ہم سے اللہ تعالیٰ ناراض ہو گئے اس لئے یہ عقوبت پیش آئی بلکہ اس کو یسر و رحمت سمجھو کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔ ان مع العسر يسرًا۔ کہ مشقت کے ساتھ یسر بھی ہے۔ رہا یہ کہ اس سے مراد عسر غیر اختیاری ہے اس کی دلیل یہ ہے کہ اس سے اوپر جس عسر کا ذکر ہے وہ غیر اختیاری ہی تھا چنانچہ ووضعنا عنک وزرک الذی انقض ظهرک میں عسر کا ذکر ہے۔ اور ظاہر ہے کہ حضور علیہ السلام پر جو ثقل وحی وغیرہ کا تھا وہ غیر اختیاری تھا تو اس عسر کے متعلق ارشاد ہے کہ اس کے ساتھ یسر بھی ہے اور اس میں معیت یسر ظاہر ہے کیونکہ اس سے رفع درجات ترقی اجر ہوتا ہے پس ہر پریشانی اور ضیق و قبض وغیرہ کو عقوبت نہ سمجھو بلکہ اس کو رحمت سمجھو۔

تفویض کی ضرورت:

ہمارے حاجی صاحبؒ کا ارشاد ہے کہ کبھی لطف بصورت قہر ہوتا ہے اور کبھی قہر بصورت لطف ہوتا ہے۔ اس ارشاد کا حاصل یہی ہے کہ نہ لطف سے بے فکر ہو جاؤ۔ نہ صورت قہر سے مایوس ہو جاؤ بلکہ یہ سمجھے کہ شاید یہ رفع درجات کیلئے آیا ہو اور ساتھ میں توبہ و استغفار بھی کرتا رہے تاکہ اگر بالفرض کسی معصیت کی وجہ سے یہ صورت پیش آئی ہو تو اس کا بھی علاج ہو جائے۔ لیکن عقوبت ہونے کا یقین نہ کرے۔ بعض سالکین جن کو حالات و کیفیات کی طلب ہوتی ہے بعض دفعہ ان کو قبض پیش آتا ہے تو یہ سمجھ لیتے ہیں کہ بس ہم مردود ہو گئے یہ سخت غلطی ہے بعض نے اس حالت میں خودکشی تک کر لی ہے سو میں ان سے پوچھتا ہوں کہ سلب کیفیات کو تم نے کس دلیل سے قہر سمجھ لیا لطف حق عطائے کیفیات ہی میں منحصر نہیں بلکہ بعض دفعہ سلب کیفیات لطف ہوتا ہے تاکہ سالک کا عجب زائل ہو جائے اور بسط سے ناز نہ پیدا ہو بلکہ اس میں پستی پیدا ہو جائے اور پستی وہ چیز ہے۔

ہر کجا پستی ست آب آنجا رود	ہر کجا مشکل جواب آنجا رود
ہر کجا دردے دوا آنجا رود	ہر کجا رنجے شفا آنجا رود
فہم و خاطر تیز کردن نیست راہ	جز شکستہ می نگیرد فضل شاہ

جس جگہ نیچان ہوتا ہے اسی طرف پانی رواں ہوتا ہے جہاں مشکل پیش آتی ہے جواب وہیں دیا جاتا ہے۔ جہاں مرض ہوتا ہے اسی جگہ دوا کی جاتی ہے۔ جہاں مرض ہوتا ہے وہاں شفا آتی ہے۔ فہم و خاطر کا تیز کرنا راہ سلوک نہیں فضل الٰہی سوائے شکستہ دل کے اور کہیں متوجہ نہیں ہوتا۔

اس کی ایسی مثال ہے جیسے ایک شخص کے کھیت میں پانی آرہا تھا اس نے ایک ٹیلہ قائم کر کے پانی روک دیا اور ٹیلہ اس لئے بنایا تاکہ اس پر بیٹھ کر تفریح کیا کرے۔ مگر اس نے یہ نہیں سوچا کہ اس ٹیلہ کی وجہ سے کھیت خشک ہو جائے گا حق تعالیٰ نے قبض طاری کر کے پانی کا رستہ کھول دیا اور اتنا زور کا ریلا آیا کہ ٹیلہ سب بہہ گیا اب یہ شخص تو ٹیلہ بہہ جانے سے روک رہا ہے مگر عارف خوش ہے کہ اب کھیت ہرا ابھرا ہو جائے گا اور تھوڑی دیر کے بعد جب اس کو کھیت کا منظر نظر آئے گا تو یہ بھی خوش ہو کر یوں کہے گا:

ناخوش تو خوش بود بر جان من　　　دل فدائے یار دل رنجان من

تیرا رنجیدہ کرنا مجھے اچھا لگتا ہے دل ایسے یار قربان جو دل کو رنجیدہ کرے۔

پس تم اپنی تجویز کو دخل نہ دو بلکہ اپنی ترتیب کو خدا کے سپرد کرو تفویض سے کام لو کہ وہ جس طرح چاہیں تربیت کریں خواہ حالات و کیفیات عطا کر کے یا ب کو سلب کر کے

تو بندگی چو گدایان بشرط مزد مکن　　　کہ خواجہ خود روش بندہ پروری داند

تو فقیروں کی طرح مزدوری کی شرط پر عبادت نہ کر کیونکہ اللہ تعالیٰ بندہ پروری کے طریق خود جانتے ہیں یعنی اتنا ثواب عطا فرماتے ہیں کہ بندہ کے وہم و گمان میں بھی نہیں۔

تفویض والا بڑی راحت میں ہے اس کو کسی حال میں پریشانی نہیں۔ اگر کسی وقت اس کو پریشانی بھی پیش آتی ہے تو اس میں راحت ہوتی ہے کیونکہ اس نے اپنے ارادہ کو فنا کر کے خدا تعالیٰ کی رضا میں اپنی رضا کو مدغم کر دیا ہے اب جو خدا کی مرضی ہے وہی اس کی مرضی ہے۔

حکایت حضرت بہلول:

حضرت بہلولؒ نے کسی بزرگ سے پوچھا کہ کیا حال ہے فرمایا اس شخص کا حال کیا پوچھتے ہو جس کی خواہش کے خلاف عالم میں کچھ نہیں ہوتا جو ہوتا ہے اس کے ارادہ کے موافق ہوتا ہے پوچھا یہ کیونکر؟ فرمایا تو یہ ظاہر ہے کہ دنیا میں خدا کے ارادہ کے خلاف کچھ نہیں ہوتا اور میرا وہی ارادہ ہے جو خدا کا ارادہ ہے تو میرے ارادہ کے خلاف بھی کچھ نہیں ہوتا۔ صاحبو! رنج و غم اور پریشانی کی

حقیقت یہی ہے کہ خلاف ارادہ خلاف توقع کا ظہور ہو اور صاحب تفویض کا ارادہ و توقع ہی کچھ نہیں ہوتا اس کا تو مذاق یہ ہے ؂

فکر خود و رائے خود در عالم رندی نیست
کفرست دریں مذہب خود بینی و خود رائی

اپنی رائے اور فکر کو راہ سلوک میں کچھ دخل نہیں اس راہ میں خود بینی اور خود رائی کفر ہے۔

اب اسے کاہے کی پریشانی اور کس کا غم۔ غم تو اس سے خود پناہ مانگتا ہے۔

یہ تو ہر حال میں خوش رہتا ہے قبض ہو تو خوش بسط ہو تو خوش اور کچھ بھی نہ ہو تو خوش اس وقت یہ بے دھڑک یوں کہتا ہے۔ ؂

روزہا گر رفت گو رو باک نیست
تو بماں اے آنکہ جز تو پاک نیست

ایام تلف ہونے پر حسرت نہ کرنا چاہئے اگر گئے بلا سے گئے عشق جو اصلی دوست ہے اور سب خرابیوں سے پاک و صاف ہے اس کا رہنا کافی ہے۔

اس شخص کو پوری راحت حاصل ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے تفویض و تقدیر کا مسئلہ اسی لئے تو ہم کو بتلایا ہے کہ پریشانی اور غم سے بچے رہیں۔ ذرا تفویض و تقدیر کے منکر تو کوئی نسخہ اس کے مقابلہ میں لائیں ہرگز نہیں لا سکتے۔ اب یہ دعویٰ ہر طرح ثابت ہو گیا کہ اللہ تعالیٰ بندوں کو راحت میں رکھنا چاہتے ہیں اعمال ظاہرہ میں بھی اور اعمال باطنہ میں بھی۔ مگر ایک بات ضرور ہے کہ تم تفویض و توکل اس نیت سے اختیار نہ کرو کہ راحت حاصل ہو گی کیونکہ اس سے راحت تو بہر حال ہو گی مگر اس نیت سے ثواب باطل ہو جائے گا اور ممکن ہے اس نیت کی نحوست سے راحت بھی کم نصیب ہو۔

نیت رضائے حق:

جیسے کسی شخص نے واعظ سے سنا تھا کہ ایک خرچ کرنے دس ملتے ہیں اس نے ایک روپیہ خیرات کر دیا اور گھر میں بیٹھ گیا جب ایک دن گزر گیا اور دس نہ ملے تو میاں کو دست لگ گئے (یعنی دس مع شی زائد مل گئی کیونکہ دست میں تا زیادہ ہے) اس حالت میں ایک دن استنجے کے لئے کسی کھیت میں بیٹھا تھا۔ ڈھیلا جو اٹھایا تو اس کے نیچے ایک بٹوا ملا جس کے اندر دس روپے تھے بڑا خوش ہوا اور واعظ سے کہا کہ واقع تم نے سچ کہا تھا۔ کہ ایک کے دس ملتے ہیں مگر اس کے ساتھ مروڑے بھی بڑے غضب کے لگتے ہیں اب سے وعظ میں یہ بھی کہہ دیا کرو کہ مروڑوں کے بعد دس ملتے ہیں۔ تا کہ لوگوں کو دھوکہ نہ ہو۔ اس شخص کو مروڑے اس واسطے لگے کہ اس نے انفاق حقیقی نہ کیا تھا اس نے دس کی نیت سے انفاق کیا تھا رضائے حق کا قصد نہ کیا پس تم تفویض میں نیت نہ کرنا۔ سبحان اللہ اہل اللہ کے مقامات اور مقالات بڑے ہی بلند ہیں کہ بلند پرواز بھی وہاں تک نہیں پہنچ سکتا۔ چنانچہ ایک بزرگ دوسرے

بزرگ سے ملنے گئے جب قریب پہنچے تو ان کو خلوت میں یہ کہتے ہوئے سنا۔ اللھم انی اسئلک التفویض واعوذبک من لذۃ التفویض اے اللہ میں آپ سے مقام تفویض مانگتا ہوں اور لذت تفویض سے پناہ مانگتا ہوں یہ دعا سن کر دوسرے بزرگ نے حیران ہوگئے کہ اللہ اکبر اس شخص کا کیسا بلند مقام ہے اور یہ عارفین کا مقام ہے باقی ہم لوگوں کو عدم لذت سے رنج ہوتا ہے اس لئے ہم کو لذت کی دعا کا بھی مضائقہ نہیں لیکن نیت لذت کی نہ کرے۔

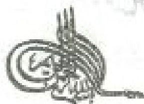
خلاصہ وعظ:

خلاصہ بیان کا یہ ہوا کہ جن امور میں تدبیر کا کچھ تعلق و دخل نہیں ان میں تو ابتدا ہی سے تفویض وتسلیم کرنا چاہئے اور جن میں تدبیر کو بھی کچھ دخل ہے وہاں تدبیر بھی کی جائے مگر نتائج وثمرات تدبیر میں تفویض کی جائے یہ تجویز نہ کرے کہ میری تدبیر کا ثمرہ یہ ہونا چاہئے بلکہ خدا کے حوالہ کرے کہ وہ جو چاہیں ثمرہ مرتب کر دیں میں اس پر راضی ہوں انشاء اللہ تعالیٰ پریشانی اور غم سے نجات رہے گی اور اس آیت سے جس کو میں نے تلاوت کیا تھا اس مضمون کا تعلق یہ ہے کہ۔ اللہ تعالیٰ نے اس میں اپنی اس نعمت کو بیان فرمایا ہے۔ جو مراکب کے متعلق ہے کہ ہم نے تمہارے لئے مویشی پیدا کیا تاکہ تم ان پر سواری کرو اور تاکہ وہ تمہارے بوجھ کو ایسے مقامات تک پہنچائیں جہاں پہنچنا بدوں سواری کے تم کو دشوار تھا۔ تو اس میں بھی اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کی راحت وآسانی کے سامان پر امتنان فرمایا ہے۔ جس سے ثابت ہوا کہ راحت وآسانی سے بھی مطلوب ہے اور یہی اس بیان کا موضوع تھا۔ بس تعلق واضح ہے۔ اور گو یہ وعظ پہلے وعظ کا تتمہ بھی قرار دیا جاسکتا ہے۔ جس کی وجہ تمہید وعظ میں مذکور ہے مگر میں اس کا نام مستقل ہی رکھتا ہوں چنانچہ اس کا نام التیسیر للتسیر تجویز کرتا ہوں یعنی آسانی کرنا دین ودنیا کے سب کاموں کے چلانے میں۔ اب دعا کیجئے اللہ تعالیٰ ہم کو فہم سلیم عطا فرمائیں اور عملی توفیق نصیب فرمائیں اور تمام پریشانیوں سے نجات دے کر اپنے ساتھ وابستہ کرلیں آمین۔

وصلی اللّٰہ علیٰ سیدنا محمد وعلیٰ الہ ...... واصحابہ اجمعین واخر دعونٰنا ان الحمد للہ رب العالمین۔

دفع اشکال:

اور بزرگوں سے جو بعض اختیاری مشقتیں منقول ہیں وہ بطور تقرب وتعبد کے نہیں محض بطور معالجہ کے ہیں جس کی تجویز کے لئے مجتہد کا اجتہاد یا شیخ کی اجازت ضروری ہے۔



القرض

قرض

یہ وعظ ۳۰ ربیع الثانی ۱۳۳۱ھ بمقام جامع مسجد دہلی جو کہ حضرت والا نے بیٹھ کر پھر کھڑے ہو کر ارشاد فرمایا جس کو مولٰنا سعید احمد صاحب نے قلم بند فرمایا۔

خطبہ ماثورہ

بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للّٰہ نحمدہٗ ونستعینہ ونستغفرہ ونومن بہ ونتوکل علیہ ونعوذ باللّٰہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا من یھدہ اللّٰہ فلامضل لہ ومن یضللہ ھادی لہ ونشھد ان لا الہ الا اللّٰہ وحدہ لاشریک لہ ونشھد ان سیدنا ومولانا محمدًا عبدہ ورسولہ صلی اللّٰہ تعالیٰ علیہ وعلیٰ الہ واصحابہ وبارک وسلّم.

اما بعد فاعوذباللّٰہ من الشیطٰن الرجیم بسم اللّٰہ الرحمن الرحیم ان تقرضوا اللّٰہ قرضاً حسنا یضاعفہ لکم ویغفرلکم واللّٰہ شکورحلیم ؕ عالم الغیب والشھادۃ العزیز الحکیم.

ترجمہ:۔ اگر تم اللہ تعالیٰ کو اچھی طرح (یعنی خلوص کے ساتھ قرض دو گے تو وہ اس کو تمہارے لئے بڑھاتا چلا جاوے گا اور تمہارے گناہ بخش دے گا اور اللہ تعالیٰ بڑا قدر دان ہے (کہ عمل صالح کو قبول فرماتا ہے اور) بڑا بردبار ہے پوشیدہ اورظاہر (اعمال) کا جاننے والا (اور) زبردست ہے۔(اور) حکمت والا ہے۔

تمہید

شریعت میں شک کا منشاء حقائق سے عدم واقفیت ہے:

صاحبو! یہ آیتیں سورۂ تغابن کے خاتمہ کی ہیں اور قبل اس کے کہ ان کے متعلق کچھ بیان کیا جائے اور مقصود کی تعیین کی جائے ان کے متعلق جو قصہ اس وقت پیش آیا ہے اس کو عرض کرنا چاہتا ہوں تاکہ معلوم ہو جائے کہ خدائی حکمتوں کی کیا شان ہوتی ہے۔قصہ مختصر یہ کہ میں وطن میں تھا کہ میرے پاس دہلی سے خط گیا جس کا مضمون یہ تھا کہ آج کل مسلمانوں کو پریشانی زیادہ ہے اور ان کو طرح طرح کے وسوسے پیدا ہوتے ہیں اور اس کا اثر شدہ شدہ عقائد پر ہوتا ہے اس لئے اس کی ضرورت ہے کہ یہاں آکر وعظ کے ذریعہ سے ان شبہات کو دفع کیا جائے یہ الفاظ کا حاصل تھا جو کہ میں سمجھتا تھا۔جس کا خلاصہ یہ تھا کہ اس وقت مسلمانوں کی پستی اور تنگی کی حالت ہے جس سے پریشانی پیدا ہو گئی اور اس کا یہ اثر ہوا کہ ان کو شریعت میں شکوک پیدا ہونے لگے۔مگر خوب سمجھ لو کہ

ان کو جو یہ شکوک ہوئے اس کا منشا عدم واقفیت علی الحقائق ہے کیونکہ جس کو حقائق پر اطلاع ہو جاتی ہے اس کو کبھی قیامت تک شریعت میں شک نہیں ہو سکتا کلام الٰہی میں جس کسی کو شک ہوا ہے وہ اسی عدم واقفیت حقائق سے پیدا ہوا ہے۔

شوکت اور زور خاصہ کلام الٰہی ہے:

اسی لئے تو بڑے بڑے دعوے کے ساتھ صاف طور پر فرما دیا ذالک الکتٰب لا ریب فیہ (یہ ایسی کتاب ہے جس میں کوئی شک نہیں) حضرات! ایسا پر زور دعویٰ ایسی حالت میں کہ اس کی تکذیب کرنے والے ہزاروں آدمی موجود ہوں کوئی نہیں کر سکتا یہ شوکت اور زور خاصہ کلام الٰہی کا ہے غرض باوجود بہت سے شاکین کے موجود ہونے کے لاریب فیہ فرمانا دلیل ہے اس بات کی کہ یہ شک جو ان لوگوں کو پیدا ہوا بوجہ عدم تدبر کے ہوا ہے تو حقیقت میں یہ شک کلام الٰہی میں نہیں بلکہ خود ان میں شک کا منشاء موجود ہے اس طرح اس وقت اس حالت سے بھی جن لوگوں کو شریعت میں شک پیدا ہوا ہے اس کا منشاء ان لوگوں کی عدم واقفیت علی الحقیقت ہے شریعت بالکل محل شک واقع میں نہیں تو میرے پاس اس مضمون کا خط گیا تھا کہ یہاں آکر مسلمانوں کے شبہات دفع کئے جائیں جس کے جواب میں میرا ارادہ خط لکھنے کا تھا خود آنے کا ارادہ نہ تھا کیونکہ ایک دو وعظ میں سامعین حقائق سے واقف نہیں بن سکتے اور جب تک یہ واقفیت حاصل نہ ہو شک کا ازالہ نہیں ہو سکتا۔

تمہید وعظ:

اس لئے میں وعظ کے لئے اپنے آنے کو بے سود سمجھتا تھا مگر اتفاق سے ایک مقام سے میرے بلانے کی تحریک پہلے سے ہو رہی تھی جس کا راستہ دہلی ہو کر تھا اس لئے میں دہلی آیا اور یہاں آکر احباب سے ملاقات کی اور اس خط کا حاصل اور اپنا جواب عرض کیا مگر بعد مشورے کے یہ بات قرار پائی کہ ایک وعظ دہلی میں بھی ضرور ہونا چاہئے جس سے تمام شکوک کا ازالہ نہ ہوگا تو کم از کم اپنی غلطی پر کسی درجہ میں تو تنبیہ ہو جائے گا اس لئے میں نے اپنے سفر کے حساب کو بڑھا کر اس بات کو منظور لیا اگرچہ اس صورت میں میرا سابق حساب سفر غلط ہو گیا ہے لیکن اس کا احسان کسی پر نہیں خدا تعالیٰ کا احسان ہے کہ وہ مجھ سے یہ کام لے لیں اور میں نے اس کے متعلق آیات بھی چھانٹ لی تھیں جو ان آیتوں کے علاوہ تھیں جو میں نے اس وقت تلاوت کی ہیں مگر اس تبدیل کا یہ سبب ہوا کہ جب میں نے وعظ کہنا منظور کر لیا تو احباب نے بطور مشورہ کے یہ بھی فرمایا کہ اس وقت اگر چندہ کے

متعلق بھی کچھ ذکر ہو جائے تو مناسب ہو اس وقت تو میں نے اس مشورہ کو منظور نہ کیا اور یہ کہہ دیا کہ یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی بلکہ اس موقع پر خالص مقصود مذکور ہی کا وعظ ہونا مناسب ہے لیکن انہوں نے فرمایا کہ ایسے موقعہ پر مسلمان خود منتظر رہتے ہیں کہ کچھ تحریک ہو تو دیں۔ چونکہ میری اس رائے کی وجہ یہ تھی کہ شاید تحریک چندہ سے سامعین پر گرانی ہو تو جب میرا اس طرح اطمینان کر دیا گیا کہ سامعین ایسے مواقع میں اس کے منتظر ہوتے ہیں تو کس قدر اس وقت نرم ہو گا لیکن چونکہ میں اس بات کو عام نہ سمجھتا تھا بلکہ یہ احتمال باقی تھا کہ شاید بعض پر اس کی گرانی ہو اس لئے میرا یہ قصد تھا کہ اس موقع کے بعد الگ کسی وقت تحریک چندہ کی کر دوں گا۔ چنانچہ جمعہ کے روز میں نے اس کا بیان بھی کیا تھا اور اسی روز یہ وعدہ بھی کر لیا تھا کہ انشاء اللہ جلسہ عظیم میں یہ بیان نہ ہو گا اس کے بعد مشورہ ہوا اور تجویز قرار پائی کہ مقصود اتو مضمون وعظ یعنی ازالہ شبہات کا بیان ہو اور تبعاً چندہ کا بھی ذکر دیا جاوے میں اس حالت کو لے کر یہاں سے چلا گیا اور جہاں گیا وہاں اس کے قبل کی آیت کو پڑھا اور تتمیم کلام کے لئے اس کے قبل کی آیات کو بھی پڑھ دیا تھا۔

اشارہ غیبی:

پڑھتے ہی خیال آیا کہ یہ جو تین آیتیں اس وقت خود بخود منجانب اللہ تلاوت ہو گئیں تو عجب نہیں کہ اشارہ غیبی ہو اس بات کی طرف کہ انہیں تین آیتوں کو اس سفر میں بیان کیا جائے تو پہلی آیت انما اموالکم واولادکم فتنۃ تو سیولی میں بیان ہو گئی اس کے بعد دوسری آیت فیروز آباد میں بیان ہوئی اور وہ وہاں کے مناسب معلوم ہوئی یہ اخیر کی آیت رہ گئی دہلی کیلئے جس کو میں نے اس قوت تلاوت کیا تھا قصد ان آیتوں کے اختیار کرنے کے متعلق تو اس اشارۂ غیبی کے بعد میں یہ سمجھا کہ شاید میری وہ رائے چندہ کے متعلق بیان نہ ہو مناسب نہ ہو گی گو وہ میری رائے مصالحہ پر مبنی تھی مگر اشارہ غیبی کے سامنے سب مصالح گرد ہیں اسی لئے میں نے چندہ کو جز و مقصود قرار دے کر بیان شروع کیا اور دوسری آیات کو نہیں تلاوت کیا اور اس آیت سے بظاہر پہلے مقصود کا پتہ بھی نہیں معلوم ہوتا چنانچہ ترجمہ آیات سے ظاہر۔ ہے کہ اگر تم حق تعالیٰ کو اچھا قرضہ دو گے تو وہ اس کو تمہارے لئے دو چند کر دیں گے اور تمہاری مغفرت فرماویں گے اور حق تعالیٰ شانہ قدر دان ہیں صاحب حلم ہیں جاننے والے ہیں پوشیدہ ظاہر کے غالب صاحب حکمت ہیں اس ترجمہ کو سن کر ہی آپ نے اندازہ کر لیا ہو گا کہ وہ پہلا مقصود یعنی ازالہ شبہات اس میں کہیں مذکور نہیں۔ مگر میں آپ

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

محض رعایت الفاظ کی مقصود ہے۔ پس غضب ہے کہ خدا تعالیٰ کے کلام میں اس قسم کے شبہات کئے جاتے ہیں اور یوں چاہتے ہیں کہ حق تعالیٰ کا برتاؤ ہمارے ساتھ غیروں کا سا ہو۔

قرآن پاک میں باوجود طرز شفقت کے ترتیب:

پس اس تقریر سے یہ بات واضح ہوگئی کہ کلام میں ترتیب کا ہونا ضروری نہ تھا۔ لیکن حق تعالیٰ کی قدرت ہے کہ باوجود طرز شفقت کے اختیار کرنے کے پھر بھی ترتیب اس کے کلام میں موجود ہے ہم لوگ اس سے عاجز ہیں مخلوق کے کلام میں اگر طرز شفقت ہوگا تو ترتیب نہ ہوگی اور ترتیب ہوگی تو شفقت کا انداز نہ ہوگا بلکہ باضابطہ کلام ہوگا مگر یہ کلام الٰہی ہی کی شان ہے کہ باوجود کامل انداز شفقت کے پھر بھی کلام موتیوں کی لڑی ہے کہ کہیں بے ربط نہیں چنانچہ جو کتابیں وجہ ربط میں تصنیف ہوئی ہیں ان کے مطالعہ سے یہ بات بخوبی معلوم ہو سکتی ہے۔ اس تقریر سے میرا مقصود یہ ہے کہ بوجہ شفقت کے کلام اللہ میں ہر جگہ جامعیت ہے۔ چنانچہ ان آیات میں بظاہر ان شبہات کا جواب نہیں معلوم ہوتا جن کے ازالہ کا اس وقت قصد ہے لیکن غور کرنے سے معلوم ہو جائے گا کہ اس آیت میں ظاہراً قرضہ کی ترغیب دی ہے لیکن دوسرے جزو سے بھی کلام اللہ خالی نہیں ہے چنانچہ میں ان آیتوں سے دونوں کو بیان کروں گا اور یہ قدرتی بات ہے کہ آیت میں ان دونوں مقصود کی ترتیب بدل گئی ہے جو چیز میرے خیال میں مقدم تھی (یعنی جواب شبہات) وہ آیت میں موخر ہے اور تابع ہے اور جو چیز میرے ذہن میں موخر تھی (یعنی ترغیب چندہ) وہ آیت میں مقدم ہے اور متبوع ہے مگر قدرت کا مقابلہ کرے کون جب اشارہ غیبی اسی طرح ہے تو سر آنکھوں پر ہے اسی ترتیب سے دونوں کو بیان کروں گا تو یہ تھا وہ قصہ جو ان آیات کے متعلق من جانب اللہ پیش آیا۔

چندہ مانگنے سے عوام کی گرانی کا سبب:

اور اس سے یہ بھی معلوم ہو گیا ہوگا کہ چندہ کے متعلق قصداً بیان کرنے کا خیال نہ تھا اس لئے امید ہے کہ لوگوں پر گراں بھی نہ ہوگا۔ اور اگر اب بھی گرانی ہو تو گویا اشارات غیبی پر گرانی ہو رہی ہے کیونکہ سب کو معلوم ہے کہ میں قصداً مال کے متعلق بہت کم بیان کرتا ہوں کیونکہ اس سے سامعین پر گرانی ہوتی ہے لیکن جب حقیقی صاحب مال کی طرف اشارہ ہے کہ مال کے متعلق بیان کیا جائے تو پھر کیوں نہ ہو یہ ساری گرانی اسی لئے ہوتی ہے کہ ہم اس کو اپنا مال سمجھے ہوئے ہیں، حالانکہ یہ بالکل غلط ہے۔

ہر شئی دراصل ملک خداوندی ہے:

یہ سب ملک خداوندی ہیں جو ہمارے ہاتھوں میں امانت ہیں جن کی آمد وصرف میں ہم بالکلیہ مختار نہیں بلکہ مثل امین کے ہیں کہ جہاں سے لینے کا حکم ہو گیا وہاں سے لے سکتے ہیں اور جہاں صرف کرنے کا حکم ہوگا اسی جگہ صرف کر سکتے ہیں۔ ذرا انصاف کیجئے کہ ایک شخص کی زمین ہو اسی کے بیل ہوں، اسی کا تخم ہو تو پیداوار کسی کی ہوگی ظاہر ہے مالک زمین کی ہوگی پھر اگر وہ اس میں سے خرچ کرنا چاہیں اور نوکر کا جی دکھے تو یہ حماقت ہی نہیں اگر نوکر کو گرانی ہو تو اس سے پوچھا جائے گا کہ کیا زمین تمہاری ہے یا بیل تمہارے ہیں یا تخم تمہارا ہے۔ جب کچھ بھی تمہارا نہیں تو مالک کے حکم کے خرچ کرنے میں جان کیوں نکلتی ہے۔ بعینہ یہی مثال ہماری ہے کہ یہ اموال جو ہمارے ہاتھ میں ہیں درحقیقت ہمارے نہیں کیونکہ زمین کو ہم نے نہیں پیدا کیا وہ خدا تعالیٰ کی پیدا کی ہوئی ہے۔ پانی ہم نے نہیں برسایا خدا ہی کی رحمت سے بارش ہوتی ہے۔ آفتاب ہم نے نہیں بنایا جس کی تپش سے کھیتی پکتی ہے۔ بیل وغیرہ ہمارے پیدا کئے ہوئے نہیں جن سے ہل جوت کر تخم پاشی کرتے ہیں۔ تخم ہمارا پیدا کیا ہوا نہیں پھر پیداوار ہماری کدھر سے ہوگئی وہ بھی خدا ہی کی ملک ہوگی ہم صرف اس کے نوکر ہیں جو اس کے حکم کے مطابق اس میں تصرف کرنے کے مامور ہیں۔ چاندی اور سونا معدن سے نکلتا ہے جس کی تکوین میں ہم کچھ بھی نہیں کرتے۔ حق تعالیٰ شانہ، اپنی قدرت سے معدن میں ان چیزوں کو پیدا فرما دیتے ہیں ہم وہاں تخم پاشی بھی جا کر نہیں کرتے تو وہ بھی خدا کی ملک ہیں۔ اگر آپ کہیں کہ ہاتھ پیر تو ہمارے جو کام ہم ان سے کرتے ہیں وہ ہماری ملک ہونی چاہئیں تو سمجھو کہ حقیقت میں یہ بھی حق تعالیٰ ہی کی ملک ہیں اسی طرح وہ قوت جس کے ذریعہ سے آپ کام کرتے ہیں وہ بھی بالکل آپ کے اختیار سے باہر ہے خدا تعالیٰ پر کسی کا زور نہ تھا کہ وہ آپ کو قوت عطا ہی فرماتے ممکن تھا کہ آپ کو اپاہج پیدا کرتے یہ بھی ممکن تھا کہ آپ کو ہاتھ پیر عطا ہی نہ فرماتے لنجا منڈا پیدا کر دیتے تو پھر یہ ہاتھ پیر بھی انہیں کی ملک ہوئے ہمارا تو کچھ بھی نہ ہوا۔ اب آپ سمجھیں گے کہ جو شخص اموال کو اپنی ملک سمجھتا ہے وہ احمق ہے ہمارے اعمال بدنی بھی جیسے کہ نماز روزہ ہماری ملک نہیں کیونکہ یہ بدن کے کھیت کی پیداوار ہیں جب کھیت ہمارا نہیں تو پیداوار ہماری کہاں سے ہو جائے گی۔ آپ ناز کرتے ہیں کہ ہم تجارت کرتے ہیں کھیتی کرتے ہیں اس قدر غلہ ہماری ملک ہے اس قدر روپیہ ہمارا مملوک ہے لیکن یہ دیکھا جائے گا کہ جن چیزوں کے ذریعہ سے یہ حاصل ہوئے ہیں یہ کس کی ملک ہیں تب حقیقت معلوم ہوگی تو حالت یہ ہے۔۔

تو دادی ہمہ چیز و من چیز تست

(تو نے سب چیزیں عطا فرمائیں اور میری سب چیزیں آپ کی ہیں)۔

اس لئے ارشاد فرماتے ہیں۔

ولا یحسبن الذین یبخلون بما اتٰھم اللّٰہ من فضلہ ھو خیراً لھم بل ھو شر لھم سیطوقون ما بخلوا بہ یوم القیمۃ وللّٰہ میراث السموات والارض واللّٰہ بما تعملون خبیر

ترجمہ یہ ہے کہ جو لوگ ان چیزوں کے ساتھ بخل کرتے ہیں جو اللہ تعالیٰ نے (محض) اپنے فضل سے ان کو عطا کی ہیں وہ اس بخل کو اپنے لئے اچھا نہ گمان بلکہ یہ ان کے لئے (بہت) برا ہے قیامت کے دن ان کو یہی چیزیں جن ساتھ بخل کرتے تھے طوق (گردن) بنادی جائیں گی (کیونکہ) اللہ تعالیٰ کے لئے ہے آسمان و زمین کی میراث اور اللہ تعالیٰ تمہارے کاموں پر خبردار ہے۔ صاف صاف فرمارہے ہیں کہ جو کچھ آسمان زمین میں ہے سب اللہ تعالیٰ ہی کی ملک ہے۔

اموال اور اعمال کی نسبت ہماری طرف کرنے کا سبب:

اور یہ جو کہیں اموال اور اعمال کی اضافت ہماری طرف کردی گئی ہے یہ صرف ہمارا جی خوش کرنے کے فرمادیا گیا ہے کہ یہ تمہاری چیز ہے۔ نیز انتظام تمدن کے لئے یہ نسبت لگادی گئی ہے کیونکہ اگر نسبت بھی نہ ہوتی تو میری ٹوپی آپکے ہاتھ میں ہوتی اور آپ کا عمامہ میرے ہاتھ میں ہوتا تو اس صورت میں انتظام کیونکر ہوتا جو چیز آپ کے ہاتھ میں وہ بھی خود خدا کی جو میرے ہاتھ میں وہ بھی خدا کی اور بندے خدا کے سب برابر تو اب انتظام کیسے ہوتا اس لئے حق تعالیٰ نے ایک گونہ نسبت ہمارے ساتھ ان چیزوں کی فرمادی تاکہ نظام عالم درست رہے جب اس نسبت کے ہوتے ہوئے یہ حالت ہے کہ دن رات مقدمات کچہریوں میں بھر مار رہتی ہے تو عدم نسبت کی حالت میں تو کیا کچھ نہ ہوتا۔ غرض یہ نسبت محض مجازی ہے جو بمصلحت قائم کی گئی ہے حتیٰ کہ جن چیزوں سے اسباب ظاہری کے اعتبار سے بھی یہ نسبت زائل ہوجاتی ہے وہاں بھی انتظام کیلئے ایک نہ ایک نسبت باقی رہتی ہے۔

اوقاف میں تصرف کے لئے متولی کی اجازت ضروری ہے:

مثلاً اوقاف میں کہ ظاہری اسباب کے اعتبار سے بھی وہ کسی کی ملک شمار نہیں ہوتے مگر ان

میں بھی تصرف کی عام اجازت نہیں بلکہ متولی کی اجازت کی ضرورت ہے تو یہاں ایک نسبت متولی کی طرف رکھی گئی ہے اگر چہ وہ مالکانہ نہیں بلکہ منتظمانہ ہے مگر نسبت تو ہے کہ یہاں تک کے مکان موقوفہ میں ہر شخص جا کر نہیں رہ سکتا جب تک متولی کی اجازت نہ ہو حتیٰ کہ اگر کوئی محلہ کی مسجد کو از سر نو بنانا چاہے تو بدوں اجازت اہل محلہ کے جائز نہیں یہ نسبت اوقاف میں بھی اسی لئے قائم کی گئی ہے تا کہ تمدن خراب نہ ہو ورنہ مال وقف پر ہمیشہ فوجداریاں ہوا کرتیں۔ وہ کہتا میں رہوں تم کہتے میں رہوں خوب فساد بڑھا کرتا متولی کے مقررہ ہونے سے یہ فساد رفع ہو گیا۔

شریعت اللہ کی بڑی رحمت ہے:

اور یہاں سے آپ کو معلوم ہو گیا ہو گا کہ اگر شریعت نہ ہوتی تو نری حقیقت ہی ہوتی جیسے کہ آجکل کے صوفی کہتے ہیں کہ شریعت کوئی چیز نہیں بس حقیقت اصل ہے اور یہ لوگ تو نہ حقیقت کو سمجھیں نہ شریعت کو لیکن خیر اگر مان بھی لیا جائے تو شاہ صاحب کی مصیبت آجائے گی کیونکہ۔

فی الحقیقت مالک ہر شے خداست

حقیقت کی رو سے ہر چیز اللہ تعالیٰ کی ہے شاہ صاحب کا کچھ بھی نہیں تو چار ہی روز میں میاں بھوکے ننگے نظر آنے لگتے' ساری حقیقت کھل جاتی یہ شریعت ہی کی بدولت شاہ صاحب بنے پھر رہے ہیں کہیں جبہ ہے کہیں دستار تو کیا غضب ہے جس ہنڈیا سے کھائیں اسی میں چھینک کریں ان کی بعینہ وہ مثال ہے

یکے بر سر شاخ و بن می برید   خداوند بستاں نگہ کرد و دید

کہ شاخ پر بیٹھے ہوئے ہیں اور پھر یہ ضد کہ اسی شاخ کی جڑ کاٹ رہے ہیں۔ بھلا اس احمق سے کوئی یہ تو پوچھے کہ جب ڈالا ہی کٹ جائے گا تو یہ کہاں سے بچ جائے گا یہ بھی تو گرے گا، یہی حال ہمارے شاہ صاحبوں کا ہے کہ شریعت ہی کی بدولت تو چین کریں اور پھر اسی کی جڑ کاٹیں یہ نہیں سمجھتے کہ اگر آج شریعت نہ ہو تو ہم بھی نظر نہ آئیں گے اور یہی معنی ہیں۔

مولانا کے اس قول ؎

سر پنہاں است اندر زیر و بم   فاش اگر گویم جہاں برہم زنم

لوگ اس کے معنے جانے کیا سمجھتے ہوں گے بعض تو اس کو ایک شاعرانہ مبالغہ سمجھتے ہیں کہ بھلا ایسی بھی کوئی بات ہو سکتی ہے کہ اس کے کہنے سے عالم میں آگ لگ جائے ہم تو جس مضمون کو چاہیں بیان کر دیں گے کہیں بھی آگ نہ لگے یہ لوگ مولانا کا مطلب نہیں سمجھتے مطلب یہ ہے کہ اگر میں راز

توحید کو صاف صاف بیان کردوں کہ کوئی چیز کسی کی بھی ملک نہیں سب خدا تعالیٰ ہی کی ملک ہے ہے تو عالم درہم برہم ہوجائے اس لئے راز توحید کو صاف صاف نہیں کہتا۔ شریعت کی آڑ لے کر کہتا ہوں کہ نسبت بھی کوئی چیز ہے اور اس نسبت کو شریعت میں اس درجہ قوت دی گئی ہے کہ حق تعالیٰ نے اپنے معاملہ میں بھی اس کو محفوظ رکھا ہے یعنی اس تقریر سابق کا تو خلاصہ صرف اس قدر تھا کہ نظام عالم درست رکھنے کے لئے یہ نسبت مجازیہ قائم کی گئی ہے حقیقت میں سب خدا کی ملک ہیں۔

حق تعالیٰ شانہ کی شفقت عجب شان:

تو اس تقریر کا مقتضا یہ تھا کہ مخلوق کے باہمی تعلقات میں تو وہ نسبت محفوظ رہتی مگر جب خدا سے معاملہ ہوتا تو وہ گم ہوجاتی۔ لیکن کا ٹھکانا ہے شفقت کا کہ حق تعالیٰ اپنے معاملات میں بھی اس نسبت کو محفوظ رکھتے ہیں فرماتے ہیں۔

ان اللّٰہ اشتری من المؤمنین انفسھم و اموالھم بان لھم الجنۃ ۔

کہ خدا تعالیٰ نے مسلمانوں سے ان کی جان و مال کو جنت کے بدلے خرید لیا ہے تو دیکھئے اپنے کو مشتری کو قرار دیا اور خریدنے والا ظاہر ہے کہ پہلے سے مالک نہیں ہوتا گویا یوں فرماتے ہیں کہ جان و مال سب تمہارے ہیں ہے مگر ہمارے ہاتھ فروخت کردو اللہ اکبر آپ نے شفقت خداوندی کو دیکھ لیا ایسی شفقت کسی کو بھی ہوسکتی ہے ہرگز نہیں اس جگہ عارفین نے ایک نکتہ خوب بیان فرمایا ہے کہ حق تعالیٰ نے جو اپنے آپ کو خریدار ٹھہرایا اس کو سن کر عوام تو خوش ہوئے کہ اس جان و مال کے بدلے بڑی دولت ہم کو ملے گی۔

کلام اللہ کا عارفین پر اثر:

مگر اہل تحقیق اس آیت کو سن کر شرمندہ ہوگئے کہ حق تعالیٰ اپنی مملوک جان اور مال کو ہماری جان و مال فرماتے ہیں اس سے شرمندہ اس لئے ہوئے کہ ہم لوگ ان چیزوں کو چونکہ اپنا سمجھتے ہیں حق تعالیٰ نے بھی اسی کے موافق کلام فرمایا اور پردہ پوشی کی ہمارے خیال کی غلطی ظاہر کر کے ہم کو رسوا نہیں فرمایا فضیحت نہیں کیا بلکہ رحمت سے اس خیال کو بظاہر صحیح کردیا کہ ہاں یہ جان و مال تمہارا ہی ہے ہم اپنا نہیں کہتے مگر تم اس کو جنت کے بدلے ہمارے ہاتھ بیچ ڈالو عارفین پر یہ اثر ہوا اس آیت کا جس سے مارے شرمندگی کے ان کے سر اوپر نہیں اٹھتے اور اس سے حق تعالیٰ کی محبت و معرفت ان کو اور زیادہ ہوگئی۔

مجازی نسبت میں حکمت:

بہرحال اب سمجھ میں آگیا ہوگا کہ اس مجازی نسبت میں یہ حکمت ہے ورنہ حقیقت میں سب خدا ہی کی ملک ہے مال بھی اور جان بھی بلکہ جان کے حاصل کرنے میں تو ہمارا کچھ بھی دخل نہیں شاید کوئی نو تعلیم یافتہ فرمائیں کہ ماں باپ کا دخل ہے کہ اگر ان دونوں کا اجتماع نہ ہوتا تو جان کہاں سے آتی مگر عاقل جانتا ہے کہ ماں باپ کا دخل صرف اقتران میں ہے پھر اس کی خلقت بالکل انکے اختیار سے باہر ہے چاہے بچہ پورا ہو یا ادھورا اس میں ان کا کچھ اختیار نہیں۔

ثبوت وجود باری تعالیٰ پر ایک لطیفہ:

مجھے ایک لطیفہ اپنے ماموں صاحب کا یاد آیا کہ وہ ایک مدرسہ میں ملازم تھے وہاں ایک ممتحن لامذہب آیا اور بچوں سے پوچھا کہ خدا تعالیٰ کے وجود کی کیا دلیل ہے ماموں صاحب نے کہا بچوں سے کیا پوچھتے ہو مجھ سے پوچھو اس نے کہا آپ ہی بتلایئے۔ انہوں نے جواب دیا کہ دلیل یہ ہے کہ تم نہ تھے اور ہو گئے۔ اس نے کہا کہ ہم کو تو ہمارے ماں باپ نے پیدا کیا ہے، انہوں نے کہا کہ اگر سلسلہ ختم نہ ہو تسلسل لازم آئے گا اور وہ محال ہے اور اگر سلسلہ ختم کرو گے تو اس کو کس نے پیدا کیا اس کا تو کچھ جواب اس سے نہ بن پڑا کہنے لگا کہ یہ منطقی دلائل نہیں جانتے موٹی بات یہ ہے کہ ہمارے ایک آنکھ ہے تو اس سے کہو کہ ہماری آنکھ درست کر دے۔ ماموں صاحب بڑے ظریف تھے آسمان کی طرف منہ اٹھا کر ذرا دیر کے بعد کہنے لگے میں نے خدا تعالیٰ سے کہا تھا انہوں نے فرمایا کہ میں نے آنکھ بنا دی تھی اس نے ہمارے وجود کا انکار کیا مجھ کو غصہ آیا میں نے آنکھ پھوڑ دی اب اسی سے کہو کہ اپنے ماں باپ سے بنوالے وہ بہت بگڑا مگر کچھ کر نہیں سکا خیر میں نے یہ قصہ اس تائید میں بیان کیا تھا کہ جان کے بارہ میں کسی کا کوئی دخل نہیں اس لئے جان بھی حق تعالیٰ ہی کی ملک ہے۔

خودکشی کے حرام ہونے کا راز:

اور یہی راز اس کا کہ خودکشی حرام ہے اس لئے کہ جان ہماری ملک نہیں خدا تعالیٰ کی ملک ہے اس میں ناجائز تصرف کا ہم کو اختیار نہیں اسی لئے مال میں بھی ہر قسم کا تصرف جائز نہیں ہر جگہ صرف کرنے کے ہم مجاز نہیں کیونکہ ہم محض تحویلدار ہیں مالک و مختار نہیں لیکن اتنا فرق ہے کہ دنیا میں اگر کوئی خزانچی ہوتا ہے تو خزانچی کو کم ملتا ہے اور تحویل ساری گورنمنٹ یا مالک ہوتی ہے

اور یہاں اگر دس لاکھ آپ کی تحویل میں ہیں تو مشکل سے ایک ایک لاکھ کی تقسیم کا حکم فرمایا گیا ہوگا اور نو لاکھ پورے آپ ہی کو دیدیئے کہ اپنے صرف میں لاؤ اسی سے تو دھوکہ ہوا کہ ہم یوں سمجھ بیٹھے کہ یہ ہمارا مال ہے اگر تھوڑا سا آپ کو دیکر سارا لے لیا جاتا تو اس وقت آنکھیں کھلتیں کہ ہم مالک نہیں تحویلدار ہیں اب اس رحمت سے دھوکہ میں پڑ گئے اور جو لوگ شریف النفس ہوتے ہیں وہ تو رحمت سے اور پگھل جاتے ہیں اور ہماری یہ حالت ہے

چو با سفلہ گوئی بلطف وخوشی فزوں گردش کبر و گردن کشی

(جب کسی بدذات سے بات کرتے ہیں لطف وخوشی سے تو وہ تکبر اور غرور سے کہیں بڑھ جاتا ہے)

فضول خرچی کی عجیب مثال:

تو ہم کو یہ زعم ہو گیا کہ ہماری چیز ہے اور پھر اس کو رنڈی بھڑوں پر افتخار واشتہار موقع پر خرچ کر دیتے ہیں چنانچہ اسی وقت میں بعض لوگوں نے فضول موقع پر دس دس ہزار روپے دے دیئے اور دینی چندہ کے موقع پر مشکل سے سو دیئے ہوں گے ان لوگوں نے دو غلطیاں کیں ایک تو یہ کہ خرچ کے موقع پر دیتے ہوئے ان کے قلب پر گرانی ہوتی ہے دوسرے فضول موقعوں پر خوب خرچ کرتے ہوئے دل پر ہرگز گرانی نہ ہوئی کہ اس کو اپنا سمجھا ورنہ اگر خدا کا مال سمجھتے تو دینی مواقع میں خرچ کرتے ہوئے دل پر ہرگز گرانی نہ ہوتی کیونکہ جب مالک کا اس جگہ خرچ کرنے کا حکم ہے تو کیونکہ خزانچی کو اپنا دل دکھانے کا کیا حق ہے اور ناجائز موقعوں میں صرف کرنے کی ہرگز ہمت نہ ہوتی کیونکہ خزانچی کو کب جائز ہے کہ بلا اجازت مالک کے اس کی ناراضی کے موقع میں صرف کرے۔ پس نہ تو ہر جگہ خرچ کرنا چاہئے اور نہ موقع پر گرانی ہونی چاہئے۔

لا اسراف فی الخیر کا مفہوم:

ایک بزرگ کی یہ حالت تھی کہ جو کچھ آتا خرچ کر ڈالتے تھے ایک دوسرے بزرگ نے ان کو لکھا لاخیر فی الاسراف انہوں نے اس کے جواب میں لکھا لا اسراف فی الخیر حاصل یہ ہے کہ موقع دیکھنا چاہئے جہاں سارا مال دینے کا موقع ہو سب دو کہ وہ خیر ہے جہاں ممانعت ہو وہاں رکو کہ ممانعت کا خلاف خیر نہیں ہے۔ غرض ہمارے پاس ایک قانون ہے اس کے موافق کرو اس قانون کی ایک دفعہ یہ بھی ہے کہ سارا مال خرچ کرنے کے بعد دیکھنا چاہئے کہ آپ کہاں سے

کھائیں گے اگر صاحب توکل ہے اس کو سب خرچ کر دینا جائز ہے اور اگر صاحب توکل نہیں بلکہ سارا مال خرچ کر کے کل کو بھیک مانگنا پڑے گی ایسے شخص کو سارا مال خرچ کرنا جائز نہیں۔

غربا خلوص سے چندہ دیتے ہیں:

اور یہ اسراف کا مسئلہ ہمارے بھائیوں کو دینی خرچ کے موقع پر سوجھتا ہے اپنے اخراجات میں کوئی بات اسراف ہی نہیں سمجھتے کیا یہ اسراف نہیں کہ گاڑھا ایک شخص پہن سکتا ہے اور اس کی اسی قدر حیثیت ہے پھر بھی وہ اچکن پہنے دال گوشت کھانے کی حیثیت ہے مگر کباب اور پلاؤ کے بغیر چین ہی نہیں یہ تو اسراف نہیں اور خدا کے رستہ میں پچاس ہزار میں سے پچاس روپے دینا بھی اسراف ہے لوگ آج کل فضول اخراجات کے لئے قرض اور وہ بھی سودی قرض تک لیتے ہیں یہ تو اسراف میں داخل نہیں اور دینی کام کے لئے موجودہ مال سے بھی کچھ نکالنا اسراف ہو گیا۔ یہ لوگ اول تو دینی کام میں کچھ دیتے ہی نہیں او جو دیتے بھی ہیں تو محض وضعداری سے خلوص بہت کم ہوتا ہے۔ صاحبو! خلوص تو غرباء میں ہوتا ہے۔ میرٹھ میں ایک غریب پستاری عورت نے دو دو پیسے کر کے کچھ روپیہ جمع کیا تھا اور اس نے دینی موقع پر دے دیا میرا یہ مطلب نہیں کہ آپ بھی سب دیدیں۔ لیکن ذرا اتنا غور کر لیجئے کہ اگر اس وقت میں آپ کے بیٹے کی شادی پیش آجائے تو آپ کا کتنا خرچہ کریں گے۔ پس اسی سے جواب سمجھ لو کہ اس موقع پر کتنا خرچ کرنا چاہئے۔ اگر آپ بیٹے کی شادی میں پانچ سو روپے خرچ کرتے تو اس موقع پر چار سو پچاس ہی دیجئے کیا خدا کا اتنا بھی حق نہیں کہ حالانکہ حقیقت میں سب کچھ اسی کا ہے۔ اور صاحبو اگر کسی کو مفت دینا گراں ہو تو اس کو چاہئے کہ اللہ کی راہ میں قرض ہی دیدے۔

چندہ کی گرانی دور کرنے کا طریقہ:

اول تو گرانی اس کو ہوگی جس کو دین سے محبت نہیں محب اسلام کو تو گرانی نہیں ہو سکتی اور اگر کسی کو ہو تو اس کے رفع کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ اپنے جی کو سمجھا لے کہ میں تو قرض دے رہا ہوں ایسی جگہ جہاں سے وصولیابی کی امید ہے روپیہ جمع کرنے سے قرض چلا دینا بہتر ہے کیونکہ اگر آپ کے پاس رہا یا سو تو جمع کرو گے اس میں حفاظت کرنی پڑے گی یا تجارت میں لگاؤ گے سو اگر تجارت میں لگا سکو تو خیر لیکن جو روپیہ جمع ہی کرنا پڑے اس کا قرض دے دینا بہتر ہے کہ آپ حفاظت سے بچ گئے اور اس کے ذمہ روپیہ واجب ہو گیا کہ بروقت ضرورت مل جائے گا بعض بزرگوں کا تو معمول یہ رہا ہے کہ کچھ رقم قرض دینے کیلئے الگ کر لیتے تھے۔ یعنی صدقہ وخیرات تو کرتے ہی تھے۔

قرض کی فضیلت:

قرض دینے کی فضیلت سن کر ایک رقم قرضہ علیحدہ کر دیتے تھے کیونکہ قرض دینے کی فضیلت صدقہ سے زیادہ ہے ابن ماجہ میں حدیث ہے کہ حضور علیہ السلام نے جنت کے دروازے پر لکھا دیکھا کہ قرض میں ایک کے عوض اٹھارہ ملیں گے حضور علیہ السلام نے جبریل سے پوچھا کہ اے جبریل یہ کیا بات ہے کہ قرضہ کا ثواب صدقہ سے زیادہ کیا اچھا جواب دیا کہ صدقہ تو شخص بھی لے لیتا ہے جس کو ضرورت نہ ہو اور قرض وہی لیتا ہے جس کی جان پر آبنی ہو تو ایسے شخص کی امداد زیادہ فضیلت ہے صاحبو! اس وقت نہ معلوم کتنے اللہ کے بندے ہوں گے جن کی جان پر بن رہی ہے مگر ہمیں کیا ہم تو آرام سے دونوں وقت کی کھاتے پیتے ہیں اور رات کو سو رہتے ہیں

اے ترا خارے بپا نشکستہ کے دانی کہ چیست　　حال شیرانے کہ شمشیر بلا بر سر خورند

(اے وہ شخص جس کے پاؤں میں کانٹا بھی نہیں لگا ان شیروں کا حال کیا جان سکتا ہے جو کہ اپنے سروں پر مصیبت کی تلوار کے زخم پر زخم کھائے جاتے ہیں)

مصیبت زدہ کی تکلیف کا اندازہ ناز پروردہ کیسے کر سکتا ہے تو ایسے لوگوں کو اول تو مفت امداد دینی چاہئے اور اگر کسی پر یہ گراں ہو تو میں سہل طریقہ بتلاتا ہوں کہ قرض ہی سے ان کی امداد کرو۔

قرضہ اصطلاحی:

اگرچہ اس آیت میں ان تقرضوا اللہ قرضاً حسنا سے یہ قرضہ اصطلاحی مراد نہیں بلکہ مراد اس سے صدقہ خیرات ہے کیونکہ خداوند تعالیٰ کو قرض دینا یہی ہے کہ اس کے بندوں کو بالکل مالک بنا دیا جائے واپس نہ لیا جائے لیکن اگر کسی کو اتنی ہمت نہ ہو تو قرضہ اصطلاحی ہی دے دو اور بطور عموم مجاز اس کو بھی اس میں داخل کیا جا سکتا ہے کیونکہ اصلی مقصود تو انفاق ہے تو قرض سے اللہ کی راہ میں خرچ کرنا مراد لیا جائے خواہ بطریقہ تملیک ہو یا بطور قرض ہو تو قرضہ کی فضیلت کا راز آپ کو اس حدیث ابن ماجہ سے معلوم ہو گیا ہو گا اور اٹھارہ کے عدد کی تعیین کا راز بھی میں جمعہ کو بیان کر چکا تھا اب پھر بتلاتا ہوں کہ یہ عدد بظاہر تعجب انگیز ہے کہ نہ دس نہ بیس برابر صدقہ کے ہوتا تو دس ہونا چاہئے تھا دو گنا ہوتا تو بیس کا عدد ہونا چاہئے تھا تو یوں سمجھ میں آتا ہے کہ اصل عدد تو بیس ہوتا ہے کیونکہ قرض والا بہت ہی حاجت مند ہوتا ہے ایسے شخص کی امداد صدقہ لینے والے سے مضاعف فضیلت رکھتی ہے مگر چونکہ وہ روپیہ پھر لوٹ آوے گا اس لئے دو عدد کہ روپیہ کا مضاعف ہے ثواب

سے کم ہو گئے باقی اللہ جانے تو قرضہ کی رغبت تو آپ کو زیادہ ہونی چاہئے کیونکہ اول تو اس میں ثواب اور فضیلت زیادہ ہے دوسرے وہ مال لوٹ آئے گا تو دنیا بھی لیجئے اور آخرت بھی لیجئے ایسی تجارت ہے کہ سرمایہ بھی بعینہ لوٹ آیا اور نفع بھی زیادہ سے زیادہ مل گیا کیا ٹھکانا ہے کہ ثواب بھی رہا اور وہ قرضہ بھی آ گیا اور لوٹ کر آوے گا بھی اس طرح کہ اس کا نفع آخرت میں المضاعف فرماویں گے اور گناہ معاف فرماویں گے۔ حاصل یہ ہے کہ خدا تعالیٰ کی رحمت بہت عجیب ہے۔ دنیا میں قاعدہ یہ ہے کہ جس سے رنجش ہوتی ہے اس سے معاملہ نہیں کیا کرتے بلکہ ایسے شخص سے معاملہ کرتے ہیں جو نافرمان آپ کا نہ ہو حق تعالیٰ شانہ، گناہ گاروں نافرمانوں سے بھی معاملہ فرماتے ہیں چنانچہ اس آیت میں ارشاد ہے کہ اگر تم اللہ کو قرض حسن دو گے تو اس کو المضاعف کردیں گے اور تمہارے گناہ معاف کردیں گے تو خطاب گنہگاروں ہی کو تو ہے۔

خوب کہا ہے۔

کہ مستحق کرامت گنہگارانند

اور اس سے زیادہ عجیب بات یہ ہے کہ دنیا میں تو اگر کوئی خطا کر کے معافی چاہتا ہے تو صرف خطا معاف کر دیتے ہیں انعام و اکرام کوئی نہیں دیا کرتا بلکہ معاف کر دینے ہی کو بہت بڑا انعام سمجھتے ہیں حق تعالیٰ شانہ، صدقہ و توبہ کے بعد گنہگاروں کے گناہ بھی معاف فرمادیتے ہیں اور انعام بھی دیتے ہیں یعنی ثواب چنانچہ جابجا غفور کے ساتھ رحیم بھی وارد ہوا ہے۔ اس سے خدا کی رحمت تو دیکھئے اور ثواب بھی کس قدر یہ نہیں کہ جتنا خرچ کیا تھا اسی کے برابر بلکہ بڑھا کر دیتے ہیں رہی یہ بات کتنا بڑھا کردیں گے تو یضاعف سے شاید آپ نے دونا سمجھا ہوگا یہ نہیں بلکہ مضاعف کے معنی مطلق بڑھانے کے ہیں خواہ دونا ہو یا اس سے بھی زیادہ اس جگہ سے دونے سے زیادہ کو بھی یہ لفظ شامل ہے۔

راہ خدا میں خرچ کی مثال:

کیونکہ دوسری آیت میں اس کی مثال اس طرح بیان فرمائی ہے۔ **مثل الذین ینفقون اموالھم فی سبیل اللہ کمثل حبۃ انبتت سبع سنابل فی کل سنبلۃ مائۃ حبۃ واللہ یضاعف لمن یشاء واللہ واسع علیم۔**

ترجمہ:۔ جو لوگ اللہ کے رستے میں مال خرچ کرتے ہیں ان کے مال کی ایسی مثال ہے جیسی ایک دانہ سے سات خوشہ پیدا ہوں اور ہر خوشہ میں سو سو دانہ ہوں تو اس آیت سے معلوم

ہوگا کہ ایک چیز دینے سے سات سو حصے اس کے آخرت میں ملیں گے اس کے بعد ارشاد ہے۔
واللہ یضاعف لمن یشاء کہ حق تعالیٰ جس کو چاہتے ہیں اس سے بھی زیادہ دیتے ہیں حدیث میں اسکی زیادہ توضیح ہے کہ اگر ایک چھوارہ اللہ کی راہ میں خرچ کیا جائے تو حق تعالیٰ شانہ، اس کی پرورش فرماتے ہیں اور بڑھاتے رہتے ہیں یہاں تک کہ احد پہاڑی کی برابر کر کے اس شخص کو دیں گے اس حدیث کو ہم لوگ پڑھتے ہیں مگر غور نہیں کرتے غور کر کے دیکھئے اگر احد پہاڑ کے تم ٹکڑے ٹکڑے کرنے لگو چھوارہ کے برابر تو وہ ٹکڑے کس قدر ہوں گے اور خصوصاً اگر ٹکڑے چھوارہ کی جسامت کے برابر نہ کئے جاویں بلکہ چھواراہ کے وزن کے برابر لئے جاویں تو احد پہاڑ چونکہ پتھر یا اس کا ذرا سا ٹکڑا وزن میں چھوارہ کے تو احد پہاڑ چونکہ پتھر ہے اس کا ذرا ٹکڑا وزن میں چھوارہ کے برابر ہو جائے گا تو اس صورت میں تو اور بھی زیادہ ٹکڑے ہوں گے۔ تو اس حدیث سے معلوم ہو گیا کہ تضاعف سات یا سات کے مضاعف تک محدود نہیں اور یہ بات سب کو معلوم ہے کہ اکثر ایسے موقع میں مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس مثال سے سمجھ لو اور حقیقت میں وہ ثواب اس سے بھی زیادہ ہوتا ہے تو احد ٹکڑوں کے ساتھ بھی ثواب محدود نہیں تو دیکھئے یہ حساب کہاں تک پہنچتا ہے اسی کو فرماتے ہیں مولانا

خود کہ یابد ایں چنیں بازار را	کہ بیک گل میخری گلزار را
نیم جاں بستاند و صد جاں دہد	انچہ در وہمت نیاید آں دہد

(ایسا بازار کہاں پاؤ گے کہ ایک پھول کے بدلے چمن ہی کو خرید لو۔ حقیر اور فانی مالی لیتے ہیں اور جان باقی عطا کرتے ہیں جو تمہارے وہم گمان میں بھی نہیں آیا وہ عطا کرتے ہیں)

حضرت یہ تو مال بھی اور جان بھی سب انہی کی ہے وہ مفت مانگیں تب بھی سب قربان کر دینا چاہئے تھا چہ جائیکہ اس قدر ثواب کا وعدہ بھی ہے

ہم چوں اسماعیل پیشش سر بنہ	شاد و خنداں پیش تیغش جاں بدہ
ہر کہ جاں بخشد اگر بکشد رواست	نائب ست و دست او دست خداست

(حضرت اسماعیلؑ کے مانند اپنے سر جھکا دو۔ اس کی تلوار کے سامنے ہنسی خوشی جان دے دو جو جان بخشتا ہے اگر وہ قتل کرے جائز ہے، وہ نائب ہے اس کا ہاتھ خدا کا ہاتھ ہے)

جب نائب کا یہ حق ہے تو اصل کا کیا کچھ ہوگا تو حضرت ہم چیز ہی کیا ہیں ہمارا مال ہی کیا ہے وہ اس کو قبول ہی فرمالیں تو بڑی عنایت ہے اس لئے ہمت کر کے بخوشی اللہ کے رستہ میں دینا

چاہئے۔ اور اگر آج دریغ کرو گے تو قطع نظر اس کے باز پرس ہوگی۔

مرنے کے بعد راہ خداوندی میں خرچ شدہ مال کام آئیگا:

آپ سے یہ مال چھوٹنے والا ہے آپ مر جائیں گے دوسروں کے کام آئے گا۔ حق تعالیٰ تمہارے نفع کی تدبیر بتلا رہے ہیں کہ موت کے بعد بھی یہ مال تمہارے ہی پاس رہے گا۔ حدیث شریف میں ہے کہ حضور ﷺ نے صحابہؓ سے خطاب کر کے فرمایا کہ وہ کون شخص ہے جس کو وارث کا مال اپنے مال سے زیادہ پیارا ہو صحابہؓ نے عرض کیا کہ یارسول اللہ ﷺ ایسا تو ہم میں کوئی بھی نہ ہو گا۔ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جو شخص مال کو جمع کرتا ہے اور اللہ کے راستہ میں خرچ نہیں کرتا یہاں تک کہ وہ مال اس سے چھوٹ جاتا ہے اور اس کے وارث کو ملتا ہے اس شخص کو وارث کا مال اپنے مال سے زیادہ پیارا ہے (اگر اس کو اپنا مال پیارا ہوتا تو اللہ کی راہ میں خرچ کرتا کہ بعد الموت اس کا ثواب اس کو ملتا) صاحبو! میرا مطلب یہ نہیں کہ سارا ہی مال خرچ کر دو اور ورثہ کے لئے کچھ بھی نہ چھوڑو کہ وہ بعد تمہارے ننگے بھوکے رہیں اس کی بھی حدیث میں ممانعت آئی ہے بلکہ مقصود کہنے سے یہ ہے کہ اس معیار کو پیش نظر رکھو کہ اگر اس وقت آپ کے بیٹے کی شادی ہونے لگے تو آپ کتنا خرچ کریں اور خدا کے کام میں تو اس سے زیادہ خرچ کرنا چاہئے اور کم از کم اتنا تو ضرور خرچ کرنا چاہئے اب میں مضمون کو طول دینا نہیں چاہتا دوسرے مضمون کو شروع کرتا ہوں اور اس میں اختصار یا تطویل خدا کے قبضہ میں ہے ممکن ہے کہ جلدی ختم ہو جائے۔ اب میں اس مضمون کو کھڑے ہو کر بیان کروں گا حق جل وعلا شانہ، نے اس مضمون ترغیب قرضہ کے بعد اس مقام پر اپنی چند صفتیں بیان فرمائی ہیں ان سے وہ مضمون رفع شبہات کا نکلتا ہے جس کو میں اب بیان کروں گا اور آیات کے اخیر میں جو حق تعالیٰ کی صفات مذکور ہوتی ہے ہیں کہ یہ تمام مضمون سابق کا نچوڑ ہوتا ہے اور وہ ماقبل کے ساتھ اس طرح مرتبط ہوتے ہیں کہ مضمون سابق کی علت کی طرح ہوتے ہیں۔ نیز مضمون سابق میں جو شبہات پیدا ہوتے ہیں ان جواب ان صفات سے ہو جاتا ہے۔

شکور حلیم کا مفہوم:

تو ارشاد فرماتے ہیں واللہ شکور حلیم اگر تم حق تعالیٰ کو قرض حسن دو گے تو تمہاری مغفرت کر دیں گے اور اس کو الضاعف کر دیں گے (کیونکہ) اللہ تعالیٰ قدرداں ہیں (قدرتی دانی تو ظاہر ہے کہ اس سے زیادہ اور کیا قدر دانی ہوگی اس کی تفصیل ابھی بیان ہو چکی ہے اس کے بعد

فرماتے ہیں حلیم کہ وہ بردبار ہستی ہیں یہ صفت اس لئے بیان فرمائی کہ طاعت میں جو کوتاہی ہو جاتی ہے اس پر نظر نہیں فرماتے بوجہ حلیم ہونے کے دوسرے یہ کہ بعض لوگ ایسے بھی تو ہیں جو طاعت کرتے ہی نہیں بلکہ معاصی میں مبتلا ہیں تو اہل طاعت کی قدر فرماتے ہیں اور اہل معاصی سے حلم اور بردباری فرماتے ہیں کہ ان کو جلدی سزا نہیں ملتی تو حلیم بڑھا کر اہل معاصی کو متنبہ کر دیا کہ سزا نہ ملنے سے یہ نہ سمجھیں کہ وہ مستحق سزا نہیں بوجہ حلم کے ان کو جلدی سزا نہیں ملتی پھر کسی وقت یعنی آخرت میں سزا دیں گے اور کبھی تھوڑی سی سزا دنیا میں بھی دیدیتے ہیں۔ اور ایک نکتہ اسی وقت سمجھ میں آیا ہے، بہت عجیب بات ہے وہ یہ کہ شکور حلیم کو طاعت و معاصی دونوں کے اعتبار سے نہ مانا جائے بلکہ صرف ایک ہی امر کے متعلق مانا جائے یعنی طاعت ہی کے متعلق دونوں صفتوں کو قرار دیا جائے۔ مطلب یہ ہے کہ حق تعالیٰ شانہ، تمہاری اطاعت کو بوجہ قدردانی اور حلم کے قبول کر لیتے ہیں کیونکہ ہماری طاعت کے دو پہلو ہیں ایک تو یہ کہ وہ ہماری طاعت ہے اور ناقص ہیں تو اس لحاظ سے اس کو گستاخی کہا جائے تو عجیب نہیں اور

ہماری اطاعت کی عجیب مثال:

میں اس کو ایک مثال سے عرض کرتا ہوں آپ کو بعض نوکر ایسے نالائق ملے ہوں گے کہ وہ موافق آپ کی طبیعت کے کام نہیں کرتے ہوں گے اس لئے کہ ان کو سلیقہ اور تمیز نہیں اگر پنکھا جھلتا ہے تو یوں معلوم ہوتا ہے کہ ابھی سر میں مار دے گا، ہر دفعہ آپ اپنے سر کو بچاتے ہیں تو اب دو موقعے پیش آتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ آپ اس کو ڈانٹ دیں اس وقت تو اسے معلوم ہو جائے گا کہ میری خدمت سے راحت نہیں پہنچی بلکہ تکلیف ہوئی ایک موقع یہ ہے کہ آپ اپنے حلم سے خاموش رہیں اس وقت وہ سمجھتا ہے کہ میں نے میاں کو ایک گھنٹہ کھڑے ہو کر پنکھا جھلا تو میں مستحق جزا و انعام کا ہوں حالانکہ یہ نہیں سمجھتا ہے کہ اس گھنٹہ بھر تک میاں کو ستایا ہے اس سے تو خالی ہی بیٹھا رہتا تو اچھا تھا اس کی خدمت گستاخی کا حکم رکھتی تھی ایسی ہی ہماری عبادت ہے کہ وہ مواقع میں عبادت اور طاعت کہنے کے لائق نہیں۔ ہمارے حضرت حاجی صاحبؒ اولٰئک یبدل اللہ سیئاتھم حسنات کی عجیب تاویل فرماتے تھے جس سے میری اس تقریر کی تائید ہوتی ہے۔ فرماتے تھے کہ اس آیت میں سیات سے ہماری طاعت مراد ہیں کہ حق تعالیٰ شانہ، اپنی رحمت سے ان طاعات کو جو کہ در حقیقت سیئات ہیں طاعات سے بدلیں گے تو نامہ اعمال میں چاہے تو یہ

تھا کہ جب ہم نماز پڑھیں ایک گناہ لکھا جاتا مگر رحمت خداوندی سے نماز ہی لکھدی جاوے گی اور بوجہ حلم کے ان کوتاہیوں پر نظر نہ ہوگی ہماری طاعت کی تو یہ حالت ہے۔

سبحہ بر کف توبہ بر لب دل پر از ذوق گناہ　　　معصیت را خندہ می آید بر استغفار ما

تو ایسی نماز پر ثواب تو ثواب اگر مواخذہ نہ ہو اور جان بچ جائے تو بسا غنیمت ہے۔

طاعتم گر سبب و موجب غفران نہ شود　　　راضیم گر ندہ دے علت عصیاں نہ شود

(میری اطاعت اگر بخشش کا سبب موجب نہ بنے ہیں اس پر میں راضی ہوں کہ میرے گناہوں کی علت نہ بن جائے)

اور یہ مذاق کچھ معتقدین صوفیہ کا تراشا ہوا نہیں سلف کا بھی یہ مذاق تھا، احادیث سے صحابہ کے مذاق کا جو پتہ چلتا ہے وہ اسی کے موافق ہے صحاح میں روایت موجود ہے کہ حضرت عمرؓ کی گفتگو ہوئی تھی ابو موسیٰ اشعری کے ساتھ اور گفتگو یہ تھی کہ آپس میں ایک نے دوسرے سے پوچھا کہ ہم نے جو اعمال کئے ہیں۔ حضور ﷺ کے سامنے اور آپ کے بعد ان کی بابت کیا خیال ہے۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ ہماری تمنا تو یہ ہے کہ جو کچھ حضور ﷺ کے سامنے کیا ہے وہ تو مقبول ہو جائے اور حضور ﷺ کے بعد جو کچھ کیا ہے اس پر مواخذہ نہ ہو تو بسا غنیمت ہے انہیں حضرات کی شان میں یہ آیت ہے یؤتون ما اتوا وقلوبھم وجلة انھم الی ربھم راجعون یعنی وہ ایسے لوگ ہیں کہ دیتے ہیں جو اموال دیتے ہیں یا وجود دیتے ہیں جن اعمال کو وجود دیتے ہیں اس حال میں کہ ان کے دل خدا کے پاس جانے کے خیال سے خائف ہوتے ہیں تو وہ خوف کس بات کا ہوتا ہے۔ اسی کا تو کہ کہیں کوتاہی اعمال پر سوال نہ ہونے لگے کہیں بجائے ثواب کے پکڑ نہ ہونے لگے۔

حکایت حضرت سیدنا عبدالقادر جیلانیؒ:

حضرت سیدنا شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کا واقعہ شیخ سعدیؒ نے گلستان میں لکھا ہے کہ حرم میں حق تعالیٰ اس طرح عرض کر رہے تھے۔

من نہ گویم کہ طاعتم بپذیر　　　قلم عفو بر گناہم کش

(میں نہیں کہتا کہ میری نیکی قبول فرمالے بلکہ میں تو یہ چاہتا ہوں کہ میرے گناہوں پر معافی کا قلم پھیر دو۔)

تو ہماری طاعت کا تو پوچھنا ہی کیا حق تعالیٰ شانہ، کی عظمت کے سامنے تو کاملین کی طاعت

بھی بیچ میں ہیں کوئی ان کی عظمت کے لائق کیا طاعت کرسکتا ہے تو ہماری طاعات میں دو پہلو ہوئے۔ ایک یہ کہ ہم نے اپنی استطاعت کے موافق کیا دوسری یہ کہ عظمت الٰہی کے موافق نہیں کیا تو باعتبار اول فرماتے ہیں **شکور** کہ ہم قدر دان ہیں اس طاعت کو بھی جو کہ تم نے اپنی ہمت کے موافق کی ہے قبول کرلیں گے اور ثانی اعتبار سے فرماتے ہیں **حلیم** کہ گو ہماری عظمت کے لائق یہ طاعت نہیں مگر طاعت کی نقل تو ہے اور نقل کا حکم بھی اصل کا سا ہو جاتا ہے۔ جیسے کوئی مٹی کا خربوزہ بنا کر لائے اور اس کو انعام مل جائے تو حالانکہ وہ خربوزہ واقع میں نہیں مگر اس کی نقل تو ہے اچھی چیز کی نقل پر بھی انعام دیدیا جاتا ہے مگر اس سے غرور نہ کرنا چاہئے یہ سمجھتے رہنا چاہئے کہ نقل ہے۔

حکایت حضرت اورنگزیب عالمگیر اور بہروپیہ:

اس نقل پر مجھے ایک حکایت یاد آئی کہ جب عالمگیر تخت نشین ہوئے تو ایک بہروپیہ آیا جیسا کہ دستور ہوتا ہے کہ ایسے لوگ خوشی کے وقت انعام کے امیدوار ہوا کرتے تھے عالمگیر متقی شخص تھے ان خرافات کی ان کے دل میں قدر نہ تھی ایسے دینے کو اسراف سمجھتے تھے اس لئے ایک لطافت کے ساتھ دفع الوقتی کی کہ اپنا کمال دکھلا کر مستحق انعام ہو سکتے ہو تمہارا کمال یہ ہے کہ ہم تم کو نہ پہچان سکیں وہ مختلف اشکال آیا اور پہچانا گیا اتفاق سے عالمگیر کو سفر دکن کا پیش آیا اس بہروپیہ کو اطلاع ہو گئی وہ پہلے سے آگے جا کر ایک گاؤں میں صوفی بن کر بیٹھ گیا عالمگیر فقراء کی بہت تعظیم کرتے تھے راستہ میں جہاں کسی بزرگ کا نام سنتے ان کی زیارت کرتے اور نذر پیش کرتے اس گاؤں پر بھی گزر ہوا۔ (یہ حکایت کتابی نہیں سنی ہوئی ہے) معلوم ہوتا ہے کہ یہاں بھی ایک بزرگ رہتے ہیں تو اول وزیر کو بھیجا کہ ان بزرگ کو دیکھ کر آؤ کہ کیسے ہیں اس کو بھی دھوکہ ہوا کہ اس نے کہا واقعی بہت بڑے صوفی ہیں اس کے بعد عالمگیر خود گئے ان کو بھی بہت اثر معلوم ہوا اور آبدیدہ ہوگئے اور چلتے ہوئے ایک ہزار کا توڑہ پیش کیا اسنے انکار کیا بادشاہ نے بہت ہی اصرار کیا اس نے ایک نہ مانی بادشاہ اپنا سامنہ لے کر روپے ساتھ لے آئے جب عالمگیر اپنے خیمہ میں پہنچے تو پیچھے پیچھے بہروپیہ بھی پہنچا اور جھک کر سلام کیا عالمگیر نے پہچان لیا کہ اس بہروپیہ نے مجھے دھوکہ دیا۔ یہی صوفی بن کر بیٹھا تھا اور مجھے پتہ بھی نہ چلا معمولی انعام کیلئے حکم دیا اس نے سر آنکھوں پر رکھ کر قبول کئے۔ اور بادشاہ کو دعائیں دینے لگا۔ عالمگیر نے کہا کہ ہم تمہارے کمال کے قائل ہو گئے مگر ساتھ ہی حماقت کے بھی قائل ہیں ہماری سمجھ میں یہ بات نہیں آئی کہ اس وقت ہم تم کو ہزار دیتے رہے اور تم نے نہ

لئے اور اب اس سے کم پر راضی ہو گئے۔ اس نے کیا حیرت انگیز جواب دیا ہے کہ۔ حضور اگر میں اس وقت لے لیتا تو نقل ٹھیک نہ ہوتی اس وقت تو میں درویشوں کا بہروپ بنائے ہوئے تھا اس کا یہی مقتضا تھا جو میں نے کیا وہ درویش کیا جس کی ذرا سی بات پر رال ٹپک پڑے صاحبو! ہم اس بہروپیہ کے بھی برابر نہیں اس سے بھی بدتر ہیں اس نے تو اپنے بہروپ کی رعایت اس قدر کی کہ دنیا پر رات ماردی اور ہم حکم خداوندی کی بھی رعایت نہیں کرتے حرص وطمع کے مارے مال گھر میں جمع کئے ہوئے ہیں حکم الٰہی کے بعد بھی حرص کو نہیں چھوڑتے اور خرچ نہیں کرتے۔

طاعات کے دو پہلو:

خلاصہ یہ کہ ہماری طاعات میں دو پہلو تھے ایک کے اعتبار سے شکور فرمایا گیا اور دوسرے کے اعتبار سے علیم فرمایا گیا۔ آگے ارشاد فرماتے ہیں عالم الغیب والشہادۃ یعنی حق تعالیٰ جاننے والے ہیں پوشیدہ اور ظاہر کے۔ یہ اس لئے فرمایا گیا تا کہ لوگ خلوص سے اللہ کی راہ میں مال خرچ کریں کیونکہ دارومدار ثواب کا خلوص پر ہے اور خدا تعالیٰ کو دلوں کی باتوں کا علم پورا پورا ہے اس کے سامنے کوئی حیلہ بہانہ چل نہیں سکتا۔

صفات خداوندی عزیز اور حکیم کا مفہوم:

اس کے بعد ارشاد ہے العزیز الحکیم یعنی حق تعالیٰ شانہ، غالب ہیں، صاحب حکمت ہیں یہ اس لئے فرمایا کہ اجر دینے کا جو پہلے وعدہ فرمایا تھا اس پر شاید کسی کو یہ شک ہوتا کہ معلوم نہیں دیں گے بھی یا نہیں تو فرماتے ہیں کہ خدا ہر شے پر غالب ہے ان کو ایفاء وعدہ سے کوئی امر مانع نہیں اس کا وعدہ خلاف نہیں ہو سکتا اس پر پھر کسی کو یہ خیال پیدا ہو کہ جب غالب ہیں ابھی کیوں نہیں دے دیتے دیر کس لئے کی جاتی ہے اس شبہ کو حکیم سے قطع فرما دیا کہ وہ صاحب حکمت ہیں ان کا ہر کام حکمت سے ہوتا ہے اس دیر میں بھی حکمت ہے یہ تو صفات کا بیان تھا۔ اب میں عزیز حکیم سے استنباط کرتا ہوں۔ ان شبہات کا جواب جو آج کل لوگوں کو پیش آ رہے ہیں اور شبہات عجب نہیں کہ مختلف ہوں مگر سب کا مختصر جواب سن لیجئے۔

مسلمانوں کی پستی اور کفار کے غلبہ عروج کے شبہ کا جواب:

اور مختصر اس لئے کہتے ہوں کہ مطول جواب میں سامعین کی طبیعت کو انتشار ہو جاتا ہے

حاصل تمام شبہات کا یہ ہے کہ آج کل مسلمان پستی کی حالت میں ہیں اور کفار کو غلبہ وعروج ہے تو بعض لوگوں کو یہ شبہ پیدا ہوا کہ قرآن شریف میں تو ارشاد فرمایا گیا ہے۔ الا ان حزب اللّٰہ ھم الغالبون. کہ اللہ کی جماعت غالب رہا کرتی ہے۔ تو اب دیکھنا یہ ہے کہ آج کل غالب کون ہے۔ آج کل تو کفار ہی غالب ہیں تو اس سے ان کا حزب اللہ ہونا لازم آتا ہے۔ صاحبو! سمجھ لیجئے کہ یہ ارشاد الٰہی بالکل ٹھیک ہے میں آپ کو اس کا جواب سناتا ہوں اور جواب کی وجہ سے اس وقت ہمیں اپنی اور اپنے بھائیوں کی حالت کے متعلق کچھ کہنا پڑتا ہے۔ اگر چہ یہ موقع شکایت کا نہ تھا لیکن اب چونکہ خدا تعالیٰ تک اعتراض پہنچتا ہے (سبحانہ،) اس لئے مجبوراً لب کشائی کرتا ہوں۔

کیا ہم حزب اللہ کہلانے کے مستحق ہیں:

صاحبو! یہ ارشاد عالی بالکل بجا اور درست ہے مگر آپ نے جو خدا تعالیٰ پر الزام دیا تو ذرا اپنی حالت کو بھی دیکھا ہوتا کہ آپ (حزب اللہ) گروہ خداوندی بننے کے قابل بھی ہیں یا نہیں افسوس ہماری اس وقت بالکل وہی مثال ہوگئی ایک عورت کی انگلی پر بچہ کو پخانہ پھراتے ہوئے کچھ پاگخانہ لگا رہ گیا تھا اس نے اسی انگلی کو ناک پر رکھ کر چاند دیکھا تو اس وقت چاند دیکھنے کے ساتھ بدبو بھی آئی تو آپ فرماتی ہیں اوہو اب کے چاند سڑا ہوا کیوں نکلا۔ چاند میں بدبو کیوں ہوتی، اس نے اپنی خبر نہیں لی بدبو اسی میں تھی یہی بعینہ ہماری حالت ہے کہ اپنے جرائم کی نسبت خدا تعالیٰ کی طرف کرتے ہیں اور اپنے آپ کو صاف سمجھتے ہیں ہماری تو وہ حالت ہے جو مولانا فرماتے ہیں۔

حملہ برخودمی کنی اے سادہ مرد ہمچوں آں شیرے کہ برخود حملہ کرد

(اے سادہ لوح تم خود اپنے پر حملہ کرتے ہو جس طرح اس شیر نے اپنے پر حملہ کیا تھا)

تو ہم خدا پر کیا الزام رکھیں گے اپنی زبان سے اپنے ہی عیب بیان کر رہے ہیں ہماری وہ حالت ہے کہ ایک حبشی بدشکل جا رہا تھا راستہ میں آئینہ پڑا ہوا پایا، اس کو اٹھا کر جو دیکھا تو اس میں اپنی پاکیزہ صورت نظر آئی جھنجلا کر پھینک دیا اور آپ فرماتے ہیں کہ ایسا بدشکل تھا جب ہی تو کوئی پھینک گیا۔ یہی ہمارا حال ہے کہ اپنے عیوب دوسرے میں نظر آتے ہیں اور دوسرا بھی کون؟ ذات حق تبارک وتعالیٰ شانہ، ہائے افسوس۔

اپنے عیوب دوسروں میں نظر آنے کی عجیب مثال:

مجھے اس حالت پر ایک اور حکایت یاد آئی کہ ایک احمق بڈھا بیٹھا ہوا تھا اس کا بچہ روٹی کھا رہا

تھا ایک ٹکڑا لوٹے میں گر پڑا اس نے لوٹے میں سے وہ ٹکڑا نکالنا چاہا تو اسے اپنی شکل لوٹے میں نظر آئی یہ سمجھا کہ ان نے ٹکڑا چھین لیا ہے تو اس نے باپ سے شکایت کی اس نے جو لوٹے میں ہے میرا ٹکڑا چھین لیا ہے باپ صاحب جو اس لوٹے میں سے ٹکڑا نکالنے گئے تو انکو بھی اپنی صورت مع ریش مبارک پڑی تو آپ اس کو مخاطب کر کے کہتے ہیں کہ تف ہے تیری اوقات پر کمبخت اس لمبی ڈاڑھی کے ساتھ بچہ کا ٹکڑا لیتے ہوئے شرم نہ آئی۔ تو ہماری مثال ایسی احمق کی سی ہے کہ ہم خود اپنے ہی کو برا کہہ رہے ہیں اور اپنے ہی عیبوں کا پردہ فاش کر رہے ہیں ذات حق اس سے بہت برتر ہے کہ اس کی طرف ذرا بھی کسی عیب کی نسبت ہو سکے اس کی ذات تمام عیبوں سے پاک ہے ہم نے اپنے عیبوں سے یہاں تک آنکھیں بند کیں ہیں کہ کھلی ہوئی سیاہی بھی نظر نہیں آتی۔ صاحبو! ذرا اپنی مجموعی حالت کو تو دیکھو اور پھر اپنے کو خدا کا گروہ کہتے ہوئے شرماؤ۔ صاحبو! اگر آج حضور ﷺ کے وقت کا کوئی مردہ زندہ ہو جائے تو اور ہماری اس حالت کو دیکھے تو شاید وہ ہمیں مسلمان اور امت محمدیہ ﷺ بھی نہ سمجھے اس کو اس وقت کی اور اس وقت کی حالت میں زمین آسمان کا تفاوت نظر آئے گا۔ کیا صاحبو! اس وقت یہی حالت تھی ہماری آمدنی کی جو آج ہے کہ حلال وحرام کا کچھ بھی خیال نہیں۔ کیا یہی حالت تھی ہمارے اخلاق کی جو آج ہے کہ دیگر اقوام بھی دیکھ کر طعنہ دیتی ہیں۔

ما انا علیہ واصحابی کا مفہوم:

حضور ﷺ کا ارشاد ہے کہ میری امت کے بہتر فرقے ہوں گے جس میں سے جنت میں ایک جائے گا وھو ما انا علیہ واصحابی اور فرقہ وہی جو میری اور مرے صحابہ کی طرز پر ہو اور ما انا علیہ واصحابی صرف نماز روزہ کے ساتھ خاص نہیں ہے بلکہ معاشرت کو بھی عام ہے اور یہاں سے میں ایک شبہ کو رفع کرنا چاہتا ہوں وہ یہ کہ شاید کوئی صاحب اعتراض کریں کہ آج کل تو کوئی بھی ما انا علیہ واصحابی پر پورا عامل نہیں کیونکہ حضور ﷺ کے زمانہ میں یہ باریک کپڑے یہ طرز وانداز لباس کا جواب ہے۔ کہاں تھا یہ سواریاں ریل وغیرہ کہاں تھیں تو سمجھو کہ حضور ﷺ جیسے ہونے کا مطلب یہ ہے کہ حضور ﷺ کے عمل کے موافق ہو یا قول کے تو اگر ایک عمل حضور ﷺ کے عمل کے مطابق نہیں مگر قول کے مطابق ہے۔ یعنی حضور ﷺ نے قولاً اس کی اجازت دی ہے تو وہ بھی ما انا علیہ واصحابی میں داخل ہے تو اب یہ شبہ جاتا رہا ما انا علیہ واصحابی کے خلاف وہ عمل ہوگا جو نہ عمل رسول ﷺ واصحابہ کے مطابق ہو نہ قول سے اس کی اجازت نکلتی ہو جو کام دونوں کے خلاف ہوگا وہ البتہ مخالفت ما انا علیہ واصحابی کا مصداق ہوگا۔

دور حاضر کے مسلمانوں کی حالت زار:

اس کو خوب سمجھ لیجئے اس تقسیم کے بعد اب میں پھر شکایت کا اعادہ کرتا ہوں کہ کیا ہماری کوئی بھی حالت حضور ﷺ اور صحابہ کے مطابق ہے۔ لوگوں کی اب یہ حالت ہے کہ دین کے پانچ ارکان ہیں ان میں سے کوئی بھی درست نہیں سب سے پہلا جزو عقائد ہیں ان کی یہ کیفیت ہے کہ ہر طرف بدعات اور الحاد کا شیوع ہو رہا ہے اور الحاد بھی کیسا جو شرک سے بڑھ کر ہے کیونکہ شرک میں خدا تعالیٰ کے کمال کا انکار مشرکین نہیں کرتے وہ لوگ خدا کو بھی مانتے ہیں گو اس کے ساتھ دوسرے کو بھی مانتے ہیں اور اصل شرک کا منشا تعظیم حق ہی ہے مگر مشرکین کو سمجھنے میں غلطی ہوئی ہے اپنے زعم میں وہ تعظیم کرتے تھے مگر حقیقت میں اس سے اور نقص لازم آ گیا بہر حال ان کی نیت تو تعظیم کی تھی۔ بات یہ ہے کہ شرک اس لئے پیدا ہوا کہ مشرکین کے ذہن میں یہ مقدمہ جم گیا کہ چھوٹی چھوٹی اور معمولی چیزیں کا حق تعالیٰ سے مانگنا خلاف ادب ہے اس لئے ایک خدا ایسا بھی ہونا چاہئے جس سے چھوٹی چیزیں مانگی جاویں مگر بے وقوف یہ نہ سمجھے کہ جس کو ہم بڑی چیز سمجھتے ہیں حق تعالیٰ کے نزدیک بھی اس چھوٹی ہی کے برابر ہے وہاں تو ہر کام ذرا سے اشارہ میں ہوتا ہے کیا چھوٹا کیا بڑا تو اگر چھوٹی چیز کا مانگنا بے ادبی ہے تو بڑی کا بھی مانگنا خلاف ادب ہوگا کیونکہ یہ فرق ہمارے اعتبار سے ہے قدرت کے سامنے سب برابر ہیں رسول ﷺ اس خیال کی جڑ ہی کاٹ دی ارشاد فرماتے ہیں کہ جوتے کا تسمہ ٹوٹے تو بھی خدا سے مانگو نمک بھی حق تعالیٰ سے مانگو اس میں یہی راز ہے کہ خدا تعالیٰ کے نزدیک سلطنت اور نمک سب برابر ہیں سب ان سے ہی مانگو بہر حال عظمت کی حفاظت کے قصد سے شرک پیدا ہوا۔ اگر چہ اس سے حفاظت ہوئی نہیں تو مشرک گو سب سے بدتر ہے مگر اس نے عظمت خداوندی کو تو مانا۔

اہل سائنس فطرت ہی کو فاعل مانتے ہیں:

اور آج کل ایسا الحاد پھیلا ہے کہ بعض خدا ہی کے منکر ہیں یا اگر اس کو مانتے ہیں تو بالکل بے کار سمجھتے ہیں یعنی اس وقت سائنس کا ایسا شیوع ہوا ہے کہ اکثر مسلمانوں کے دلوں میں اسکے مسائل جمے ہوئے ہیں زیادہ تر تو تعلیم یافتہ جماعت اس کی گرویدہ ہے اور سائنس میں قدرت کا صاف انکار ہے کیونکہ اس کا مسئلہ ہے کے خلاف فطرت کچھ ہو سکتا فطرت کے خلاف محال ہے گویا فطرت ہی کو فاعل مانتے ہیں خدا کوئی چیز نہیں تو عقائد کی تو یہ کیفیت ہے کہ ان میں جو عقیدہ

اصل الاصول ہے یعنی توحید اور وجود صانع عالم کا اقرار اسی میں آج کل لوگ متردد ہیں ۔ رہا دوسرا حصہ رسالت کا تو اس میں بھی سخت کوتاہی کی جارہی ہے۔ حضور ﷺ کے ارشادات پر نکتہ چینیاں ہوتی ہیں رسول اللہ ﷺ کی جو عظمت ہونی چاہئے تھی کہ آپ کے ارشادات کو سر آنکھوں سے قبول کیا جاتا آج کل اس کا پتہ نہیں غضب ہے کہ ہر شخص دین میں رائے دینا چاہتا ہے کیا عظمت رسول اللہ ﷺ اسی کا نام ہے جن لوگوں کی عظمت قلوب میں ہے جیسے کہ بادشاہان دنیا ان کے احکام میں نکتہ چینیاں کرتے ہوئے ہم نے کسی کو نہیں دیکھا رہی قیامت تو اس کا تو شاید خواب ہی آ گیا ہوگا بعض کو اسی میں بھی شک ہے اور دوسرا حصہ اعمال کا ہے۔ سو دیکھ لیجئے کہ مردوں میں سے نمازی کتنے ہیں، پھر نمازیوں کے گھر جا کر دیکھ لیجئے کہ گھر میں نمازی کتنے ہیں نہ بیوی نمازی ہے نہ نوکر اور جوان سے کہا جائے کہ تنبیہ کرو تو کہتے ہیں ہم نے بہت سمجھایا کوئی مانتا ہی نہیں میں کہتا ہوں کہ اگر کھانے میں گھر والے نمک تیز کر دیا کریں تو کیا وہاں بھی ایک دفعہ کہنے کے بعد خیال کر لیا ہے کہ بہت سمجھا دیا نہیں مانتے جو جانے دو وہاں ایک دفعہ کہہ کر کوئی بھی خاموش نہیں ہوتا بلکہ ڈنڈا لے کر تیار ہو جاتے ہیں تو کیا نماز پر بھی کبھی ناخوشی ظاہر کی ہے اس کہنے کو کہنا نہیں جاتا۔ یاد رکھو اسی کا مواخذہ آپ سے بھی ہوگا۔ اور زکوۃ تو شاید ہی دیتے ہوں وہاں تو یہی خیال رہتا ہے چالیس ہزار میں سے ایک ہزار نکلیں گے اور جو لوگ دیتے بھی ہیں تو بعض ان میں سے بڑی چالا کیاں کرتے ہیں۔

کان پور میں ایک شخص یہ کیا کرتے تھے کہ ہنڈیا میں روپے بھر کر اوپر سے اناج بھر دیتے تھے اور ایک غریب آدمی کو دیدی اور پھر اس سے خود ہی خرید لی زکوۃ بھی اس طرح ادا ہو جائے گی اور روپیہ گھر کا گھر ہی میں رہے گا۔ بعض لوگ حج کرنے نہیں جاتے کہ تجارت کے کاروبار سے فرصت نہیں۔ افسوس دنیا میں اس درجہ انہماک ہوا ہے کہ فریضہ اسلام کی بھی پرواہ نہیں ہے معاملات ان کی تو ایسی گندی حالت ہے کہ خدا کی پناہ کوئی ایک آدھا آدمی ایسا ہوگا جو کہ سود سے بچتا ہو آج کل سود اس کو سمجھتے ہیں کہ ایک روپیہ دے کر سوا روپیہ لیا جاوے۔

بیع فاسد کی تمام صورتیں سود ہیں:

یاد رکھو بیع فاسد کی تمام صورتیں سودی ہیں بیگ آ جانے پر مال کا بیچنا یہ بھی سود ہے اور ناجائز۔ سینکڑوں مسلمان ایسا کرتے ہیں میں نے قریب ہی بیان کیا تھا۔

آج کل معاملات میں حلال وحرام کی کوئی تمیز نہیں:

حلال وحرام کا معیار آج کل یہ رہ گیا ہے کہ جس کھانے میں گھی زیادہ ہو حلال ہے ورنہ حرام استغفر اللہ یہ بھی کچھ کم جہالت ہے۔ صاحبو! آپ خوب سمجھتے ہیں اور جانتے ہیں کہ معاملات میں کبھی کوئی شخص علماء سے رجوع نہیں کرتا صرف وکیلوں سے قانونی سوال وجواب کر کے تسلی کر لیتے ہیں اگر آپ نے کبھی کوئی گاؤں خریدا ہوگا تو اس کا مسودہ کسی وکیل سے تو لکھوالیا ہوگا مگر کسی عالم سے پوچھنے کی نوبت نہ آئی ہوگی۔ غرض معاملات میں آج کل حلال وحرام کی کوئی بھی تمیز نہیں کیونکہ اس کو دین سے خارج سمجھ کر رکھا ہے۔ دین صرف نماز روزہ کو سمجھ رکھا ہے۔

آج کل کی ساری معاشرت کا خلاصہ:

اس کے آگے معاشرت ہے کہ آج کل اس کی حالت تو نور علی نور ہو رہی ہے ساری معاشرت کا خلاصہ اور حاصل یہ ہے کہ غیر قوموں کی تقلید پر فخر کیا جاتا ہے اٹھنے بیٹھنے میں کھانے پینے میں وضع میں لباس میں یہاں تک کہ لہجہ میں بھی غیر قوموں کی تقلید کی جاتی ہے اگر کوئی حدیث من تشبہ بقوم فھو منھم پڑھ دے تو متعصب کہتے ہیں میں کہتا ہوں کہ من تشبہ بقوم فھو منھم تو تمام عقلاء کے نزدیک مسلم ہے اس کا انکار کوئی کر ہی نہیں سکتا اور اگر ایسا نہیں ہے تو ذرا آپ اپنی بیگم صاحبہ کا لباس تو پہن کر مجمع میں چلے آئیے اگر اور بھی کچھ نہیں تو کم از کم زنانے پن کا خطاب تو ہر طرف سے مل ہی جائے گا تو اگر کسی نے آپ کو کافروں کا لباس پہنے ہوئے دیکھا کر ان کے مشابہ کہہ دیا تو کیا ظلم کیا۔

اخلاق حسنہ کا نام ونشان مسلمانوں میں مٹ رہا ہے:

اخلاق کی حالت یہ ہے کہ جو اچھے اخلاق تھے ان کا نام ونشان مسلمانوں سے مٹتا جاتا ہے۔ اخلاص شکر وصبر توکل حمیت غیرت تواضع، مروت، ہمدردی، رحم، ایفاء وعدہ یہ اخلاق حسنہ ہیں۔ ہمارے اندر ان کی بجائے ریا، فخر، تکبر، حسد، کینہ، بخل، خلاف وعدگی اور جھوٹ وغیبت رہ گئے ہیں تو دین کے پانچ اجزاء تھے عقائد عبادات، معاملات ومعاشرت واخلاق پانچوں کی یہ حالت ہے جو میں نے عرض کی، پھر ہم نے اپنے کو اللہ کی جماعت بتلاتے ہیں اور مستحق بنا چاہتے ہیں عزت وترقی وغلبہ کے اور جب پستی ہوتی ہے تو سوال کرتے ہیں کہ یہ وعدہ الٰہی کے خلاف کیوں ہوا کیا۔ اب بھی ہمارا منہ سوال کا ہے حزب اللہ ایسے ہی ہوتے ہوں گے۔

ہمارا کونسا وقت گناہ سے خالی ہے:

میں بقسم کہتا ہوں کہ اگر ہم پر پکڑ میں کمی ہو تو یہ تعجب کی بات ہے اگر ایک جرائم پیشہ اگر دس سال تک بچا رہے تو اس پر تعجب ہو سکتا ہے نہ اس کی گرفتاری پر مگر آج کل ہمارے بھائی مسلمانوں پر جن میں میں بھی داخل ہوں جب کوئی مصیبت آتی ہے تو آپس میں یوں کہا کرتے ہیں کہ خدا جانے ہم کس گناہ میں پکڑے گئے افسوس بجائے اس کے کہ یوں کہتے اللہ اکبر حق تعالیٰ کس قدر حلیم ہیں کہ بہت دنوں کے بعد پکڑا۔ الٹی اپنی براءت ظاہر کرتے ہیں کہ خدا جانے ہم کس گناہ میں پکڑے گئے۔ ارے ظالم گناہ سے خالی ہمارا کونسا قوت گزرتا ہے۔ ہم کو تو اگر روٹی ملے تو تعجب ہونا چاہئے۔ تندرستی رہے تو حیرت کی بات ہے اور مواخذہ پر تو تعجب ہونا ہی نہ چاہئے۔ اگر اس پر یہ اشکال کیا جائے کہ اس سے تو لازم آتا ہے کہ حزب اللہ (اللہ کا گروہ) کبھی دنیا میں ہوا ہی نہ ہو کیونکہ انبیاء اور اولیا پر بھی مصائب آئے تھے تو کیا وہ بھی گناہ کی بدولت ہے۔

مصیبت کی صورت:

اس کا جواب یہ ہے کہ واقعی حقیقی مصیبت جب آتی ہے گناہ ہی کی وجہ سے آتی ہے باقی ان حضرات پر مصیبت کی صورت ہوتی ہے حقیقت مصیبت ان میں موجود نہیں ہوتی ان کو اس میں ایک لطف آتا ہے بھلا مصیبت میں بھی کسی کو لطف آیا ہے وہ ان کے امتحان اور رفع درجات کے لئے صورۃ مصیبت ہوتی ہے اور جہاں صحابہ کرام یا اولیاء اللہ سے پریشانی کی مصیبت کا پتہ چلتا ہے وہاں اس سے بھی کوئی لغزش ہوئی ہے چنانچہ غزوہ احد میں حضور ﷺ نے ایک جماعت تیر اندازوں کی ایک جگہ متعین فرما دی تھی جب وہ غنیمت کے لئے وہاں سے ہٹ گئے تو شکست ہوگئی۔ اسی لئے ارشاد فرماتے ہیں قل ھو من عند انفسکم انما استزلھم الشیطان ببعض ما کسبوا۔ یعنی جو کچھ واقعہ شکست غزوہ احد میں ہوا یہ تمہاری طرف سے ہوا۔ شیطان نے ان کو پھنسا دیا بوجہ بعض گناہوں کے تو ایک جماعت نے حضور ﷺ کے ارشاد پر عمل نہیں کیا تھا اس کے وبال میں صحابہؓ گرفتار ہو گئے۔ اور اس کا دوسرا جواب بھی ہے مگر یہی جواب کافی ہے۔

مسلمانوں کی پستی کا اصلی سبب:

اور اگر یہ شبہ کیا جائے کہ جو لوگ آج کل ترقی اور عروج و غلبہ پائے ہوئے ہیں وہ کون سے

اللہ کی جماعت ہیں ان کو غلبہ کیوں حاصل ہوا تو سمجھو کہ یہ شبہ بالکل غلط ہے اس کو طالب علم خوب جانتے ہیں کہ اس آیت میں یوں ارشاد فرمایا ہے جو اللہ کی گروہ ہے وہ غالب ضرور ہوگی یہ نہیں فرمایا کہ جو غالب ہو وہ اللہ کی گروہ ہے جو اس کی ایسی مثال ہے کہ ہم یوں کہیں کہ ہر انسان جاندار ہے یہ بات صحیح ہے مگر اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ ہر جاندار انسان ہو جائے بہت سے جاندار انسان نہیں جیسے گھوڑے، گدھے، تو انسان ہونے کے لئے تو جاندار ہونا لازم ہے مگر جاندار ہونے کے لئے انسان ہونا لازم نہیں۔ طالب علمی اصطلاح میں کہا جائے گا کہ کل انسان حیوان سے کل حیوان انسان لازم نہ آئے گا تو کسی جماعت کے عروج اور غلبہ سے یہ نہیں سمجھا جا سکتا کہ وہ اللہ کی جماعت ہے ہاں جو اللہ کی جماعت سچی ہوگی وہ ضرور غالب ہوگی مگر ہم ایسے ہیں کہاں اب رہا یہ سوال کہ اچھا اس میں کیا حکمت ہے کہ کفار کو عروج غلبہ دیدیا گیا جب وہ خدا کے باغی ہیں اور سرکش ہیں تو ان کو یہ عزت کیوں حاصل ہوئی تو اس کی وجہ یہ ہے کہ آپ اپنی حالت کو ذرا غور سے دیکھئے کہ آپ کے ساتھ دو قسم کے لوگ تعلق رکھتے ہیں ایک دوست دوسرے دشمن دوستوں سے ذرا سی بات پر رنج ہو جاتا ہے اور دشمن کے ذرا سے ہنر کی قدر ہوتی ہے جب یہ قاعدہ سمجھ میں آگیا تو اب سنئے کہ جو لوگ حق تعالیٰ شانہ، کے ساتھ مدعی محبت ہیں ان سے ذرا سی بات میں عتاب ہو جاتا ہے اور کفار باغی ہیں ان کی ذرا سی خوبی پر انعام ہو جاتا ہے اب دیکھئے کہ کوئی مسلمان ایسا نہیں جس میں کوئی معصیت نہ ہو اور کوئی کافر ایسا نہیں جس میں کوئی نہ کوئی خوبی نہ ہو اور ان کی جزا کی بابت یہ قانون ہے۔ من کان یرید الحیوۃ الدنیا و زینتھا نوف الیھم اعمالھم فیھا وھم فیھا لا یبخسون اولئک الذین لیس لھم فی الاخرۃ الا النار وحبط ماصنعو فیھا وباطل ما کانو ایعملون۔

جو شخص (اپنے اعمال خیر سے) محض حیات دنیوی (کی منفعت) اور اس کی رونق (کا حاصل کرنا) چاہتا ہے تو ہم ان لوگوں کے (ان) اعمال (کی جزاء) ان کو اس (دنیا) ہی میں پورطور سے بھگتا دیتے ہیں اور ان کے لئے اس دنیا کچھ کمی نہیں ہوتی۔ یہ ایسے لوگ ہیں کہ ان کے لئے آخرت میں بجز دوزخ کے اور کچھ (ثواب وغیرہ) نہیں اور انہوں نے اس (دنیا) میں جو کچھ کیا تھا وہ (آخرت میں سب کا سب،) نا کارہ (ثابت) ہوگا اور (واقع میں تو) جو کچھ کر رہے ہیں وہ اب بھی بے اثر ہے۔ کہ دنیا کو مقصود بالذات سمجھتے ہیں۔ ان کے اعمال کا بدلہ ان کو دنیا ہی میں پورا کر دیا جاتا ہے۔ ان لوگوں کے لئے آخرت میں سوائے جہنم

کے کچھ نہیں اور مسلمانوں کے لئے ارشاد ہے۔ اعد اللہ لھم جنت تجری من تحتھا الانھار (کہ ان کے واسطے اللہ تعالیٰ نے جنت تیار کر رکھی ہے تو ان کا اجر تو موجود ہے آخرت میں اور کفار میں جو خوبیاں اور بھلے کام ہیں ان کا اجر دنیا میں موعود ہے تو ان کو یہاں غلبہ و عزت دے دی جاتی ہے کیونکہ آخرت میں ان کا کچھ نہیں اور مسلمانوں کی جو طاعات ہیں ان کا اجر آخرت میں موعود ہے اور معصیت کا اثر کبھی دنیا میں بھی پہنچ جاتا ہے۔

مسلمانوں پر نزول مصائب کا سبب:

اس لئے کبھی ان پر معاصی کے مصائب بھیج دی جاتی ہیں مگر یہ یاد رکھا جائے کہ انجام متقین ہی کے لئے اچھا ہوتا ہے کہ کیونکہ ارشاد فرماتے ہیں والعاقبۃ للمتقین تو کسی معصیت اور ذلت سے گھبرانا نہ چاہئے بلکہ یہ سمجھنا چاہئے انشاء اللہ اس کا انجام ہمارے لئے اچھا ہوگا اور یہ جواب تو اس قوت جبکہ یہ پستی اور ذلت بوجہ معاصی کے مانی جائے مگر مصیبت کبھی دوسری وجہ سے بھی آتی ہے یعنی رفع درجات کے لئے اس کو خوب سمجھ لیجئے کیونکہ مولویوں پر یہ بھی اعتراض ہے کہ وہ تو کہتے ہیں کہ مصیبت بوجہ گناہ کے آتی ہے حالانکہ ہم بزرگوں کو بھی مبتلائے مصیبت دیکھا ہے۔ تو بات یہ ہے کہ مولوی یہ نہیں کہتے کہ صورت مصیبت بھی ہمیشہ معاصی ہی کے سبب سے آتی ہے بلکہ وہ یہ کہتے ہیں کہ صورت مصیبت معصیت کی وجہ سے بھی آتی ہے اور اس باب میں ان کی دلیل یہ ہے مااصابکم من مصیبۃ فبما کسبت ایدیکم ۔ اور تم کو (اے گناہ گارو) جو کچھ مصیبت پہنچتی ہے تو وہ تمہارے ہی ہاتھوں کے کئے کاموں سے (پہنچتی ہے) لیکن اس کے مخاطب اہل معاصی ہیں صلحاء اس کے مخاطب نہیں۔

صلحاء کو رفع درجات کیلئے مصائب میں مبتلا کیا جاتا ہے:

حاصل کلام یہ ہوا کہ خطا کا پرتو مصیبت گناہ کی وجہ سے آتی ہے اور صلحاء پر اس لئے آتی ہے۔

زاں بلاہا کانبیا برداشتند
سر بہ چرخ ہفتمیں افراشتند

(انبیاء نے اسی طرح مصائب برداشت کئے ساتوں آسمان سر پر اٹھائے)

حضرات اخر بھی ہے انبیاء کون ہیں ان سے زیادہ حق پر کون ہوگا۔ لیکن ان پر بھی مصائب صوریہ نازل ہوئے ہیں کہ ایک تاریخ میں ستر ستر نبی شہید ہوئے ہیں اگر آپ اس وقت ہوتے تو مولویوں کی جان کھا جاتے۔ پس یاد رکھئے کبھی تو مصیبت سے عقوبت اور سزا مقصود ہوتی ہے

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

دونوں باتوں کو ذکر فرمایا ہے کہ تمہاری مغلوبیت میں چند حکمتیں تھیں اور کفار کا غلبہ ان کے اہل حق ہونے کی دلیل نہیں۔

ان یمسسکم قرح فقد مس القوم قرح مثله وتلک الایام نداولها بین الناس ولیعلم الله الذین امنو ویتخذ منکم شهداء والله لا یحب الظلمین ولیمحص الله الذین امنو ویمحق الکافرین ام حسبتم ان تدخلوا الجنة ولما یعلم الله الذین جاهدوا منکم ویعلم الصابرین ○ یعنی اگر تم کو کوئی زخم لگا ہے تو تمہارے مخالفوں کو بھی اس جیسا زخم لگ چکا ہے اور ان ایام کو ہم لوگوں میں نوبت بنوبت پھیرتے رہتے ہیں (اور تمہاری اس مصیبت میں حکمت یہ تھی کہ) حق تعالیٰ شانہ مومنوں کو جانچ لیں اور تم میں سے بعض کو شہید بنا دیں اور حق تعالیٰ شانہ، ظالموں کو نہیں چاہتے،۔ اور تاکہ مسلمانوں کو منافقوں سے الگ کر دیں اور کافروں کو مٹا دیں آیا تم نے یہ گمان کر لیا ہے کہ تم جنت میں ابھی سے داخل ہو جاؤ اور حق تعالیٰ نے مومنوں کو اور صابرین کو جانچا بھی نہیں۔

مصیبت کی عجیب حکمت:

واللہ مصیبت کی عجیب حکمت بیان فرمائی مسلمانو! یہ مصیبت ظاہر میں مصیبت ہے ورنہ حقیقت میں راحت ہے۔ کیونکہ اسکی بدولت سب کو دین کی طرف توجہ ہو گئی ہے۔ اس راز کو جو سمجھ گئے ہیں وہ بلاؤں پر خوش ہوتے ہیں۔

ناخوش تو خوش بود بر جان من　　　　دل فدائے یار دل رنجان من

(آپ کی ناخوشی خوشی میری جان پر ہے دل تو محبوب ہی کا ہے)

بس زبون وسوسہ باشی دلا　　　　گر طرب را باز دانی از بلا

(تم بالکل وسواس سمجھے جاؤ گے اگر محبوب کے طرب وبلا میں فرق سمجھو گے)

عارف شیرازی صبر کی فضیلت میں فرماتے ہیں

باغباں گر پنج روزے صحبت گل بایدش

حق تعالیٰ نے مصیبت کی ایک حکمت یہ بھی بیان فرمائی ہے ویعلم الصابرین یعنی تاکہ مصیبت کی وجہ سے صابرین غیر صابر سے ممتاز ہو جائیں اور حق تعالیٰ اپنے صابر بندوں کو جانچ لیں صاحبو! اگر ہمیشہ راحت ہی رہا کرے تو صبر کا کونسا موقع ہوگا۔

باغباں گر پنج روزے صحبت گل بایدش | بر جفائے خار ہجراں صبر بلبل بایدش
اے دل اندر بند زلفش از پریشانی منال | مرغ زیرک چوں بدام افتد تحمل بایدش

(اے باغ کے مالی اگر تو چند روز کے لئے پھول کی صحبت میں رہنا چاہتا ہے تو جدائی کے کانٹوں کے ظلم پر تجھ کو صبر بلبل اختیار کرنا چاہیے۔ اے دل محبوب کی زلف کی قید میں پھنس کر پریشان ہو کر مت چیخ عقلمند پرندہ جب جال میں پھنس جاتا ہے تو اس کو صبر برداشت سے کام لینا چاہیے۔

اور اگر کسی کو اپنے علم و عمل پر ناز ہو کہ بلا میں استبعاد ہونے لگے تو اس کے لئے فرماتے ہیں

تکیہ بر تقوی و دانش در طریقت کافری ست | راہرو صد ہنر دارد ہم توکل بایدش

(تقوی اور عقل بھروسہ طریقت میں کفر ہے۔ رہرو کے پاس اگر سو ہنر بھی ہوں تب بھی اسے توکل کرنا چاہیے)

تو صاحبو! کیا یہ تھوڑی بات ہے کہ حق تعالیٰ مصیبت بھیج کر آپ کو صابر بنانا چاہتے ہیں کیا آپ کو خدا کی رحمت سے مایوسی ہوگئی ہے کیا یہ خیال ہے ہمیشہ یہی حال رہے گا۔ دیکھئے صاحب ملک خدا کا ہے آپ کون ہیں رائے دینے والے کہ یہ ہو وہ نہ ہو جبکہ نوکر کو آپ کے معاملات میں دخل دینے کا اختیار نہیں تو آپ کو خدا تعالیٰ کے معاملات میں دخل دینے کا کیا اختیار ہے آپ کا تو کام یہ ہے کہ جب مصیبت آئے اپنے اعمال پر نظر کیجئے اور ان میں جو کوتاہی ہوگئی ہے اس کی اصلاح کیجئے یہ کیا خرافات ہے کہ مصیبت کے وقت بجائے اپنی اصلاح کے خدا کی شکایات کرنے لگے۔ مولانا فرماتے ہیں۔

غم چو بینی زود استغفار کن | غم بامر خالق آمد کار کن
ہرچہ برتو آید از ظلمات وغم | آں زبیبا کی و گستاخی است ہم

(جب تجھ کو کوئی تکلیف آئے جلد تو بہ استغفار کر کیونکہ اللہ کے حکم سے تکلیف آتی ہے تجھ پر جو بھی ظلمات و غم آئیں وہ بھی ہماری بے باکی و گستاخی کے سبب ہیں)

اب نفس شبہات تو بحمد اللہ تعالیٰ سب رفع ہو گئے مگر ان شبہات کی تقریر لوگ آج کل مختلف طریقوں سے کرتے ہیں ان طرق تقریر کو بھی بیان کر کے اجمالاً اس کا رد کئے دیتا ہوں اگرچہ اس کی ضرورت نہیں کیونکہ میری اس تمام تقریر کو ان شبہات پر منطبق کر کے جواب بآسانی معلوم ہو سکتا ہے مگر تبرعاً شک کرنے والوں کے الفاظ ہی سے شبہ کو بیان کر کے اس کا بھی رد کئے دیتا ہوں۔ بعض تو یہ

کہتے ہیں کہ آج کل مسیحی ترقی پر ہیں معلوم ہوتا ہے کہ خدا تعالیٰ بھی تثلیث کی طرف داری کرتے ہیں۔

حق اور ناحق کا مدار دلائل پر ہے:

تو صاحبو! سمجھ لیجئے کہ حق ناحق کا مدار غلبہ و ترقی پر نہیں بلکہ اس کا مدار دلائل پر ہے۔ ورنہ خود جناب رسول اللہ ﷺ ہمیں خبر دے چکے ہیں کہ ایک وقت ایسا بھی آئے گا کہ دنیا میں کافر ہی کافر ہوں گے۔ مسلمان کوئی نہ ہوگا تو کیا اس وقت اسلام حق نہ رہے گا۔ صاحبو! اگر دین کے حق ہونے کی یہی علامت ہوا کرے کہ اس کے متبعین ترقی اور غلبہ پر ہوں تو دنیا دار الابتلاء نہ ہوتی ایمان بالغیب کچھ نہ رہتا جانچ اور آزمائش نہ ہو سکتی اس لئے کہ کامیابی کی طرف تو سب ہی آیا کرتے ہیں خوب سمجھ لو کہ حق ناحق کا مدار دلائل پر ہے کامیابی یا ناکامی دنیا پر نہیں ہے۔ پس اگر کسی وقت اہل تثلیث ترقی پر ہوں اور ان کو غلبہ حاصل ہو تو تثلیث حق نہ ہو جائے گی بلکہ حقیقت میں اس وقت بھی اسلام ہی حق ہوگا اس کی ایسی مثال ہے کہ سپرنٹنڈنٹ پولیس گرفتار ہوں اور ایک باغی سلطنت ابھی تک گرفتار نہ ہو تو بتلائے ان دونوں میں افضل و اعلیٰ کون ہے بظاہر تو سپرنٹنڈنٹ سے باغی اچھا معلوم ہوتا ہے کہ وہ آرام سے پھرتا ہے اور جو چاہے کرتا ہے نہ پابندی ہے نہ کسی کی غلامی اور سپرنٹنڈنٹ بظاہر ادنیٰ معلوم ہوتا ہے کہ محبوس ہے۔ قید خانہ میں پڑا ہوا ہے کچھ نہیں کر سکتا مگر حقیقت شناس سمجھتا ہے کہ سپرنٹنڈنٹ گو قید میں ہے باغی سے بہر حال افضل ہے کیونکہ وہ جب رہا ہوگا پھر حاکم کا حاکم ہے بلکہ وہ قید میں بھی حاکم ہے کیونکہ حکام کی قید بھی دوسروں کی قید سے سہل ہوتی ہے ان کا پورا اعزاز قید میں بھی ہوتا ہے۔ اور باغی اگرچہ بھاگا پھرتا ہے مگر جب گرفتار ہوگا جان سے مار ڈالا جائے گا اور اس کی لاش جانوروں اور کتوں کے آگے ڈال دی جائے گی اور وہ ہر وقت خطرہ میں ہے اس لئے کہ باغی ہے اور سپرنٹنڈنٹ کو قید میں بھی انعام سلطانی کی امید ہے کیونکہ اس نے کبھی تو خدمات میں کی ہیں۔ پس کامیابی و ناکامی دنیا پر مدار ہرگز نہ رکھنا چاہئے۔

مصیبت میں اپنی زبان بند رکھنی چاہئے:

بلکہ مصیبت کے وقت اپنی حالت کو درست کرنا چاہئے اور زبان کو بند کرنا چاہئے اس لئے کہ اس سے آپ اپنا ہی نقصان کر رہے ہیں بہتر یہ ہے کہ ذرا بیداری پیدا کیجئے اور دینی حالت کو درست کر لیجئے کیونکہ اگر اس بک بک سے حق تعالیٰ شانہ کو غصہ آگیا اور ہمیشہ پستی ہی رہی کبھی

راحت نصیب نہ ہوئی تو آپ کی اس بک بک سے کیا فائدہ ہوگا بلکہ اس بک بک سے وہاں کا (یعنی آخرت کا) گھر بھی ہاتھ سے جاتا رہے گا۔ اور اگر آپ کو ہمیشہ ترقی حاصل رہی تو اس سے کتنی دیر کا فائدہ ہوگا آخر دنیا فنا ہوگی وہاں پھر اعمال کی باز پرس ہوگی بلکہ تمام ترقی وراحت کی ضرورت بھی اس لئے ہے تاکہ اطمینان سے احکام خداوندی پر عمل کیا جائے ارشاد ہے۔ **الذین ان مکنا هم فی الارض اقاموا الصلوۃ واتوا الزکوۃ.** یہ لوگ ایسے ہیں کہ اگر ہم ان کو دنیا میں حکومت دیں تو یہ لوگ (خود بھی) نماز کی پابندی کریں اور زکوۃ دیں) پس آرام دینے سے غرض حق تعالیٰ کی یہی ہوتی ہے کہ شریعت پر پوری طرح عمل کیا جائے اس کے احکام کی اشاعت کی جائے۔

خوردن برائے زیستن وذکر کردن ست — تو معتقد کہ زیستن از بہر خوردن ست

ترجمہ: کھانا زندہ رہنے اور ذکر کرنے کیلئے ہے جبکہ تو اس کا معتقد ہے کہ زندگی کھانے کیلئے ہے۔

حق تعالیٰ شانہ نے مسلمانوں کو بہت کچھ ترقی وعروج دیا تھا اور اس سے غرض یہ تھی کہ دین کو قائم کریں دین کو رونق دیں انہوں نے سمجھا کہ یہ عروج وعیاشی برتنے کے لئے دیا ہے اس پر یہ سزا ہوئی کہ اب مسلمان پستی کی حالت میں ہیں اب ان پر جو کچھ بھی مصائب آئیں اس کی سزا ہے حق تعالیٰ شانہ فرماتے ہیں۔

اولم یروا انا ناتی الارض ننقصها من اطرافها۔ (کیا وہ اس (امر) کو نہیں دیکھ رہے کہ ہم زمین کو ہر (چہار) طرف سے برابر کم کرتے چلے آتے ہیں)

اس شبہ کا جواب اچھی طرح بحمد اللہ ہو گیا۔ اگر اب بھی اس کا کوئی جز رہ گیا ہو تو اس کو صاف کر لیجئے کیونکہ راحت دنیا اور ترقی مال ودولت سے زیادہ اس کی حفاظت ہے اصل مقصود ایمان ہے ترقی مقصود نہیں۔ پس اگر کوئی شبہ اب بھی رہ گیا ہو تو ضرور پوچھئے۔ زبان اخط سے پوچھئے۔ ایک مولوی سے تسلی نہ ہو تو دوسرے تیسرے سے پوچھئے دیکھئے اگر آپ کے سر میں درد ہو جائے تو اس کے لئے ایک طبیب سے رائے لیتے ہیں اس سے نفع نہ ہو دوسرے سے رجوع کرتے ہیں تیسرے سے درخواست کرتے ہیں تو کیا دینی مرض کی اتنی بھی پرواہ نہیں ایمان کی اتنی بھی قدر نہیں۔

تمام مسلمانوں کے لئے ضرورت دعا:

میں پھر کہتا ہوں کہ اپنی حالت کو درست کرو اور جناب باری میں اپنی اور تمام مسلمانوں کے لئے دعا کرو کہ حق تعالیٰ ہماری اصلاح فرمائیں انشاء اللہ تمہاری دعا مقبول ہوگی۔ بعض لوگ کہا کرتے ہیں کہ ہم نے تو بہت دعائیں کی قبول ہی نہیں ہوتیں حالانکہ وعدہ ہے ادعونی استجب

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

لیک شیرینی ولذات مقر ہست بر اندازہ رنج سفر

یعنی اپنی قرارگاہ کی لذت تعب سفر کی مقدار پر معلوم ہوا کرتی ہے جتنی تکلیف سفر میں ہوئی ہوگی اسی قدر لطف گھر پہنچ کر آئے گا اس میں بیان ہے حکمت کا یعنی یہ تمام تاخیر اور دیر اس لئے ہو رہی ہے تا کہ اس کے بعد جب تمکین حاصل ہو تو اس کی قدر رہو اور لذت زیادہ حاصل ہو۔

آنکہ از فرزند و خویشاں برخوری کز غریبی رنج و محنت ہا بری

یعنی ان پریشانیوں میں حکمت یہ ہے کہ اس کے بعد جو دولت ملے گی اس کی قدر ہوگی۔

ہر کہ او ارزاں خرد ارزاں دہد گوہرِ طفلے بقرصِ ناں دہد

خلاصہ اس مقام پر تمام مقدمات شبہات کو تسلیم کر کے ایک نیا مقدمہ بتلا کر سب کا جواب دیدیا جس سے ہم بے خبر تھے بعینہ یہی حال ہمارا ہے کہ ایک مقدمہ سے غافل ہو رہے ہیں یعنی صفت حکیم سے اس لئے شبہات سے پریشانی ہے اس صفت پر غور کرنے سے تمام شکوک حل ہو جائیں گے۔ اس وقت ایک ولایتی مولوی صاحب نے کھڑے ہو کر باآواز بلند سوال کیا کہ قرآن میں ہے ان الارض یرثھا عبادی الصالحون . تو غیر صالحین ارض کے مالک ہیں فرمایا کہ اس سے مراد امت محمدیہ ﷺ ہے اور یہ آیت پیشین گوئی ہے جو کہ پوری بھی ہو چکی قاعدہ کلیہ نہیں کہ ہمیشہ صالحین ہی مالک ہوں گے یعنی مطلقاً ہمیشہ دائمہ نہیں جس سے شبہ کیا جائے (اس کے بعد فرمایا کہ) اب میں وعظ ختم کر چکا ہوں ایک ضروری گزارش ہے کرتا ہوں کہ میں نے جب وعظ کا وعدہ کیا تھا تو یہ وعدہ بھی لیا تھا کہ اور کوئی صاحب تقریر نہ کریں اس کو شاید کوئی صاحب تفرد پر محمول فرماویں لیکن یہ تو خدا کو معلوم ہے کہ میری کیا نیت ہے پھر مجھے یہ بھی معلوم ہوا کہ مجھے جلسہ کا صدر بنایا گیا ہے اس لئے میں اس وعدہ کی بنا پر بھی اور بحیثیت صدارت بھی منع کرتا ہوں کہ اب کوئی صاحب تقریر نہ کریں، البتہ اس کے بعد شاید امام صاحب کچھ فرمائیں تو اس کو سن لیجئے گا وہ شاید چندہ کی تحریک فرمائیں۔ اب دعا کیجئے کہ حق تعالیٰ شانہ، ہمارے اعمال کو درست فرمائیں۔ آمین۔

(آمین والحمد للہ رب العلمین وصلی اللہ تعالیٰ علیٰ خیر خلقہ سیدنا محمد وعلیٰ الہ واصحابہ اجمعین)



الشکر

شکر

یہ وعظ ۸ ذی قعدہ ۱۳۳۰ھ بمقام تھانہ بھون مکان بیری والا
جو کہ حضرت والا نے بیٹھ کر ایک گھنٹہ پچاس منٹ ارشاد فرمایا۔
سامعین کی تعداد تقریباً ایک سو تھی۔ مستورات بھی تھیں جس کو
مولانا محمد عبداللہ گنگوہی نے قلم بند فرمایا۔

خطبہ ماثورہ

بسم اللّٰہ الرحمن الرحیم

الحمد للّٰہ نحمدہٗ ونستعینہ ونستغفرہ ونومن بہ ونتوکل علیہ ونعوذ باللّٰہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا من یھدہ اللّٰہ فلامضل لہ ومن یضللہ فلا ھادی لہ ونشھد ان لاالہ الا اللّٰہ وحدہ لاشریک لہ ونشھد ان سیدنا ومولانا محمدًا عبدہ ورسولہ صلی اللّٰہ تعالی علیہ وعلیٰ الہ واصحابہ وبارک وسلم۔

اما بعد فاعوذ باللّٰہ من الشیطن الرجیم بسم اللّٰہ الرحمن الرحیم ان فی ذالک لاٰیات لکل صبار شکور۔

ترجمہ: اس میں نشانیاں ہیں ہر ایسے شخص کیلئے جو صابر اور شاکر ہو۔

یہ جملہ ایک آیت طویلہ کا جزو ہے اس سے پہلے حق تعالیٰ نے اپنی قدرت کی نشانیاں بیان فرمائی ہیں اور اس کا تتمہ اس جملہ کو قرار دیا ہے۔ اور اس مختصر جملہ میں فضیلت اور مدح کے ساتھ دو بڑی چیزوں کا ذکر ہے۔

تمہید

حق تعالیٰ شانہ کی دو پسندیدہ چیزیں:

جس سے معلوم ہوتا ہے کہ حق تعالیٰ کے نزدیک وہ دونوں شے پسندیدہ بلکہ واجب اور مامور بہ کے درجہ میں ہیں اور وجوب اور ضرورت بھی ان کی اس درجہ ہے کہ کوئی وقت ان کی ضرورت سے خالی نہیں ہے کبھی ایک کی کبھی دوسری کی نوبت بنوبت ہر وقت ضرورت ہے کوئی حالت ایسی نہیں ہے کہ دونوں کی یا ایک کی ضرورت نہ ہو پس ظاہر ہے کہ ایسا امر کس درجہ کا ضروری ہوگا۔ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ بعض عبادات اور مامور بہ تو ایسے ہوتے ہیں کہ خاص خاص اوقات میں ضروری ہوتے ہیں جیسے نماز روزہ باوجودیکہ اسلام کے ارکا اور شعائر ہیں لیکن بعض وقت ایسا ہوتا ہے کہ اس وقت یہ صرف غیر ضروری ہی نہیں بلکہ معصیت ہو جاتے ہیں۔

ایسی عبادات جو بعض اوقات معصیت ہوتی ہیں:

چنانچہ عین دوپہر یا غروب یا طلوع آفتاب کے وقت نماز منہی عنہ ہے۔ بقرعید کے دن روزہ ممنوع ہے اور اسی طرح مکلفین کے اعتبار سے بھی ان کو عموم نہیں چنانچہ حائضہ اور نفساء اگر نماز روزہ ادا کریں تو گناہ ہے۔

بعض غیر ضروری امور:

اور بعض امور بھی ایسے ہیں کہ خاص خاص اوقات میں تو نہیں لیکن غیر ضروری ہیں نماز روزہ ہی کو یہاں بھی لے لیجئے کہ بعد ادائے فرائض وسنن ضروری نہیں رہتے تطوع کے درجہ میں آجاتے ہیں۔

ہر وقت کے ضروری کام:

اور بعض امور وہ ہیں کہ وہ ہر وقت اور ہر شخص کے لئے ضروری ہیں یعنی جن اوقات میں آدمی غیر مکلف ہوتا ہے جیسے نوم جنون نابالغی اس کے سوا ہر وقت ضروری کسی وقت اور کسی حالت کی قید نہیں صبح شام لیل ونہار وضو بے وضو غیر قبلہ رخ ہر وقت ضروری ہیں اس شان کی بھی بہت سے عبادات ہیں منجملہ ان کے دو وہ ہیں جن کا ذکر حق تعالیٰ نے اس جزو آیت میں فرمایا ہے چنانچہ مختصراً حاصل مقام یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ بعض آیات قدرت کو بیان فرما کر فرماتے ہیں۔ ان فی ذالک لایات لکل صبار شکور. یعنی ہم نے جو اپنی قدرت کی نشانیاں بیان فرمائی ہیں ان کو دیکھتے سب ہیں لیکن ان کو آیات قدرت سمجھنا پھر اس سمجھنے سے منتفع ہونا ہر ایک کے لئے نہیں۔

انتفاع کی دو شرطیں:

بلکہ اس انتفاع کی دو شرطیں ہیں ایک کو لفظ صبار سے تعبیر فرمایا اور دوسری کو شکور سے یعنی جس شخص کے اندر دو صفتیں ہوں اول صبر دوسرے شکر وہی ہماری آیات قدرت سے نفع حاصل کرتا ہے یہ ہے اس آیت کا حاصل اس مقام سے معلوم ہو گیا ہوگا کہ اللہ تعالیٰ نے ان دونوں صفتوں کی کس درجہ مدح فرمائی ہے کہ ان آیات قدرت سے منتفع ہونے کا موقوف علیہ قرار دیا ہے۔ اور اسی سے دونوں صفتوں کا وجوب بھی مفہوم ہو گیا ہوگا کیونکہ واجب کا موقوف علیہ واجب ہے اور آیات الٰہیہ سے اعتبار کا واجب ہونا ظاہر ہے۔ اب یہ سمجھئے کہ پہلے عرض کیا گیا ہے کہ ایسی عبادتیں کہ جن کی ہر وقت ضرورت ہے متعدد ہیں پھر ان میں سے صبر شکر کو جو میں نے اس وقت بیان کے لئے اختیار کیا ہے اس کی وجہ کیا ہے۔

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

ناگوار امر ہو چنانچہ مواقع صبر کو کسی قدر بسط کے ساتھ عنقریب بیان کیا جاوے گا ان سے اچھی طرح سمجھ میں آجائے گی۔ اور شکر کہتے ہیں حق تعالیٰ کی نعمتوں کی قدر کرنا خواہ وہ نعمت کھانا ہو یا پانی یا اور شے اور قدر کرنا دل سے بھی اور زبان سے بھی اور دیگر جوارح سے بھی۔ لوگ شکر کی حقیقت صرف اتنی ہی سمجھتے ہیں کہ زبان سے کہہ لیا الحمد للہ یا اے اللہ شکر ہے بس شکر ادا ہو گیا۔

شکر کی حقیقت:

شکر یہ ہے قلب اس کا معترف ہو اور منعم حقیقی کی نعمتوں سے متاثر ہو اور زبان اور دیگر جوارح پر بھی اس کا اثر ہو آگے اس کے مواقع بھی بیان کیئے جاویں گے۔ اب مواقع صبر شکر کو سمجھ لیجئے دونوں کی تعریف سے اجمالاً اتنا معلوم ہو گیا ہو گا کہ صبر کا موقع مصیبت ہے اور شکر کا محل نعمت ہے۔ اتنی بات تو سب کو معلوم ہے لیکن اس میں غلطی یہ واقع ہوئی ہے کہ صبر کا موقع خاص مصیبت اور شکر کا ایک خاص نعمت کو سمجھا ہے اس لئے ان دونوں یعنی مصیبت و نعمت کی حقیقت بھی بیان کی جاتی ہے۔

نعمت کی حقیقت:

نعمت کی حقیقت یہ ہے النعمة حالة ملائمة للنفس نعمت وہ حالت ہے جو نفس کے لئے خوش گوار ہو۔

مصیبت کی حقیقت:

اور مصیبت کہتے ہیں حالة غیر ملائمة للنفس (مصیبت وہ حالت ہے جو نفس کو ناگوار ہو) تفصیل اس محل کی یہ ہے کہ۔

انسان پر دو قسم کے حالات آتے ہیں:

انسان پر دو قسم کے حالات آتے ہیں۔ بعض تو وہ ہیں جو اس کی مرضی کے موافق ہیں اور بعض وہ ہیں جو مرضی کے موافق نہیں۔ اول موقع شکر کا ہے ثانی محل صبر کا اول میں نفس کا اقتضا فرح اور فخر اور اس کو اپنے کسب اور اپنی تدبیر سے سمجھنا اور منعم حقیقی کو فراموش کر دینا اور اس نعمت کو اس طرف نسبت نہ کرنا ہوتا ہے پس شکر یہ ہے کہ اس نعمت کو حق تعالیٰ کی طرف سے جانے اترا وے نہیں اپنا کمال نہ سمجھے غافل اور ناسی نہ ہو اور نعمت میں مشغول ہو کر رب کی نعمت کو نہ بھولے بلکہ نعمت اس

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

مخلوقات ہونے کے یہ اتنا محتاج کیوں ہوا سو راز اس میں یہ ہے کہ اس کو اپنی امر یت پر نظر کرنے سے عجب نہ ہو جاوے اس لئے اتنی حاجتیں اس کے پیچھے لگا دی گئی ہیں کہ جب ناز اور فخر ہو تو فوراً اس طرف بھی نظر کرے کہ میں کیا ناز کروں میں تو ایک ایک جزو عالم کا محتاج ہوں۔ اس کے سوا اور بھی حکمتیں ہوں گی۔ بہر حال انسان سب چیزوں کا محتاج ہے اور کوئی شے انسان کی محتاج نہیں اور اللہ تعالیٰ کو انسان تو کیا احتیاج ہوتی جن چیزوں کا خود انسان محتاج ہے اللہ تعالیٰ کو ان کی بھی احتیاج نہیں بلکہ یہ امر عقلاً و نقلاً ثابت ہے کہ شے اپنے وجود اور بقاء میں حق تعالیٰ کی محتاج ہے پس حق تعالیٰ کے اس استغناء اور انسان کے احوج ترین مخلوقات ہونے کا اقتضاء تو یہ تھا کہ انسان کی بات بھی نہ پوچھتے اور احکام کا مخاطب نہ بناتے لیکن اس سے یہ لازم نہ آتا کہ حقوق بھی نہ ہوتے حقوق تو ضرور ہی ہوتے پس جب حقوق ہوتے اور ان کے ادا کا طریقہ بتلایا نہ جاتا تو سخت مصیبت ہوتی جو آقا اشاروں اور موز پر خادموں کو چلاتے ہیں خادموں کو سخت مصیبت کا سامنا ہوتا ہے اور ایک دو ہی کوئی ایسا نکل آتا ہے جو اتنا مزاج شناس ہو کہ اشارے کو سمجھے علی حزیں شاہزادہ ایران کو اتفاق سے ایک خادم رمضانی کا نام ایسا مل گیا تھا کہ اشاروں کو سمجھتا تھا۔ ایک مرتبہ علی حزیں شاہ دہلی سے درخواست کی کہ ہم کو ایک سلیقہ دار خادم کی ضرورت ہے بادشاہ نے ایک بڑے ہوشیار شخص کو بھیج دیا علی حزیں باغ میں بیٹھے تھے اور نیا خدمت گار باغ کے دروازے پر تھا۔ ایک شخص آیا اور اس نے ایک رقعہ دیا اس خادم نے وہ رقعہ پہنچا دیا اس میں درخواست تھی کہ لیموں عنایت فرمائیے علی حزیں نے چہرہ پر بل ڈال کر وہ رقعہ واپس دے دیا یہ خادم سخت پریشان ہوا کہ زبان کو تو بند کر لیا اور چہرہ سے ناگواری کے آثار معلوم ہوتے ہیں یہ کس بات پر بگڑے ہیں اتفاق سے وہاں رمضانی بھی آ نکلا۔ اس سے خدمت گار نے سارا قصہ بیان کیا رمضانی نے کہا چہرہ پر بل ڈال کر رقعہ دینے کا مطلب یہ ہے کہ لیموں دیدو، لیموں ترش ہوتا ہے انہوں نے چہرہ ترش کر کے بتلا دیا خادم یہ سن کر بھاگا اور سوچا کہ میں یہاں رہوں گا تو سخت مصیبت میں رہوں گا۔ یہ حکایت صحیح ہے یا غلط ہے بہر حال میرا مطلب یہ ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ بھی اشاروں سے کام لیتے تو حق تھا، لیکن کیسی مصیبت ہوتی اور ان اشاروں کو سمجھنے والا کون تھا سو ایسا نہیں کیا بلکہ ایک ایک مضمون کو خوب کھول کر دو دو مرتبہ تین تین مرتبہ بیان فرمایا اور بیان بھی اس طور سے نہیں فرمایا کہ کوئی پرچہ بھیج دیتے کہ اس کے پڑھنے اور سمجھنے یا عمل کرنے میں دقت ہوتی ہے بلکہ ایک عجیب اور فطرت کے موافق طریقہ اختیار فرمایا۔

حضور علیہ ﷺ کا جنس بشر سے ہونا ایک نعمت ہے:

وہ یہ ہے کہ ایسی ذات مقدس کو بھیجا جن کی شان یہ ہے لقد جاء کم رسول من انفسکم یعنی تمہارے پاس ایک رسول آئے ہیں تمہاری جنس سے پس حضور علیہ ﷺ کا ہماری جنس سے ہونا ایک نعمت تو یہ ہے اس لئے اگر کسی فرشتہ یا جن کو بھیج دیتے تو سب ہیبت ہی کے مارے مر جاتے اور آپس میں کچھ مناسبت بھی نہ ہوتی آج کل لوگ اس فکر میں ہیں کہ پیغمبر کو عبدیت اور بشریت کے مرتبہ سے گزار کر الہ تک پہنچا دیں گویا اس صفت کو مٹانا چاہتے ہیں کہ جو ہمارے اور ذات حق میں واسطہ اضافی ہے حالانکہ یہ عین رحمت الٰہی اور عین کمال نبوی بھی ہے کہ بشر ہو کر قرب کے ایسے درجہ پر تھے کہ تو یہ کمال تھا اور رحمت اسلئے کہ بشریت کی مناسبت سے بے راہوں کو راہ پر لا دیں سو ان عبدیت کو مٹانے والوں کی وہی حالت ہے۔

یکے بر شاخ بن مے برید

کہ ایک شیخ جس شاخ پر بیٹھا تھا اسی کو کاٹتا تھا۔

اسی صفت کے ذریعہ سے تو ہم کو ہدایت ہوئی اور یہ ظالم اسی کو اڑانا چاہتے ہیں۔ اور اپنے نزدیک اس کو مدح اور شان بڑھانا سمجھتے ہیں اور بشریت کے اثبات کو تنقیص کہتے ہیں نعوذ باللہ۔ الحاصل اثبات میں ایک نعمت تو یہ ہے کہ پیغمبر علیہ ﷺ کو بشر بنایا دوسرے یہ کہ عزیز علیہ ما عنتم یعنی ارشاد ہے کہ اعنتیو تمہاری مشقت ان پر بہت شاق ہے حریص علیکم بالمؤمنین رؤف الرحیم۔ تم پر حریص اور مومنین کے ساتھ شدت سے رحمت فرمانے والے ہیں۔ کیا ٹھکانا ہے آپ کی شفقت کا ہم تو تمام رات آرام سے سوویں اور حضور علیہ ﷺ ہمارے لئے تمام رات کھڑے ہو کر گزار دیں۔

حضور اکرم علیہ ﷺ وسلم کی شفقت ورحمت:

ایک مرتبہ ایک آیت میں صبح ہوگئی وہ آیت یہ ہے۔ ان تعذبھم فانھم عبادک وان تغفرلھم فانک انت العزیز الحکیم ۔ (یعنی اے اللہ اگر آپ ان کو عذاب کر دیں تو آپ کے بندے ہیں اور اگر ان کے لئے بخشش فرما دیں تو آپ غالب ہیں حکمت والے ہیں، اور ہم تو سوتے بھی نہ تھے بلکہ معدوم محض تھے سو ہم ناکاروں کیلئے جن کا اس وقت وجود بھی نہ تھا حضور علیہ ﷺ تعب اٹھاتے تھے اور فکر میں گھلے جاتے تھے چنانچہ ارشاد ہے۔ لعلک باخع نفسک ان لا یکونوا مومنین یعنی اے محمد علیہ ﷺ شاید اس غم میں ہیں کہ یہ مومن نہیں ہوئے آپ اپنی

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

سے جانور رفتہ رفتہ حق تعالیٰ سے محبت ہو گی اور شکر کا درجہ کاملہ نصیب ہو جاوے گا جیسے کوئی عالم ہونا چاہے تو اول الف با تا شروع کرتا ہے بتدریج علم کامل تک نوبت پہنچ جاتی ہے پس جب حقیقت شکر کی یہ ہوئی ہم جو دیکھتے ہیں تو اپنے اندر کوئی درجہ شکر کا نہیں پاتے نہ عقلی درجہ ہے نہ طبعی دونوں سے معرا ہیں اس لئے شکر خواہ عقلی ہو یا طبعی اس کے لوازم میں سے ہے منعم کے حقوق کو ادا کرنا اور اس کی نافرمانی نہ کرنا اب دیکھ لیجئے کہ ہم سے صبح شام تک کتنی طاعت ہوتی ہے اور کتنی نافرمانیاں غور کرو گے تو معلوم ہو گا کہ کوئی وقت بھی نافرمانی سے خالی نہیں گزرتا مگر ہم نے نافرمانیوں کی فہرست چونکہ بہت مختصر بنا رکھی ہے اس لئے ہم کو یہ امر معلوم نہیں ہوتا ہم چوری، زنا، غصب، قتل ناحق، شراب پینے وغیرہ کو محض گناہ سمجھتے ہیں اور حالانکہ گناہ ہاتھ سے بھی ہوتا ہے پاؤں سے بھی ہوتا ہے آنکھ سے بھی ہوتا اور سب سے زیادہ یہ کہ قلب ہمارا بہت گندہ ہے قلب میں حسد، تکبر، حرص، حب مال، حب جاہ کینہ بھرا ہوا ہے نماز پڑھتے ہیں روزہ رکھتے ہیں اور قلب میں یہ بلائیں بھری ہوئی ہیں۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ جب ہم ہر وقت نافرمانی میں مبتلا ہیں تو کھل کھیلیں اور جن نافرمانیوں سے محفوظ ہیں اس میں بھی مبتلا ہو جاویں اس لئے کہ جتنے جرائم سے بچیں بہتر ہے ورنہ اس کی تو ایسی مثال ہے کہ کسی شخص پر ایک مقدمہ قائم ہو وہ اور جرائم کا بھی مرتکب ہونے لگے اس کو تو یہ چاہئے کہ اس مقدمہ سے بھی کسی طرح بری ہو میرا مقصود اس تعمیم نافرمانی کے بیان سے صرف اس شخص کو جتلانا ہے جو ناز کرتا ہے کہ ہم بڑے فرمانبردار ہیں الحاصل نافرمانیوں کا ارتکاب کرنا بڑی ناشکری ہے یہ تو بیان تھا نعمتوں اور اس کے شکر کے متعلق۔

صبر کے دو محل:

دوسری حالت ہے صبر۔ اس کے دو محل ہیں۔ اول تو مصیبت چنانچہ ارشاد ہے۔ وبشر الصابرین الذین اذا اصابتهم مصيبة قالو انا لله و انا اليه راجعون. یعنی اے محمد ﷺ آپ صابرین کو جن کی حالت یہ ہے کہ جب ان کو کوئی مصیبت پہنچتی ہے تو کہتے ہیں سب اللہ کی ملک ہیں اور ہم اسی کی طرف جانے والے ہیں بشارت دیجئے یعنی وہ حضرات شکوہ وشکایت کرتے اور ان کے دل میں حق تعالیٰ کی ناشکری اور بے تعلقی نہیں ہوتی اب ہم اپنی حالت دیکھیں کہ ہمارا کیا معاملہ ہے ہماری حالت یہ ہے کہ ادنیٰ سی مصیبت میں شکوہ وشکایت اور جزع فزع زبان پر آجاتا ہے اور اگر زبان پر نہیں آتا تو دل میں تو ضروری ہوتا ہے۔ دوسرا محل صبر کا عبادت ہے۔ اس کی ہی نسبت ارشاد ہے۔ یا ایها الذین امنو استعنو بالصبر ولصلوة.

یعنی اے ایمان والو صبر اور صلوٰۃ کے ساتھ مدد چاہو۔ یہاں دو چیزوں کو جمع کر کے صرف صلوٰۃ کا مضمون بیان کرنا باوجودیکہ مقام مقتضی ہے کہ دونوں کا بیان ہو کہ قرینہ اس کا ہے کہ اوپر صبر و صلوٰۃ کا مجموعہ ایک ہی چیز ہے یعنی صبر علی الصلوٰۃ اور یہ اسی قید سے محکوم علیہ ہے لکبیرۃ کا ورنہ خالی صلوٰۃ میں کوئی گرانی نہیں اور اوپر اس مضمون پر حدیث اسباغ الوضوء علی المکارۃ سے استدلال ہو چکا ہے جو بالکل ہی صریح ہے پس صبر کے دو محل ہوئے مصیبت اور عبادت۔ مصیبت کے متعلق جو ہمارا برتاؤ ہے وہ کچھ تو اوپر آ چکا ہے۔ اور آئندہ مفصل بیان ہوگا۔ اول عبادت کو لیجئے، عبادت بہت ہیں ان میں نمازی ہی کو دیکھ لیجئے۔ صبر کے معنی تو یہ تھے کہ ہم اس حقوق و آداب پر نفس کو مجبور کرتے ہیں یعنی نفس کے خلاف ہم اس کے اہتمام میں اور اس کی تکمیل میں اپنی پوری وسعت خرچ کر دیتے اور حتی الوسع خشوع و خضوع حضور قلب سے ادا کرتے۔

ہماری نماز کی مثال:

مگر ہماری نماز ایسی بد صورت ہوتی ہے کہ خشوع دوسرے درجہ میں ہے ارکان بھی باقاعدہ ادا نہیں ہوتے نہ رکوع درست ہے نہ سجدہ کا حق ادا کرتے ہیں۔ پس نام نماز کا ہے باقی حقیقت اور مغز تو ہے نہیں اس نماز کی مثال ایسی ہے کہ جیسے کسی دوست سے آپ فرمائش کریں کہ ہم کو ایک آدمی کی ضرورت ہے وہ دس دن کے بعد چار آدمیوں کے سر پر ایک کھٹولا لادے اور اس پر چادر پڑی ہو پوچھا کہ یہ کیا ہے جواب دیا کہ جناب آپ نے آدمی لانے کے لئے ارشاد فرمایا تھا میں آدمی لایا ہوں دوست نے کہا کہ میاں یہ کیسا آدمی ہے دیکھیں تو چادر اتاری تو کیا منظر نظر آیا کہ ایک مضغہ گوشت بے ہاتھوں سے لولا پاؤں سے لنجا، اندھا، گونگا، بہرا، جذامی غرض دنیا بھر کے عیب اس میں موجود مگر ہاں حیوان ناطق کا اطلاق اس پر صحیح ہے یعنی تعریف آدمی کی اس پر صادق ہے۔ اس پر وہ دوست یہی کہے گا کہ تم بھی عجیب احمق ہو یہ کوئی آدمی ہے یہ کس کام کا ہے بس ایسا جو جیسے وہ لغتہ آدمی ہے اسی طرح ہماری نماز بھی لغتہ نماز ہے مگر باعتبار اس کے اغراض مختصر کے وہ نماز نہیں اور جس طرح سے آدمی کا لانا سبب ناراضی صاحب فرمائش کا ہے اسی طرح ہماری ایسی نماز کا پیش ہونا بھی فی نفسہ موجب عتاب حق تعالیٰ شانہ کا ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ نماز چھوڑ بیٹھو۔

اعلیٰ درجہ کی نماز حاصل کرنے کی کوشش کرنا ضروری ہے:

مقصود یہ ہے کہ اس کمی کی اصلاح کرو اور اسی اصلاح میں جب تک اعلیٰ درجہ کی نماز حاصل نہ ہو سعی کرتے رہو کہ درجہ علیا صلوٰۃ کا حاصل ہو جاوے۔ جب تم اپنی سعی کر لو اور پھر بھی وہ درجہ میسر نہ

ہوتو عنداللہ بری ہو جاؤ گے۔ اللہ تعالیٰ ایسے کریم ہیں کہ وہ ایسے ہی قبول فرمالیں گے شکایت تو اسی کی ہے کہ اس طرف توجہ ہی نہیں پس سعی کے بعد ہم جیسی نماز پڑھیں گے اگر وہ صلوٰۃ مطلوبہ کے درجہ میں بھی نہ ہوگی مگر حق تعالیٰ کا کام ایسا وسیع ہے کہ وہ اسی کو مطلوب کے درجہ میں کر دیں گے۔ چنانچہ اسی بنا پر آیت فاولئک یبدل اللہ سیاتھم حسنات (پس یہ ایسے لوگ ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان کے گناہوں کو نیکیوں سے بدل دیں گے۔) تفسیر حضرت مرشدی علیہ الرحمتہ یہ فرماتے تھے کہ سیئات سے مراد ہمارا نماز روزہ ہے کہ در حقیقت ہی عبادت نہیں بلکہ واقع میں گستاخی اور بے ادبی ہے اور ہم ایسی عبادت کو پیش کر کے بے ادب بنتے ہیں جیسے اس آدمی کا لانے والا بے ادب اور احمق شمار کیا گیا تھا اور ہمارا ایسے عبادات پر اپنے کو مستحق اجر سمجھنا ایسا ہی ہے کسی آقا کا گستاخ نوکر پنکھا جھلے اور ہر دفعہ میں اس کے سر پر پنکھا مارتا ہو اور پھر انعام کا طالب ہو اس پر تو اگر وہ آقا سزا ہی نہ دے تو بڑی عنایت ہے اسی طرح ہماری عبادت بے ادبی اور گستاخی ہے اس پر اگر ہم کو سزا بھی نہ ہو تو بڑی رحمت ہے لیکن حق تعالیٰ کی وہ رحمت ہے کہ ہمارے اس گمان کے موافق کہ ہم ان کو عبادت سمجھے ہوئے ہیں سچ مچ عبادت کر کے اس پر بھی ثواب دیں گے امراء کے یہاں دیکھا ہوگا کہ غرباء مٹی کے خربوزے تربوز بنا کر لاتے ہیں ان کو بھی انعام ملتا ہے ایسی ہی یہ ہماری نماز ہے کیسا عجب ہے جو اس پر بھی انعام مل جاوے لیکن واقع میں تو ضرورت اسی کی ہے کہ ہماری ایسی نماز ہو جیسی جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تھی اور جب تک یہ حاصل نہ ہو سعی کرتے رہیں غضب تو یہ ہے کہ ہماری تو صورت نماز بھی درست نہیں کیونکہ درستی ہوتی ہے صبر سے یعنی خلاف نفس مشقت اٹھانے سے اور اس سے نفس گھبراتا ہے بلکہ بعضوں نے تو یہ حکم لگا دیا ہے کہ ہم سے خشوع خضوع حضور قلب نماز میں ہو ہی نہیں سکتا میں کہتا ہوں کہ ہو کیوں نہیں سکتا مگر ہاں ذرا نفس کو روکنا پڑتا ہے اور اس میں ہوتی ہے مشقت اس لئے اس سے جی گھبراتا ہے باقی ہو سب کچھ سکتا ہے۔

نماز میں حضور قلب حاصل کرنے کا طریقہ:

چنانچہ اس کا طریقہ عرض کرتا ہوں اگر اس طریقہ پر عمل کرو تو دیکھیں کیسے حضور قلب اور خشوع خضوع نہ ہو وہ یہ ہے کہ فلسفی اور عقلی قاعدہ ہے کہ النفس لا تتوجہ الیٰ شیئین فی ان واحد یعنی ایک وقت میں دو چیزوں کی طرف متوجہ نہیں ہوتا نماز میں دل حاضر نہ ہونے کی وجہ اصل یہ ہے کہ دل دوسری طرف متوجہ ہے۔ آپ اس کو نماز کی طرف اس طرح متوجہ کریں کہ نماز یاد سے

نہ پڑھیں بلکہ ہر جزو کو سوچ سوچ کر ادا کریں یعنی جو حرکت نماز میں آپ کریں اور جو کلمہ بھی زبان سے کہیں بلا ارادہ نہ کہیں ہر کلمہ اور ہر رکن کے ادا کرنے کے لئے مستقل ارادہ کریں اسی طور سے تمام نماز ختم کردیں اس میں اول تو مشقت ہوگی اس لئے کہ نفس خوگر ہو رہا ہے میدانوں میں اور بازاروں میں گھومنے اور دوستوں سے باتیں کرنے کا اس لئے اس کو یہ روک بہت گراں ہوگی۔ لیکن رفتہ رفتہ اس کی عادت ہو جائے گی اب تو ہماری نماز کی ایسی مثال ہے کہ جیسے گھڑی کہ اس کو ایک مرتبہ کوک دو وہ ۲۴ گھنٹہ پورے کر کے ہی دم لے گی اس طرح ہم کو اللہ اکبر کہہ کر بس سلام پھیرنے کے بعد ہی خبر ہوتی ہے۔ رکوع، سجدہ، قومہ، قیام قرات سب آپ ہوتے چلے جاتے ہیں۔ کچھ خبر نہیں ہوتی کہ ہم کیا کر رہے ہیں۔ پس ساری خرابی نماز کو صرف مشق سے بلا سوچے یاد پڑھنے کی ہے اور علاج بالضد ہوتا ہے پس نماز میں جو کچھ کرو یا کہو سوچ کر اور ارادہ سے کہو مثلاً سبحانک اللّٰھم پڑھو تو اس کلمے کے کہنے کے لیے ارادہ کرو دوسرا کلمہ کہنے کے لئے مستقل ارادہ کرو چند روز اس طرح نماز پڑھنے سے پھر نفس اسی کا خوگر ہو جاوے گا لیکن اس میں کامیابی کے لئے تقاضا اور جلدی نہ کرنا چاہیے۔ رفتہ رفتہ سب کام بن جاوے گا۔

صوفی نشود صافی تا در نکشد جامی   بسیار سفر باید تا پختہ شود خامی

ترجمہ:۔ (بدوں مجاہدات و ریاضت کے اصلاح درستی نہیں ہو سکتی خامی دور ہونے اور پختگی ہونے کے لئے ریاضات اور مجاہدات کی ضرورت ہے)

پس معلوم ہوا کہ عبادات کے اندر جو خرابیاں ہیں وہ بے خبری کی وجہ سے ہیں۔ دوسرا محل صبر کا تھا مصائب اس میں ہماری یہ کیفیت ہے کہ ذرا سر میں درد ہو جائے سارے شہر میں گاتے جائیں گے۔ میرا مطلب یہ نہیں کہ بیماری کو بالکل ظاہر نہ کرے بضرورت تو ظاہر کرنا ہی ضروری ہے شریعت نے ہم کو اعتدال سکھلایا ہے اور یہ ہی مشکل ہے واللہ یہ تو آسان ہے کہ کسی سے نہ کہیں اور یا سب سے کہیں لیکن یہ موقع ضرورت میں کہیں اور بلا ضرورت زبان نہ ہلاویں اس میں نفس کو بڑی مشقت ہوتی ہے۔

حضرت حافظ محمد ضامن صاحبؒ کی خدمت میں ایک شخص با ارادہ بیعت آیا حضرت نے فرمایا کہ کچھ دنوں کھانا کم کھاؤ جب بیعت کریں گے۔ ایک روز کے بعد وہ شخص پھر حاضر ہوا اور عرض کیا کہ حضرت اگر حکم ہو تو روزہ رکھ لوں مگر یہ تو بڑی مشکل بات ہے کہ سامنے مزہ دار حلال

طیب کھانا موجود ہو اور پھر کم کھاؤں، حضرت نے فرمایا کہ اسی منہ سے کہتے ہو کہ اللہ کا نام لوں گا اتنا بھی نہ ہو سکا۔ صاحبو سنت کا اتباع اسی واسطے تو لوگوں کو ناگوار ہے کہ اس میں ہر امر میں اعتدال رکھا ہے اور یہ نفس کو بھاری اور کٹھن ہے اور منشا اس ناگواری کا یہ ہے کہ نفس چاہتا ہے آزادی کو اور نیز شہرت کو تو اس کو اپنے حظوظ بالکلیہ ترک کر دینا تو اس لئے آسان ہے کہ اس میں ایک آزادی ہے اور مخلوق کی نظروں میں بڑائی ہے کہ فلاں درویش کھانا نہیں کھاتے۔ اتنے برسوں سے انہوں نے کھانا پانی چھوڑ دیا ہے۔ اور اعتدال دشوار ہے کہ اس میں شہرت نہیں ہوتی کیونکہ اس میں صورتاً امتیاز نہیں ہوتا یہی تو وجہ ہے کہ درویشوں کی صورت بنالینا آسان ہے لیکن سنت پر عمل کرنا لوگوں کو دشوار نظر آرہا ہے۔ پس یہ سنت کے خلاف ہے کہ کوئی شخص عیادت کو آوے اور برابر یہ ہی کہتے ہیں کہ میں اچھا ہوں وہ بیچارہ تو ہمدردی کی راہ سے حال پوچھتا ہے اور یہ ایسے تقوے میں آئے کہ اس سے اپنا حال بھی ظاہر نہیں کرتے پس ایسے وقت یہ ہی سنت ہے کہ کہے کہ مجھ کو بخار ہے فلاں حکیم کا علاج ہے آپ بھی دعائے صحت کریں ہاں اگر کوئی مغلوب الحال ہو تو وہ دوسری بات ہے۔

مغلوب الحال کامل نہیں ہوتا:

لیکن یادرکھو مغلوب الحال کامل نہیں ہوتا گو یہ حالت محمود ہو لیکن کمال نہیں کمال وہی ہے جو حضور ﷺ کا طریقہ ہے۔ ایک مغلوب الحال کی حکایت لکھی ہے کہ انہوں نے قیام کیا جب تک ندا نہیں آئی رکوع نہیں کیا۔ رکوع میں گئے تو وہاں ہی رات گزار دی جب تک ندا نہیں آئی قومہ نہیں کیا قومہ کیا تو اب سجدہ میں نہیں جاتے ظاہراً تو لوگوں کے نزدیک یہ شخص بڑا ولی ہے لیکن کمال نہیں۔

کمال صلوٰۃ:

حالانکہ کمال صلوٰۃ وہ ہے جو حضور ﷺ کی نماز کے مشابہ ہو۔ حضور ﷺ کی نماز میں اعتدال ہوتا تھا۔

بلاضرورت مرض ومصیبت کا اظہار مناسب نہیں:

پس بیماری کے اندر بھی اعتدال یہ ہے کہ موقع پر اظہار میں ظاہر کرے اور اور بلاضرورت خاموش رہے اور حضرت عمر فاروقؓ بیمار ہوئے لوگوں نے پوچھا کہ اے امیر المومنین کیسا مزاج ہے فرمایا اچھا نہیں لوگوں نے کہا آپ شکایت کرتے ہیں فرمایا کیا میں اپنے رب کے سامنے قوت اور

پہلوانی ظاہر کروں غرض جہاں موقع ہو ظاہر بھی کرے اور تدبیر بھی کرے یہ خلاف صبر نہیں چنانچہ اس کی دلیل اسی وقت سمجھ میں آئی حضرت یعقوبؑ نے یوسف کی جدائی کی مصیبت میں فرمایا تھا۔ یا اسفی علیٰ یوسف یعنی ہائے افسوس یوسف پر، اس پر بیٹوں نے کہا کہ تم تو ہمیشہ یوسف ہی کو یاد کرتے رہو گے۔ تو اس کے جواب میں فرمایا قال انما اشکو بثی وحزنی الی اللہ۔ یعنی میں تم سے نہیں کہتا میں تو اپنے درد وغم کی اپنے اللہ سے شکایت کرتا ہوں پھر اسی کے ساتھ ہی حضرت یعقوبؑ نے تدبیر بھی فرمائی چنانچہ یابنی اذھبوا فتحسسو امن یوسف۔ یعنی اے میرے بیٹو جاؤ اور یوسف کا پتہ چلاؤ جامعیت انبیائی کا حصہ ہے۔ بہر حال ثابت ہوا کہ اپنی مصیبت اپنے مرض کو بلا ضرورت گاتا نہ پھرے اور موقع ضرورت میں ظاہر کرے۔

صبر و شکر کی مشترکہ حالتیں:

تیسری ایک قسم عقلی اور ہے یعنی وہ حالت جس کے متعلق صبر و شکر دونوں ہوں اور وہ حالت کوئی جداگانہ نہیں بلکہ جو مواقع صبر کے ہیں وہ بعینہ محل شکر کا بھی ہے اور اسی طرح جو حالتیں شکر کی ہیں وہ صبر کی بھی ہیں اور اگرچہ ظاہراً تقسیم کا مقتضی تو یہ تھا کہ تین قسمیں جدا جدا ہوتیں اول جس سے شکر محض کا تعلق ہو۔ دوسرے جس سے صبر محض کا۔ تیسرے مرکب لیکن ایسی کوئی حالت نہیں کہ جس میں صبر محض یا شکر محض ہو بظاہر مصیبت ایسی حالت ہے کہ اس میں صرف صبر ہے لیکن ابھی معلوم ہوگا کہ اس کا تعلق شکر سے بھی ہے اور اس کو ایک مثال سے سمجھنا چاہئے مثلاً ایک شخص بیمار ہوا اور طبیب نے مسہل تجویز کیا لیکن وہ طبیب کسی وجہ سے ناراض ہو گیا نسخہ مسہل کا لکھ کر نہیں دیتے بڑی کوشش کے بعد وہ راضی ہوئے اور نسخہ لکھا اب بتلائیے کہ یہ حالت شکر ہے یا نہیں بیشک شکر کی بات ہے۔ چنانچہ اس طبیب کا شکریہ ادا کیا جاتا ہے حالانکہ مسہل پینے میں اور دستوں میں سخت تکلیف ہے لیکن اس پر بھی شکریہ طبیب کا کیا جاتا ہے تو وہ وجہ کیا ہے وجہ یہی ہے کہ مادہ فاسدہ کا ازالہ ہو کر یہ بیمار بالکل صحیح وتندرست ہو جاوے گا تعجب کی بات ہے طبیب اگر نسخہ مسہل کا لکھے اس کا شکریہ ادا کیا جاوے اور اللہ میاں اگر مسہل تجویز کریں تو ان کا شکر نہ کریں۔ اب رہی یہ بات کہ مرض اور مصیبت مسہل کیوں کر ہے۔ اسی کو میں بتاتا ہوں۔ صاحبو یہ روحانی مسہل ہے۔ اس سے گناہ معاف ہوتے ہیں چنانچہ حدیثوں میں کثرت سے آتا ہے کہ اہل مصیبت کے گناہ معاف ہوتے ہیں۔ حق تعالیٰ کی رضا بڑھتی ہے کسی کا بچہ مر جاتا ہے تو اس کے لئے جنت میں ایک گھر بنایا

جاتا ہے اور اس کا نام رکھا جاتا ہے "بیت الحمد" بیت الحمد نام ہونے اور بیت الصبر نام نہ ہونے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس حالت میں ہم کو حمد بھی سکھلائی گئی ہے۔

مصیبت بھی بڑی نعمت ہے:

پس صاف معلوم ہوا کہ مصیبت بھی بڑی نعمت ہے ایک حکایت یاد آئی۔ حضرت حاجی صاحب قبلہ قدس سرہ کے یہاں ایک مرتبہ اسی کا ذکر تھا کہ بلا بھی نعمت ہوتی ہے ایک شخص آہ آہ کرتا حاضر ہوا کہ حضرت بڑی تکلیف ہے دعا فرمایئے کہ اللہ تعالیٰ اس تکلیف کو دور کردیں مجھے خیال ہوا کہ حضرت دعا کریں گے یا نہیں اگر کریں گے تو ابھی بیان فرما رہے تھے کہ بلا بھی نعمت ہے اس کے خلاف ہوگا اور اگر نہیں کریں گے تو اس کی دل شکنی ہوگی۔ حضرت نے دعا کے لئے ہاتھ اٹھائے سبحان اللہ کیا دعا فرمائی۔ مضمون یہ تھا کہ اے اللہ ہم خوب جانتے ہیں کہ یہ بلا بھی ایک نعمت ہے لیکن ہم ضعیف ہیں ناتواں اپنے ضعف کی وجہ اس نعمت کے متحمل نہیں ہوسکتے۔ اے اللہ اس نعمت کو نعمت صحت کے ساتھ مبدل فرما دیجئے۔ بہرحال حدیث سے بزرگوں کے ملفوظات سے یہ امر ثابت ہے کہ بلا بھی نعمت ہے پس وہ موقع جیسے صبر کا ہے اس طرح شکر کا بھی ہے اگر کوئی کہے کہ جب نعمت ہے تو مصیبت کدھر سے ہوئی۔ بات یہ ہے کہ ہر شے کی ایک حقیقت ہوتی ہے اور ایک صورت مصیبت صورت کے اعتبار سے تو مصیبت اور حقیقت کے اعتبار سے جب کہ اس کی غایت اور منفعت پر نظر ڈالی جاوے تو وہ نعمت ہے مثلاً مرض ہے صورت کے اعتبار سے کہ جسم کو تکلیف ہوتی ہے درد ہوتا ہے مصیبت ہے لیکن غایت اس کی یہ کہ گناہ معاف ہوجاتے ہیں نفس میں تہذیب آتی ہے نعمت اسی طرح نعمت بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ موقع صرف شکر کا ہے لیکن غور سے معلوم ہوتا ہے کہ صبر کا بھی موقع ہے مثلاً کسی کے پاس مال آیا شکر کی حالت تو ظاہر ہے لیکن وہاں بھی واجب ہے اس طور سے کہ حدود شرعیہ سے اس کے خرچ کرنے میں آگے نہ بڑھے نفس کو روکے اور حد سے زیادہ اس سے خوش نہ ہو پس مصیبت نعمت عبادت تینوں حالتوں میں صبر و شکر دونوں واجب ہیں بحمد اللہ میرا وہ دعویٰ ثابت ہوگیا ہے صبر و شکر ہر حالت میں ضروری ہے اب ایک بات رہ گئی وہ یہ ہے کہ جب صبر و شکر ہر وقت واجب ہے تو کسی کو شبہ ہو کہ بس نماز روزہ چھوڑ کر انا للہ اور الحمد للہ پڑھا کریں اس شبہ کے درود سے میں اپنے دعوے سے رجوع نہ کروں گا اور یہ ہی کہوں گا کہ ہاں ہر وقت صبر و شکر ضروری ہیں لیکن صبر و شکر صرف انا للہ و الحمد کا نام نہیں ہیں آپ بھول گئے میں نے اول عرض کیا تھا کہ صبر نام ضبط نفس کا ہے اور اس کا تحقق نماز روزہ سب ہی پر ہوتا ہے، شکر قدر دانی کا نام ہے اور انا للہ

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]



تحقیق الشکر

شکر کی تحقیق

یہ وعظ ۲۶ محرم ۱۳۳۹ھ شب جمعہ بمقام تھانہ بھون برمکان اہلیہ صغریٰ حضرت حکیم الامتؒ جو کہ حضرت والا نے بیٹھ کر ایک گھنٹہ ۲۰ منٹ ارشاد فرمایا سامعین کی تعداد تقریباً چالیس تھی۔ مستورات کا مجمع بھی تھا جس کو حضرت مولانا ظفر احمد صاحب نے قلم بند فرمایا۔

خطبہ ماثورہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للہ نحمدہ ونستعینہ ونستغفرہ ونومن بہ ونتوکل علیہ ونعوذ باللہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا من یھدہ اللہ فلامضل لہ ومن یضللہ فلاھادی لہ ونشھد ان لاالہ الا اللہ وحدہٗ لاشریک لہ ونشھد ان سیدنا ومولانا محمداً عبدہ ورسولہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وعلیٰ الہ واصحابہ وبارک وسلم۔

امابعد فاعوذ باللہ من الشیطان الرجیم بسم اللہ الرحمن الرحیم ۵ ط

اعملو آال داؤد شکراًط وقلیل من عبادی الشکور ۵

ترجمہ:۔ اے داؤد علیہ السلام کے خاندان والوتم سب شکریہ میں نیک کام کرو۔

تمہید

ایک ذات پرانعام سے پورے خاندان کو نفع عظیم:

یہ ایک بہت بڑی آیت کا ٹکڑا ہے جس میں حضرت سلیمانؑ کا قصہ مذکور ہے اوران نعمتوں کا ذکر ہے جو سلیمانؑ کو دی گئی تھیں وہ آیت یہ ہے۔ ولسلیمان الریح غدوھا شھرور واحھا شھرو اسلنا لہ عین القطرط ومن الجن من یعمل بین یدیہ باذن ربہ ومن یزغ منھم عن امرنا نذقہ من عذاب السعیر ہ یعملون لہ مایشآء من محاریب وتماثیل وجفان کالجواب وقدور رسیت ط اعملو اال داؤد شکرًا وقلیل من عبادی الشکور

(اورسلیمان (علیہ السلام) کیلئے ہوا کو مسخر کردیا کہ اس کی صبح کی منزل ایک مہینہ بھر کی ہوتی اوراس کی شام کی منزل ایک مہینہ بھر کی ہوتی اور ہم نے ان کے تانبے کا چشمہ بہادیا۔ اور جنات میں بعضے وہ تھے جوان کے آگے کام کرتے تھے ان کے رب کے حکم سے اوران میں سے جو شخص ہمارے حکم سے سرتابی کرے گا ہم اس کو دوزخ کا عذاب چکھادیں گے وہ جنات ان کے لئے وہ چیز بناتے جوان کو منظور ہوتا بڑی بڑی عمارتیں اور مورتیں اور لگن جیسے حوض اور دیگیں جوایک ہی جگہ جمی رہیں۔ اے داؤد (علیہ السلام) کے خاندان والوتم سب شکریہ میں نیک کام کیا کرو اس کے بعد

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

تھا ان کے قضایا فیصلے اور حکیمانہ اقوال بہت عجیب وغریب ہوتے تھے جس سے بعض لوگوں کو یہ شبہ ہوتا تھا کہ حضور ﷺ نے ان کو کچھ خاص اسرار دوسروں سے علیحدہ بتلائے ہیں اس وجہ سے یہ سوال کیا گیا جس کا جواب حضرت علیؓ نے بڑی تاکید کے ساتھ قسمیں کھا کر یہ دیا والذی برا النسمۃ وفلق الحبۃ ماخصنا رسول اللہ علیہ وسلم بشی الا مافی حذہ الصحیفۃ۔ او فھما اوتیہ الرجل فی القرآن قسم اس ذات کی جس نے جان کو پیدا کیا اور دانہ کو پھاڑا (اور اس میں سے درخت وغیرہ کو نکالا) کہ ہم کو حضور ﷺ نے کسی چیز کے ساتھ خاص نہیں کیا مگر وہ باتیں جو اس صحیفے میں ہیں یا وہ فہم جو انسان کو قرآن سمجھنے کے عطا ہوا اور صحیفہ میں تو بعض احکام زکوٰۃ اور صدقہ کے متعلق تھے جو دیگر صحابہ کو بھی معلوم تھے اور فہم ایسی چیز ہے جو حضور ﷺ کے دینے کی نہ تھی ہاں یہ نعمت حق تعالیٰ کے دینے کی تھی۔ حضرت علیؓ کے جواب کا حاصل ظاہر ہے یعنی جن لوگوں کا میری نسبت یہ خیال ہے کہ حضور ﷺ نے مجھے خاص علوم بتلائے ہیں یہ خیال بالکل غلط ہے البتہ حق تعالیٰ نے مجھے قرآن کی فہم عطا فرمائی ہے۔ جس وجہ سے یہ عجیب وغریب فیصلے اور حکیمانہ اقوال میری زبان سے نکلتے ہیں۔ مگر بعض لوگ پھر بھی ایسی بھدی طبیعت کے تھے کہ ان کا خیال نہ بدلا اور انہوں نے یہ نہ سمجھا کہ حضرت علیؓ تقیہ کرتے ہیں اور بات کو چھپانا چاہتے ہیں چنانچہ اب بھی بعض غالی معتقد اپنے شیخ کے بارے میں کچھ سے کچھ خیال پکا لیتے ہیں اور اگر وہ اس کی تردید کریں تو یوں کہتے ہیں کہ یہ حضرت کی تواضع ہے۔

حکایت حضرت گنگوہیؒ:

حضرت مولانا گنگوہیؒ کی مجلس میں ایک دیہاتی شخص نے دوسرے کو آہستہ سے کہا کہ حضرت نے جو فلاں مسجد کی درستی کا اہتمام فرمایا ہے حضرت کو کشف ہوا تھا مولانا نے یہ بات سن لی۔ پکار کر فرمایا ہے کہ مجھ کو کشف وغیرہ کچھ نہیں ہوا جو کوئی میری نسبت کا ایسا خیال رکھے وہ بالکل غلط ہے تو وہ صاحب چپکے سے دوسرے آدمی سے کیا کہتے ہیں کہ پڑے کہو انہیں کہنے دو انہیں کشف ہوا تھا۔ اب بھلا اس کا بھی کچھ علاج ہے کہ شیخ کی تردید کے بعد بھی اس کی بات نہیں مانی جاتی اور اپنے اعتقاد پر اصرار کیا جاتا ہے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کو فہم قرآن کا خصوصی علم:

یہی حال حضرت علیؓ کے بعد معتقدوں کا تھا کہ وہ پھر بھی اپنے اسی خیال پر جمے رہے حالانکہ حضرت علیؓ قسم کھا کر اس کی غلطی ظاہر کر اور بتلا چکے کہ مجھے کوئی خاص علم قرآن وحدیث کے

سوا حاصل نہیں البتہ قرآن کا فہم حق تعالیٰ نے مجھے عطا فرمایا ہے اگر یہ کوئی خاص بات ہو تو ہو۔ اس کا مطلب یہ نہ تھا کہ دوسرے صحابہ کو قرآن کا فہم نہ تھا مطلب یہ ہے کہ مجھے قرآن کا فہم حق تعالیٰ نے کچھ دوسروں سے زیادہ عطا فرمایا ہے چنانچہ آپ کا یہ مقولہ تھا کہ اگر میں سورہ فاتحہ کی تفسیر لکھنے بیٹھوں تو ستر اونٹوں کا بوجھ ہو جائے اور ختم نہ ہو اور غالب وجہ ان علوم کی حضرت علیؓ کا قرب خاص تھا رسول اللہ ﷺ سے کیونکہ آپ حضور ﷺ کے داماد تھے اور داماد بمنزلہ اولاد کے ہوتا ہے۔ دوسرے وہ حضور ﷺ کے چچا زاد بھائی بھی تھے اور چچا بھی کیسے کہ حضور ﷺ کے جان نثار۔ اگر چہ وہ حضور ﷺ پر ایمان نہیں لائے مگر طبعی محبت کی وجہ سے انہوں نے حضور ﷺ کی بہت خدمت اور حمایت کی تھی مگر آہ وہ کام نہ آئی۔

بزرگوں سے محض طبعی محبت کامیاب نہیں:

اس سے معلوم ہوا کہ بزرگوں سے اگر طبعی محبت ہو اور عقلی نہ ہو تو ہیچ ہے۔ اور یہ مطلب نہیں کہ اس سے دنیا میں بھی نفع نہ ہوگا۔ دنیا میں تو اسے کچھ نہ کچھ نفع ہو ہی جائے گا کیونکہ حق تعالیٰ فرماتے ہیں۔ من کان یرید العاجلة عجلنا له فیها مانشآء لمن نرید. (جو شخص دنیا کی نیت رکھے گا ہم ایسے شخص کو دنیا میں جتنا چاہیں گے جس کے واسطے چاہیں گے فی الحال ہی دے دیں گے) مگر آخرت میں کچھ نفع نہیں ہوتا اولئک الذین لیس لهم فی الاخرة الا النار. (یہ ایسے لوگ ہیں کہ ان کے لئے آخرت میں سوائے دوزخ کے اور کچھ نہیں) پس کفار جو کچھ اعمال صالحہ کرتے ہیں اس سے دنیا میں ان کو کچھ مل جاتا ہے بلکہ بعض دفعہ اتنا ملتا ہے کہ مسلمانوں کو بھی نہیں ملتا اور وجہ اس کی یہ ہے ان کا سارا ثواب یہیں دے دیا جاتا ہے اور مسلمانوں کا ثواب آخرت کے لئے ذخیرہ ہوتا ہے اس لئے دنیا میں ان کو زیادہ فراخی کم میسر ہوتی ہے۔

کفار کے عذاب میں تفاوت کے دلائل:

اور نصوص سے معلوم ہوتا ہے کہ آخرت میں بھی گو نجات کا نفع نہ ہو مگر پھر بھی کفار کے عذاب میں تفاوت ہوگا جیسا کہ اہل ایمان کے درجات میں تفاوت تو جس کا کفر اشد ہوگا اس کو عذاب بھی سخت ہوگا اور جس کا کفر خفیف ہوگا اس کو پہلے شخص کی بہ نسبت عذاب بھی کم ہوگی اس کی ایک دلیل تو یہ ہے کہ جہنم کے لئے درجات اور طبقات مختلف ہونا نصوص سے معلوم ہوتا ہے ان المنافقین فی الدرک الاسفل من النار . فرماتے ہیں کہ منافقین جہنم میں سب سے نیچے طبقہ میں

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

حضرت موسیٰ اور حضرت خضر علیہما السلام کا واقعہ:

دوسری دلیل حضرت موسیٰ اور خضر علیہما السلام کا واقعہ ہے جو قرآن میں مذکور ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ حضرت موسیٰؑ نے حضرت خضرؑ کے ساتھ رہنا چاہا تو انہوں نے فرمایا کہ آپ میرے معاملہ میں صبر نہ کر سکیں گے کیونکہ آپ بعض باتوں کو خلاف شریعت دیکھ کر پریشان ہوں گے چونکہ موسیٰؑ کو وحی کے ذریعہ سے خضرؑ کا مقبول خدا ہونا معلوم ہو چکا تھا اس لئے وعدہ فرمالیا کہ انشاء اللہ تعالیٰ میں سب باتوں پر صبر کروں گا۔ خضرؑ نے فرمایا کہ پھر شرط یہ ہے کہ کسی بات پر مجھ کو ٹوکا نہ جائے جب تک میں خود ہی اس کی حقیقت نہ بتلادوں غرض اس قول و اقرار کے بعد دونوں حضرات تشریف لے چلے راستہ میں دریا پڑا اور دونوں ایک کشتی میں سوار ہوئے کشتی والے خضرؑ کو پہچانتے تھے دونوں کو سوار کرلیا خضرؑ نے پہلی بات یہ کی کہ اس کشتی کا ایک تختہ بیچ میں سے نکال دیا جس سے پانی بھر کر غرق ہو جانے کا خوف تھا حضرت موسیٰؑ اس حرکت سے بے چین ہو گئے کہ ایک تو کشتی والوں نے ہم پر احسان کیا اس کا بدلہ شکر کی جگہ ان کو یہ دیا کہ کشتی کے غرق کرنے کا کام کیا انہوں نے حضرت خضرؑ سے کہا یہ کیا بات ہے کیا تم کشتی والوں کو غرق کرنا چاہتے ہو یہ تو بہت ہی بے جا بات ہے خضرؑ نے کہا کہ دیکھئے میں کہتا نہ تھا کہ آپ سے میرے معاملات پر صبر نہ ہو سکے گا موسیٰؑ نے معذرت کی کہ مجھ کو یاد نہ رہا تھا اس مرتبہ معاف کرو۔ پھر آگے چلے تو ایک نابالغ معصوم بچہ کو خضرؑ نے مار ڈالا۔ موسیٰؑ سے اس پر بالکل نہ رہا گیا اگرچہ شرط یاد تھی مگر ایک معصوم کے قتل پر بے چین ہو گئے اور پھر خضرؑ کو ٹوکا کہ یہ تو تم نے بڑا بھاری جرم کیا کہ ایک معصوم کو ناحق مار ڈالا انہوں نے پھر وہی شرط یاد دلائی موسیٰؑ نے فرمایا کہ اس کے بعد اگر میں ٹوکوں تو پھر آپ مجھے اپنے ساتھ نہ رکھئے گا پھر ایک گاؤں میں پہنچے ان صاحبوں کو بھوک لگ رہی تھی گاؤں والوں سے دعوت کی درخواست کی کہ ہماری دعوت ضیافت کرو وہ ایسے ظالم تھے کہ صاف جواب دے دیا یہ بھی نہ دیکھا کہ ہم سے دعوت مانگ رہے ہیں پورے ہی کم قسمت تھے کہ ایسے لوگ خود دعوت مانگیں اور وہ ٹکا سا جواب پکڑا دیں خیر یہ دونوں حضرات خاموش رہے اس کے بعد خضرؑ نے اس گاؤں میں ایک دیوار شکستہ دیکھی جو گرا چاہتی تھی اس کو انہوں نے ہاتھ سے اشارہ کر کے کرامت کے طور پر سیدھا کر دیا ہمارے موسیٰؑ تو صاحب جلال تھے ان سے نہ رہا گیا فرمایا جس بستی کے لوگوں نے ہمارے ساتھ ایسی بے مروتی کی ان کے ساتھ آپ کو مروت کی کیا ضرورت تھی اگر دیوار گر پڑتی اور اگر آپ کو

ایسا ہی مروت کا جوش تھا تو اجرت لے کر درست کی ہوتی تا کہ اس اجرت ہی سے ہم کھانا وغیرہ خرید کر کھا لیتے خضرؑ نے کہا کہ بس حضرت اب ہماری اور آپ کی جدائی ہے آپ نے دوسری شرط کو بھی نہ نباہا۔ اس کے بعد خضرؑ نے سب باتوں کی حقیقت جتلائی کہ میں نے کشتی کا تختہ اس لئے توڑا تھا کہ پیچھے ایک ظالم بادشاہ صحیح سالم کشتیوں کو غصب کرتا ہوا آ رہا تھا۔ میں نے چاہا کہ یہ کشتی ضبط نہ ہو کیونکہ اس کے مالک ہمارے محسن تھے اس لئے میں نے اس میں عیب ڈال دیا اور جب وہ اس کو چھوڑ کر چلا گیا پھر کشتی والوں نے درست کر دیا۔ اور لڑکے کو اس لئے قتل کیا کہ اس کی تقدیر میں یہی لکھا تھا کہ اگر یہ بالغ ہوگا تو کافر ہو جائے اور اس کے والدین مسلمان تھے اور ان کو اس سے محبت بہت تھی اگر یہ بڑا ہو کو کافر ہوتا تو اندیشہ تھا کہ ماں باپ بھی اس وجہ سے کافر ہو جاتے اس لئے میں نے اس کو مار ڈالا۔ اور دیوار کو میں نے اس لئے درست کیا کہ اس کے مالک دو یتیم بچے تھے جن کا خزانہ اس کے نیچے دبا ہوا تھا اگر وہ گر پڑتی تو ان کا خزانہ لٹ جاتا اس کے بعد یہ بھی فرمایا ۔وکان ابوھما صالحا فاراد ربک ان یبلغا اشدھما ویستخرجا کنزھما رحمۃ من ربک اور ان کا باپ نیک شخص تھا تو خدا تعالیٰ نے چاہا کہ وہ دونوں یتیم جوان ہو کر اپنا خزانہ خود نکال لیں یہ رحمت تھی خدا تعالیٰ کیطرف سے اس جگہ پر مفسرین نے متنبہ فرمایا ہے کہ وکان ابوھما صالحا سے معلوم ہوتا ہے کہ اس رحمت میں باپ کی صلاحیت کو بھی دخل تھا اگرچہ مفسرین کی اس تنبیہ کی ضرورت نہ تھی اور نہ اس تنبیہ پر آیت کی دلالت کا مدار ہے عقل سے خود یہ بات آیت سے معلوم ہوتی ہے کہ اگر باپ کی صلاحیت کو خضرؑ کے فعل میں کچھ دخل نہ ہوتا تو ان کو اس جملے کے بڑھانے کی کیا ضرورت تھی وکان ابوھما صالحا مگر خدا تعالیٰ مفسرین کو جزائے خیر دے کہ وہ بدیہی باتوں پر بھی تنبیہ کر دیتے ہیں تا کہ اگر کسی کو اس طرف التفات نہ ہو تو التفات ہو جائے اور سچی بات یہ ہے کہ بعض باتیں تو مفسرین کے بیان کے بعد ہی معلوم ہوتی ہیں اگر وہ بیان نہ کرتے تو شاید ادھر التفات ہی نہ ہوتا۔ ان کے جتلانے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ اس کے بیان کی کیا ضرورت تھی۔

آباواجداد کی برکت سے اولاد کو نفع:

غرض اس واقعہ سے معلوم ہو گیا کہ آباؤ اجداد کی برکت سے بھی اولاد کو نفع ہوتا ہے مگر یہ مومنین کے واسطے ہے اور کفار کے بارے میں یہ ارشاد ہے فلا انساب بینھم یومئذ ولا

یتساءلون ○ نہ ان میں تعلقات رہیں گے نہ آپس میں ایک دوسرے کا حال پوچھیں گے۔ مومنین کی اولاد کے بارے میں ایک آیت میں صاف موجود ہے والذین امنو واتبعتهم ذریتهم بایمان الحقنابهم ذریتهم جو لوگ ایمان والے ہیں اور ان کی اولاد نے بھی ایمان میں ان کا اتباع کیا ہو تو ہم اس اولاد کو آباؤ اجداد ہی سے ملا دیں گے یعنی اگر اولاد کا درجہ کم ہوگا اور باپ کا درجہ بلند ہوگا تو اس اولاد کو بھی باپ ہی کے درجہ میں کر دیں گے تاکہ اولاد کے قرب سے آباء کو انس زیادہ ہو آگے فرماتے ہیں۔ وما التنا هم من عملهم من شئی یعنی ان باپ دادوں کے اعمال سے ہم کچھ کم نہ کریں گے اس میں بعض وہمیوں کے شبہ کا جواب ہے وہ یہ ہے کہ اولاد کو باپ کے پاس پہنچانے کی یہ بھی ایک صورت ہو سکتی ہے کہ اولاد کے اعمال تو ادنیٰ درجہ کے قابل ہیں اور باپ کے اعلیٰ درجہ کے تو کچھ باپ کے اعمال کم کر کے اولاد کی طرف لگا دیے جائیں اور اوسط نکال کر دونوں کو درمیانی درجہ میں رکھ دیا جائے کچھ باپ کی طرف کم کر دیا اور کچھ اولاد کی طرف بڑھا دیا تو فرماتے ہیں یہ صورت نہ ہوگی آباء کے اعمال میں کمی نہ کی جائے گی بلکہ ابناء کے اعمال میں زیادتی کر کے اس کو اسی درجہ میں پہنچا دیں گے جہاں ان کے آباء ہیں باقی اس کے علاوہ جو اس آیت میں تحقیقات ہیں وہ تفسیر سے معلوم کر لی جائیں اس وقت میں تفسیر بیان نہیں کرتا محض تائید کر رہا ہوں کہ حق تعالیٰ آباء اجداد کی وجہ سے اولاد کو بھی نفع پہنچاتے ہیں پھر حضور ﷺ جو تخلقوا باخلاق اللہ کے کامل مظہر تھے آپ عادت الٰہیہ پر کیوں عمل نہ کرتے تو کیا آپ ابو طالب کے احسانات کو بھول جاتے اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے ساتھ احسان و شفقت فرما کر ان احسانات کا شکریہ مکمل نہ کرتے نہیں آپ ضرور کرتے اور کر کے دکھا بھی دیا۔

حضرت علیؓ سے حضور اکرم ﷺ کا قرب حسی:

حضور ﷺ کو حضرت علیؓ سے بہت تعلق تھا جس کو آپؐ نے مختلف عنوانات سے مختلف اوقات میں ظاہر بھی فرمایا ایک دفعہ ارشاد فرمایا من کنت مولاہ فعلی مولاہ جس کا میں دوست علی بھی اس کے دوست ہیں اسکے بعد حضرات صحابہ نے نہایت مسرت کے ساتھ حضرت علیؓ کو مبارک باد دی کہ انت مولانا کہ آپ ہمارے دوست (یا آقا) ہیں۔ ایک بار فرمایا انت منی بمنزلة هارون من موسیٰ تم کو مجھ سے وہ نسبت ہے جو ہارون کو موسیٰ سے تھی۔ حضرات شیعہ اس کو کہاں سے کہاں لے جاتے ہیں اس سے حضرت علیؓ کی خلافت بلا فصل کا مسئلہ نکالتے ہیں۔

اس وقت میں اس سے بحث نہیں کرنا چاہتا مگر ان احادیث سے یہ ضرور معلوم ہوتا ہے کہ حضور ﷺ کو حضرت علیؓ سے قرب اور تعلق بہت تھا اور قرب حسی تو ضرور ان سے زیادہ تھا۔

حضرت صدیق اکبرؓ کا حضور ﷺ سے قرب معنوی:

گو قرب معنوی بعض صحابہ کو زیادہ ہو جیسا کہ واقعات شاہد ہیں چنانچہ حضور ﷺ کے وصال کے بعد تمام صحابہ پریشان ہو گئے اگر کوئی شخص مستقل رہنے والا ثابت قدم تھا تو وہ حضرت ابوبکر صدیقؓ تھے اس وقت تمام صحابہ کو یہ معلوم ہو گیا کہ واقعی ابوبکر صدیقؓ ہم سب سے افضل اور اعلم ہیں صحابہ کو حضور ﷺ کی وفات ایک عجیب بات معلوم ہوتی تھی اس وقت ان کے خیال سے وہ آیات بھی غائب ہو گئیں جن میں حضور ﷺ کی وفات کا ذکر تھا کہ آپ کا بھی وصال ہو جائے گا جیسا کہ دوسرے انبیاء گزر گئے اور عام لوگ وفات پاتے ہیں جس وقت حضرت ابوبکر صدیق نے ممبر پر کھڑے ہو کر یہ آیات پڑھی۔ وما محمد الا رسول قد خلت من قبله الرسل افائن مات او قتل انقلبتم علی اعقابکم ومن ینقلب علی عقبیه فلن یضر الله شیئا وسیجزی الله الشکرین (اور محمد (ﷺ) نرے رسول ہی تو ہیں آپ سے پہلے اور بھی بہت رسول گزر چکے ہیں سو اگر آپ کا انتقال ہو جائے یا شہید ہی ہو جائیں تو کیا تم کل الٹے پھر جاؤ گے اور جو شخص الٹا پھر بھی جائے گا تو خدا تعالیٰ کا نقصان نہ کرے اور اللہ تعالیٰ جلد ہی ثواب دیدیگا شکر گزار لوگوں کو) اور انک میت وانهم میتون ٥ ثم انکم یوم القیمة عند ربکم تختصمون (آپ کو بھی مرنا ہے اور ان کو بھی مرنا ہے پھر قیامت کے روز تم مقدمات اپنے رب کے سامنے پیش کرو گے) اس وقت صحابہ کی آنکھیں کھل گئیں اور سب کی زبانوں پر یہی آیتیں تھیں یوں معلوم ہوتا تھا کہ یہ آیتیں گویا آج ہی نازل ہوئی ہیں۔ حضرات صوفیہ نے اس واقعہ کا راز بیان کیا ہے کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ کو حضور ﷺ کے وصال کے بعد بھی آپ سے بعد نہ ہوا تھا جیسا قرب حیات میں تھا وصال کے بعد بھی ویسا ہی حاصل تھا اس لئے ان کو دوسرے صحابہ کی طرح بدحواسی اور زیادہ پریشانی نہیں ہوئی وہ اسی طرح مستقیم رہے جیسا کہ حضور ﷺ کے سامنے مستقیم تھے یہی وجہ ہے کہ حدیث میں حضرت عمرؓ کے لئے آیا ہے لو کان بعدی نبیا لکان عمر اگر میرے بعد کوئی نبی ہوتا تو وہ عمر ہوتے اور حضرت صدیقؓ کے بارے میں یہ بات نہیں فرمائی اس کے جواب مختلف طور پر علماء نے دیئے ہیں مگر مجھ کو اپنے استاد کا جواب زیادہ پسند ہے۔

وللناس فیما یعشقون مذاهب

حضرت صدیق اکبرؓ کا حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام سے تعلق فنائے تام:

مولانا نے اس کی وجہ بیان فرمائی کہ حضرت صدیقؓ کو حضور ﷺ کے ساتھ قرب اور فنائے تام کا ایسا تعلق تھا کہ وہاں بعدی کہنے کی گنجائش نہ تھی کیونکہ بعدیت کیلئے غیریت ضروری ہے اور حضرت صدیقؓ کو حضور ﷺ سے گویا غیریت بالکل نہ تھی وہ تو گویا۔

من تو شدم تو من شدی من تن شدم تو جاں شدی
تا کس نہ گوید بعد ازیں من دیگرم تو دیگری

(میں آپ کا ہو گیا آپ میرے ہو گئے میں مثل بدن ہو گیا آپ مثل جان ہو گئے تا کہ اس کے بعد کوئی یہ نہ کہہ سکے کہ میں اور آپ دو ہیں کا مصداق تھے اس لئے حضرت صدیقؓ کے واسطے آپ نے یہ نہیں فرمایا کہ اگر میرے بعد کوئی نبی ہوتا تو ابوبکر ہوتے۔ ان میں بعدیت اور غیریت کا مرتبہ ہی نہ تھا۔ اور یہ ایسی بات ہے جس کا محض ان نکات پر مدار نہیں بلکہ نصوص قرآنیہ اور حضور ﷺ کے برتاؤ وغیرہ اس کے کافی دلائل ہیں قرآن میں ان اللہ معنا (غم مت کرو خدا تعالیٰ ہمارے ساتھ ہے) فرمایا جس وقت حضرت صدیقؓ اور حضور ﷺ ہجرت کرنے کے لئے غار ثور میں جا کر چھپے اور کفار نے ان کو تلاش کیا اور غار تک پہنچ گئے اور یہاں تک کہ حضرت صدیق نے ان کو چلتا پھرتا دیکھا تو وہ گھبرا گئے اور حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا لا تحزن ان اللہ معنا غم مت کرو خدا تعالیٰ ہمارے ساتھ ہے۔ معنا میں حضرت صدیقؓ بھی تھے جس سے حضور ﷺ کے ساتھ ان کی کامل معیت اور موافقت معلوم ہوتی ہے اور حضور ﷺ کے برتاؤ تو بکثرت ایسے تھے جن سے حضرت صدیق کا حضور ﷺ کے ساتھ کامل اتحاد صاف صاف معلوم ہوتا ہے بلکہ حق تعالیٰ نے بعض اسباب ایسے جمع کر دیئے ہیں جن میں اشارہ آپ کے کامل اتحاد کی طرف نکل سکتا ہے۔

علماء مشائخ کا ایک خلاف سنت عمل:

چنانچہ ایک اشارہ اسی واقعہ ہجرت سے معلوم ہوگا جس وقت حضور ﷺ نے ہجرت کی ہے تو آپ نے اہل مدینہ کو تاریخ سے اطلاع نہ دی تھی کہ آپ کس دن مدینہ پہنچیں گے۔ صحابہ ہر روز مدینہ سے باہر آپ کے اشتیاق میں آتے تھے اور دوپہر کے قریب واپس ہو جاتے تھے۔ مجھے اس واقعہ سے آج کل کے علماء اور مشائخ کا طرز دیکھ کر افسوس ہوتا ہے کہ ان میں یہ عرف اور رسوم خلاف سنت کیوں ہیں کہ پہلے اپنی آمد کی تاریخیں مقرر کرتے ہیں تا کہ اس تاریخ پر ان کا شاندار

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] | [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

میں پس حضرت علیؓ کے ان علوم میں قرب کو بڑا دخل تھا چنانچہ ان کے اقوال نہایت نپے تلے ہوتے ہیں حکماء میں وہ بہت بڑے حکیم ہیں۔ پس خاندان والوں کو چونکہ نبی یا ولی سے قرب حسی زیادہ ہوتا ہے ان کو دوسروں کی نسبت زیادہ فیض ہوتا ہے وہ اس کے عادات واطوار سے دوسروں کی نسبت زیادہ واقف ہوتے ہیں۔ البتہ کبھی دوسرے لوگوں میں جب کسی کو قرب معنوی اور محبت و خلوص زیادہ ہوتا ہے تو وہ خاندان والوں سے بھی بڑھ جاتا ہے مگر ایسا کم ہوتا ہے اکثر خاندان والوں ہی کو بوجہ مناسبت اور قرب کے زیادہ نفع ہوتا ہے۔

حضرت داؤد علیہ السلام کے پورے خاندان کو شکر کا حکم:

اس لئے اس آیت میں داؤدؑ کے تمام خاندان کو خطاب کیا گیا ہے اگرچہ جن انعامات کا یہاں ذکر ہے وہ ظاہر میں خاص داؤد و سلیمانؑ پر ہوئے ہیں مگر اس تمام تقریر سے معلوم ہوگا کہ درحقیقت یہ انعامات تمام خاندان کو شامل ہیں۔ خاندان میں ایک شخص کے مقبول ہو جانے سے ظاہری اور معنوی دونوں طرح کے فیض خاندان والوں کو دوسروں سے زیادہ حاصل ہوتے ہیں بشرطیکہ وہ طالب بھی ہوں اور ان فیوض و برکات سے فائدہ اٹھانا بھی چاہیں اس لئے حق تعالیٰ نے داؤدؑ کے پورے خاندان کو متنبہ فرمایا ہے کہ یہ انعامات تم سب پر ہیں سب کو ان کا شکر ادا کرنا چاہئے۔

اعمال صالحہ ہی شکر کے غایت ہیں:

فرماتے ہیں اعملوا ال داود شکرا یہاں شکرًا مفعول نہیں ہے ورنہ اس کے لئے واشکروا کافی تھا بلکہ مفعول لہ ہے اور اعملوا کا مفعول بہ یہاں بھی وہی مقدر ہے جو اس کے قبل ملفوظ ہے یعنی واعملوا صالحا یہاں یہ مفعول لہ اس لئے بڑھایا تا کہ اس سے معلوم ہو جاوے کہ شکر ہی غایت ہے اعمال صالحہ کی یعنی اعمال صالحہ اسی لئے وضع کئے گئے کہ اس سے شکر کا ضروری اور مہتم بالشان ہونا معلوم ہو گیا ہوگا مجھے اس وقت اسی کا بیان کرنا زیادہ مقصود تھا اور میں مستورات کے خیال سے سہل مضامین بیان کرنے کا قصد کر رہا تھا نہ معلوم یہ تمہید لمبی کیسی ہو گئی مگر امید ہے کہ وہ سمجھ گئی ہوں گی گو سب مضامین مع ہیئت ترکیبیہ نہ سمجھی ہوں مگر ہر جز و فرد افرداً ان کی سمجھ میں بھی آ گیا ہوگا۔ خیر یہ مضامین بھی ضروری تھے جو اہل علم کے کام کے ہیں۔ میرا مقصود یہ تھا کہ آج کل ہم لوگوں میں یہ بڑی کوتاہی ہے کہ ہم میں شکر کا مادہ کم ہے۔

شکر کی کمی کا ایک سبب:

ہم لوگ حق تعالیٰ کی نعمتوں کا بہت کم شکر کرتے ہیں۔ اور افسوس یہ ہے کہ بعضوں کو تو خدا تعالیٰ کے احسانوں کا علم بھی نہیں چنانچہ اگر کوئی غریب مصیبت زدہ خدا تعالیٰ کا شکر کرے تو اس سے بعضے لوگ کہتے ہیں کہ تو کس چیز کا شکر کرتا ہے تیرے پاس کونسی نعمتیں ہیں افسوس! اس سے معلوم ہوتا ہے کہ لوگوں کو خدا تعالیٰ کی نعمتوں کا علم بھی نہیں بعض لوگ بیماری میں زیادہ گھبرا جاتے ہیں اور خدا تعالیٰ کی شکایتیں کرنے لگتے ہیں حالانکہ بیماری کے اندر بھی غور سے دیکھا جائے تو خدا تعالیٰ کی نعمتیں ضرور ہوتی ہیں مگر اپنے سے زیادہ بیمار کو دیکھا جائے تو اس وقت حقیقت معلوم ہو کہ یہ بیماری بھی اس کے لحاظ سے ایک بڑی نعمت ہے پھر خدا تعالیٰ کا یہ کتنا بڑا احسان کہ بیماری دی تھی تو اس کے ساتھ دوا کے دام بھی دیئے عطار اور حکیم اور تیماردار بھی پیدا کیے پھر بعض دفعہ اس بیماری میں خود بہت سی مصلحتیں بعد کو معلوم ہوتی ہیں۔ ایک صحابی کی ٹانگ ٹوٹ گئی تھی اس کی حکمت ان کو حضرت علی و حضرت امیر معاویہؓ کی لڑائی کے وقت معلوم ہوئی کہ جو تندرست تھے اکثر اس میں شریک ہوئے اور ان صحابی سے کسی نے شریک ہونے کو کہا ہی نہیں کیونکہ وہ جانتے تھے کہ یہ لنگڑے ہیں لڑائی سے معذور ہیں اور اگر کسی نے کہا بھی تو وہ اپنی ٹانگ کا عذر بیان کر کے چھوٹ گئے اس وقت ان کو اپنی ٹانگ ٹوٹنے کی قدر ہوئی کہ اس نے بہت کام دیا کیونکہ ان لڑائیوں میں جو خون ہوئے ہیں وہ بہت محترم خون تھے دونوں طرف صحابہ ہی صحابہ تھے اول تو مطلق مسلمان کا خون محترم ہے پھر صحابہ کا خون تو بہت ہی محترم ہے اس میں ہاتھ رنگنے سے بچ جانا بہت بڑی نعمت تھی۔ اب ہم کو اس میں گفتگو بھی نہ کرنا چاہئے کہ کون حق پر تھے۔

حضرات صحابہؓ نفسانیت سے پاک تھے:

حضرات صحابہ نفسانیت سے پاک تھے انہوں نے جو کچھ کیا محض للہیت سے کیا ان تمام جھگڑوں کا منشاء اجتہادی غلطی تھی سو مجتہد کو غلطی پر ثواب ملتا ہے بس اس سے زیادہ گفتگو فضول ہے اس بارے میں حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کا مقولہ بہت ہی عجیب ہے وہ فرماتے ہیں **تلک دماء طهر الله عنها ایدینا فلنطهر عنها السنتنا** یہ ایسے خون ہیں کہ خدا تعالیٰ نے ان سے ہمارے ہاتھوں کو پاک صاف رکھا ہے تو ہم کو زبانیں بھی ان سے پاک رکھنی چاہئیں۔ جب خدا تعالیٰ نے

ہمارے ہاتھوں کو ان سے ملوث نہیں کیا تو ان کی شان میں بے ادبی اور گستاخی کر کے ہم نے اپنی زبانوں کو کیوں گندہ کریں دوسرے یہ اختلاف بڑوں بڑوں کا ہے چھوٹوں کا اس میں بولنا زیبا نہیں۔ باپ اور چچا میں اگر جھگڑا ہو تو دونوں کی اولاد کو اس میں بولنا اور ان میں سے کسی ایک کے ساتھ بے ادبی کرنا ہرگز مناسب نہیں کیونکہ آخر تو وہ دونوں بھائی بھائی ہیں آپس میں ایک دوسرے کو وہ جو چاہیں کہہ لیں مگر چھوٹوں کی زبان سے کوئی شخص اپنے بھائی کی توہین گوارا نہیں کر سکتا۔ غرض بعض دفعہ وہ مصیبت ہی خود نعمت ہوتی ہے جس کا نعمت ہونا بعد میں معلوم ہوتا ہے اور اگر اپنی محبت بھی خدا تعالیٰ نے دی ہو تو تب تو بیماری کا لطف بہت آتا ہے تکلیف اور درد بھی راحت ہی معلوم ہوتا ہے۔

از محبت تلخہا شیریں شود

(راستہ کی ساری تلخیاں محبت سے شیریں ہو جاتی ہیں)

عاشق تو بیماری اور درد میں یہ کہتا ہے۔

درد از یار ست و درماں نیز ہم　　　دل فدائے آں شدو جاں نیز ہم

(درد بھی محبوب کا دیا ہوا ہے دوا بھی وہی کرے گا میں تو دل و جان سے اس پر فدا ہو چکا ہوں)

عاشق کو محبوب کی مار میں وہ لطف آتا ہے جو دوسروں کے پیار میں بھی نہیں آتا دیکھو اگر کسی کا محبوب پیچھے سے آ کر عاشق کی آنکھیں بند کر کے اس کو زور سے دبا لے تو اول تو گھبرائے گا کہ یہ کون ہے مگر صورت دیکھ کر پہچان کر وہ کس درجہ خوش ہوتا ہے اب تو وہ چاہے گا کہ اور زور سے دبائے اور اس کی کوشش کرے گا کہ اپنے بدن کو اس کے سینے سے خوب لگا دے بلکہ اگر محبوب پوچھے بھی کہ اگر دبانے سے تکلیف ہوتی ہو تو تجھ کو چھوڑ کر فلانے کو جو میرا دوسرا عاشق ہے دبا لوں تو وہ یوں کہے گا

نشود نصیب دشمن کہ شود ہلاک تیغت　　　سر دوستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی

(دشمن کا ایسا نصیب نہ ہو کہ آپ کی تیغ کا کشتہ بنے۔ دوستوں کا سر ہی سلامت رہے کہ ان پر آپ کا خنجر ہے)

تو جو لوگ بیماری میں گھبرا جاتے ہیں اور خدا تعالیٰ سے شکایتیں کرنے لگتے ہیں۔ ان کے دل محبت سے خالی ہیں ورنہ ان کو درد میں بھی لطف آتا۔ عارفین سے اس کی لذت کو پوچھو وہ بیماری میں کیسے مسرور ہوتے ہیں گو ظاہر میں تکلیف ہوتی ہو۔

جو کشف قرآن وحدیث کے خلاف ہو وہ غلط ہے:

بلکہ بعض عارفین کو تو اس لذت کا اس قدر غلبہ ہوا کہ وہ یہ سمجھ کر منشاء اس لذت کا معرفت ہے یوں کہنے لگے کہ کفار کو بھی کچھ مدت کے بعد جہنم کا عذاب معلوم نہ ہوگا کیونکہ اس وقت ان کو حق تعالیٰ کی معرفت حاصل ہو جائے گی اور معرفت کے بعد وہ سمجھ جائیں گے کہ یہ حق تعالیٰ کی طرف سے ہے اس معرفت کی لذت میں ان کو جہنم کے عذاب کا احساس نہ ہوگا بلکہ ان کو اس میں بھی لذت آئے گی۔ اس میں متن شیخ ابن عربی کا ہے اور شرح ایک بزرگ نے کی ہے۔ شیخ ابن عربی نے صرف اتنا کہا تھا کہ اہل جہنم کو ایک مدت بعد عذاب کا احساس نہ ہوگا۔ ایک بزرگ شارح نے اس کی علت یہ بیان کر دی کہ ان کو اس وقت معرفت نصیب ہو جائے گی اور معرفت کے بعد عذاب لذیذ معلوم ہوگا جیسا کہ عارفین کو دنیا کی تکالیف اور بیماریاں اسی معرفت سے لذیذ معلوم ہوتی ہیں مگر قواعد سے یہ متن اور شرح دونوں غلط ہیں۔ نصوص قرآنیہ سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ کفار کو ہمیشہ عذاب کا احساس ہوگا اور روز بدن عذاب میں زیادتی معلوم ہوگی۔ کلما نضجت جلودھم بدلنا ھم جلوداً غیرھا لیذوقوا العذاب ٥ لا یخفف عنھم الاعذاب ولا ھم ینظرون ٥ زدناھم فوق العذاب بما کانو یفسدون ٥ (ان سے عذاب ہلکا نہ ہونے پائے گا اور نہ اس کو مہلت دی جائے گی جب ایک مرتبہ ان کی کھال جل چکے گی تو ہم اس پہلی کھال کی جگہ فوراً دوسری کھال پیدا کر دیں گے تاکہ عذاب چکھتے رہیں ان کو ہم بڑھا دیں گے عذاب پر عذاب بدلہ میں ان کی شرارت کے) ان صاف اور صریح آیات کے بعد ہرگز اس قول کی صحت قابل تسلیم نہیں شیخ نے تو محض ایک کشف لکھا ہے اور دلیل کچھ بیان نہیں کی تو ہم صاف کہتے ہیں کہ جو کشف قرآن وحدیث کے خلاف ہو وہ بالکل غلط ہے اور شارح نے جو اس کی دلیل بیان کی ہے اس میں ان کو دھوکا ہوا ہے وہ لذت کا مدار نفس معرفت پر سمجھتے ہیں۔ حالانکہ لذت کا مدار معرفت اور محبت کا مجموعہ ہے۔ سو ہم نے مانا کہ کفار کو ایک وقت میں معرفت نصیب ہو جائے گی۔ مگر یہاں کہاں سے معلوم ہوا کہ ان کو محبت بھی حاصل ہو جائے گی۔ کفار کو محبت خاک نصیب ہوگی۔ بلکہ عجب نہیں کہ معرفت کے بعد ان کو خدا تعالیٰ سے بغض وعداوت پہلے سے زیادہ ہو جاوے۔ کیونکہ جب تک کہ ان کو خدا تعالیٰ کی معرفت حاصل نہ تھی نہ معلوم وہ اس عذاب کی وجہ اور علت کیا سمجھتے ہوں گے اور معرفت کے بعد تو ان کو صاف معلوم ہوگا کہ حق تعالیٰ کے حکم سے ہم کو عذاب ہو رہا ہے اور ہماری یہ تکلیف اس کی مشیت سے ہے تو اس حالت میں محبت پیدا ہوگی یا بغض زیادہ ہوگا۔ اس لئے یہ دلیل بالکل غلط ہے۔ اور میں تو کیا چیز ہوں جو ان حضرات کی غلطیاں نکالوں۔

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

ادا کرتی ہیں وہ بھی خدا تعالیٰ کے شکر سے غافل ہیں خاوند کا اس لئے شکر کرتی ہیں کہ وہ چھنا چھن روپے لاتا رہتا ہے پہننے کو زیور اور کپڑے عمدہ بنا دیتا ہے تو اس کو تو روپیہ اور زیور لاتے ہوئے دیکھتی ہیں اسلئے اس کا شکر ادا کر دیتی ہیں اور خدا تعالیٰ کو کچھ دیتے دلاتے دیکھا نہیں اس لئے خدا تعالیٰ کا دھیان بھی نہیں آتا اور کسی کو ذرا بھی خیال نہیں ہوتا کہ سب نعمتیں اسی کی دی ہوئی ہیں اس کا شکر بھی کرنا چاہیے۔ البتہ کھانا کھا کر عورتیں اتنا ضرور کہہ دیتی ہیں کہ اللہ تعالیٰ تیرا شکر بس ان کا بڑا شکر کھانے کے وقت ادا ہوتا ہے اور اس زبانی شکر ہی کو وہ شکر سمجھتی ہیں اس لئے شاید ان کو یہ خیال بھی ہوا ہو کہ ہم تو دونوں وقت کھانا کھا کر خدا تعالیٰ کا شکر کرتے ہیں پھر ہم کو ناشکر کیوں کہا جاتا ہے۔

شکر کی حقیقت:

سو بات یہ ہے کہ ان کو ابھی تک شکر کی حقیقت ہی معلوم نہیں ہوتی حقیقت معلوم ہو جائے تو وہ خود کہیں گی کہ واقعی ہم بہت ناشکری کرتے ہیں۔ اس غلطی میں اکثر لوگ مبتلا ہیں کہ وہ زبان سے اللہ تعالیٰ تیرا شکر کہنے ہی کو شکر سمجھتے ہیں اس غلطی کو قرآن شریف نے دفع کیا ہے۔ فرماتے ہیں اعملو اال داوٗد شکرا اے ال داوٗد شکر کے لئے عمل کرو۔ اس سے معلوم ہوا کہ شکر کا تعلق عمل سے بھی ہے صرف قول ہی سے تعلق نہیں۔

شکر کا محل عام ہے:

اگر شکر کا تعلق صرف قول سے ہوتا تو اعملوا نہ فرماتے شکرا فرماتے۔ بس قرآن میں شکر کے لئے اعملوا فرمانا اس کی صاف دلیل ہے کہ شکر کا تعلق عمل سے بھی ہے۔ اور یہی ہمارے علماء نے لکھا ہے کہ شکر کا محل عام ہے لسان و قلب و اعضاء سب سے شکر ہوتا ہے اس مضمون کو ایک شاعر نے بھی بیان کیا ہے

افادتکم النعماء منی ثلثة　　　یدی ولسانی والضمیر المحجبا

(میری نعمتوں میں سے جو تم کو عطا کی گئی ہیں تین نعمتیں لوگوں کو زیادہ فائدہ پہنچاتی ہیں ہاتھ، زبان، دل)

تو حق تعالیٰ یہ فرماتے ہیں کہ شکر کے لئے عمل کرو۔ اور عورتیں صرف کھانا کھا کر یا سونے کے کڑے پہن کر زبانی شکر کرتی ہیں۔ وہ بھی شوہر کے سامنے نہیں نہ اس کے سامنے پہن کر جائیں گی اس کے سامنے زبان سے بھی کبھی شکر نہیں کریں گی اس کے سامنے تو ہر چیز کو کم ہی ظاہر کریں گی تاکہ آج سونے کے کڑے لایا ہے تو کل کو خوشامد میں سونے کی کڑیاں لاوے گا شہتیر لاوے گا۔ سونے چاندی سے ان کو کبھی سیری ہی نہیں ہوتی۔

عورتوں کو اپنے شوہروں کے شکر کی ضرورت:

مگر سب ہی ایسی نہیں بعض عورتیں اللہ تعالیٰ کی بندیاں ایسی بھی ہیں جو شوہر کو معظم سمجھتی ہیں۔ اس کی لائی ہوئی چیزوں کو شکریہ کے ساتھ قبول کرتی ہیں اور جن کا اس حدیث پر عمل ہے من لم یشکر الناس لم یشکر اللہ جس نے آدمیوں کا شکر نہیں کیا وہ خدا تعالیٰ کا بھی شکر نہیں کرتا۔ سو یاد رکھو کہ جب تک شوہر کا شکر نہ کرو گی اس وقت تک اللہ تعالیٰ کے ہاں تیرا شکر بھی قبول نہ ہوگا۔ خدا تعالیٰ یہ چاہتے ہیں کہ جب ہم کوئی نعمت اپنے کسی بندے کے ذریعہ سے تم کو دیں تو ہمارے شکر کے ساتھ اس آدمی کا شکر بھی کرو۔ غرض شکر کی حقیقت یہ ہے کہ زبان سے بھی شکر و کرو ہاتھ اور پاؤں سے شکر کرو۔ دل سے بھی شکر کرو اور زبان کا شکر یہی نہیں ہے کہ صرف اللہ تعالیٰ تیرا شکر کہہ دیا کرو بلکہ زبان کو ان کاموں میں مشغول کرو جو خدا تعالیٰ کو پسند ہیں اور ان باتوں سے بچاؤ جن سے وہ ناراض ہوتے ہیں۔ زبان سے خدا تعالیٰ کا ذکر کرو قرآن کی تلاوت کرو۔ مسئلے مسائل پڑھو دوسروں کو بتلاؤ زبان سے غیبت نہ کرو۔ چغلی نہ کھاؤ۔ جھوٹ نہ بولو۔ یہ زبان کا شکر ہے۔ کان کے متعلق شکر یہ ہے کہ اچھی باتیں سنو۔ قرآن اور مسئلے مسائل اور اللہ تعالیٰ و رسول اللہ ﷺ کی باتیں سنو۔ غیبت اور چغلی اور حکایات و شکایت نہ سنو۔

دل کا شکر:

دل کے متعلق شکر یہ ہے کہ اس میں خدا تعالیٰ اور رسول اللہ ﷺ کی محبت پیدا کرو۔ تواضع اور مسکنت اور توکل اور خوف خدا تعالیٰ پیدا کرو۔ اور بری عادتیں اس میں سے نکال دو۔ تکبر اور حسد اور عجب وغیرہ سے اس کو پاک وصاف رکھو کسی کو حقیر نہ سمجھو۔

اپنے خاتمہ بالخیر ہونے کا علم کسی کو نہیں:

علماء نے لکھا ہے کہ مومن جب تک اپنے کو کافر فرنگ سے بھی بدتر نہ سمجھے اس وقت تک مومن نہیں اس کی حقیقت تو اہل حال سمجھتے ہیں مگر اس کی ایک ظاہری توجیہ تو یہی ہے کہ خاتمہ کا حال کسی کو معلوم نہیں اس لئے بالتعیین کسی کافر سے اپنے کو افضل نہ کہے کیا خبر ہے کہ اس کا خاتمہ ایمان پر ہو جائے اور خدانخواستہ ہمارا خاتمہ برا ہو جائے تو وہ ہم سے افضل ہو جائے۔ حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ کے پڑوس میں ایک بنیا رہتا تھا وہ مر گیا تو مولانا نے اس کو جنت میں پھرتا دیکھا پوچھا کہ لالہ جی تم یہاں کہاں؟ کہنے لگا مولوی جی مرتے وقت میں نے ان کہنی (یعنی

کلمہ شریف) کہہ لی تھی اس وقت تک فرشتے نظر نہ آئے تھے وہ ان کہنی قبول ہوگئی۔ لیجئے لالہ جی نے ساری عمر تو کفر میں گزاری اور اخیر عمر میں جنت لے مرے تو خاتمہ کا حال کسی کو معلوم نہیں اس لئے کسی خاص شخص سے خواہ وہ کافر ہی ہو اپنے کو افضل نہ سمجھے۔ البتہ اجمالاً یہ عقیدہ رکھے کہ جن کا خاتمہ ایمان پر ہوگا وہ ان لوگوں سے اچھے ہیں جو کافر مریں گے۔ نیز دل میں کسی مسلمان سے دنیاوی معاملات کی وجہ سے عداوت نہ رکھے یہ دل کا شکر ہے۔

سارے بدن کا شکر:

اور سارے بدن کے متعلق یہ شکر ہے کہ عورت کوئی ایسا کپڑا نہ پہنے جس سے بدن جھلکے۔ اور نامحرم سے پردہ میں کمی نہ کرے۔ اپنی مسلمان بہن کے سامنے بڑا بننے یا اترانے کے واسطے کوئی بڑھیا کپڑا یا زیور نہ پہنے جس سے اس کا دل ٹوٹے۔ اسی طرح مرد کوئی لباس خلاف شرع نہ پہنے۔

کامل شکر:

غرض کامل شکر یہ ہے کہ تمام اعضاء زبان اور ہاتھ دل سب کے سب خدا تعالیٰ کی عبادت میں مشغول ہوں دل میں محبت و معرفت الٰہی ہو اور کسی عضو سے گناہ کا ارتکاب نہ ہو۔ اس وقت تم شاکر ہوگی۔ اس لئے کہ تم کو ایک احکام جاننے کی۔ دوسرے ہمت کی ضرورت ہوگی۔ سو بحمد اللہ اس وقت علم کا سامان بہت آسان ہوگیا ہے ضروری معلومات کے لئے بہشتی زیور کے حصے بھی کافی ہیں۔ سو سب سے پہلے تو علم کا اہتمام کرنا چاہئے دوسری ضررت ہے ہمت کی کہ دل سے یہ ہمت کرلو کہ ہم خدا تعالیٰ کی نافرمانی کبھی نہ کریں گے اگر کوئی غیبت اور شکایت کی باتیں کرے اس کی بات ہرگز نہ سنو چاہے کوئی ہو اگر کہیں خلاف شرع رسمیں ہوں وہاں کبھی نہ جاؤ چاہے۔ ساری برادری ناراض ہوجائے کچھ پرواہ نہ کرو۔

ذکر اللہ سے ہمت میں برکت ہوتی ہے:

قیامت میں یہ برادری کام نہ آئے گی تمہاری ہمت ہی کام آئے گی۔ پھر اس ہمت کو برکت اور قوت اللہ اللہ کرنے سے ہوتی ہے اس لئے کچھ ذکر شروع کردو اور یہ مت سمجھو کہ اصلاح کے لئے بس تسبیح پڑھ لینا کافی ہے یہ تنہا کافی نہیں اس سے تو صرف ہمت کو قوت ہوجاتی ہے دل میں انوار پیدا ہوتے ہیں اور ان سے عمل میں برکت ہوتی ہے اور اصل ضرورت عمل کی ہے۔ اسی طرح یہ خیال نہ کیا جائے کہ ذکر و شغل کرنے سے پھر ہمت کی ضرورت نہیں رہے گی۔ ہمت سے تو پھر بھی کام لینا

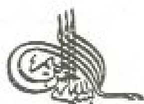
ہوگا۔ اگر ہمت ہی ہار دی تو پھر بیچاری تسبیح کیا کرلے گی۔ پھر اس سب کی امانت کے لئے ایک کام یہ کرو کہ سوتے ہوئے موت کا مراقبہ کرو۔ یہ سوچو کہ ایک دن ہم دنیا سے جانے والے ہیں موت کے فرشتے ہماری جان نکالیں گے اس وقت دنیا کے تمام دھندے خود بخود چھوٹ جائیں گے اور اس وقت ہم کو نیک کاموں کی حسرت ہوگی کہ ہم نے نیک کام بہت زیادہ کیوں نہ کیے تو ہم کو چاہیے کہ ابھی سے برے کاموں کو چھوڑ دیں اور نیک کاموں کا شوق کے ساتھ اہتمام کریں اللہ تعالیٰ کی یاد میں لگیں پھر قبر کا حال سوچو پھر حساب و کتاب اور قیامت کا تصور کرو۔ یہ سمجھو کہ ایکدن خدا تعالیٰ کے سامنے جانا ہے حق تعالیٰ سب کاموں سے سوال کریں گے قیامت میں گناہ گاروں کو رسوائی ہوگی اس مراقبہ سے خدا تعالیٰ کا خوف دل میں پیدا ہوگا بہت سے کام خوف سے درست ہو جاتے ہیں۔

حق تعالیٰ شانہ، کی شکایت:

اس کے بعد حق تعالیٰ فرماتے ہیں وقلیل من عبادی الشکور اس میں حق تعالیٰ بندوں کی شکایت فرماتے ہیں اور ایسی شکایت ہے کہ اگر ہم باغیرت ہوتے تو مر جاتے فرماتے ہیں کہ میرے بندوں میں شکر گزار بہت کم ہیں۔ زیادہ ناشکرے ہیں یہ ایسی بات ہے جیسے کوئی آقا اپنے نوکروں کو سنا کر کہے کہ نمک حلال نوکر بہت کم ہیں ظاہر ہے کہ غیرت مند تو اس بات سے زمین پر گڑ جائے گا، اس سے یہ بھی بات معلوم ہوگئی کہ شکر فقط زبان ہی سے نہیں ہوتا کیونکہ زبانی شکر تو ہر شخص کرسکتا ہے زبان سے تو اللہ تعالیٰ تیرا شکر ہے ہر آدمی کہہ لیتا ہے اگر شکر کی یہی حقیقت ہوتی تو حق تعالیٰ اتنی بڑی شکایت نہ فرماتے کہ میرے بندوں میں شکر گزار کم ہیں معلوم ہوا کہ شکر کا زیادہ تعلق عمل سے ہے اور بے شک عمل کرنے والے بہت تھوڑے ہیں اسی لئے یہ شکایت کی گئی۔ تو صاحبو! ہم کو حق تعالیٰ کی شکایت سے غیرت کرنی چاہئے اور اپنے تمام اعمال کو درست کرنا چاہئے اس وقت ہم شاکر کہلا سکتے ہیں۔ اب دعا کیجئے کہ حق تعالیٰ ہم کو فہم کی توفیق اور عمل کی ہمت عطا فرماویں۔

اس کے بعد حسب معمول حضرت والا نے خاموشی کے ساتھ دعا فرمائی اور سب حاضرین نے بھی دعا کے لئے ہاتھ اٹھائے۔ اے اللہ تعالیٰ اس ناچیز غلام اور عبدالمنان کو بھی شاگردوں میں داخل فرما۔ اور اس کو اپنے مقبول بندے حضرت حکیم الامتؒ کے برکات و فیوض سے متمتع فرما کر ایمان کامل پر خاتمہ نصیب فرمایئے۔ آمین۔

واخردعونا ان الحمد للہ رب العلمین وصلی اللہ تعالیٰ وسلم علیٰ خیر خلقہ سیدنا ومولانا محمد وعلیٰ الہ واصحابہ اجمعین۔ ۱۱ ما بع



التنبہ

متنبہ کرنا

یہ وعظ ۲ جمادی الاخری ۱۳۳۱ھ بروز جمعہ بمقام جامع مسجد تھانہ بھون جو کہ حضرت والا نے بیٹھ کر ایک گھنٹہ ۵۵ منٹ ارشاد فرمایا۔

سامعین کی تعداد تقریباً ۷۵ تھی۔ جس کو مولانا ظفر احمد صاحب نے قلم بند فرمایا۔

خطبہ ماثورہ

بسم اللّٰہ الرحمن الرحیم

الحمد للّٰہ نحمد ونستعینہ ونستغفرہ ونومن بہ ونتوکل علیہ ونعوذ باللّٰہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا من یھدہ اللّٰہ فلامضل لہ ومن یضللہ فلاھادی لہ ونشھد ان لاالہ الا اللّٰہ وحدہ لاشریک لہ و نشھد ان سیدنا محمدًا عبدہ ورسولہ صلی اللّٰہ علیہ والہ واصحابہ وسلم اما بعد فاعوذ باللّٰہ من الشیطن الرجیم بسم اللّٰہ الرحمن الرحیم.

ولقد ارسلنا الی امم من قبلک فاخذ ناھم بالباساء والضراء لعلھم یتضرعون فلولا اذا جآءھم باسنا تضرعو اولکن قست قلوبھم وزین لھم الشیطن ماکانو یعملون ۝ فلما نسواماذکروبہ فتحنا علیھم ابواب کل شئی حتی اذا فرحوا بما اوتوا اخذناھم بغتۃ فاذا ھم مبلسون فقطع دابر القوم الذین ظلموا والحمدللّٰہ رب العالمین۝

ترجمہ:۔ اور ہم نے امتوں کی طرف بھی جو آپ سے پہلے گزر چکی ہیں پیغمبر بھیجے تھے سو ہم نے ان کو تنگدستی اور بیماری سے پکڑا تاکہ وہ ڈھیلے پڑ جائیں سو جب ان کو ہماری سزا پہنچی تھی وہ ڈھیلے کیوں نہ پڑے لیکن ان کے قلوب تو سخت ہی رہے اور شیطان ان کے اعمال کو ان کے خیال میں آراستہ کر کے دکھلاتا رہا پھر جب وہ لوگ ان چیزوں کو بھولے رہے جن کی ان کو نصیحت کی جاتی تھی تو ہم نے ان پر ہر چیز کے دروازے کشادہ کر دیئے یہاں تک کہ جب ان چیزوں پر جو کہ ان کو ملی تھی وہ اترا گئے ہم نے ان کو دفعتہً پکڑ لیا تو وہ بالکل حیرت زدہ ہو گئے پھر ظالم لوگوں کی جڑ کٹ گئی اور اللہ تعالیٰ ہر قسم کی تعریف کے لائق ہیں جو تمام عالم کے پروردگار ہیں۔

تمہید

ملت اسلامیہ کا خاص امتیاز:

یہ چند آیتیں ہیں سورہ انعام کی ان آیتوں میں جو مضمون مذکور ہے وہ اس وقت کی حالت کے مناسب ہے اور اسی لئے مضمون کو اس وقت اختیار کیا جاتا ہے یعنی ہر وقت میں انسان کی ایک

حالت ہوتی ہے اور اس حالت کے مناسب حق تعالیٰ کے کچھ احکام ہوتے ہیں انسان کی کوئی ایسی حالت نہیں ہے جس کے متعلق قرآن میں کوئی نہ کوئی حکم مذکور ہے نہ ہو خواہ بلا واسطہ خواہ بواسطہ حدیث کہ حدیث میں اس حالت کے متعلق کچھ حکم ہوتا ہے سو حدیث بھی قرآن ہی کی تفصیل ہے بہر حال قرآن میں ہو یا حدیث میں شریعت اسلامیہ کا یہ خاص امتیاز ہے کہ کوئی حالت اور مواقع ایسا نہیں جس کے متعلق اس شریعت میں کوئی حکم نہ ہو اور اس کا راز یہ ہے کہ حق تعالیٰ فرماتے ہیں۔ **ایحسب الانسان ان یترک سدی** الایۃ۔ ترجمہ یہ ہے کہ کیا انسان چاہتا ہے کہ وہ مہمل چھوڑ دیا جائے یعنی ایسا نہیں ہو سکتا مہمل وہ ہے جس کے واسطے کوئی حکم نہ ہو کوئی اس سے تعرض نہ کرے جیسے ہندو بیل کو سانڈ بنا کر چھوڑ تے ہیں کہ چاہے وہ کھیت کھالے چاہے کچھ نقصان کر دے مگر اس سے کچھ تعرض نہیں کرتے اور اس سے کچھ نہیں کہتے۔ تو اگر انسان چاہتا ہے کہ آزاد رہے اور آزادی میں اپنی راحت سمجھتا ہے کیونکہ اس میں خواہش نفسانی اچھی طرح پوری ہوتی ہے مگر حق تعالیٰ بڑے رحیم کریم ہیں چونکہ آزادی میں اس کی مضرت تھی اس لئے اس کو آزاد نہیں کیا بلکہ اس کے واسطے احکام نازل فرما کر مقید کر دیا اگر اس کو مقید نہ کیا جاتا تو ایسی مثال ہوتی جیسے طبیب کسی مریض کو آزاد کر دے کہ جو کچھ چاہے کھائے پیئے پرہیز کسی چیز کا نہیں اب ظاہر ہے کہ اس مریض کا کیا حشر ہوگا اس مثال پر شاید کوئی یہ شبہ کرے کہ طبیب تو ادویہ و اغذیہ کے خواص کا صرف جاننے والا ہے وہ خواص اس کے ہاتھ میں نہیں اس لئے اس کی شفقت تو اسی میں ہے کہ مریض کو مقید کرے اگر اس نے آزاد کر دیا تو وہ دوائیں اور غذائیں ایک دن ایسا اثر پیدا کریں گی کہ جو وہ اس کے اختیار سے باہر ہوگا بخلاف حق تعالیٰ کے کہ سب خواص اشیاء ان کے ہاتھ میں ہیں ان کو قدرت ہے کہ آزاد کر کے پھر ان اشیاء کے خواص کے اثر کو ظاہر نہ ہونے دیں مثلاً حکیم کی شفقت تو اس میں ہے کہ زہر سے منع کرے کیونکہ اگر منع نہ کیا تو اس کی خاصیت طبیب کے ہاتھ میں تو ہے نہیں وہ ایسا اثر کرے گا جس کو طبیب نہیں روک سکتا اور حق تعالیٰ کے ہاتھ میں زہر کی خاصیت ہے۔ اس کو یہ بھی قدرت ہے کہ زہر کھا کر کوئی بھی نہ مرے وہ اس کے اثر کو روک سکتا ہے تو رحمت و شفقت کے لئے خدا کو یہی کیا ضرور تھا کہ انسان کو مقید ہی فرما دے شفقت کا یہ بھی تو ایک طریقہ تھا کہ آزاد کر کے خواص اشیاء کے اثر کو روک دیتے جیسا کہ خدا نے آگ کو ابراہیمؑ پر گلزار کر دیا۔ داؤدؑ کے لوہے کو نرم کر دیا۔ ایسا ہی اوروں کیلئے بھی کر دیتے ہیں تو در اصل یہ شبہ مسئلہ تقدیر کے متعلق ہے اس کا جواب وہی ہے جو مسئلہ قدر کا ہے جس میں زیادہ گفتگو کرنے سے شریعت نے ہم کو منع کر دیا ہے۔ مجملاً جواب کا

حاصل یہ ہے کہ حق تعالیٰ کی بعض مصالح اس کو مقتضی ہوئیں کہ ہر شے میں کوئی خاصیت و اثر رکھا جائے جو اس شے کے لئے لازمی ہو کفر و ایمان ایک خاصیت ہے علم و جہل میں ایک خاصیت طاعت و معصیت میں ایک خاصیت ہے۔ اور یہ بات نہیں کہ شریعت نے مسئلہ قدر میں گفتگو کرنے سے روکنے میں ہم پر جبر کیا ہے کہ دل مانے یا نہ مانے اس کو بلا گفتگو مانا جائے۔

حق تعالیٰ شانہ، کی عجیب رحمت:

بلکہ حق تعالیٰ شانہ، کی عجیب رحمت ہے کہ اس نے اسباب میں ہماری امداد بھی کی کہ جس مقدار پر مسئلہ تقدیر کی ہم کو تعلیم دی گئی ہے اس کو فطری بنا دیا ہے بلکہ فطرت اس سے گھبراتی ہے چنانچہ طبائع سادہ ہیں وہ اتنا کہہ دینے سے مطمئن ہو جاتی ہیں کہ میاں کی مصلحت اس کو مقتضی تھی اور اگر اسباب بیان کرنے لگو تو طبیعت کو قرار نہیں ہوتا اور وجہ یہ ہے کہ سب اسباب حادث ہیں ہر ایک سبب کے لئے کوئی مسبب ہوگا۔ آخر میں قرار اسی سے ہوتا ہے کہ خدا کی مرضی اسی کو مقتضی تھی کسی کو کوئی مہلک مرض ہوا اور وہ مر جائے اب اگر اسباب بیان کرنے بیٹھو تو کوئی کہتا ہے کہ فلاں چیز دی تھی اس سے پیٹ میں سدہ پیدا ہو گیا ہے اس سے پاخانہ پیشاب بند ہو گیا کوئی کہتا ہے کہ دماغ کو گرمی چڑھ گئی سرسام ہو گیا ہر ایک کو کچھ نہ کچھ خیالات پیدا ہوں گے مگر اس سے سوائے کلفت زیادہ ہونے کے کچھ حاصل نہ ہوگا جو سادہ طبیعت ہیں وہ یہی کہیں گے کہ میاں کہاں جھگڑا باندھا خدا کو یہی منظور تھا اس کی اسی میں مصلحت تھی سبحان اللہ حق تعالیٰ نے کیا تائید فرمائی ہے کہ جتنا ہم کو تقدیر کے ماننے پر حکم ہے اسی کو فطری بنا دیا ہے کہ ہمیشہ طبیعت کو اسی سے قرار ہوتا ہے تو چونکہ مسئلہ تقدیر کی طرف فطرت کیخلاف ہے اس لئے میں نے بھی اس شبہ کے جواب میں تفصیل کو چھوڑ دیا اور اجمال پر اکتفا کیا وہ یہ کہ

ہر چیز کی ایک خاصیت حق تعالیٰ شانہ کی حکمت ہے:

حق تعالیٰ کی حکمتیں لاانتہا ہیں اونہیں حکمتوں کا یہ مقتضا ہے کہ ہر شے میں ایک خاصیت رکھدی ہے۔ جس کا اثر ضرور ظاہر ہوتا ہے اب وہ سوال نہیں ہو سکتا کہ شفقت کا بھی ایک طریقہ تھا کہ آزاد کر دیا جاتا اور خواص اشیاء کے اثر کو روک دیا جاتا اب آپ کو معلوم ہو گیا کہ خدا کی حکمت اسی کو مقتضی ہے کہ جس شے میں جو خاصیت ہے اس کا اثر ظاہر ہو زنا میں جو ظلمت اور وحشت ہے وہ ضرور ظاہر ہو گی تظلم کا جو وبال ہے وہ یقیناً ہو کر رہے گا زمین دبانے کا جو قہر ہے وہ ضرور پڑے گا۔ اب

آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ حق تعالیٰ کی رحمت اسی میں ہے کہ آزاد نہ کیا جائے بلکہ مقید کر دیا جائے لہٰذا ہر حالت کے متعلق حق تعالیٰ کے کچھ احکام ہیں جس کو شریعت میں مفصلاً بیان کیا گیا ہے انہیں حالات میں سے ایک وہ حالت ہے جس میں ہم مبتلا ہو رہے ہیں تو اس کے متعلق کچھ احکام ہوں گے میں ان کو اس وقت بیان کر دینا چاہتا ہوں وہ حالت یہ ہے کہ دو مہینہ سے ہماری بستی میں طاعون پھیل رہا ہے اور عرصہ سے لوگ اسی کے قصہ میں ہیں بلکہ بعضوں کو تو جب سے طاعون آیا ہے ایک شغل ہاتھ آ گیا گلی کوچوں میں مارے مارے پھرتے ہیں اور مرنے والوں کے شمار معلوم کرتے ہیں اگر دوپہر تک کوئی نہ مرے تو کہتے ہیں میاں ابھی شام کو آنے دو وہ شام کا انتظار کرتے ہیں اگر شام تک سن لیا کہ کوئی مرا ہے تو تحفہ کے طور پر کہتے ہیں کہ لو میاں تم تو کہتے تھے کہ آج کوئی نہیں مرا فلاں مرا ہے ان لوگوں کے تو طاعون کا آنا اور باعث غفلت ہو گیا کہ انہوں نے اسی کو لہو و لعب بنا لیا مگر تاہم ہم اکثر لوگ اس وجہ سے پریشان ہیں اور ان پر طاعون کے آنے کا اثر بھی ہوا ہے اور ان کے دل پر چوٹ بھی لگی ہے مگر انہوں نے یہ غضب ڈھایا کہ ان میں سے بعض تو مصیبت سے پریشان ہو کر خدا کی ناشکری کرتے ہیں جب کوئی مر جاتا ہے تو اس طرح کی باتیں کرتے ہیں جس سے خدا کی شکایت ٹپکتی ہے یہ لوگ خدا کو رائے دیتے ہیں کہ ایسا کیوں کر دیا یا یوں کیوں نہ کیا اگرچہ صریح الفاظ سے نہ کہیں کہ ہم خدا کو رائے دیتے ہیں مگر ان کی باتوں سے مفہوم یہی ہوتا ہے غور کیجئے۔

حق تعالیٰ شانہ، کی شکایت کا سبب:

ہم نے بعضوں کو یہ کہتے سنا ہے کہ فلاں تو وقت سے پہلے مر گیا ابھی اس نے دیکھا ہی کیا تھا اب یہ رائے دینا نہیں تو اور کیا ہے گویا خدا کے احکام میں نقص نکالتے ہیں گویا یہ شخص موت کے وقت کو خدا سے زیادہ جانتا ہے جو کہتا کہ فلاں وقت سے پہلے مر گیا۔

تو صاحبو! بات یہ ہے کہ ہم لوگوں کے دماغ سڑ گئے ہیں ہم اپنے آپ کو بہت بڑا سمجھتے ہیں مثل مشہور ہے کہ اونٹ جب تک پہاڑ کے نیچے سے نہیں گزرتا اپنے آپ کو سب سے بڑا سمجھتا ہے۔ ایک حکایت بھی مشہور ہے کہ ایک اونٹ کی اور چوہے کی دوستی ہو گئی تھی۔ ایک مرتبہ دونوں سیر کو چلے راستہ میں دریا مل گیا تو اونٹ تو اس میں گھس گیا چوہا کنارہ ہی پر رہ گیا تو اونٹ نے اس سے کہا کہ چلے آؤ پانی بہت کم ہے صرف ٹخنوں تک پانی ہے چوہے نے کہا جی حضور ذرا اپنی ٹانگوں پر نظر کیجئے تمہارے ٹخنوں تک پانی ہے میں تو ڈوب ہی جاؤں گا چوہے کی یہ بات سن کر اونٹ کا

دماغ کہاں تھا سمجھا کہ میں بہت ہی بڑا ہوں مگر خدا کی رحمت ہوئی کہ راستہ میں ایک پہاڑ پڑ گیا اب اونٹ کی گردن نیچی ہوئی کہ نہیں کوئی مجھ سے بھی اونچا ہے۔ صاحبو! ہماری حالت اس اونٹ کی سی ہو رہی ہے ایک تو خود ہم میں خناس سما رہا تھا اوپر سے لوگوں کی تعظیم نے ہمارا ناس کر دیا اب ہم اپنے آپ کو بہت بڑا سمجھنے لگے یہاں تک دماغ سڑا کہ حق تعالیٰ کے افعال و تصرفات میں عیب نکالتے ہیں اور اعتراض و شکوہ شکایت کرتے ہیں۔ گویا خدا نے ہماری مرضی کے خلاف کیوں کام کیا۔ صاحبو! اگر حاکم دنیوی کسی مقدمہ میں آپ کے خلاف ڈگری کر دے اگرچہ اس سے غلطی ہی ہو گئی مگر سامنے یہی کہو گے کہ حضور بجا کیا درست کیا مجھے ایک اپنے دوست کی حکایت یاد آئی کہ جن کا نام اس وقت بیان کرنا مناسب نہیں جانتا کہ کسی حاکم کے یہاں ان کا مقدمہ تھا، اتفاق سے حاکم نے ان کے خلاف فیصلہ کر دیا پھر اس حاکم نے یہ معلوم کرنا چاہا کہ اس شخص کا میری طرف کیا گمان ہے اس نے ٹیلیفون کے ذریعہ سے ان سے گفتگو کی اور دھوکہ دیا کہ اپنا نام اس کے کسی دوست کے نام پر بدل دیا کیونکہ اس میں آواز نہیں پہچانی جاتی اور یہ کہا کہ فلاں حاکم نے بڑا ظلم کیا کہ آپ کو ہرا دیا ہے حالانکہ آپ حق پر تھے مجھے اس کا سخت افسوس ہے اس وقت ان کے دل میں خدا کی طرف سے بات آ گئی کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ گفتگو کرنیوالا خود وہی حاکم ہو اس لئے کوئی ایسی بات نہ کہنی چاہئے جس پر گرفت ہو سکے انہوں نے یہ جواب دیا کہ نہیں صاحب ہمیں حکام سے بدگمانی نہیں کرنی چاہئے وہ ظلم نہیں کر سکتے وہ اپنی طرف سے حق معلوم کرنے کی پوری کوشش کرتے ہیں انہوں نے جو کچھ فیصلہ کیا وہ عین عدل ہے۔ تو صاحبو! دیکھئے اس احتمال پر کہ کہیں حاکم نہ سن رہا ہو ہمت نہیں پڑتی کہ ان کے کام پر اعتراض کیا جائے اور حاکم حقیقی جس کے بارہ میں یقین ہے کہ وہ سنتا اور دیکھتا ہے بے باکانہ گستاخیاں کرتے ہیں اور اسی کے فیصلوں میں عیوب اور نقائص نکالتے ہیں۔

احکام الٰہیہ میں نکتہ چینی کتنی بڑی گستاخی ہے:

افسوس ہے کہ حاکم مجازی کے فیصلہ میں نکتہ چینی نہ کر سکیں اور حاکم حقیقی کے احکام میں بے دھڑک نکتہ چینیاں کرتے ہیں حق تعالیٰ حلیم و کریم ہیں ورنہ گستاخی تو ایسی سخت ہے کہ سب ایک طرف سمیٹ کر مار دیئے جاتے مگر شائد اس لئے کچھ نہیں کہا جاتا کہ لوگ ناواقفی سے ایسا کرتے ہیں بے ادبی کا قصد تو نہیں کرتے مگر ناواقفی کی وجہ سے وہ گستاخی ہو جاتی جیسا کہ گنواروں سے حکام دیہا مواخذہ نہیں کرتے مگر صاحبو! گنوار ہونا خود ایک بہت بڑا عیب ہے حکام ناواقف سمجھ کر

گنواروں سے کچھ مواخذہ نہ کریں تو وہ حکام کے مقرب بھی نہیں ہوتے تو ایسے لوگ خدا کے یہاں درجہ کمال میں مقبول نہیں ہو سکتے۔ کتنے بڑے افسوس کی بات ہے کہ ہمارا ایک خدا اس کے سوا ہمارا کوئی نہیں پھر اس کے ہم مقرب نہ ہوں اور وہ ہم سے ناخوش ہوں۔ اور یہ بات کہ ناواقفی سے گستاخیاں کرتے ہیں میں نے اس لئے کہہ دی کہ شاید تم کہو کہ یہ باتیں تو ہمارے ذہن میں بھی نہیں آئیں جو تم نے اس وقت گنائی ہیں تو صاحبو ہم اگرچہ قصداً گستاخی نہ کریں مگر ہماری جہالت سے گستاخی ہو جاتی ہے۔ مجھے ایک حکایت یاد آئی کہ ایک دوست تھے عبدالرحمٰن خان صاحب ان سے بہت نفع تھا کیونکہ وہ دیہات میں جا کر گاؤں والوں کی اصلاح کیا کرتے تھے جہاں علماء بھی نہیں جاتے کیونکہ مولوی تو اسی جگہ جاتے ہیں جہاں سمجھدار لوگ ہوں دیہات میں مولوی کم جاتے ہیں تو انہوں نے اپنا قصہ بیان کیا کہ ایک دفعہ میں ایک گاؤں سے چلنے لگا تو ایک گوجر کے لڑکے نے مجھے روکنا چاہا کہ ابھی ٹھہر جا میں نے کہا بھائی مجھے ضروری کام ہے۔ تو اس نے اپنے چچا یا دادا کو پکارا کہ یہ پیر تو ٹھہرتا نہیں تو وہ گوجر کیا کہتا ہے کہ پیر کی دادی کی یوں توں کروں یہ پیر ایسے ہوں ہیں۔ اور خیر سے دونوں خان صاحب سے مرید بھی تھے خان صاحب نے اس سے کہا کہ شاباش چوہدری مرید ہو کر میری ہی دادی کو سنگوانا تھا۔ گوجر نے کہا کہ پیر برا مت مان ہم گنوار ایسے ہی ہوں۔ تو گو خان صاحب نے اس کی جہالت کی وجہ سے اسے کچھ نہ کہا مگر یہ بھی نہیں کہ وہ اس کو مقرب بنا کر پہلو میں بٹھاتے ہوں گے تو اگرچہ ناواقف ہونے کی وجہ سے ان لوگوں سے حق تعالیٰ مؤاخذہ نہ فرمادیں مگر یہ لوگ خدا کے مقرب بھی نہیں ہوتے۔ جب خدا تعالیٰ اس کو پسند نہیں فرماتے تو ہم آپس میں کسی کو گالی دیں یہ کب پسند ہو سکتا ہے کہ خود ان کو بے نقط سنا دیں اور اگر سمجھ کر قصد سے کہا ہے تب تو مؤاخذہ یقینی ہے اور خسارہ تو ہر حال میں ہے۔ بھلا کتنا بڑا ظلم ہے کہ جو بات ہم کسی حاکم کے مجازی کو بھی نہ کہہ سکیں وہ حاکم حقیقی کو بے خوف خطر کہتے ہیں۔ تو خسارہ سے تو کوئی حالت نہیں۔ ایک تو یہ حالت جو ہم کو پیش آچکی ہے یعنی طاعون کا آنا۔

اب ایک دوسری حالت اس کے فی الحال پیش آرہی ہے اور اس کا تعلق ان سے ہے جن کو شہر کے حالات سے اطلاع رہتی ہے بہت سے ایسے ہیں کہ ان کو کچھ خبر ہی نہیں شہر میں کیا ہو رہا ہے اور یہ اچھی حالت ہے میرا یہ مطلب نہیں کہ اگر کوئی بیمار ہو تو اسے پوچھنے ہی نہ جاوے یہ تو ضروری بات ہے میرا مطلب یہ ہے کہ ایسی خبروں کی ہر وقت تلاش میں رہنا جیسا کہ بعض نے اسی کو مشغلہ بنا رکھا ہے یہ برا ہے بعض احباب نے مجھ سے بذریعہ خطوط دریافت کیا تھا کہ بستی میں بیماری کی

کیا حالت ہے تو میں نے جواب میں یہ لکھدیا تھا کہ سنا ہے کہ اب کمی پر ہے اس پر مجھے ایک حکایت یاد آئی ہے کہ ایک مرتبہ میں اور بھائی اکبر علی دونوں کھانا کھا رہے تھے بھائی نے پوچھا کہ آج کونسا دن ہے تو میں نے کہا سنا ہے کہ بدھ ہے تو اس پر والد صاحب نے میرے ایک طمانچہ مارا تھا کہ کیا تم کو خبر نہیں یوں کہتے ہو کہ سنا ہے۔ مجھے ڈر ہے کہ کہیں والد صاحب کی طرح یہ شخص بھی مجھ کو بے وقوف نہ بنائے کہ شہر میں رہتے ہیں اور پھر بیماری کی خبر نہیں کہ لکھتے ہیں سنا ہے مگر ان دونوں واقعوں میں فرق ہے روزہ تو خود رکھتا تھا اس میں یہ کہنا کہ سنا ہے واقعی بے وقوفی کی بات تھی اور بیماری کا مشاہدہ تو ہے نہیں سننے کی اس لئے فرصت نہیں کہ کام بہت ہیں واللہ اتنی بھی فرصت نہیں ملتی کہ جو اپنے کام ہیں وہی اچھی طرح پورے ہو جائیں تو شہر کے حالات معلوم کرنے تو کہاں مہلت ملے۔

اپنی حالت سے بے خبری:

مجھے صاحبو حیرت ہوتی ہے کہ ان لوگوں کو فرصت کیسے ملتی ہے جو حق تعالیٰ فرماتے ہیں ولتنظر نفس ماقدمت لغد۔ کہ ہر نفس دیکھے کہ اس نے کل کیلئے کیا بھیجا ہے یہ نہیں فرمایا ولتنظر نفس ماقدمت نفس غیرک لغد۔ مگر آج کل ہماری حالت اس کے بالکل برعکس ہے کوئی طاعون میں مر جائے تو لوگ مجمع میں بیٹھ کر اسکا تذکرہ کرتے ہیں کوئی کہتا ہے کہ میاں کیسے قہر الٰہی میں نہ مرتا اپنی بہو کو بری نظر سے دیکھتا تھا ایک بولے کے طاعون کیسے نہ ہو پرایا مال بھی کھایا کرتا تھا دوسروں کے اعمال کی سب خبر رکھتے ہیں اپنی خبر نہیں کہ رات دن جھوٹ، غیبت، بہتان میں گزرتا ہے۔ رشوت اور سود کا مال کھاتے ہیں اس کا تو ایک کام طاعون کا سبب بن گیا اور اپنا یہ گناہوں کا پہاڑ بھی کچھ کرتا۔ ہاں اگر طبیب کو ان حالات کی اطلاع رہے تو اس کے لئے البتہ زیبا ہے کیونکہ اس سے اس کو معالجہ کی طرف توجہ زیادہ ہو جاتی ہے غرض جن لوگوں کو اس کی تفتیش ہے ان سے اس دوسری حالت کی اطلاع ہوئی ہے اور وہ طاعون کا اب کم ہونا ہے کیونکہ وہ کہتے ہیں کہ اب کچھ کم ہے تو یہ دو حالتیں ہوئیں ایک طاعون کی زیادتی دوسری اس کے بعد اب اس کمی کی اور اس بیشی کمی سے ایک مجموعی حالت متحقق ہوئی یعنی ایک بلا کا آجانا پھر اس کا کم ہو جانا تو چونکہ اللہ تعالیٰ کے احکام ہر حال کے متعلق ہیں تو اس مجموعی حالت کے لئے بھی کچھ حکم ہوگا اس وقت میں سناتا ہوں۔

وعظ میں کس قسم کے مضامین بیان کرنے چاہئیں:

اور صاحبو! وعظ میں یہی باتیں ہیں جو سننے اور سنانے کے قابل ہیں اکثر لوگ قصے اور مثنوی

کو وعظ سمجھتے ہیں جس وعظ میں کوئی قصہ نہ ہو نہ شعر پڑھا جائے اس کو لوگ وعظ ہی نہیں جانتے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے مذاق بگڑ گئے ہیں ورنہ وعظ تو احکام کے بیان کرنے کا نام ہے مگر احکام میں بھی بعض وہ احکام ہیں جو مشہور ہیں جیسے نماز روزہ وغیرہ جن کو اکثر لوگ جانتے ہیں زیادہ سنانے کے قابل وہ احکام ہیں جن کی لوگوں کو خبر نہیں یہاں بہت سے آدمی ایسے ہیں کہ جن کو بالکل معلوم نہیں کہ بلا کے متعلق کیا احکام ہیں۔

بلا کے آنے اور جانے کے وقت کے احکام:

اس لئے ضرورت ہے کہ بتلا دوں بلا کے آنے کے وقت خدا کے کیا احکام ہیں۔ حق تعالیٰ اس آیت میں پہلی امتوں کی حکایت بیان فرماتے ہیں اور یہ مضمون دوسری جگہ بھی ایک آیہ میں اسی کے قریب قریب مذکور ہے۔ وما ارسلنا فی قریۃ من نبی الا اخذنا اھلھا بالباساء والضراء لعلھم یضرعون ثم بدلنا مکان السیئۃ الحسنۃ حتی عفوا و قالوا قد مس اباء نا الضراء والسراء فاخذ نا ھم بغتۃ وھم لا یشعرون۔

ترجمہ:۔ یعنی ہم نے کسی بستی میں کوئی نبی نہیں بھیجا کہ وہاں کے رہنے والوں کو ہم محتاجی اور بیماری میں نہ پکڑا ہوتا کہ وہ ڈھیلے پڑ جائیں ہم نے اس بدحالی کی جگہ خوش حالی بدل دیں یہاں تک کہ ان کو خوب ترقی ہوئی اور اس وقت برائے کج فہمی کہنے لگے کہ ہمارے آباؤ اجداد کو بھی تنگی اور راحت پیش آئی تھی ہم نے ان کو دفعۃً پکڑ لیا اور ان کو خبر بھی نہ تھی۔

اور یہ دوسری جگہ اس مضمون کا آنا میں نے طلبہ کے لئے بیان کیا ہے کیونکہ ایک مضمون کے دو مقام میں ہونے سے ان کو فائدہ ہوتا ہے کہ ایک آیت کے بعض الفاظ کی توضیح و تفسیر دوسری آیت سے ہو جاتی ہے ورنہ عوام کے لئے اس کی ضرورت نہیں حق تعالیٰ جل شانہٗ ایک قصہ کے ضمن میں فرماتے ہیں کہ ہم نے آپ ﷺ سے پہلے امتوں کی طرف رسول بھیجے تھے مگر وہ قصہ ایسا نہیں جیسا کہ آج کل قصہ کہانی لوگ کہا کرتے ہیں کہ اس میں اول سے آخر تک کسی کی سوانح مذکور ہوں بلکہ وہ قصہ ہے بصورت شکایت اور اس میں مضمون بھی ایسا ہی ہے جو قصہ کے طور پر نہیں ہے اس لئے اگرچہ لفظاً خبر ہے مگر حکماً انشاء ہے اور یہی کیا جتنے قصے پہلوں کے قرآن میں جا بجا مذکور ہیں وہ سب ایسے ہی ہیں کہ ان سے مقصود اخبار نہیں بلکہ وہ سب حکم انشاء میں ہیں گویا ان قصوں میں ہم کو یہ حکم ہوتا ہے کہ جو امتیں تم سے پہلے گزر گئی ہیں ان کے حالات دیکھ کر عبرت

حاصل کرو اور یہ خدا کی بڑی رحمت ہے کہ ہم کو سب امتوں کے بعد میں پیدا کیا تا کہ پہلوں کے حالات دیکھ کر عبرت اور نصیحت حاصل کر سکیں جیسا کہ مکتب کے لڑکوں میں سے جس کا سبق استاد پیچھے سنے اس پر گویا بڑی عنایت کی اور جس کا سب سے پہلے سنے اس کی کم بختی آ جاتی ہے تو خدا کی بڑی نعمت ہے کہ ہم کو بعد میں پیدا کیا تو فرماتے ہیں کہ ہم نے پہلوں پر رسول بھیجے تھے پھر ہم نے ان کو شدت اور تکلیف سے پکڑا۔

انفسی اور آفاقی مصائب:

کلفتیں اور مصیبتیں دو طرح کی ہوتی ہیں داخلی اور دوسری خارجی یا یوں کہو کہ ایک انفسی ایک آفاقی آفاقی یہ ہے کہ مثلاً کوئی دشمن چڑھائی کر کے چلا آوے۔ انفسی وہ کہ خود اپنے بدن میں کوئی مرض ہو باساء سے مراد آفاقی ہے اور ضراء سے مراد انفسی بلیات ہیں اور یہاں ایجاز ہے اصل کلام اس طرح ہے۔ ولقد ارسلنا الی امم من قبلک فاخذناھم (اور ہم نے اور امتوں کی طرف بھی جو آپ سے پہلے گزر چکیں رسول بھیجے تھے سو ہم نے انکو پکڑ لیا) تا کہ تضرعوا کے مقابل کوئی شئے مذکور ہو یعنی ان لوگوں نے تضرع نہ کیا بلکہ تکذیب کی تو ہم نے ان کو عذاب دیا جب انہوں نے سرکشی کی تو ہم نے ان کو مصائب میں گرفتار کیا۔ اس سے ایک فائدہ مستقلہ نکل آیا وہ یہ کہ مصیبت جب آتی ہے تو گناہ کی وجہ سے آتی ہے خلاصہ کلام یہ ہوا کہ حق تعالیٰ فرماتے ہیں ہم نے پہلی امتوں کے پاس رسول بھیجے تو انہوں نے سرکشی کی ہم نے ان کو مصائب میں مبتلا کیا تا کہ وہ تضرع کریں۔ یہ تو بیان تھا مصائب کے آنے کا اسکے بعد ان مصائب سے ان کے متاثر نہ ہونے کا ذکر مع الشکایت ہے کہ اس وقت انہوں نے تضرع کیوں نہ کیا جبکہ ہم نے ان کو باساء میں گرفتار کیا تھا باساء یہاں عام ہے یعنی چاہئے تو یہ تھا کہ بعد بلا آنے کے تضرع کرتے اور زاری کرتے مگر انہوں نے ایسا نہ کیا بلکہ ان کے دل اور سخت ہو گئے اور شیطان نے ان کے اعمال کو مزین کر دیا یعنی اپنے اعمال سیۂ کی طرف ان مصائب کو منسوب نہیں کیا پس یہ حالت تو مشابہ ہماری پہلی حالت کے ہے کہ اسی طرح ہم پر طاعون آیا مگر اس پر متنبہ نہ ہوا کہ یہ ہمارے اعمال کے سبب سے ہے تا کہ اصلاح کر لیتے جس پر حق تعالیٰ کو شکایت ہے اس کے بعد ارشاد ہے کہ پھر جب بھول گئے اس چیز کو جس کی یاد دہانی کرائے گئے تھے یعنی جب وہ مصیبت وغیرہ کو بھول گئے کیونکہ قاعدہ ہے کہ مصیبت اول اول یاد رہتی ہے پھر مساوات سی ہو جاتی ہے اور یاد نہیں رہتی ہم نے بزرگوں سے سنا

ہے کہ بیس سیر کے گیہوں ہو جانے پر سارے شہر میں شور مچ جایا کرتا تھا اور خلق اللہ پریشانی ہو جاتی تھی اب دس سیر ہو جانے پر بھی کسی کو خبر نہیں ہوئی غرض جب وہ مصائب کو بھول گئے تو ہم نے ابواب نعمت خوب کھول دیے۔

دوسرے کی حالت سے عبرت حاصل کرنا سعادت ہے:

یہی مضمون دوسری آیت میں ہے ان لفظوں سے ہے ثم بدلنا مکان السیئۃ الحسنۃ حتی عفوا الخ اب ان کی وہ غلطی اور پختہ ہوگئی کہ یہ اعمال کی وجہ سے نہیں ورنہ ہمارے اعمال تو اب بھی ویسے ہی ہیں پھر وہ نعمتیں ہم کو کیوں ملتی ہیں۔ معلوم ہوا کہ مصیبت کا آنا ایک اتفاقی امر تھا اور ایسا ہی تھا جیسے آباؤ اجداد کو بھی ایسے واقعات پیش آئے اور ختم ہو گئے حتی کہ جب وہ اترانے لگے تو خدا نے ان کو دوبارہ پکڑا یہاں تک کہ ناامید ہو گئے اور ان کی جڑ کٹ گئی اور خدا ہی کی تعریف ہے یہ دوسری حالت ہماری دوسری حالت کے مشابہ ہے کہ بیماری کم ہونے لگی تو لوگ بے فکر ہونے لگے اور تھوڑا بہت جو احتمال تھا وبال معاصی کا بھی رخصت ہونے گا اور اس کے بعد اخذنا ھم بغتۃ بہت خوف دلاتا ہے کہ ایسا نہ ہو پس لوگ تو بیماری کے جاتے رہنے سے خوش ہوتے ہیں اور قرآن مجید سے معلوم ہوتا ہے کہ حالت موجودہ غفلت میں بیماری کا جاتا رہنا اس کے آنے سے زیادہ خوفناک ہے۔ اور اس موقع پر الحمد للہ رب العلمین محاورہ کے موافق ہے کیونکہ جب ظالم ہلاک ہوتا ہے تو لوگ کہا کرتے ہیں کہ الحمد للہ ظالم شخص ہلاک ہو گیا ایسے ہی حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ظالمین کی جڑ کٹ گئی اور خدا کا شکر ہے۔ یہ تو آیت کی تفسیر تھی اب ہمیں چاہئے کہ اس قصہ پر اپنی حالت کو منطبق کر کے عبرت حاصل کریں کیونکہ یہ قصے اسی لئے ہیں خصوص اس موقع پر تو قصہ کا پیرایہ بھی نہیں بلکہ اس میں ان لوگوں کی شکایت ہے کہ انہوں نے عذاب کو اپنے اعمال کی وجہ سے نہ سمجھا اور تضرع وزاری کیوں نہ کی:

قصہ عبرت:

حق تعالیٰ فرماتے ہیں لقد کان فی قصصھم عبرۃ لاولی الالباب . (یعنی انبیاءؑ وامم سابقین کے قصے میں سمجھدار لوگوں کے لئے بڑی عبرت ہے) حالانکہ قصہ یوسفؑ سے کوئی نتیجہ لفظوں میں نہیں بتلایا تھا مگر پھر بھی فرمادیا کہ یہ قصہ عبرت ہے تو جہاں نتیجہ نصاً مذکور ہو یقیناً عبرت ہی کیلئے ہے چنانچہ اس آیت میں جو قصہ مذکور ہے اس پر یہ نتیجہ مرتب فرمایا کہ فلولا

اذجاء ھم باسنا تضرعوا کہ ان لوگوں نے بعد نزول عذاب تضرع کیوں نہ کیا صاف صاف شکایت فرمار ہے ہیں اسی لئے مولانا فرماتے ہیں۔

بشنوید اے دوستاں ایں داستاں خود حقیقت نقد حال ماست آں

نقد حال خویش را گر پے بریم ہم ز دنیا ہم ز عقبے بر خوریم

(یعنی دوستوں یہ داستاں سنو کہ واقعہ میں ہماری ہی حالت کے مطابق ہے یعنی اگر اپنی موجودہ حالت میں غور وفکر کرتے رہا کریں تو دنیا وآخرت دونوں جہانوں کا ہم کو نفع حاصل ہو)

گویا دوسرے کی حالت سے عبرت حاصل کرنا اور اس کو اپنے اوپر منطبق کرنا بھی سعادت ہے۔خلاصہ یہ کہ ان پر پہلے احکام الٰہی آئے تھے بذریعہ انبیاءؑ ہمارے پاس بھی احکام آئے ورثۃ الانبیاء کے ذریعہ سے انہوں نے نافرمانی کی ہم نے بھی نافرمانی کی جس کے بیان کی ضرورت نہیں۔

صورت ببیں حالت مپرس

(صورت دیکھو تو حال دریافت کرنے کی ضرورت نہیں) اگر کسی نے حضور ﷺ کو دیکھا ہو اور ہم کو دیکھے ہرگز نہ پہچان سکے کہ ہم آپ کی امت ہیں کیا آپ غیبت کیا کرتے تھے کیا آپ کا لباس ایسا ہی تھا آپ کے وقت میں بھی یہ کھیل تاش وگنجفہ تھے کیا نعوذ باللہ آپ میں ایسا ہی ظلم تھا کہ جس کی چاہی زمین دبالی جس کا چاہا روپیہ مار لیا اگر کوئی ہمیں سلام کرلے تو ناخوش ہوتے ہیں اور حضور ﷺ خود سلام کیا کرتے تھے۔ حضور ﷺ کے صاحبزادہ کا انتقال ہوا تو آپ کے صرف دو چار آنسو نکل گئے اور یہاں آسمان اور زمین ایک رل ہو جاتا ہے۔غرض ہماری حالت بگڑی ہوئی ہے۔

تن ہمہ داغ داغ شد پنبہ کجا کجا نہم

(تمام جسم داغ داغ ہو رہا ہے کہاں کہاں روئی رکھیں یعنی ہماری حالت خراب ہے کس کس کا ذکر کریں)

اس حالت کو دیکھ دیکھ کر کوئی صاحب ذوق کہتا ہے

اے بسرا پردۂ یثرب بخواب خیز کہ شد مشرق ومغرب خراب

کہ اے حضور اقدس ﷺ ذرا خواب راحت سے اٹھئے تو سہی دیکھئے آپ کی امت کس بلا میں گرفتار ہے۔

بعد وصال امتیوں کی حضور ﷺ کو ایذا دہی:

صاحبو! ایک پیغمبر کی جان اور آپ پر دو دو دفعہ ہفتہ میں ساری امت کے اعمال پیش ہوتے

ہیں خیال تو کیجئے کہ آپ کو کس قدر تکلیف ہوتی ہوگی الگ الگ ہر شخص کے اعمال پر نظر فرما کر رنجیدہ ہوتے ہوں گے آپ کو تو ہم سے اتنی محبت کہ ہمارے لئے یہاں تک دعائیں کیں کہ قدم مبارک سوج گئے اور ہم نے آپ کو بعد وفات بھی راحت نہ پہنچائی تو آپ کا کیا حال ہوگا اور پھر برے کام کر کے ہم لوگ اصرار کرتے ہیں کہتے ہیں کہ اللہ غفور رحیم ہے تو پیغمبر پر ایمان بھی نہ لائے ہوتے تب بھی اللہ غفور رحیم ہے۔ صاحبو! جب ہماری یہ حالت ہے تو ہم رسولؐ کے کہاں ہوئے ہم تو اپنے نفس کے بندہ ہیں تو جیسے پہلوں نے رسول کی نافرمانی کی تھی ویسے ہی ہم نے رسول کی نافرمانی کی پیغمبر نے شادی کے طریقے بتلا دیئے اور ہم ضد کر کے اس کے خلاف کرتے ہیں پھر علماء پر الزام لگاتے ہیں کہ یہ سختی کرتے ہیں چنانچہ مولانا مولوی محمد اسمٰعیل صاحب شہیدؒ کو ایک بڑھیا نے پکڑا کہ میں نے سنا ہے تو بیوی کی صحنک کو منع کرتا ہے تو آپ نے فرمایا کہ ان کے ابا منع کرتے ہیں اسی طرح یہاں تو یہ حالت ہے۔

در پس آئینہ طوطی صفتم داشتہ اند   آنچہ استاد ازل گفت بگو میگویم

یعنی جو کچھ حضور ﷺ ارشاد فرما گئے ہیں وہی کہتے ہیں اگر شک ہو تو کتابیں کھول کر دیکھ لو کہ ہم نے منع کیا ہے رسول اللہ ﷺ نے، جب تم نے ہر بات میں رسول اللہ ﷺ کا مقابلہ شروع کر دیا تو علماء کیونکر منع نہ کریں برے کاموں کو چھوڑ کر ہمارے جو نیک اعمال ہیں ہم نے ان میں بھی اپنی رائے کو دخل دیا اور رسول کی مخالفت سے باز نہ آئے مثلاً مسجد بنانا ایک نیک کام ہے مگر اس میں بھی ہم رسول کا مقابلہ کرتے ہیں نقش نگار منع ہے روشنی بہت زیادہ کرنا منع ہے مگر رمضان میں اکثر مساجد میں روشنی ہوتی ہے اگرچہ ہمارے قصبہ میں یہ رواج کم ہو گیا کیونکہ افلاس نے پورا وعظ کر دیا نہ وہ آدمی رہے طاعون سے مر مرا گئے نہ مال رہا اس لئے ہماری بہت بڑی اصلاح تو افلاس ہی نے کر دی نہ وہ روشنی رہی نہ تاش گنجفہ رہا تنگدستی نے پورا علاج کر دیا غرض ہم لوگوں کی یہ حالت ہو رہی ہے کہ ہر شے میں ایک نیا طریقہ نکال لیا ہے جیسے ان لوگوں کی نافرمانی بڑھ رہی تھی ایسے ہی ہماری نافرمانی بڑھ رہی ہے یہ دو حالتیں ہوئیں تیسری حالت ان کی یہ تھی کہ ان کو حق تعالیٰ نے عذاب میں گرفتار کیا تھا اب ہم پر طرح طرح کی بلائیں آتی ہیں عذر کے بعد حق تعالیٰ نے ہم کو مہلت دی مگر جب ہم باز نہ آئے تو ایک پیادہ سرکاری مقرر کر دیا وہ طاعون ہے واقعی یہ ایسا عذاب ہے جو کبھی پیچھا نہیں چھوڑتا ہر سال موجود ہو جاتا ہے تمام اطبا اس کے اسباب میں حیران ہیں کوئی تدبیر اس کے دفعیہ میں کارگر نہیں ہوتی لاٹوس صاحب لوگوں سے کہتے پھرتے

ہیں کہ تم لوگ بےفکر رہو ہم کسی تدبیر پر مجبور نہیں کرتے کیونکہ یہ خدا کا قہر ہے اس کا مقابلہ گورنمنٹ نہیں کر سکتی۔ صاحبو! ایک غیر مسلم شخص کی زبان پر یہ بات آگئی ہے کہ خدا کا قہر ہے۔

طاعون میں بھی مسلمانوں کی بے حسی:

ہم کیسے مسلمان ہیں کہ ہماری زبان پر بھی یہ کلمہ نہیں آتا اگر یوں کہا جائے کہ ہم دل سے سمجھتے ہیں تو بتلایئے اس کے آثار کیا ہیں کتنے لوگ ہیں جنہوں نے طاعون کے خوف سے بہنوں کے حق دیئے ہیں کتنے آدمیوں نے موروثی زمینیں چھوڑ دی ہیں بلکہ بعضوں کی تو طاعون میں موج آرہی ہے ایک جارج سے طاعون کے زمانہ میں کسی نے پوچھا کہ کیسے گزرتی ہے تو وہ جواب دیتا ہے کہ موج آرہی ہے کیونکہ آمدنی خوب ہو رہی تھی جیسے دوا فروش طاعون وغیرہ سے خوش ہوتے ہیں ان کی موج آئی ہے استغفر اللہ جیسے بنیوں کو قحط سے خوشی ہوتی ہے بعضوں نے اس سے اثر بھی حاصل کیا تا کہ یہ شکایت نہ رہے کہ طاعون کو قہر الٰہی سمجھ کر کیا آثار ظاہر ہوئے سو انہوں نے یہ اثر لیا کہ تھوڑی دیر بیٹھ کر رو لئے مگر کسی کا حق ادا نہیں کرتے

گر جان طلبی مضائقہ نیست ور زر طلبی سخن درین ست

(اگر جان مانگو تو حاضر ہے اور اگر مال مانگو تو یہ بہت مشکل ہے)

مصیبت کا اصل اثر:

جیسا مولانا نے ایک اعرابی کا قصہ بیان فرمایا ہے کہ اس کا کتا سفر میں مرنے لگا وہ اس کے پاس بیٹھا رو رہا تھا لوگوں نے پوچھا کیا حال ہے کہا میرا رفیق بھوک سے مرتا ہے سامنے ایک تھیلہ نظر آیا کسی نے پوچھا اس میں کیا ہے کہنے لگا روٹیاں تو پوچھا گیا کہ پھر رونے کی کیا بات ہے اس کو بھی کھلا دے نہ مرے گا کہنے لگا کہ اتنی محبت نہیں کہ داموں کی چیز کھلاؤں اور آنسو تو مفت کے ہیں جتنے چاہوں بہادوں یہی مثال ہمارے بعض بھائیوں کی ہے کہ ان پر اس مصیبت کا یہ اثر تو ہوتا ہے کہ تھوڑی دیر رو لیتے ہیں آنسوؤں میں کیا خرچ ہوتا ہے یہ نہیں ہوتا کہ اعمال کی اصلاح کر لیں آئندہ کے لئے گناہوں سے توبہ کر لیں لوگوں کے حقوق دیدیں تیلی کے بیل کی طرح جہاں تھے وہاں ہی ہیں نہ طاعون سے پہلے کوئی اصلاح کی نہ طاعون کے آنے کے بعد تو ہمارا یہ حال بھی ان کی حالت کے مشابہ ہے انہوں نے بھی عذاب آنے پر تضرع وزاری نہیں کی تھی اور اس کو اپنا ثمرہ اعمال نہ سمجھے۔ ہم نے بھی مصائب سے عبرت حاصل نہیں کی اور خدا کی طرف رجوع نہ کیا جس

طرح شیطان نے ان کے اعمال کو نگاہوں میں آراستہ کر رکھا تھا ویسے ہی ہم بھی اپنے اعمال کو اچھا سمجھتے ہیں ہمیں کبھی مصیبت کے وقت یہ خیال نہیں ہوتا کہ یہ ہماری شامت اعمال سے ہے اور اگر سمجھتے بھی ہیں تو غیروں کے اعمال کا اثر سمجھتے ہیں مجلس میں بیٹھ کر محلہ کے قصے بیان ہوتے ہیں ایک صاحب کہتے ہیں کہ فلاں شخص اپنی بہو کو بری نگاہ سے دیکھتا ہے دوسرے بولے کہ فلاں شخص کا فلانی عورت کے ساتھ ناجائز تعلق ہے۔ تیسرے کہتے ہیں پھر بھلا طاعون کیوں نہ آوے گویا خود تو جبریل میکائیل ہیں کہ ان سے کوئی گناہ ہوتا ہی نہیں اگر طاعون آئے گا تو دوسروں سے ناجائز تعلقات کی وجہ سے آئے گا اس کے کہنے والے کے گناہوں کو اس میں کوئی عمل دخل نہیں صلحاء سلف تو باوجود کمال تقدس کے اپنے ہی کو تمام بلاؤں کا سبب سمجھتے تھے، ایک مرتبہ بصرہ میں قحط ہوا تو لوگ پریشان ہو کر حضرت ذوالنون بصریؒ کے پاس دعا کرانے گئے آپ سن کر رونے لگے افسوس میرے گناہوں کی وجہ سے اب مخلوق مصیبت میں گرفتار ہونے لگی فرمایا کہ صاحبو! یہ سب میری شامت اعمال ہے مجھ کو شہر سے باہر نکال دو تو امید ہے کہ تمہارے اوپر سے یہ بلا ٹل جائے ہماری حالت اسکے برعکس ہے کہ خود سرتاپا گناہوں میں ڈوبے ہوئے ہیں مگر خیال یہ ہے کہ طاعون وغیرہ اور لوگوں کے ناجائز افعال کا اثر ہے۔

ہماری حالت پہلوں کے مشابہ ہے:

غرض ہماری یہ حالت بھی پہلوں کے مشابہ ہے کہ وہ بھی اپنے اعمال کو اچھا سمجھتے تھے اور نزول بلا میں اعمال کا دخل نہ سمجھتے تھے ہماری بھی وہی حالت ہے۔ اس کے بعد فرماتے ہیں **فلما نسوا ما ذکروا به فتحنا علیهم ابواب کل شیئی حتی اذا فرحوا بما اوتوا اخذنا هم بغتة فاذاهم مبلسون** ۝ ؎

یعنی جب نزول بلیات سے انہوں نے عبرت حاصل نہ کی اور اپنے اعمال کی اصلاح نہ کی یہاں تک کہ رفتہ رفتہ اس مصیبت کو بھول گئے تو ہم نے ہر چیز یعنی ہر نعمت کے دروازہ کھول دیئے اس وقت مجھے اس حالت کا بیان کرنا زیادہ مقصود ہے کیونکہ مضمون سابق پہلے بھی بیان ہو چکا ہے تو میں دیکھتا ہوں کہ جب سے طاعون میں کمی ہے کچھ لوگ زیادہ غافل ہو چکے ہیں وہ یہ سمجھتے ہیں کہ کمی ہو گئی مگر سمجھتے ہو یہ کمی کیسی ہے یہ قہر ہے بصورت لطف پہلے قہر بصورت قہر تھا۔ اس سے بچنا دشوار نہ تھا مگر اس سے بچنا بڑا مشکل ہے کیونکہ بظاہر سکون معلوم ہوتا ہے مگر حقیقت یہ امتحان ہے اور ڈھیل ہے

زہر اگر زہر کی صورت میں ہو تو اس سے بچنا سہل ہے مگر مٹھائی میں تو زہر بڑا سخت ہے اس سے بچنا اسی کا کام ہے جو نہایت ہی محتاط ہو تو فرماتے ہیں کہ جب وہ مصیبت کو بھول گئے تو ہم نے ان پر خیر کے دروازے کھول دیئے پھر جب وہ خوش ہو گئے اور اترانے لگے تو ان کو دوبارہ دفعۃً پکڑ لیا پس وہ ناامید ہو کر رہ گئے بعض لوگ طاعون کے موقع میں کہا کرتے ہیں ذرا طبیعت کو چین ہو اطمینان ہو تو نماز پڑھیں گے علم دین پڑھیں گے اس بے چینی میں تو کچھ بھی نہیں ہو سکتا تو اب ہم ان کو دیکھیں گے کہ وہ اپنی کیسی اصلاح کرتے ہیں کیونکہ اصلاح کبھی فکر سے ہوتی ہے کبھی بے فکری سے حق تعالیٰ نے دونوں حالتیں دکھا دیں اب بھی اگر اصلاح نہ کی تو بہت وبال ہو گا جس طرح کا فروں کو پہلی بیماری قحط وغیرہ بھیج کر ہلکی سی سزا دی تھی جب وہ باز نہ آئے تو سخت سزا دی اور جڑ تک کاٹ دی تو صاحبو! یہ سزا تو بید لگنے کی مثل تھی اب اگر اصلاح نہ کی تو پھانسی کی سزا ہو گی۔ حق تعالیٰ نے اول تو احکام بھیج کر حجت تمام کی پھر ارسال حوادث سے پھر رفع حوادث سے اب کونسا عذر باقی ہے کہ ہم اپنی اصلاح کریں۔ صاحبو! مجھے سخت خوف ہے کہ اس امن کے زمانہ میں بھی ہم نے اپنی حالت درست نہ کی تو کہیں سخت پکڑ نہ ہو۔ حق تعالیٰ نے پہلوں کی دو شکایتیں کی ہیں ایک تو یہ ہے کہ بلا آنے کے وقت ان لوگوں نے تضرع وزاری نہ کی دوسرے بلا کے ٹلنے پر وہ اترانے لگے۔

بلا کے دو حق:

تو بلا کے دو حق ہیں آنے کے وقت تو یہ حق ہے کہ تضرع وزاری کریں اور گناہوں سے معافی مانگیں مغفرت چاہیں دوسرا حق یہ ہے کہ جب بلا ٹل جائے اترائیں نہیں۔

اترانے کی مذمت:

حق تعالیٰ نے ایک اور مقام پر بھی اس اترانے کی مذمت بیان فرمائی ہے۔ ربکم الذی یزجی لکم الفلک فی البحر لتبتغوا من فضلہ انہ کان بکم رحیما٥ واذا مسکم الضر فی البحر ضل من تدعون الا ایاہ فلما نجکم الی البر اعرضتم وکان الانسان کفورا٥ افامنتم ان یخسف بکم جانب البر اویرسل علیکم حاصبا ثم لا تجدوالکم وکیلا ٥ ام امنتم ان یعید کم فیہ تارۃ اُخریٰ فیرسل علیکم قاصفا من الریح فیغرقکم بما کفرتم ثم لاتجدوالکم علینا بہ تبیعا ٥

یعنی تمہارا پروردگار تمہارے لئے سمندر میں کشتیاں چلاتا ہے پھر وہاں جب تم کو کوئی طوفان

وغیرہ کا حادثہ آتا ہے تو تمہیں سوائے خدا کے کوئی یاد نہیں رہتا پھر جب نجات دے کر خشکی میں پہنچا دیتے ہیں تو تم عرض کرنے لگتے ہو کیا تم کو اس سے اطمینان ہو گیا کہ ہم تم کو خشکی میں دھنسا دیں جیسا کہ قارون خشکی ہی میں دھنسا دیا تھا اگر یہ سمجھو کہ یہ تو بڑا قدیم قصہ ہے تو یاد کر لو کانگڑہ میں کیا ہوا کہ سارا گاؤں زلزلہ میں دھنس گیا بستی کی بستی تباہ ہو گئی تو خدا تعالیٰ جیسے دریا میں ہمارے ڈبونے پر قادر ہے خشکی میں دھنسانے پر قادر ہے اس کے نزدیک خشکی تری سب برابر ہے ایک ملاح سے کسی نے پوچھا کہ تمہارے باپ کہاں مرے کہا دریا میں کہا اور ماں کہاں مری کہا دریا میں پھر کہا تمہارے دادا کہاں مرے کہا دریا میں کہا کہ تم بڑے بیوقوف ہو کہ پھر بھی دریا کو نہیں چھوڑتے ملاح نے پوچھا کہ حضرت آپ کے والد صاحب کہاں مرے کہا گھر میں دادا کہاں مرے کہا وہ بھی گھر میں مرے اس نے کہا کہ آپ بھی بہت بڑے بیوقوف ہیں کہ پھر بھی اسی گھر میں رہتے ہیں سبحان اللہ حقیقت میں خوب جواب دیا خشکی ہی میں کیا اطمینان ہے مکان گر پڑے تو کیا ہو سکتا ہے آگ لگ جائے تو کیا ہو سکتا ہے تو حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ تم جو دریا سے نکلتے ہی پھر سرکشی کرنے لگے تو کیا اس سے اطمینان ہو گیا کہ ہم تم کو خشکی میں دھنسا نہیں سکتے یا ہم تند ہوا نہیں بھیج سکتے اگر تم اسکو بعید سمجھتے ہو تو کیا ہم اس پر قادر نہیں ہیں کہ تم کو دوبارہ کسی ضرورت کی وجہ سے دریا میں لوٹا دیں کہ پھر سفر دریا کرو اور کشتی میں سوار ہو اور ہم تم کو غرق کر دیں۔ صاحبو! طاعون رفع ہو گیا تو خوشی کیا ہے خدا کو قدرت ہے کہ ایک مہینہ کے بعد پھر ہوا لوٹا دے یا اور کوئی مصیبت بھیج دے جب خدا کو سب قدرت ہے تو اترانا کیسا۔

فرح بطر اور فرح شکر میں فرق:

ہاں مصیبت زائل ہو جانے پر خدا کا شکر کرنا چاہئے یہ خوشی ممنوع نہیں یہ تو فرح شکر ہے یہ عمدہ حالت ہے ممنوع فرح بطر ہے جس کو اترانا کہتے ہیں یہ مذموم ہے اور دونوں میں فرق یہ ہے کہ فرح بطر کے بعد غفلت ہوتی ہے فرح شکر کے بعد غفلت نہیں ہوتی اب فیصلہ تمہارے ہاتھوں میں ہے آزماؤ کہ یہ خوشی کیسی ہے اگر دل میں خوف خدا رہا اور نمازی ہو گئے لوگوں کے حقوق ادا کر دیئے تو یہ فرح شکر ہے اگر ایسا نہ ہوا تو فرح بطر ہے اس سے ڈرنا چاہئے خدا جانے پھر کیا بلا نازل ہو جائے۔ اور آفات دو قسم کی ہیں آفاقی انفسی آفاقی تو جیسے لڑائی ہو جائے مرض عام پھیل جائے۔ انفسی یہ ہے کہ اپنے اوپر کوئی بلا آئے جس میں سب سے بڑھکر قساوت قلبی ہے کہ گناہ

کرتے کرتے دل سخت ہو جائے جس سے روز بروز غفلت بڑھتی جاتی ہے یہ سخت آفت ہے اس سے رفتہ رفتہ کبھی ایمان جاتا رہتا ہے خدانخواستہ ایمان گیا تو آخرت برباد ہوئی لوگ کہتے ہیں کہ فلاں شخص بڑا خوش اقبال تھا کہ کھاتے پیتے عیش میں مر گیا۔

دنیا کی زیادتی کی عجیب مثال:

مولانا محمد یعقوب صاحبؒ فرماتے تھے کہ جو لوگ دنیا کی زیادتی پر اور اس کی راحت پر خوش ہوتے ہیں ان کی ایسی مثال ہے کہ ایک بھنگی کہے کہ میں نے آج اتنے ٹوکرے کمائے دوسرا کہے کہ میں نے تجھ سے زیادہ کمائے یہ خوش اقبال نہیں یہ تو بد اقبالی کی علامت ہے کہ ایک بار گراں لاد کر لے گیا اس نے اپنے ساتھ وہ جنس لی جو وہاں کام نہیں آتی اس نے وہ سکہ لیا جو رائج نہیں جیسے اگر کسی حاجی کے پاس پیسے ہی پیسے ہوں تو وہ بمبئی سے آگے مفلس ہے کیونکہ ہندوستانی پیسے آگے نہیں چلتے مولانا فرماتے ہیں

که بازار چندان که آگنده تر تهیدست رادل ..... پراگنده تر

یعنی بازار جس قدر بھرا ہوا زیادہ ہوتا ہے تنگ دست کا دل اسی قدر پراگندہ ہوتا ہے۔

اعمال صالحہ سے حق تعالیٰ کی رضا حاصل ہوتی ہے:

تو صاحبو! جہاں پیسے کمائے ہیں جو بمبئی سے آگے نہیں چلتے روپے اشرفی بھی کمالو تا کہ مکہ مدینہ میں بھی کام آئے ورنہ وہاں تو مفلس رہو گے اور یہ تمثیل روپے پیسے کی اس جگہ خوب ہی چسپاں ہے کیونکہ پیسہ صورتاً بھی کثیف اور روپیہ لطیف ہوتا ہے یہی حال متاع دنیا اور آخرت کا ہے دوسرے جیسا روپیہ ہندوستان میں بھی کام آتا ہے اور مکہ مدینہ میں بھی۔ ایسے ہی اعمال آخرت کہ وہاں تو کام آتے ہی ہیں یہاں بھی کام آتے ہیں۔ اس لئے اعمال آخرت سے حق تعالیٰ کی رضا حاصل ہوتی ہے۔ خدا کی خوشی کو معلوم کر کے اس شخص کا دل خوش ہوتا ہے۔ دنیا میں دیکھ لیجئے کہ صرف حاکم کی خوشی کے واسطے کیا کچھ کیا جاتا ہے اگر کسی کو معلوم ہو جائے کہ صاحب کلکٹر مجھ سے خوش ہوتے ہیں تو خیال کیجئے کہ اس کو خوشی ہو گی یا نہیں ایسے ہی اللہ والے بھی حق تعالیٰ کی خوشی معلوم کر کے خوش ہوتے ہیں دنیا میں بھی آرام ان کو ہی ہے دوسرے یہ کہ خدا سے ان کو محبت ہے کچھ بھی نہ ہو تو محبت کی لذت ہی بڑی چیز ہے پھر محبت بھی کس کی اللہ تعالیٰ شانہ کی جس سے بڑھ کر صاحب حسن جمال کوئی نہیں ہو سکتا ایک کسی کی محبت میں تو یہ لطف آتا ہے کہ گھر بار تک لٹا دیتے

ہیں جس سے بدنامی ہوتی ہے ذلت بھی ہوتی ہے پھر خدا کی محبت میں کیوں لذت نہ ہو گی جس میں سب سے بڑی کامیابی کی بھی امید ہے

عشق مولیٰ کے کم از لیلےٰ بود　　　　گوئے گشتن بہر او اولےٰ بود

(حق تعالیٰ شانہ کا عشق لیلیٰ کے عشق سے کب کم ہووے محبوب حقیقی کے لئے تو کوچہ گردی کرنا بہت ہی بہتر ہے)

محبان حق تعالیٰ شانہ ہر حال میں خوش رہتے ہیں:

محبت والے ہر حال میں خوش رہتے ہیں چاہے غم ہو یا خوشی ہو آزما لیجئے کہ ایک وہ شخص ہے جس کے دل میں خدا کی محبت ہے بیوی مرگئی بچے مر گئے سب کچھ ہو گیا مگر اس شخص کے بجز چند آنسو بہنے کے کچھ نہیں ہوتا بات یہ ہے کہ وہ سمجھتا ہے کہ یہ سب خدا کی چیزیں ہیں جب تک اس نے چاہا ہمارے پاس رکھیں جب چاہا چھین لیں اللہ والے کا دل مصیبت میں بھی مطمئن ہوتا ہے یا اپنی تسلی کرتا ہی ہے دوسروں کی بھی تسلی کرتا ہے مگر جس شخص کے دل میں خدا کی محبت نہیں جہاں اس کو کوئی مصیبت پیش آتی ہے پریشان ہو جاتا ہے اس کی زندگی تلخ ہو جاتی ہے خدا کی شکایت کرتا ہے ایک طبیب نے اپنی لڑکی کے مرنے پر کفریہ کلمات کہے تھے۔ صاحبو! اگر آپ نے اپنی مرضی کے موافق ایک نہایت عمدہ مکان بنوایا ہو اور تمہارا نوکر یہ کہے کہ مجھے تو یہ چیزیں اس جگہ اچھی معلوم ہوتی ہیں جہاں آپ نے رکھی ہیں وہاں اچھی نہیں لگتیں تو یہ نوکر آپ کے نزدیک سزا کے قابل ہے یا نہیں آپ اس کے ایک طمانچہ ماریں گے کہ بدتمیز ہم نے مکان تیری خوشی کے لئے بنایا ہے یا اپنی خوشی کیلئے۔ تو رائے دینے والا کون ہوتا ہے مگر افسوس ہم خدا کی چیزوں میں بے خوف وخطر جو چاہے کہتے ہیں اگر ہم ان کو خدا کی چیزیں سمجھتے تو کبھی شکایت دل میں نہ آتی تو صاحبو! یہ خدا کی چیزیں ہیں تم ان کو اپنی کیوں سمجھتے ہو پھر خدا کو اختیار ہے جس چیز کو چاہے مکان دنیا میں رکھے جس کو چاہے مکان آخرت میں رکھے۔ تم کو راضی رہنا فرض ہے ناراض ہونا بدتمیزی ہے رضا و محبت سے دنیا میں بھی راحت حاصل ہوتی ہے حضرت بہلولؒ سے کسی نے پوچھا کہ کیا حال ہے فرمایا کہ کیا حال پوچھتے ہو اس شخص کا جس کی خواہش کے موافق دنیا کے سارے کام ہوں پوچھا حضرت یہ کیونکر ہو سکتا ہے کہ سارے کام ایک شخص کی خواہش کے موافق ہوتے ہوں فرمایا کہ جس شخص نے اپنی خواہش کو خدا کی خواہش میں فنا کر دیا ہو تو ہر کام اس کی خواہش کے موافق ہی ہوتا ہے آپ کو

معلوم ہوا کہ دنیا بھی اگر درست ہے تو دین والے ہی کی ہے۔ دنیا یہ نہیں کہ ہزاروں روپے ہوں منتشر ہو کر ہوں دنیا یہ ہے کہ دل چین سے ہو واللہ اگر دل چین سے ہے تو صرف اللہ والوں کا ہے۔

مال اور اولاد کی بے حد محبت وبال جان ہے:

دنیا والوں میں سے جس کو دیکھو ایک نہ ایک غم میں گرفتار ہے۔ کوئی بیماری میں چیخ رہا ہے، کسی کو اولاد سے بے حد محبت ہے۔ ایک بیگم کو اپنے بچوں سے محبت تھی وہ ان سب کو اپنے پاس ایک فرش پر لٹاتی تھی اور رات کو بار بار اٹھ کر دیکھتی بھی کہ کوئی غائب تو نہیں ہو گیا کیا یہ عذاب نہیں۔ بعض لوگوں کو حق تعالیٰ مال کی محبت سے عذاب دیتے ہیں۔ مشہور ہے کہ بخیل جب مسجد میں جایا کرتا تھا گھر کا چراغ گل کر جاتا تھا ایک مرتبہ بھول گیا تو مسجد سے لوٹ کر آیا باندی نے پوچھا کہ خیر ہے کیوں لوٹ کر آئے کہا میں چراغ گل کرنا بھول گیا تھا اس نے کہا میں ایسی غافل نہیں تھی میں نے تمہارے جاتے ہی گل کر دیا تھا مگر مجھے تو اس کی فکر ہے کہ تم جو لوٹ کر آئے اس میں تمہارا جوتا گھس گیا ہوگا۔ بخیل صاحب نے باندی کی بڑی تعریف کی کہ اسی طرح کفایت سے خرچ کیا کرتے ہیں اور میرے جوتوں کی تو فکر نہ کر کیونکہ لوٹتے ہوئے میں نے بغل میں دبا لئے تھے۔ تو کیا یہ مال کی محبت وبال جان نہیں ہے کہ جبکہ ہر وقت انسان اسی ادھیڑ بن میں لگا رہے اب میں نے آپ کو اچھی طرح دکھلا دیا کہ دنیا کی بھی راحت اسی کو ہے جس کا دین اچھا ہے۔

توکل سے اطمینان اور سکون قلب حاصل ہوتا ہے:

حضرت بہلولؒ سے کسی نے کہا کہ روٹی گراں ہو گئی کہا ہم کو کیا فکر ہے ہماری روٹی کا ذمہ انہوں نے لیا ہے اور ہم پر عبادت فرض کی ہے کہ ہم کو عبادت میں لگنا چاہئے روٹی وہ آپ دیں گے۔ مولانا فتح محمد صاحبؒ کے پاس ایک طالب علم مثنوی پڑھنے آیا تو آپ نے پوچھا کہ روٹی کا کیا انتظام ہوگا۔ اس نے کہا حضرت آپ روٹی کی فکر نہ کریں مجھے کتاب پڑھا دیجئے مولانا نے فرمایا کہ آخر بغیر کھائے جیو گے کس طرح اس نے کہا کہ اللہ دے گا اور جو نہ دے گا تو اپنی جان لے لیگا یعنی بہت سے بہت بھوکا مر جاؤں گا اس سے زیادہ تو کچھ نہ ہوگا اور اس سے بڑھ کر کیا خوش قسمتی ہوگی کہ طالب علمی میں موت آ جائے مولانا نے فرمایا کہ بھائی تو پڑھ لے گا تیرے واسطے کچھ انتظام وغیرہ کی ضرورت نہیں دوسرے روز محلہ کے لوگ دعوت کرنے لگے کئی مہینے تک خوب دعوتیں رہیں۔ میرا یہ مطلب نہیں کہ سارا کام چھوڑ کر اس طالب علم کی طرح دعوتوں پر پڑے رہیں نہیں

بلکہ مطلب یہ ہے کہ توکل حاصل کرنا چاہئے اگر کسی کو توکل کے بعد روٹی بھی نہ ملے تو اس کو سکون واطمینان قلب حاصل ہوگا۔ تو اصلاح اعمال وہ چیز ہے جس میں آخرت کا تو بھلا ہے ہی دنیا کی راحت بھی اسی سے حاصل ہے خصوصاً اگر تندرستی بھی ہو اور بقدر ضرورت غنا اور فراغت بھی ہو تو پھر اس شخص سے زیادہ خوش قسمت کوئی نہیں حدیث میں ہے۔ **نعمتان مغبون فیهما کثیر من الناس (ای لا ینتفع بهما الناس) الصحة والفراغ** ۔ (دو نعمتیں ایسی ہیں اکثر آدمی ان سے منتفع نہیں ہوتے ایک صحت دوسرے فراغت) ولنعم ماقیل ؎

خوشا روزگارے کہ دارد کسے — کہ بازار حرصش نباشد بسے

بقدر ضرورت یسارے بود — کند کارے اے مرد کارے بود

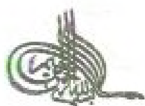
یعنی وہ شخص بڑا خوش قسمت ہے کہ خدا تعالیٰ اس کو حرص سے بچاوے اور بقدر ضرورت غنا دے کام میں لگا رہے۔

وقت ایک نعمت عظمیٰ ہے:

صاحبو! وقت کو غنیمت سمجھو کہ یہ بھی نعمت عظمیٰ ہے یہاں ایک دفعہ سبحان اللہ کہا اور سارا آسمان ثواب سے بھر جاتا ہے پھر اس ایک دفعہ سبحان اللہ کہنے کو ترس جاؤ گے بعض طبائع میں ناقدری ہوتی ہے وہ اس کی قدر نہیں کرتیں مگر مرنے کے بعد معلوم ہوگا اس وقت اس کی قدر ہوگی سب چیزیں رکھی رہ جائیں گی۔

بے فکری کے زمانہ میں فراغت سے عبادت کرنا چاہئے:

اب میں وعظ کو ختم کرتا ہوں میرا مقصود یہ تھا کہ طاعون کے چلے جانے سے بے فکری نہ ہو اور اس وقت پہلے سے زیادہ کام کرنا چاہئے ہمیں صحابہ کا مذاق اختیار کرنا چاہئے ان حضرات کا کیا اچھا مذاق تھا کہ حضور ﷺ نے ان سے پوچھا کہ جب قیصر وکسریٰ کے ملک فتح ہوں گے اور ان کے خزانے تمہارے قبضہ میں آویں گے تم لوگ اس وقت کیا کرو گے صحابہ نے عرض کیا اذن نتفرغ للعبادت. صاحبو! ہم بھی انہیں کے متبع ہیں ہمارا بھی یہی حال ہونا چاہئے کہ جب خدا تعالیٰ بے فکری دے تو فراغت سے اس کی عبادت میں مشغول ہوں اور وقت کو غنیمت سمجھیں یہ تو مقصود تھا کہ ختم ہو چکا۔ اب حق تعالیٰ سے دعا کیجئے کہ ہمارے اوپر سے بلاؤں کو دور کرے اور بلاؤں کو ہمارے لئے ذریعہ عبرت بنائے اور نیک اعمال کی توفیق مرحمت ہو۔ فقط۔



فوائد الصحبة

صحبت کے فوائد

یہ وعظ ۶ ذی قعدہ ۱۳۳۰ھ بروز جمعۃ المبارک بمقام کاندھلہ مکان مولوی رضی الحسن صاحب جوکہ حضرت والا نے کھڑے ہوکر بعد نماز جمعہ تا مغرب باستثنائے مقدار ادائے نماز عصر ارشاد فرمایا۔ سامعین کی تعداد تقریباً تین سو ۳۰۰ سے زائد تھی۔ جس کو مولٰنا سعید احمد صاحب [illegible]م بند فرمایا۔

خطبہ [illegible]

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد لله [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

عدم انذار کی صورت میں نہ ہوتا اور یہیں سے اہل علم کے نزدیک اس اعتراض کا بھی جواب ہو جاوے گا کہ جب آپ کا انذار و عدم انذار مساوی تھا تو ایک عبث فعل آپ کے کیوں سپرد ہوا۔ حاصل جواب یہ ہے کہ عبث تو اس وقت کہا جا سکتا تھا کہ جب آپ کے حق میں بھی برابر ہوتا اور جب آپ کے حق میں برابر نہ تھا۔ لترتب الثواب علی الانذار وانتفائه علیٰ عدمه (یہ سبب ثواب مرتب ہونے کے ڈرانے پر اور نہ مرتب ہونا نہ ڈرانے پر) تو یہ فعل عبث نہ رہا۔ غرض اس میں تو شبہ نہیں کہ انبیاءؑ کو تبلیغ وانذار پر ثواب تو ملتا ہے لیکن گفتگو یہ ہے کہ یہ ثواب آپ کی نظر میں بھی انذار سے مقصود تھا یا نہیں تو حضور ﷺ کی شفقت دیکھنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضور ﷺ کو محض ثواب مقصود نہ تھا کیونکہ اگر آپ کو محض ثواب مقصود ہوتا تو اس قدر دل سوزی کی کیا وجہ تھی۔ ثواب تو صرف تبلیغ پر بھی مرتب ہو جاتا تھا جس کے باب قرآن مجید میں ارشاد ہے۔ لعلک باخع نفسک ان لا یکونوا مؤمنین۔ (شاید آپ اپنی جان کو ہلاک کرنے والے ہیں اس وجہ سے کہ ایمان لانے والے نہیں ہیں) اور ما انت علیهم بوکیل (آپ ان پر وکیل نہیں ہیں) اور لا تسئل عن اصحاب الجحیم (دوزخ والوں کی نسبت آپ سے سوال نہ ہوگا) ان سب آیات سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو بے حد غم تھا ان لوگوں کے ایمان نہ لانے کا۔ چنانچہ حضور ﷺ نے اس کو صاف لفظوں میں ارشاد بھی فرمایا۔

حضور اکرم ﷺ کی غایت شفقت:

حدیث شریف میں ہے کہ فرمایا رسول اللہ ﷺ نے کہ میری تمہاری ایسی مثال ہے کہ جیسے کسی نے آگ روشن کی ہو اور پروانے گرتے ہوں وہ شخص ان پروانوں کو ہٹاتا ہو لیکن وہ اس پر غالب آ جاتے ہوں۔ اسی طرح تم لوگ دوزخ کی آگ میں جان جان کر گرتے ہو اور میں تمہاری کمریں پکڑ پکڑ کر ہٹاتا ہوں لیکن تم مجھ پر غالب آئے جاتے ہو اور اس میں گھسے جاتے ہو۔ ان الفاظ سے ہر زبان دان کو اندازہ ہو سکتا ہے کہ زیادہ مقصود حضور ﷺ کا یہ تھا کہ یہ لوگ آگ سے بچیں اور یہی وجہ تھی کہ اگر کوئی ایسی تجویز آپ کے روبرو پیش کی جاتی جس سے آپ کو اپنے مقصود حاصل ہونے کی امید ہوتی ہو تو آپ اس کو بہت جلد قبول فرما لیتے تھے۔

حضرت نبوی میں مشرکین کی ایک لایعنی درخواست:

اسی سے کفار مشرکین کو ایک شرارت سوجھی اور انہوں نے وق کرنے کے لئے مشغلہ نکالا

جیسے آج کل مصلحین کے ساتھ کیا جاتا ہے چنانچہ کفار نے کہا یا رسول اللہ ﷺ (یہ تو کیوں کہا ہوگا یا محمد کہا ہوگا) ہم آپ کے پاس آیا کریں تو کچھ سن لیں لیکن چونکہ آپ کے پاس غربا، کا مجمع رہتا ہے جن کے پاس بیٹھتے ہوئے ہمیں عار آتی ہے اس لئے ہم نہیں بیٹھتے۔ اگر آپ ان کو علیحدہ کر دیا کریں اور ہمارے لئے ایک مستقل مجلس علیحدہ کر دیں اور جس وقت ہم آیا کریں ان کو اٹھا دیا کریں کیونکہ ہمارے پاس بیٹھ کر ان کا حوصلہ بڑھے گا تو ہم حاضر ہوا کریں اور اس سے ان کو یہ ہر گز مقصود نہ تھا کہ ہم مسلمان ہو جائیں گے بلکہ محض دق کرنا منظور تھا کہ تھوڑی دیر احباب میں مفارقت ہی رہے گی۔

صحابہ کرام کی حضور ﷺ سے سچی محبت:

کیونکہ صحابہ کرام کو وہ محبت تھی حضور ﷺ سے کسی کو نہیں ہوئی۔ اور یہی سبب تھا اطاعت کاملہ کا ورنہ اگر کامل محبت نہ ہو تو اطاعت کاملہ ہو نہیں سکتی آج کل اکثر دینداروں میں بھی محض ضابطہ کی محبت ہے۔

محبت کی دو قسمیں:

صاحبو! بہت بڑا فرق ہے ضابطہ کی محبت میں اور جوش کی محبت میں۔ اول میں تو کوئی نہ کوئی غرض پنہاں ہوتی ہے اور اس میں ضرور فروگذاشت ہو جاتی ہے وہ محض مصلحت پر مبنی ہوتی ہے اور بسا اوقات ایک مصلحت کے قائم مقام دوسری مصلحت ہو جاتی ہے تو نفس کہتا ہے کہ مقصود تو آگ سے بچنا ہے اس گناہ کو کرلو اس کے بعد توبہ کر لینا تو آگ سے تو اس طرح بھی بچ جاؤ گے اور یہی وجہ ہے ہم کو ہمارے نفس نے دلیر کر دیا ہے تو آگ سے بچنے کی مصلحت ایک محرک عقلی ہے جس پر تقاضائے نفس غالب آ سکتا ہے اور محبت محرک طبعی ہے کہ اگر یہ بھی معلوم ہو جاوے کہ ترک اطاعت پر عذاب نہ ہوگا تو بھی مخالفت سے شرماتا ہے کیونکہ وہاں داعی الی الاطاعت (اطاعت کی طرف داعی) طبعی ہو جاتا ہے۔ اسی لئے فرماتے ہیں۔

صنمارہ قلندر سزد ار بمن نمائی　　　　که دراز و دور دیدنم رہ و رسم پارسائی

اے مرشد مجھ کو قلندری کا راستہ بتلا دیجئے کیونکہ پارسائی کا راستہ تو بہت دور دراز کا ہے۔

تو صحابہؓ کا اطوع الخلق (تمام مخلوق سے زیادہ اطاعت کرنے والے) ہونا اسی وجہ سے ہے کہ وہ عاشق تھے نرے مصلحت بین نہ تھے ان کی یہ حالت تھی۔

رند عالم سوز را با مصلحت بینی چکار	کار ملک ست آنکہ تدبیر وتحمل بایدش

عاشق کو مصلحت بینی سے کیا تعلق اس کو تو محبوب حقیقی کا کام سمجھ کر تحمل اور تدبیر چاہیے۔
ان کی اطاعت پر مصلحت بھی مرتب ہو جاتی تھی لیکن محبت اور اطاعت مصلحت پر مبنی نہ تھی ان کی یہ حالت تھی کہ اگر مخالفت کرنا بھی چاہتے تو نہیں ہو سکتی تھی۔

صحابہؓ کی محبت کا ایک قصہ:

صحابہ کی محبت کا اندازہ اس سے کیجئے کہ ایک مرتبہ ایک صحابی نے پختہ مکان ڈاٹ دار کسی مصلحت سے بنالیا کہ وہ مصلحت ضرورت کے درجے میں نہ تھی گو انہوں نے کسی درجے میں ضروری سمجھا ہو اتفاق سے حضور ﷺ کا گزر ایک مرتبہ اس طرف سے ہوا۔ حضور ﷺ نے اس مکان کو دیکھ کر دریافت فرمایا کہ یہ کس کا مکان ہے۔ صحابہؓ نے عرض کیا کہ یارسول اللہ ﷺ فلاں شخص کا ہے۔ حضور ﷺ نے کچھ نہیں فرمایا اور واپس تشریف لے آئے۔ جب صاحب مکان حضور ﷺ کے پاس حاضر ہوئے تو انہوں نے سلام عرض کیا۔ حضور ﷺ نے ان کی طرف سے منہ پھیر لیا وہ دوسری طرف سے آئے آپؐ نے ادھر سے بھی منہ پھیر لیا۔ اب تو ان کو بہت فکر ہوئی انہوں نے دوسرے صحابہ سے دریافت کیا تو انہوں نے کہا کہ کوئی خاص بات ہے تو ہم کو معلوم نہیں ہاں اتنا ضرور ہوا تھا کہ حضور ﷺ تمہارے مکان کی طرف تشریف لے گئے تھے اور تمہارے مکان کو دیکھ کر دریافت فرمایا تھا کہ یہ کس کا مکان ہے۔ ہم نے بتلا دیا تھا اس پر حضور ﷺ نے کچھ نہ فرمایا تو نہیں لیکن اس وقت سے خاموش ہیں۔ دیکھئے اس حدیث میں کہیں تصریح نہیں کہ حضور ﷺ نے مکان کی بابت کچھ بھی فرمایا ہو اس لئے صاحب مکان کے پاس اس یقین کا کوئی ذریعہ نہیں تھا کہ حضور ﷺ کی کبیدگی کی وجہ یہ مکان ہی ہے۔ آج کل کی عقل کا تو جس کا نسبت کسی قول ہے۔

آزمودم عقل دور اندیش را	بعد ازیں دیوانہ سازم خویش را

(عقل دور اندیش کو آزمالیا جب اس سے کام نہ چلا تو اپنے کو میں نے دیوانہ بنایا)

یہ فتویٰ ہوتا کہ پوچھ لیتے یہی وجہ ناراضی کی ہے یا کچھ اور۔ اگر یہی تو خیر اس کو گرادیں بلکہ آج کل تو اس پر بھی اکتفانہ کیا جاتا بلکہ پوچھا جاتا کہ حضور ﷺ اس میں خرابی کیا ہے۔ یہ تو فلاں فلاں مصلحتوں پر مبنی ہے۔ جیسا کہ آج کل ورثۃ الانبیا کے ساتھ ان کے احکام خداوندی پہنچانے کے وقت اور منکرات پر تنبیہ کرنے کے وقت معاملہ کیا جا رہا ہے صحابہ کرام بھی ایسا کر سکتے تھے کہ حضور

ﷺ سے اس حکم کے اسرار دریافت کرتے جیسا کہ آج کل دریافت کئے جاتے ہیں اور حضور ﷺ کو تو اسرار کی اطلاع بھی تھی علماء کو تو اسرار کی خبر بھی نہیں یہ تو قانون کے عالم ہیں نہ کہ اسرار قانون کے عالم تو اس صورت میں علماء سے اسرار کا دریافت کرنا ہی غلطی ہے لیکن حضور ﷺ تو صاحب وحی ہیں آپ کو تو اگر بالفرض اسرار کی اطلاع نہ بھی ہوتی تو خدا تعالیٰ سے پوچھ کر بتلا دیتے لیکن ان صحابی نے ان سب کو نظر انداز کر کے وجہ خفگی تعیین کی بھی ضرورت نہیں سمجھی بلکہ جس میں ذرا سا بھی احتمال سبب غضب ہونے کا ان کو ہوا اس کو خاک میں ملا دیا یعنی اسی وقت جا کر مکان کو زمین کے برابر کر دیا۔ شاید آج کل کے عقلاء اس حرکت کو خلاف عقل بتلا دیں کہ محض احتمال پر اتنا مال ضائع کر دیا۔ لیکن اگر خلاف عقل ہوتا تو حضور ﷺ اس کے گرانے پر ناخوش ہوتے۔ غرض انہوں نے فوراً مکان گرا دیا اور پھر حضور ﷺ کو اطلاع بھی نہیں کی بلکہ اپنی قسمت پر بھروسہ کر کے بیٹھ رہے کہ جس طرح حضور ﷺ نے اتفاقاً مکان کو دیکھ لیا تھا۔ اسی طرح میرے گرانے کی اطلاع بھی حضور ﷺ کی خوشنودی میری قسمت میں ہے تو اتفاقاً حضور ﷺ کو ہو جاوے گی۔ کیونکہ جانتے تھے کہ اطلاع تو جب کروں جب حضور ﷺ پر مکان گرانے کا کچھ احسان ہو تو یہ محض اپنی ہی بھلائی ہے۔

قل لا تمنو اعلی اسلامکم بل اللّٰہ یمن علیکم ان ھداکم للایمان ان کنتم صدقین۔

اے محمد ﷺ آپ فرما دیجئے کہ مجھ پر اپنے اسلام کا احسان نہ رکھو بلکہ اللہ ہی تم پر احسان رکھتا ہے کہ تم کو ایمان کی ہدایت فرمائی اگر تم سچے ہو غرض حضور ﷺ کا پھر اس طرف جو گزر ہوا تو فرمایا کہ وہ مکان کا کیا ہوا صحابہؓ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ ﷺ صاحب مکان کو جب حضور ﷺ کی خفگی کی اطلاع ہوئی تو انہوں نے فوراً ہی آ کر مکان کو گرا دیا۔ حضور ﷺ اس کو سن کر بہت خوش ہوئے۔ اور زیادتی تعمیر کی مذمت فرمائی۔ اب دوسرا مسئلہ ہے کہ کتنی تعمیر ضروری ہے جو یہاں مذکور نہیں۔

صحابہ کی لغزشیں سب معاف ہیں:

تو صحابہ کرامؓ کی محبت کا یہ عالم تھا اور اس محبت کا مقتضیٰ یہ بھی ہے کہ صحابہؓ کی زلات بالکل معاف ہوں۔ دیکھئے اگر کسی جان نثار خادم سے کبھی کوئی غلطی ہو جاتی ہے تو اس کی پرواہ بھی نہیں کیا کرتے۔ ابھی حال ہی میں ایک واقعہ ہوا کہ ایک صاحب کے بدن میں ایک گہرا زخم ہو گیا تھا ڈاکٹر نے دیکھ کر کہا کہ اس زخم میں اگر کسی آدمی کا گوشت لے کر بھرا جائے تو یہ برابر ہو جائے۔

اوران صاحب کا ایک نوکر اس وقت موجود تھا کہنے لگا کہ میری ران میں سے جس قدر گوشت کی ضرورت ہو لیا جاوے۔اب بتلایئے کہ اگر اس خادم سے کبھی کوئی سرسری لغزش ہو جاوے تو کیا وہ آقا اس پر مؤاخذہ کرے گا ہرگز نہیں۔پس یہی وجہ ہے کہ صحابہ پر طعن کرنا جائز نہیں۔

مشاجرات صحابہ کا نہایت قابل اطمینان جواب:

صاحبو! جو مشاجرات صحابہ سے منقول ہیں اور جتنی لغزشیں ہوئی ہیں اگر ان سے دس حصہ زیادہ ہوتیں وہ بھی معاف تھیں۔غضب کی بات ہے کہ آپ اپنے کو قدرداں سمجھتے ہیں کہ وفادار۔ جان نثار کی لغزش کو قابل معافی سمجھتے ہیں اور خدا تعالیٰ اور رسول اللہ ﷺ کو اتنا بھی قدرداں نہیں سمجھتے اسی لئے ہم بلا تامل کہتے ہیں کہ الصحابة كلهم عدول (صحابہ سب کے سب عادل ہیں) اوراس حدیث پر اعتماد رکھیں گے۔لا يمس النار من رانی (جس شخص نے مجھ کو دیکھا اس کو آگ نہ چھوئے گی) اور اگر صحابہ کے بعض افعال ذلت ہیں تو ہم ان کی نسبت کہیں گے۔

خون شہیداں زلآب اولی ترست   ایں خطا از صد ثواب اولیٰ ترست

(شہیدوں کا خون پانی سے اولیٰ تر ہے یہ خطا سو ثواب سے زیادہ بہتر ہے)

صحابہؓ کی جان نثاری کا دوسرا حصہ:

غرض صحابہ کی یہ شان تھی اوران کی اس محبت کا علم اور اندازہ ان کفار کو بھی تھا چنانچہ جب حدیبیہ کی صلح ہوئی ہے اور علی سبیل التعاقب روساء کفار مسلمانوں میں آئے ہیں تو ایک رئیس نے جاکر اپنی قوم سے کہا ہے کہ میں نے بڑے بڑے شاہان دنیا کا دربار دیکھا ہے۔کسریٰ اور قیصر کے درباروں میں شریک ہوا ہوں اور مگر کسی کے حشم وخدم کو میں نے اتنا مطیع نہیں دیکھا جس قدر کہ اصحاب محمد ﷺ مطیع ہیں۔یہ حالت ہے کہ اگر آپ تھوک پھینکتے ہیں تو وہ زمین پر نہیں گرتا اور جب وضو کرتے ہیں تو اس کا غسالہ لوگ اپنے ہاتھوں پر لیتے ہیں اور اگر کسی کو نہیں ملتا تو وہ دوسرے کے ہاتھ پر ہاتھ مل کر اپنے منہ پر پھیر لیتا ہے گویا وہ حالت تھی۔

مرا از زلف تو موئے بسند ست   ہوس رارہ مدہ بوی بسند ست

(یعنی اگر محبوب نہ ملے تو اس کا بال ہی کافی ہے اگر بال بھی نہ ملے تو خوشبو ہی بہت ہے)

صاحبو! بتلایئے یہ بھی کہیں قرآن میں یا حدیث میں حکم ہے کہ نبی کریم ﷺ کا غسالہ وضو

اپنے منہ پر ضرور ملا کرو۔ اللہ اکبر۔ اسوقت بہت جماعتیں صحابہؓ پر طعن کرتی ہیں مگر ان کی اس حالت کو نہیں دیکھتے بھلا نماز روزہ وغیرہ کی بابت تو یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ جنت کے شوق میں کرتے تھے لیکن غسالہ وضو کا حکم وجوبی یا استحبابی کہیں آیت میں تھا کہ اس کو منہ پر مل لیا کرو تو فلاں فضیلت ملے گی اس وقت تو واللہ بعضے ایسے مستقل مزاج ہیں کہ اگر حضور ﷺ کو وضو کرتے دیکھتے تو کبھی حرکت بھی نہ ہوتی کیا اس وقت سو میں ایک شخص بھی ایسا برتاؤ کر سکتا ہے جو صحابہ کرام نے کیا بلکہ عجیب نہیں کہ اس فعل سے استنکاف کرتے۔

ہمارا زمان نبوی ﷺ سے بعید ہونا رحمت ہے:

صاحبو! ہم بڑے خوش قسمت ہیں کہ اس وقت پیدا ہوئے اور حضور ﷺ کے زمانے میں نہیں پیدا ہوئے ورنہ ہمارا یہ استنکاف خدا جانے ہم کو کس حد میں داخل کرتا۔ اس وقت جو ہم بہت سی باتوں میں فتویٰ کفر سے بچ جاتے ہیں تو اس لئے کہ علماء تاویل کر لیتے ہیں کہ یہ استنکاف حضور ﷺ کے امر سے نہیں بلکہ فلاں شخص سے ہے جس کے واسطے سے یہ امر اس کو پہنچا ہے۔ نسبت الی الرسول ﷺ (رسول کی طرف نسبت) میں شبہ ہونے سے یہ اعتراض کیا ہے اور ہم اس وقت ہوتے اور یہ حالت ہوتی تو ہمارے ان افعال پر حضور ﷺ کی طرف سے کفر کا فتویٰ ہوتا۔

دین کے دسویں حصہ پر عمل کا مفہوم:

یہ خدا تعالیٰ کی رحمت ہے کہ ایسے زمانہ میں پیدا ہوئے جس کی نسبت حضور ﷺ نے فرمایا کہ ایک وہ زمانہ آوے گا کہ دسواں حصہ بھی اگر کوئی عمل کرے گا تو اس کی نجات ہو جاوے گی۔ مگر اس سے کوئی یہ نہ سمجھے کہ جب حضور ﷺ کے وقت میں پانچ وقت کی نماز فرض تھی تو اب نصف وقت کی نماز کافی ہو گی۔ یعنی اگر فرض و وتر کا مجموعہ بیس رکعتیں ہوں تو دو رکعتیں کافی ہو جاویں۔ چونکہ یہ شبہ ہو سکتا تھا اس لئے میں اس حدیث کی توضیح کرتا ہوں کہ یہ تخفیف کیفیت کے اعتبار سے ہے نہ کہ کمیت کے اعتبار سے یعنی اعمال میں جو خلوص اس وقت تھا اگر اس وقت نو حصہ کم بھی ہو تو نجات ہو جائے گی۔ تو یہ خدا تعالیٰ کی بڑی رحمت ہم پر ہے کہ ہم زمانہ تخفیف میں پیدا ہوئے۔ یہ تو تخفیف کا بیان ہے۔

تاویل کی مثال:

اور تاویل کی مثال یہ ہے کہ مثلاً بیوہ کا نکاح ثانی ہے کہ اس سے عام طور پر قلوب میں تنگی ہے

یعنی جیسا اول مرتبہ دل ہوتا ہے دوسری مرتبہ نکاح کرنے میں اتنا دل کھلا ہوا نہیں ہوتا۔ آگے یہ دیکھ لیجئے کہ خداوند تعالیٰ اسی تنگی کی نسبت کیا فرما رہے ہیں۔ فلا وربک لایؤمنون حتی یحکموک فیما شجر بینھم ثم لایجدوا فی انفسھم حرجا مما قضیت ویسلموا تسلیما ط

ترجمہ:۔ (تیرے رب کی قسم ہے یہ لوگ مومن نہ ہوں گے تاوقتیکہ آپ کو اپنے جھگڑوں میں حکم نہ بناویں جو آپ فیصلہ فرماویں اس پر اپنے دلوں میں تنگی نہ پاویں اور پوری طرح تسلیم کرلیں)

تو اس پر کیا فتویٰ ہوتا مگر اس وقت ہم ان لوگوں کی اس تنگی کی یہ تاویل کرلیتے ہیں کہ یہ حکم شرعی سے استنکاف نہیں ہے بلکہ عرف کی وجہ سے طبعی شرم آتی ہے۔

یقینی امر نبوی علیہ ﷺ کا انکار کفر ہے:

لیکن حضور علیہ ﷺ کسی کو فرمادیتے کہ نکاح ثانی کرو اور اس کے قلب میں اس سے تنگی پیدا ہوتی تو اس وقت کیا بچاؤ ہوتا کیونکہ خطاب خاص خود دلیل ہوتی بطلان عذر کے لئے اور اس کے لئے نظیر موجود ہے کہ حضرت زینب ؓ کا نکاح حضور علیہ ﷺ نے حضرت زید ؓ سے کرنا چاہا اور حضرت زینب ؓ بوجہ عالی خاندان کے ہونے کے ذرا رکتی تھیں اور اسی طرح ان کے بھائی بھی فوراً یہ آیت نازل ہوئی ماکان لمؤمن و لا مؤمنة اذا قضی اللہ ورسولہ امر ان یکون لھم الخیرة ط

(کسی مومن اور مومنہ کو شایاں نہیں کہ جب اللہ تعالیٰ و رسول علیہ ﷺ کسی امر کا فیصلہ فرماویں تو اس امر میں ان کو اختیار ہو)

حالانکہ یہ ایک دنیا کا معاملہ تھا لیکن اس میں بھی حکم رسول اللہ علیہ ﷺ کے سامنے چون وچرا کرنے کی اجازت نہیں ہوئی تو معلوم ہوا کہ آپ خواہ دینا کا کام بتلاویں یا دین کا کام بتلاویں مگر جس کو فیصلہ کرکے فرماویں اس سے انکار کفر ہے تو اس وقت اگر ہم انکار کرتے تو فوراً کافر ہوجاتے اور اس وقت تو یہ کہہ دیتے ہیں کہ مولویوں کے طرز بیان سے استنکاف ہے نہ کہ حکم شریعت سے تو ہمارے لئے اس زمانہ سے بعید ہونا ہی رحمت ہوا۔ یہ صحابہ ؓ ہی کا حوصلہ تھا کہ انہوں نے اپنا مال اپنی جان اولاد گھربار اپنے مصالح سب آپ کے سپرد کردیئے تھے یہ حالت تھی کہ۔

صحابہ کی اطاعت اور انقیاد کی ایک عجیب حکایت:

میں نے ایک مقام پر دیکھا ہے مگر اس وقت یاد نہیں کہ ایک شخص ایک عورت سے نکاح کرنا چاہتے تھے حضور علیہ ﷺ نے فرمایا کہ تم نے اس کو دیکھ بھی لیا ہے مقصود یہ تھا کہ کسی تدبیر سے ایک

مرتبہ اس کو دیکھ لو یہ مطلب نہ تھا کہ جا کر اس عورت کے ماں باپ کو پیغام دو کہ مجھے اپنی لڑکی دکھلا دیں مگر وہ ایسے بھولے بھالے تھے کہ جا کر اس عورت کے ماں باپ کو پیغام دیا کہ مجھے اپنی لڑکی دکھلا دو۔ اس لڑکی کے ماں باپ کو یہ بات ناگوار ہوئی۔ انہوں نے کچھ کہنا چاہا۔ پس پردہ لڑکی بھی موجود تھی حضور ﷺ کا نام سن کر فوراً پردہ ہٹا دیا اور اپنے ماں باپ سے کہا کہ خبردار حضرت ﷺ کے ارشاد کے بعد کچھ نہ بولنا اور اس شخص سے کہا کہ جب حضور ﷺ نے یہ فرمایا ہے تو میں حاضر ہوں تم مجھے دیکھ لو۔ صاحبو! یہ محبت کا خاصہ ہے اس میں مصالح اور ننگ و عار سب بالائے طاق رکھے جاتے ہیں۔ فرماتے ہیں ؎

شاد باش اے عشق خوش سودائے ما　　اے دوائے جملہ علتہائے ما

اے دوائے نخوت و ناموس ما　　اے تو افلاطون و جالینوس ما

(اے عشق خدا تجھ کو خوش رکھے تو ایسا ہے کہ تیری بدولت خیالات درست ہو جاتے ہیں اور تجھ سے تمام امراض کا علاج ہو جاتا ہے تجھ سے نخوت و ناموس کا دفیعہ ہو جاتا ہے تو ہمارے لئے مثل افلاطون اور جالینوس کے ہے) کیا اچھی بات فرمائی کہ اے دوائے نخوت ناموس ما۔

صحابہ کی جانثاری کا ایک اور واقعہ:

صاحبو! یہ حالت تھی کہ کثرت سے صحابیات نے مختلف اوقات میں آ کر حضور میں عرض کیا کہ آپ ہم کو قبول فرما لیجئے اور اپنی کنیزی میں لے لیجئے اور آپ نے فرما دیا کہ مجھے ضرورت نہیں ہے پھر کیا اس فعل پر ان کی مذمت کی گئی ہرگز نہیں۔ ان کی جو قدر کی گئی اس کو بھی سن لیجئے حضرت انسؓ کی صاحبزادی نے ایک مرتبہ ایسے ہی واقعہ پر یہ کہہ دیا کہ مااقل حیاء ھا (کیسی بے شرم ہے) حضرت انسؓ بگڑ گئے اور فرمایا کہ وہ تجھ سے ہزار درجہ اچھی تھی کہ اپنے کو حضور ﷺ کی خدمت میں پیش کرتی تھی۔

ولی کا صحابہ کے برابر نہ ہونے کا راز:

اور یہی راز ہے کہ غیر صحابی خواہ کتنا ہی بڑا ہو جاوے لیکن صحابی کے برابر نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ حضرت غوث الاعظمؒ سے حضرت امیر معاویہؓ کی بابت پوچھا گیا تو فرمایا کہ اگر معاویہ گھوڑے پر سوار ہوں اور اس کے پیروں کی گرد اڑ کر اس گھوڑی کی ناک پر جا بیٹھے تو حضرت معاویہؓ کے گھوڑے کی وہ ناک کی گرد عمرو بن عبدالعزیزؒ اور اویس قرنیؒ سے افضل ہے۔ ہم کو اس فتوے کی قدر نہیں ہے مگر اہل محبت جانتے ہیں کہ حضرت غوث الاعظمؒ نے کیا بات فرمائی۔ قدر گوہر شاہ داند

یا بداند جوہری۔ (گوہر کی قدر بادشاہ جانتا ہے یا جوہری جانتا ہے) تو صحابہ میں بڑی بات یہ تھی کہ وہ حضرات پورے عاشق تھے۔ اور یہی وجہ ہے کہ انہوں نے علمی عملی وہ اصلاح کی کہ نہ کوئی فلسفی اپنی قوم کی کر سکا اور نہ کوئی سلطان اپنی رعایا کی کر سکا کیونکہ ان کے پاس تو نور ہی دوسرا تھا جس کو فرماتے ہیں۔ اومن کان میتا فاحیینا ہ وجعلنا لہ نورا یمشی بہ فی الناس (کیا جو مردہ ہو پس اس کو ہم زندگی بخشیں اور اس کے لئے ایک نور کردیں کہ وہ اس کو لوگوں میں لئے پھرتا ہے) اس کو نور سے تعبیر کیجئے یا برکت صحبت کہئے سب کا خلاصہ ایک ہی ہے۔

عبار اتنا شتی وحسنک واحد وکل الیٰ ذاک الجمال یشیر

(ہمارے عنوانات بیان مختلف ہیں مگر تیرا حسن ایک ہی ہے ہر عنوان اسی حسن کی طرف اشارہ کرتا ہے)

اگر ہم بھی اس مقام پر پہنچنا چاہیں جس پر صحابہ تھے (یعنی باعتبار عطا کے کیونکہ وہ جاہ تو ہم کو کہاں نصیب)

حضرات صحابہؓ سے وابستگی کی ضرورت:

تو صورت یہ ہے کہ ہم ان سے وابستگی اطاعت کی پیدا کرلیں کہ اس کی بدولت انہی کے ساتھ ساتھ لگے چلے جاویں جیسے ایک انجن پشاور سے چلے اور کلکتہ پہنچے اور ایک ٹوٹی ہوئی گاڑی بھی کلکتہ پہنچنے کی متمنی ہو تو اس کے سوا کوئی صورت نہیں کہ اس انجن کے ساتھ اپنی زنجیر ملادے۔ تو اب ہمارا بھی یہی کام ہونا چاہئے کہ ہم صحابہ کے ساتھ تعلق پیدا کریں۔ خیر یہ سب جملہ معترضہ تھے مقصود یہ تھا کہ صحابہ کی محبت کا یہ عالم تھا اور کفار کو بھی اس کا علم تھا اس لئے ان کا مقصود یہ تھا کہ تھوڑی دیر کے لئے ان میں جدائی ہی ڈال دیں تو یہ رنگ لائے مگر دوستی کے پیرایہ میں ؎

دشمن ار چہ دوستانہ گویدت دام داں گرچہ ز دانہ گویدت

زانکہ صیاد آورد بانگ صفیر تا کہ گیرد مرغ را آں مرغ گیر

(دشمن اگرچہ کوئی بات دوستانہ طریق پر تم سے کہے مگر تم اس کو دھوکہ ہی سمجھو کیونکہ شکاری جانوروں کو پکڑنے کے لئے ان ہی جیسی آوازیں نکالا کرتے ہیں)

بدخواہوں کا ہمیشہ قاعدہ ہے کہ برنگ خیر خواہی بدخواہی کیا کرتے ہیں دنیا میں بہت لوگوں نے مسلمانوں سے ایسا کیا ہے تو حضور ﷺ سے بھی ان کفار نے یہی معاملہ کیا۔ حضور ﷺ کی

فراست عجیب تھی لیکن احتمال ہے کہ شاید یہ اسی طرح ایمان لے آویں اس شرط کو منظور فرمالیا۔ رہا صحابہ کے رنج کا خیال تو حضور ﷺ جانتے تھے کہ صحابہؓ تو اپنے ہیں ان کو تو اگر ساری عمر کے لئے الگ کردیں تب بھی الگ ہو جاویں گے کیونکہ وہ تو طالب رضا ہیں ان کی تو وہ حالت ہے کہ ؎

اريد وصاله ويريد هجری　　　فاترک ما اريد لما يريد

(میں اس کے وصال کا خواہشمند ہوں اور وہ فراق چاہتا ہے تو اس کی خاطر میں اپنی خواہش چھوڑ دیتا ہوں)

فرماتے ہیں ؎

فراق ووصل چہ باشد رضائے دوست طلب　　　کہ حیف باشد ازو غیر او تمنائے

(کیسا وصال اور کس کا فراق رضائے محبوب کی تمنا ہونی چاہئے اس سے غیر اس کی تمنا کے افسوس ہوگا)

رضائے محبوب کا اتباع ضروری ہے:

یہاں سے ایک اور جملہ مفیدہ یاد آگیا کہ جب عاشق پر رضائے محبوب کا اتباع ضروری ہے۔ نیز یہ بھی معلوم ہو گیا کہ صحابہ عاجل مصلحت پر نظر نہ کرتے تھے گو مصلحت اس پر مرتب ہو جائے تو اس سے یہ بھی ثابت ہو گیا کہ احکام شرعیہ میں گو مصلحت ہو مگر اطاعت اس پر موقوف نہ ہونا چاہئے بلکہ اطاعت محض رضا کے لئے ہو۔ دیکھئے اگر کسی عورت سے عشق ہو جاوے اور وہ حکم کرے کہ میں جب ملوں گی جب تم پائجامہ چڑھا کر سر پر ٹوکرا رکھ کر جوتے نکال کر فلاں جگہ سے فلاں جگہ تک دس چکر لگاؤ تو یہ ہرگز نہیں پوچھے گا کہ اس میں مصلحت کیا ہے۔

رند عالم سوز را با مصلحت بینی چہ کار الخ

(عاشق کو مصلحت بینی کیا کام)

اگر عاشق ہے تو بیس دفعہ کر دکھائے گا۔ کہاں کی تہذیب اور کس کی عار وہ اس تہذیب کو تعذیب سمجھے گا کیونکہ مانع وصال یار ہے ایسے وقت پر تو مصلحت بینی اس شخص کا کام ہے جو فارغ عن المحبت ہو اور۔

احکام شرعیہ کی حکمتیں معلوم کرنے کا طریق:

میں یہ نہیں کہتا کہ احکام شرعیہ میں حکمتیں نہیں ہیں۔ حکمتیں ضرور ہیں مگر اول تو ہم کو ان کا

احاطہ نہیں۔ دوسرے یہ کہ ان کے ادراک کا طریقہ یہ نہیں جو اختیار کیا گیا ہے۔ بلکہ وہ محض موہوب ہیں جن کا اکثر ترتب تقویٰ پر ہوا ہے۔ ذرا تاریخ میں دیکھئے کہ امت میں جو بڑے بڑے لوگ جیسے شاہ ولی اللہؒ ابن العربیؒ عبدالکریم جیلیؒ وغیرہ گزرے ہیں اور انہوں نے حکم واسرار شریعت کے لکھے ہیں تو کیا انہوں نے ان اسرار کو کسی مدرسہ میں سیکھا تھا یا کسی مناظرہ سے حاصل کیا تھا ہرگز نہیں مگر یہ بات کیا تھی کہ مدرسہ سے نکل کر علم پر عمل کرنا شروع کر دیا۔ خلوص اختیار کیا اس سے ان کے قلب میں ایک نور پیدا ہوا جس کی بدولت ان کو سب کچھ منکشف ہو گیا۔

اسی کو کہتے ہیں

بینی اندر خود علوم انبیاء　　　　بے کتاب و بے معید و اوستا

(تم کو بے معین اور بغیر استاد و کتاب کے انبیاء جیسے علوم حاصل ہوں گے)

تو اگر اسرار معلوم ہونے کا کوئی طریقہ ہے تو یہ ہے لیکن اس پر بھی طالب حق کو اسرار کی ہوس نہ ہونا چاہئے۔ اس لئے کہ یہ محبت کے خلاف ہے جب ایک مزار کا عاشق اس کی فرمائش کا راز دریافت نہیں کرتا اور خواہ بعد میں یہی معلوم ہو کہ اس میں خاک بھی مصلحت نہ تھی۔ مگر اطاعت میں کس طرح دوڑتا ہے تو طالب حق اور عاشق خدا کو ایسی کاوش کب زیبا ہے۔ غرض ایسی کاوش طریق محبت کے بالکل خلاف ہے۔ طریق عشق تو اطاعت میں دیوانہ ہوتا ہے کہ

اوست دیوانہ کہ دیوانہ نہ شد

(وہی دیوانہ ہے جو دیوانہ نہ ہوا)

صاحبو! اگر آپ اس کے نظائر دنیا میں نہ برتتے تو میں آپ سے ہرگز یہ خطاب نہ کرتا لیکن جبکہ آپ محبوبان مجازی کے ساتھ یہ برتاؤ کرتے ہیں کہ ان کے ہر حکم کو بغیر دریافت اسرار پورا بجالاتے ہیں نیز حکام مجاز کے ساتھ بھی آپ کا یہی برتاؤ ہے کہ اگر صاحب کلکٹر آپ سے یہ کہے کہ ہم کو آج رات کے وقت دو بجے فلاں مقام پر تم سے فلاں امر میں مشورہ کرنا ہے جس کو ہم پرسوں انجام دیں گے تو آپ کے دل میں کبھی یہ وسوسہ بھی نہ آوے گا کہ جب پرسوں اس کام کو کیا جاویگا تو کل دن میں بھی تو اسی کی بابت مشورہ ہو سکتا ہے پھر رات کو مجھے بے چین کرنے سے کیا فائدہ اور اگر وسوسہ آوے گا بھی تو آپ اس کو دفع کر دیں گے کہ خواہ کوئی مصلحت ہو یا نہ ہو ہمیں تو ان کی رضامندی مقصود ہے تو جب اہل محبت اور اہل حکومت کے ساتھ آپ کا یہ برتاؤ ہے تو خدا تعالیٰ کے ساتھ کیوں نہیں ہے کیا خدا تعالیٰ اور رسول اللہ ﷺ ہی تحقیقات مصالح کی مشق

کے لئے تم کو ملے ہیں اور اگر دونوں موقعوں میں کوئی فرق ہے تو بتلائیے اور فرق نہیں تو پھر یہاں لم کان کذا اور کیف کان کذا ۔ (یہ کیوں ہوا اور کیسے ہوا) کیوں ہے بلکہ خدا تعالیٰ تو محبوب بھی ہیں اور حاکم بھی تو یہاں بدرجہ اولیٰ یہ حالت ہونی چاہئے کہ ۔

زندگی عطائے تو در بکشی رضائے تو   جان شدہ مبتلائے تو ہر چہ کنی رضائے تو

(آپ اگر زندگی بخشیں تو زہے نصیب اور موت دے دیں تو زہے قسمت جب دل آپ کا عاشق ہو گیا تو پھر آپ جو چاہیں کریں)

زبان تازہ کردن باقرار تو   نینگیختن علت از کار تو

(آپ کی ربوبیت کا اقرار کرنا آپ کے کاموں میں علتیں نکالنے کو مانع ہے)

کیا معنی چوں وچرا کے اور ہمارا حق ہی کیا ہے ہم کو نسبت ہی کیا ہے کہ ہم چون وچرا کریں ہاں یہ شبہ ہو سکتا ہے کہ مخالفان اسلام کا منہ بند کرنے کے لئے ہم اسرار پوچھتے ہیں اور ان کا منہ بند کرنا ضروری تو ہم کو اسرار بتلانا بھی ضروری ۔ لیکن اگر میں مخالفین کے لئے اس سے اچھا جواب آپ کو بتلا دوں اور آپ کے اس جواب کا مخدوش ہونا ثابت کر دوں پھر تو یقیناً اس شبہ کی گنجائش نہ رہے گی اس کا بیان یہ ہے کہ مسلمان دو قسم کے ہیں ایک اہل علم دوسرے عوام تو اگر آپ عوام میں سے ہیں تب تو سیدھی بات یہ ہے کہ معترض کو عالم کا نام بتلا دیجئے کہ ان سے پوچھو ہم زیادہ نہیں جانتے اور اگر اہل علم میں سے ہیں یا وہ آپ کو ذی علم سمجھتا ہے تو اس کے لئے دوسرا جواب ہے وہ یہ کہ آپ یوں کہئے کہ احکام قوانین ہیں ان کے اسرار اسرار قوانین ہیں اور ہم قانون کے جاننے والے ہیں اسرار قانون ہم نہیں جانتے نہ ان کا بتلانا ہمارے ذمہ واجب ہے دیکھئے اگر صاحب جج کسی مقدمہ میں ڈگری دیدیں تو مدعا علیہ یہ نہیں کہہ سکتا کہ جس قانون کی رو سے آپ نے ڈگری دی ہے میں اس قانون کو تو مانتا ہوں لیکن مجھ کو خود اس میں یہ کلام ہے کہ یہ قانون مصلحت کے خلاف ہے اس لئے آپ اس کا راز بتلا دیں ۔ اور اگر وہ ایسا کہے بھی تو اس کو توہین عدالت اور جرم سمجھا جاوے گا اور اس پر صاحب جج کو حق ہوگا کہ توہین عدالت کا اس پر مقدمہ کرے اور اگر مقدمہ بھی قائم نہ کیا تو اتنا ضرور کریگا کہ کان پکڑ کر اس کو عدالت سے باہر کر دے گا ۔ اور اگر اس وقت اس کی طبیعت میں حکومت کے بجائے حکمت غالب ہوئی تو یہ جواب دے گا کہ ہم عالم قانون ہیں ۔ واضع قانون نہیں مصالح واضع سے پوچھو تو کیا کسی عقلمند کے نزدیک یہ جواب نامعقول جواب ہے یا بالکل عقل کے موافق تو اگر عقل کے موافق ہے تو آپ مولوی بن کر یہ جواب کیوں نہیں دیتے کہ

ہم عالم قانون ہیں۔ واضع قانون خدا تعالیٰ ہے مصالح ان سے پوچھ لینا۔ وہ جواب دیں گے خواہ اسرار بتلانے سے خواہ دماغ کی اصلاح کرنے سے اور یہ فروغ اسلام کے متعلق جواب ہے۔ البتہ اگر مخالف اسلام کو نفس اسلام کی حقانیت تحقیق کرنا منظور ہے تو اصول اسلام میں عقلی گفتگو کریں گے ان میں ہم یہ مذکور جواب نہ دیں گے بلکہ اس کی حقانیت کے دلائل عقلیہ بتلائیں گے خواہ دس برس تک ہم سے کوئی پوچھے جائے اور اس کی ایسی مثال ہے کہ جیسے کوئی شخص سلطنت سے باغی ہو جائے اور بادشاہ کو بادشاہ نہ مانتا ہو اور آپ اسے منوانا چاہیں اور وہ اس کے ماننے کے لئے یہ طریقہ اختیار کرے تو آپ سے ہر قانون کی مصلحت دریافت کرے تو آپ ہرگز اس کو یہ راہ نہ دیں گے اور اس کو تطویل لاطائل سمجھیں گے اور اس شغل کو فضول قرار دیں گے البتہ یہ کریں گے کہ بدلائل بادشاہ کو بادشاہ ثابت کریں گے اور قانون کو اسکا قانون ثابت کریں گے پھر جس قانون کی نسبت وہ دریافت کرے گا اور اس کی مصلحت پوچھے گا آپ اس کے جواب میں یہی کہیں گے کہ ہم اسکی مصلحت نہیں جانتے وہ بادشاہ ہے اور یہ اس کا قانون ہے اور بادشاہ کا قانون واجب العمل ہوتا ہے پس یہ بھی واجب العمل ہے۔ بعینہٖ یہی تقریر خدا تعالیٰ و رسول اللہ ﷺ کے احکام میں بھی جاری کریں گے کہ دلائل عقلیہ سے ایک ان کا صادق ہونا دوسرا ان احکام کا ان کی طرف منسوب ہونا ثابت کریں گے۔ اور فروغ میں اتنا ہی کہہ دیں گے یہ صادق کے احکام ہیں اور ایسے احکام واجب الامتثال ہیں۔

دوسری نظیر لیجئے حکیم عبدالمجید خان کا حکیم ہونا تو محتاج دلیل ہے لیکن ان کے حکیم مان لینے کے بعد کسی مریض کو یہ اختیار نہیں کہ ان کی تجویز کردہ اوزان ادویہ میں چون چرا کرے اور اس کی لم ان سے دریافت کرے پس جب دنیاوی معاملات میں یہ امر مسلم ہے تو شریعت کے احکام میں کیوں چون و چرا کیا جاتا ہے۔ صاحبو! یہ نہ سمجھیں کہ مولوی احکام کے مصالح نہیں جانتے ہیں۔ ان کے پاس سب کچھ ذخیرہ موجود ہے لیکن۔

مصلحت نیست کہ از پردہ بروں افتد راز ورنہ در مجلس رنداں خبرے نیست کہ نیست

(مصلحت نہیں ہے کہ راز آشکارا ہو جائے ورنہ رندوں کی مجلس میں کوئی ایسی خبر نہیں کہ معلوم نہ ہو)

میرے پاس اگر کوئی دو برس رہے تو میں انشاء اللہ تعالیٰ ثابت کردوں گا کہ ہر حکم شریعت میں حکم عقلیہ ہیں مگر ہم ان کو علوم عظمیہ نہیں سمجھتے کیونکہ وہ سب ظنی ہیں۔ لوگوں نے بہت سے حکم لکھے ہیں اور اب بھی الہام سے ہوتے ہیں مگر یہ سب علوم ظنیہ ہیں اس لئے علماء اس میں مشغول نہیں ہوتے۔

علماء کو احکام شرعیہ کی حکمتیں بیان نہ کرنی چاہییں:

دوسرے اس میں بھی یہ خرابی ہے کہ اگر کبھی وہ ظنیت کے سبب مخدوش ہو گئے۔ اور حکم بزعم سامع اسی پر مبنی تھا تو اس کے منہدم ہو جانے سے حکم شریعت بھی منہدم ہو جاوے گا۔ لہذا بیان اسرار سے جواب دینا بے غبار رستہ نہیں صاف جواب یہی دینا چاہیے کہ ہم اسرار نہیں جانتے۔ قیامت میں خدا تعالیٰ اور رسول اللہ ﷺ سے پوچھ لینا۔ دیکھو اگر ابھی ایک منادی کرنے والا منادی کرے کہ صاحب کلکٹر کا یہ حکم ہے تو کوئی بھی اس سے گلخپ ہوتا ہے کہ حکمت اس حکم کی بیان کرو ورنہ نری منادی بے تعصب ہے۔ پس ہم کہیں گے جب منادی کرنیوالے سے گلخپ ہو گئے اور اس کو اس منادی کے مصالح بتلانے پر مجبور کرو گے تو ہم بھی بتلا دیں گے۔ غرض حکم اسرار کا علم ہم کو ہے الحمد للہ ہم جانتے ہیں لیکن وہ ظنی ہیں۔ علم قطعی یہ ہے کہ یہ خدا تعالیٰ کا حکم ہے اور خدا تعالیٰ کا حکم قطعی ہے لہذا یہ قطعی بس یہ ہے علم قطعی کہ مگر بات یہ ہے کہ قطعی علم میں مزا نہیں ہوتا اور اختراعیات میں لذت ہوتی ہے یہ ہے اس مرض کی اصل وجہ اس پر مجھے حکایت یاد آئی کہ میں شاہ جہاں پور سے سفر کر رہا تھا۔

ایک جنٹلمین اور اس کے سوال کا جواب:

ایک جنٹلمین گاڑی میں بیٹھے تھے ایک اسٹیشن پر ان کے خادم نے آ کر اطلاع دی کہ حضور وہ تو سنبھلتا نہیں کہنے لگے کہ یہاں پہنچا دو یہ سن کر مجھے تعجب ہوا کہ وہ کون چیز ان کے ساتھ ہو گئی اور جو خادم سے نہیں سنبھل سکی اور اب یہ گاڑی میں منگا کر اس کو سنبھال لیں گے آخر چند لمحے بعد دیکھا کہ خادم صاحب ایک بہت بڑے اونچے کتے کو زنجیر سے باندھے ہوئے لا رہے ہیں اور وہ کتا زور کر رہا ہے آخر وہ ان کے سپرد کیا گیا۔ انہوں نے ریل کی آہنی سلاخوں سے اس زنجیر کو باندھ دیا اس کے بعد وہ میری طرف متوجہ ہوئے اور کہنے لگے کہ جناب! کتے کا پالنا کیوں حرام ہوا۔ باوجود یہ کہ اس میں فلاں وصف ہے اور فلاں وصف ہے کتے میں۔ انہوں نے اتنے وصف بیان کئے کہ شاید ان میں بھی نہ ہوں۔ میں سب سنتا رہا۔ جب وہ کہہ چکے تو میں نے کہا کہ جناب میں نے سن لیا اس کے دو جواب ہیں ایک عام کہ وہ اس کے علاوہ اور بھی بہت سے شبہات کا جواب ہے اور ایک خاص کہ وہ خاص اس کے متعلق ہے کونسا عرض کروں فرمانے لگے دونوں کہہ دیجئے۔

کتا پالنا کیوں حرام ہے:

کہا میں نے جواب عام تو یہ ہے کہ حضور ﷺ نے اس کی ممانعت فرمائی ہے اور یہ جواب عام اس لئے ہے کہ قیامت تک کیلئے شبہات کا جواب ہے البتہ اس میں دو مقدمے ہیں ایک یہ کہ آپ رسول ﷺ تھے دوسرے یہ کہ رسول ﷺ کا حکم ہے اگر ان میں کلام ہو تو ثابت کردں کہنے لگے کہ یہ تو ایمان ہے۔ یہ تو عام جواب تھا اور یہ علمی اور حقیقی جواب تھا لیکن ان کو اس کی قدر نہ ہوئی اور کچھ حظ نہ آیا کہنے لگے کہ جناب اور جواب خاص کیا ہے میں نے کہا کہ وہ یہ ہے کہ کتے میں جس قدر اوصاف آپ نے بیان کئے واقعی وہ سب ہیں لیکن باوجود ان اوصاف کے اس میں ایک عیب اتنا بڑا ہے کہ اس نے تمام اوصاف کو خاک میں ملا دیا وہ یہ کہ اس میں قومی ہمدردی نہیں ہوتی آپ نے دیکھا ہوگا کہ ایک کتا دوسرے کتے کو دیکھ کر کس قدر از خود رفتہ ہو جاتا ہے۔ اس جواب کو سن کر وہ بہت ہی محظوظ ہوئے اور وہ اس کو جواب قطعی سمجھے۔ حالانکہ یہ محض ایک نکتہ ہے مجھے تو خبر نہ تھی کہ یہ کون ہیں اتفاق سے جب میں اٹاوہ سے بریلی آیا تو مولوی ظہور الاسلام صاحب تحصیل دار کہنے لگے کہ آپ سے اس قسم کی گفتگو کسی سے ہوئی تھی۔ میں نے کہا کہ ہوئی تو تھی فرمانے لگے کہ علی گڑھ کالج کے طالب علم اس جواب کا تذکرہ کر رہے تھے اور اس جواب سے بہت خوش تھے۔ مجھ کو اس سے گمان ہوا کہ شاید وہاں کے تعلیم یافتہ ہوں۔ میں نے اس کو اس لیے ذکر کیا کہ میں یہ بتلا دوں کہ جس جواب پر وہ اس قدر خوش تھے علاوہ فضول ہونے کے میری نظر میں اس کی کچھ بھی وقعت نہ تھی اور میں اس کو جواب ہی نہیں سمجھتا تھا۔ غرض علت اور حکمت کا دریافت کرنا عشق ومحبت کے بھی بالکل خلاف ہے جیسا اوپر ذکر کیا گیا ہے ہاں اگر یہ کہو کہ ہم۔ عاشق ہی نہیں تو دوسری بات ہے لیکن خدا تعالیٰ اس کی بھی نفی کرتے ہیں۔ فرماتے ہیں۔ والذین امنو اشد حبا للہ (اور مومنین اللہ تعالیٰ کی محبت میں زیادہ شدید ہیں) شدت کو عشق کہتے ہیں۔ عشق چونکہ پامال لفظ تھا۔

قرآن وحدیث میں عشق کا لفظ نہ آنے کی وجہ:

اس لئے قرآن وحدیث میں اس کو کہیں استعمال نہیں کیا گیا۔ اور اس سے معلوم ہو گیا ہوگا کہ اللہ تعالیٰ ورسول اللہ ﷺ کے بارہ میں عشق کا لفظ استعمال کرنا بے ادبی ہے اس کی ایسی مثال ہے جیسے کوئی شخص وائسرائے کی تعریف کرنے لگے اور یہ کہے کہ ان کو کنسٹبل کے اختیارات بھی حاصل ہیں تو اگرچہ واقع کے اعتبار سے یہ صحیح ہے لیکن یہ مدح سخت ہجو اور بے ادبی ہے بلکہ بعض

اوقات بعض ایسے امر کی نفی بھی موہم نقص ہو جاتی ہے ؎

شاہ را گوید کسے جولاہ نیست　　　این نہ مدح است او مگر آگاہ نیست

(بادشاہ کو کوئی شخص کہے کہ وہ جولاہہ نہیں یہ اس کی تعریف نہیں ہے بلکہ وہ بادشاہ کے مرتبہ سے واقف نہیں ہے)

تو جس کی نفی بھی مدح نہ ہو اس کا اثبات کیسے مدح ہو جاوے گا وہ تو اور بھی زیادہ قدح ہوگا تو لفظ عشق کو خدا تعالیٰ ورسول اللہ ﷺ کے لئے نہ استعمال کرنا چاہئے۔ قرآن وحدیث میں بھی اس کو استعمال نہیں کیا گیا ہے ہاں شدت حب کا لفظ آیا ہے تو جب خدا تعالیٰ ہی فرما چکے ہیں کہ تم عاشق ہو تو عشق سے انکار کیسے کر سکتے ہو۔ بس عاشق کا مذہب اختیار کرو۔ خوب کہا ہے ؎

یا مکن با پیلبانان دوستی　　　یا بنا کن خانہ بر انداز پیل

(یا تو ہاتھی والوں سے دوستی نہ کرو ورنہ اپنا گھر اتنا بڑا بناؤ کہ اس میں ہاتھی آسکے)

یا مکش بر چہرہ نیل عاشقی　　　یا فروشو جامہ تقویٰ بہ نیل

(یا تو چہرہ پر عاشقی مت گداؤ یا جامہ تقویٰ کو نیل سے دھو ڈالو)

الحمد للہ ثم الحمد للہ کہ زبردستی کھینچ کر ہم کو عاشقین میں داخل کیا گیا ہے گویا ہماری وہ حالت ہے کہ ہم بھاگتے ہیں اور ہم کو پکڑ پکڑ کر بلایا جاتا ہے کہ تم تو ہمارے ہو تم کہاں چلے۔ حدیث شریف میں آیا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان لوگوں سے بہت تعجب کرتے ہیں یعنی خوش ہوتے ہیں جو زنجیروں میں جکڑ کر جنت میں داخل کیے جاتے ہیں۔

طریق محبت میں قدم رکھنے سے اسرار کا خزانہ ملتا ہے:

سو صحابہ کرام کا انداز بھی عشق تھا جیسا اوپر مذکور ہوا وہی تم بھی اختیار کرو۔ اور اس کے برکات میں سے ایک یہ بھی ممکن ہے کہ تم کو وہ علوم بھی عطا ہو جاویں جن کے تم طالب ہو یعنی اسرار دیکھو اگر کوئی بادشاہ سے کہے کہ ہم کو اپنا خزانہ دکھلاؤ تو اس کو گستاخ سمجھا جاوے گا۔ البتہ اگر خزانہ دیکھنے کی تمنا ہے تو اس کی اطاعت کرو اس سے بے تکلفی پیدا کرو پھر ممکن ہے کہ ایک دن ایسی عنایت ہو کہ بادشاہ تم کو خود ہی خزانہ پر لے جا کر کھڑا کر دے گا۔ خوب کہا ہے ؎

فہم وخاطر تیز کردن نیست راہ　　　جز شکستہ می نگیرد فضل شاہ

(فہم وخاطر تیز کرنا یہ حق تک پہنچنے کی راہ نہیں ہے بلکہ شکستگی کی ضرورت ہے بجز شکستہ لوگوں

کے فضل خداوندی کسی کو قبول نہیں کرتا)

یعنی بدوں شکستگی اور پستی کے کچھ نہیں ہوتا اور پستی ہی میں یہ اثر ہے

ہر کجا پستی است آب آنجا رود　　　ہر کجا مشکل جواب آنجا رود

(جس جگہ نیچا ہوتا ہے پانی وہیں گرتا ہے جہاں اشکال ہوتا ہے وہاں ہی جواب دیا جاتا ہے)

ہر کجا درد ے دوا آنجا رود　　　ہر کجا رنجے شفا آنجا رود

(جس جگہ بیماری ہوتی ہے وہیں دوا کی ضرورت ہوتی ہے اور جہاں رنج ہوتا ہے وہاں شفا پہنچتی ہے)

سالہا تو سنگ بودی دلخراش　　　آزموں را یک زمانے خاک باش

(تم نے برسوں پتھر کی طرح سخت رہ کر دیکھ لیا اب ذرا آزمانے ہی کو کچھ دن خاک ہو کر دیکھ لو)

در بہاراں کے شود سرسبز سنگ　　　خاک شو تا گل بروید رنگ رنگ

(موسم بہار میں پتھر کب سرسبز ہوتے ہیں خاک ہو جاؤ تو رنگ برنگ کے پھول اگیں گے)

خلاصہ یہ ہے کہ تفویض و تسلیم سے کام چلتا ہے اور بالکل خاک میں مل جانے سے۔ اور جس کو یہ دولت ملی ہے وہ اسی طرح ملی ہے۔ اور جو ساری عمر قیل و قال میں رہے تو کچھ بھی نہیں ہوا۔ پس پہلا طریقہ محمود اور ہدایت اور دوسرا طریقہ مذموم اور ضلالت ہے هدینا ہ النجدین ہم نے دونوں رستے دکھلا دیئے اب جس کا جدھر جی چاہے چلا جاوے۔ مضمون بہت بڑھ گیا مقصود ہے کہ صحابہ کو ایسی محبت تھی کہ اگر کوئی آپؐ سے فرماتے کہ ساری عمر کو نہ دیکھو تو وہ ایسا ہی کرتے چنانچہ دو واقعے ہوئے بھی۔

حضرت اویس قرنیؒ کی اطاعت و محبت کا قصہ:

ایک اویس قرنیؒ کا کہ انہوں نے باوجود شدت اشتیاق زیارت حضور ﷺ کا حکم شرعی سن کر والدہ کی خدمت نہ چھوڑنا تمام عمر زیارت نہیں کی۔

زیارت فی المنام سے اطاعت افضل ہے:

مجھے تعجب ہے ان لوگوں پر کہ جو زیارت فی المنام (سونے میں زیارت) کی تمنا کرتے ہیں اور حضور ﷺ کی اطاعت احکام میں نہیں کرتے۔ حالانکہ زیارت فی المنام (خواب میں زیارت) موخر ہے رتبہ میں زیارت فی الیقظہ (بیداری میں زیارت) سے تو حضرت اویسؓ نے یہاں تک اطاعت کی کہ زیارت فی الیقظہ (بیداری میں زیارت) بھی نہیں کی۔ کیونکہ سمجھتے تھے کہ

اطاعت کا تو کچھ بدل نہیں زیارت کا بدل ہے وہ یہ کہ اگر یہاں نہ ہوگی تو آخرت میں ہو جاوے گی کسی نے خوب کہا ہے

کششے کہ عشق دار نگذاردت بدینساں　　بجنازہ گر نیائی بمزار خواہی آمد

(عشق میں جو کشش ہے وہ تجھے یوں ہی نہ چھوڑ دے گی بلکہ اگر تو جنازہ پر نہ آیا تو مزار پر ضرور آئے گا)

اس میں بھی بدل کا مضمون ہے۔ جب اویس قرنیؒ سے کہ تابعی ہیں ایسا واقعہ ثابت ہے تو صحابہؓ کا کیا کہنا ہے۔

حضرت وحشی کی اطاعت کا قصہ:

دوسری حکایت حضرت وحشیؓ کی ہے اگرچہ یہ صحابی مشہور نہیں ہیں لیکن ہیں صحابی۔ گو حضرت عمر اور حضرت ابوبکرؓ کے درجہ کے نہیں ہیں

آسماں نسبت بہ عرش آمد فرود　　لیک بس عالیست پیش خاک تود

(آسمان اگرچہ عرش کی نسبت پست ہے مگر ایک خاک کے ٹیلہ کے سامنے تو بہت بلند ہے)

تو ان کا واقعہ یہ ہوا کہ انہوں نے حضرت حمزہؓ کو شہید کر دیا تھا۔ جب یہ مسلمان ہو کر آئے تو حضور ﷺ نے فرمایا کہ **ھل تستطیع ان تغیب وجھک عنی** (کیا اپنا چہرہ مجھ سے غائب رکھ سکتے ہو)

حضرت وحشی کے قصہ پر ایک شبہ اور اس کا جواب:

یہاں یہ شبہ ہو سکتا ہے کہ حضور ﷺ کو اپنے چچا سے اس قدر رغبت تھی کہ ان کی بدولت ایک مسلمان سے ایسے رنجیدہ رہے کہ ان کی صورت دیکھنا بھی پسند نہیں فرماتے تو یہ تو بڑی رنج کی بات ہے کہ آپ خلاف مزاج امر سے اس قدر متاثر ہوتے ہیں تو اس حالت میں عاصی آپ سے کیا امید کریں خدا جانے آپ کتنے ناخوش ہوں اور ہم کو کہاں دور پھینک دیں گے مگر ہم کو اس واقعہ ہی سے ایک بہت بڑی بات بشارت کی ہاتھ آئی۔ یہی واقعہ ہے کہ جس سے انشاء اللہ تعالیٰ ہماری تمام مشکلات حل ہوں گی کیونکہ اس سے معلوم ہوا کہ حضور ﷺ ایسے متاثر ہونے والے ہیں کہ منتسب کی دنیاوی تکلیف کی آپ کو سہار نہیں تو قیامت میں اگر ہم حضور ﷺ کا دامن پکڑ کر کھڑے ہو جاویں گے تو یقیناً حضور ﷺ ہماری مصیبت کو دیکھ نہ سکیں گے اور ہماری مدد فرماویں گے۔

صحابہؓ کے وفورِ علم کی ایک حکایت:

اور صحابہ کرام نے اسی قسم کی ایک حدیث سے ایک ایسی ہی عجیب بات سمجھی تھی۔ حضور ﷺ ایک حدیث بیان فرمارہے تھے صحابہؓ نے اس پر عرض کیا ھل یضحک ربنا یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یعنی کیا اللہ میاں ہنستے بھی ہیں۔ اور یہیں سے بھی سمجھ لینا چاہیے کہ صحابہ کرام کا علم کیسا عمیق تھا کہ اللہ میاں کے ہنسنے کو تو پوچھا لیکن آج کل کے طباعوں کی طرح اس کی کیفیت نہیں پوچھی کیونکہ جانتے تھے کہ جب خدا تعالیٰ ہی کو پوری طرح نہیں پہچانا تو اس کی صفات کیفیت کیسے سمجھ میں آسکتی ہے

؎

تو نہ دیدی گہے سلیماں را   چہ شناسی زبان مرغاں را

(جب تو نے کبھی سلیمان علیہ السلام کو دیکھا ہی نہیں تو پھر پرندوں کی بولیاں کیسے سمجھے گا)

ایک بزرگ سے کسی نے شب معراج کی مفصل گفتگو کے متعلق سوال کیا تو انہوں نے جواب میں کیا خوب فرمایا

؎

اکنوں کرا دماغ کہ پرسد ز باغباں   بلبل چہ گفت وگل چہ شنید و صبا چہ کرد

(کسی کی ہمت اور حوصلہ ہے کہ باغ کے مالی سے یہ پوچھے کہ بلبل نے کیا کہا اور پھول نے کیا سنا اور صبا نے کیا کیا)

غرض صحابہؓ نے اس حدیث کو سن کر عرض کیا کہ انشاء اللہ! ایسے رب سے خیر کے ملنے سے محروم نہ رہیں گے جو ہنستا بھی ہے یعنی اب کچھ غم نہیں کیونکہ نہیں معلوم کس بات پر ہنس پڑیں گے اور ہمارا کام بن جاوے گا۔ صاحبو! صحابہ کے یہ علوم ہیں۔ اب ان میں ہمیں اس لئے لطف نہیں آتا کہ ہمارا قلب مثلاً عنین کے ہو گیا ہے۔ اس کو حس نہیں رہی جیسے عنین کو عورت میں لطف نہیں آتا۔ اسی طرح ہم باعتبار قلب کے عنین اور نابالغ ہیں۔

خوب کہا ہے

؎

خلق اطفالند جز مست خدا   نیست بالغ جز رہیدہ از ہوا

(ساری مخلوق بچوں کی طرح ہے سوائے اس شخص کے جو حق تعالیٰ کا مست ہے۔ بس بالغ وہی ہے جو ہوائے نفسانی سے چھوٹ گیا)

تو صحابہؓ نے جیسے اس حدیث سے سمجھا اسی انداز پر اس وقت خدا تعالیٰ نے حضرت وحشیؓ کے

متعلق ارشاد نبوی ﷺ سے میرے دل میں یہ بات ڈالی کہ اگر ہم مچل جاویں گے تو ضرور نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم ہماری مدد فرماویں گے۔ غرض حضور ﷺ نے حضرت وحشیؓ سے فرمایا انہوں نے کر کے دکھلا دیا کہ تمام عمر سامنے نہیں آئے

اريد وصاله ويريد هجری فاترک ما اريد لما يريد

(میں اس کے وصال کا ارادہ کرتا ہوں وہ میرے فراق کا ارادہ کرتا ہے بس میں اپنی مراد کو اس کی مراد کی وجہ سے چھوڑتا ہوں)

کیا کیا لہریں ان کے دل میں اٹھتی ہوں گی کہ

از فراق تلخ میگوئی سخن ہر چہ خواہی کن ولیکن ایں مکن

(فراق کی تلخ باتیں کرتے ہو اور جو چاہو سو کرو مگر یہ نہ کرو)

اگر گردن بھی کاٹ لیتے تو یہ غم نہ ہوتا۔ ایک تو جدائی کا غم دوسرا یہ غم کہ لوگوں کی نظروں میں کیسی ذلت ہوگی مگر عاشق تھے کچھ بھی پرواہ نہ کی۔ جان و مال و آبرو سب فدا کر دیا۔ اور دوسرے صحابہؓ بھی کیسے مہذب کہ کسی نے ان کو ذرا نہیں چڑایا بلکہ ان کی زیارت کرنے ملک تمام میں جاتے تھے چنانچہ ان سے ایک صحابی ملنے گئے اور ان سے حضرت حمزہؓ کے قتل کا واقعہ پوچھا۔ کہنے لگے خدا تعالیٰ کا شکر ہے کہ اس کا کفارہ بھی ہو گیا کہ میں نے مسلیمہ کذاب کو قتل کیا۔

بقیہ شان نزول:

تو صحابہؓ جب ایسے تھے کہ اتنے بڑے امر میں اطاعت کر لی تو حضور ﷺ کو یقین تھا کہ اگر ہم ایسا کر لیں کہ ان روساء کے آنے کے وقت ان غرباء کو مجلس میں رہنے سے منع کر دیں تو ان کو ذرا بھی نا گوار نہ ہوگا اور شاید روسا ایمان لے آویں ورنہ اتمام حجت ہی ہو جاوے گا۔ اس لئے حضور ﷺ سوچ رہے تھے کہ ایسا کریں یا نہ کریں کہ آیت نازل ہوئی واصبر نفسک مع الذين يدعون ربهم بالغدوٰة والعشى يريدون وجهه ولا تعد عيناک عنهم تريد زينة الحيوة الدنيا۔

(اور آپ اپنے کو ان لوگوں کے ساتھ مقید رکھا کیجئے جو اپنے رب کی عبادت صبح و شام محض اس کی رضا جوئی کے لئے کرتے ہیں اور دنیاوی زندگی کی رونق کے خیال سے آپ کی آنکھیں ان سے ہٹنے نہ پائیں اور ایسے شخص کا کہنا نہ مانئے جس کے قلب کو ہم نے اپنی یاد سے غافل کر رکھا ہے اور اپنی نفسانی خواہش پر چلتا ہے اور اس کا یہ حال حد سے گزر گیا ہے)

یہ شان نزول بیان کیا تھا جس میں بعض اور ضروری مضمون بھی بیان ہو گئے۔ اب ترجمہ بیان کرتا ہوں فرماتے ہیں۔ واصبر نفسک مع الذین یدعون ربھم بالغدوۃ والعشی یریدون وجھہ الخ یعنی (کھو اپنے کو ان لوگوں کے ساتھ جو صبح وشام اپنے رب کی عبادت اس طرح کرتے ہیں کہ اس عبادت میں ارادہ کرتے ہیں محض خدا تعالیٰ کی رضا کا یعنی اپنے نفس کو مقید کر کے رکھئے ہیں ان کو اٹھانے کی اجازت تو کہاں ہے خود بھی نہ اٹھئے مثلاً خود ہی اٹھ کر ان روسا کو دوسری مجلس میں لے کر بیٹھ جاتے جس میں ان غرباء کی ذلت بھی نہیں تھی دیکھئے واصبر نفسک (جمائے رکھئے اپنے نفس کو) ارشاد ہے کہ اے محمد ﷺ اس کے ساتھ بھی تقاضا ہو قلب میں کہ میں اٹھوں کیونکہ اس اٹھنے کا داعی بھی دین ہی تھا مگر صبر کر کے بیٹھئے اس سے سمجھئے کہ کیا چیز ہیں مساکین محض۔ اس لئے کہ یریدون وجھہ (محض اس کی رضا جوئی کا ارادہ کرتے ہیں) خوب کہا ہے ۔

ہیں حقیر گدایان عشق را کیں قوم شہاں بے کمر وخسرواں بے کلہ اند

(گدایان عشق کو حقیر نہ سمجھو کیونکہ یہ لوگ بے تاج تخت کے بادشاہ ہیں ۱۲)

گدائے میکدہ ام لیک وقت مستی ہیں کہ ناز بر فلک وحکم بر ستارہ کنم

(گدائے میکدہ ہوں لیکن مستی کی حالت میں دیکھو کہ آسمان پر ناز اور ستارے پر حکم کرتا ہوں ۱۲)

جب ہی تو یہ بات ہے کہ حضور ﷺ جو کہ دو جہاں کے بادشہ ہیں فرماتے ہیں۔ اللھم احینی مسکینا وامتنی مسکینا واحشرنی فی زمرۃ المساکین۔ دیکھئے یہ نہیں فرمایا کہ مساکین کا حشر میرے ساتھ ہو بلکہ یہ فرمایا کہ میرا حشر مساکین کے ساتھ ہو۔ یعنی وہ لوگ تو اپنی جگہ رہیں میں ان کے ساتھ ہو جاؤں جہاں مسکین ہوں وہیں میں ہوں ورنہ یہ بھی فرما سکتے تھے کہ جہاں میں ہوں وہاں یہ آ جاویں۔

مسکنت کے فضائل:

اور یہ یہاں سے اندازہ ہو گا کہ مسکنت کیا چیز ہے۔ صاحبو! وہ اتنی بڑی چیز ہے کہ ایک ایسے بڑے سخت مرض کا علاج بھی ہے کہ وہ تمام مفاسد کی جڑ ہے اس سے تمدن اور دین دونوں بگڑتے ہیں اور وہ مرض کبر کی اور نخوت ہے کہ جتنی متعدی خرابیاں ہوتی ہیں۔ لڑائی غیبت۔ حسد۔ یہ سب تکبر کی بدولت ہوتے ہیں۔

اتفاق عالم کی جڑ تواضع ہے:

ہمارے مرشد حاجی صاحبؒ نے ایک مرتبہ ایک ایسی عجیب اور گہری بات فرمائی کہ جو آج

تک کسی رفارمر کی زبان پر نہیں آئی۔ فرمانے لگے کہ لوگ اتفاق کی کوشش کرتے ہیں اور اس کی جڑ کی خبر نہیں ہے۔ اتفاق کی جڑ ہے تواضع۔ ہر شخص اپنے اندر تواضع پیدا کرے کیونکہ نااتفاقی ہمیشہ کبر سے ہوتی ہے۔ کیونکہ جب ہر شخص اپنے کو دوسرے سے بڑا سمجھے گا تو بہت سی باتوں میں اپنے حقوق کی اضاعت بھی سمجھے گا ہر بات میں اپنے کو دوسرے پر بڑھانا چاہے گا اور اس سے نااتفاقی پیدا ہوگی اور جب ہر شخص میں تواضع ہوگی تو ہر شخص اپنے اوپر دوسرے کے حقوق سمجھے گا اور ان میں اپنے کو قاصر پاوے گا تو سب کے سب ایک دوسرے کے سامنے لچیں گے اور یہی اتفاق ہے۔ ہمارے عقلاء اتفاق کی کوشش کر رہے ہیں مگر ساتھ ساتھ کبر و نخوت کا بھی اہتمام کر کے اسی کی جڑ کاٹ رہے ہیں۔

بعینہ وہی حالت ہے ؂

یکے بر سر شاخ و بن مے برید　　　خداوند بستان نگہ کرد و دید

(ایک آدمی ٹہنی پر ہے اور جڑ کاٹ رہا ہے مالک باغ نے نظر کی اور دیکھا)

تو ہم شاخ اتفاق پر بیٹھے ہیں لیکن کبر کے قریب سے اس کی جڑ کاٹ رہے ہیں۔ آج خود داری تکبر کی تعلیم کی جاتی ہے اور اس کا نام رکھا گیا ہے اولوالعزمی۔

اولوالعزمی کا مفہوم:

صاحبو! اولوالعزمی یہ ہے کہ سلطنت پر لات ماردی اور حالت یہ ہو کہ لنگے زیر و لنگے بالا۔ (ایک لنگی باندھے ہوئے اور ایک لنگی اوڑھے ہوئے) اولوالعزمی کا حاصل یہ ہے ؂

موحد چہ برپائے ریزی زرش　　　چہ فولاد ہندی نہی بر سرش

امید و ہراسش نباشد زکس　　　ہمیں است بنیا توحید و بس

(موحد اور عارف کے قدموں کے نیچے خواہ زر بکھیریں یا اس کے سر پر تلوار رکھیں امید وخوف اس کو بجز خدا کے کسی سے نہیں ہوتا توحید کی بنیاد بس اسی پر ہے ۱۲)

اور وہ حالت ہو ؂

آں کس کہ ترا شناخت جاں راچہ کند　　　فرزند و عیال و خانماں راچہ کند

جس شخص کو آپ کی معرفت حاصل ہوگئی اسکو جان اور فرزند و اسباب کی پرواہ نہیں ۱۲)

حضرت خالد اور ان کے ہمراہیوں کی اولوالعزمی:

صاحبو! اولوالعزمی وہ ہے جو صحابہ نے کر کے دکھلادی کہ ماہان ارمنی کے دربار میں جب

حضرت خالدؓ سو آدمیوں کو ہمراہ لے کر تشریف لے گئے تھے۔ ماہان ارمنی حریر کا فرش بچھایا ہوا تھا۔ حضرت خالدؓ نے اس کو اٹھا دیا۔ ماہان نے کہا کہ اے خالدؓ میں نے تمہاری عزت کے لئے یہ فرش بچھایا تھا۔ حضرت خالد نے فرمایا کہ خدا تعالیٰ کا فرش تیرے فرش سے بہت اچھا ہے۔ اب غور کیجئے کہ حضرت خالد صرف سو آدمیوں کے ساتھ ہیں اور ماہان ارمنی کے پاس دو لاکھ فوج ہے لیکن حضرت خالدؓ کیا گفتگو کرتے ہیں ماہان ارمنی نے کہا کہ اے خالدؓ میرا جی چاہتا ہے کہ تم کو بھائی بنا لوں خالدؓ نے فرمایا کہ بہتر ہے کہو لا الٰہ اللہ محمد رسول اللہ (اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں)

ماہان ارمنی نے کہا کہ یہ تو نہیں ہو سکتا۔ حضرت خالدؓ نے فرمایا تو اس حالت میں ہم نے حقیقی بھائیوں کو بھی چھوڑ دیا تجھ کو کیا بھائی بناتے۔ پھر حضرت خالدؓ نے فرمایا اے ماہان تو مسلمان ہو جا ورنہ وہ دن قریب نظر آ رہا ہے کہ تو حضرت عمرؓ کے سامنے اس طرح حاضر کیا جاوے گا کہ تیرے گلے میں رسی ہوگی اور تجھ کو ایک شخص گھسیٹتا ہوگا۔ اس پر ماہان ارمنی آگ ہو گیا غضب ناک ہو کر کہا کہ پکڑو ان لوگوں کو حضرت خالدؓ فوراً اٹھ کھڑے ہو گئے اور ہمراہیوں سے خطاب کر کے فرمایا کہ خبردار اب ایک دوسرے کو مت دیکھنا اب انشاء اللہ تعالیٰ حوض کوثر پر ملاقات ہوگی اور فوراً میان سے تلوار کھینچ لی۔ یہ ہیبت دیکھ کر ماہان مرعوب ہو گیا اور کہنے لگا کہ میں تو ہنسی کرتا تھا۔ جب حضرت خالدؓ درست ہو کر بیٹھے یہ ہے اولوالعزمی نہ یہ کہ غایت کبر و نخوت و تنفر عن المساکین (مساکین سے نفرت) جنگل میں جا بسے کہ (مسلمان ان کو دیکھ سکیں نہ یہ مسلمانوں کو دیکھ سکیں۔ نیز جس کا نام آج اولوالعزمی رکھا گیا ہے وہ وہ ہے جس کی بابت قرآن مجید میں ارشاد ہے لا یریدون علواً فی الارض ولا فساداً (نہیں ارادہ کرتے ہیں بڑائی کا زمین میں اور نہ فساد کا ۱۲)

تو اولوالعزمی صحابہؓ نے کر کے دکھلائی ہے اور وہ توحید سے ہوتی ہے۔ آج کل تکبر کا نام اولوالعزمی رکھا گیا ہے اور اس کی تعلیم دی جاتی ہے۔

صاحبو! کیسے افسوس اور رنج کی بات ہے آج بچوں کو وہ تعلیم دی جاتی ہے کہ ان میں بچپن ہی سے اینٹھ مروڑ پیدا ہو جاوے۔

بچوں کی غلط تربیت:

مجھ سے ایک رئیس نے پوچھا کہ اگر بچہ نوکر کی خطا کرے تو کیا کرنا چاہئے۔ یعنی اس

حرکت پر اس کو کسی قسم کی تنبیہ کرنی چاہئے یا نہیں۔ میں نے کہا اس بچہ کو کہنا چاہیے کہ اس نوکر سے عذر کرے۔ کہنے لگے کہ یہ تو بڑی ذلت کی بات ہے اس سے اولوالعزمی میں ضعف ہوتا ہے پھر جب میں نے اس اوالعزمی کی حقیقت سمجھائی کہ یہ بدخلقی اور تکبر ہے تب ان کی سمجھ میں آ گیا۔ صاحبو! واللہ لوگوں کو پرورش اور تربیت نہیں آتی۔ تربیت یہ تھی کہ جو پہلے اتالیق کرتے تھے۔ ایک شاہزادہ کی حکایت ہے کہ وہ ایک معلم کے پاس پڑھتا تھا۔ ایک روز بادشاہ جو مکتب میں گئے تو دیکھا کہ نہ شاہزادہ ہے اور نہ معلم ہے دوسرے لڑکوں سے دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ معلم صاحب گھوڑے پر سوار ہو کر گئے ہیں اور شاہزادہ ان کے پیچھے ساتھ گیا ہے بادشاہ کو یہ حرکت ناگوار ہوئی اور جس طرف ان کا جانا سنا تھا خود بھی اسی طرف کو چلا۔ آخر ایک جگہ ملاقات ہوئی۔ بادشاہ نے دیکھا کہ میاں جی گھوڑے پر سوار ہیں اور شاہزادہ گھوڑے کے پیچھے بھاگ رہا ہے۔ بادشاہ نے معلم سے پوچھا کہ آخر اس کا کیا سبب ہے کہنے لگے کہ جناب آپ کو معلوم ہے کہ یہ شاہزادہ ہے اور خدا تعالیٰ نے کیا تو یہ تخت سلطنت پر بھی متمکن ہوگا اس وقت ایسے بھی مواقع ہوں گے کہ یہ سواری پر ہو اور اس کے ساتھ اس کے حشم خدم بھی ہوں۔ پس میں اسی وقت سے اس کو گھوڑے کے ساتھ بھگا کر بتلا رہا ہوں کہ خدام کو پیادہ دوڑنے میں ایسی تکلیف ہوا کرتی ہے تا کہ یہ اپنی تکلیف کو یاد کر کے اپنے حشم خدم پر رحم کرے اور وسعت سے زیادہ تکلیف ان کو نہ دے۔ یہ سن کر بادشاہ بہت خوش ہوا اور کہا جزاک اللہ (اللہ تعالیٰ تجھ کو جزا دے) تم نے بہت بڑی اصلاح کی۔ تو یہ ہے تربیت کا طریق۔

تکبر کا علاج:

اب تکبر کا ایسا چرچا ہوا ہے کہ خدا تعالیٰ کی پناہ اور یہی ہماری تباہی کا سبب ہے اور اس کا علاج ہے مسکنت جو بات دس برس کے مجاہدہ میں بہ وقت حاصل ہو سکتی ہے وہ مسکنت سے ایک دن میں حاصل ہو جاتی ہے اور یہ مسکنت کی وہ منفعت ہے جو میری سمجھ میں آئی ورنہ اصل یہ ہے کہ مسکنت فی ذاتہا بھی محبوب عند اللہ ہے۔ پیا جس کو چاہے وہی سہاگن ہوئے۔

صحبت نیک کی فضیلت:

شاید اس تقریر سے کسی کے دل میں یہ بات پیدا ہو کہ ہم بھی گھر لٹا دیں گے اور مساکین میں داخل ہو جاویں گے صاحبو ہرگز ایسا مناسب نہیں۔ مساکین میں داخل ہونے کا یہ طریق کہ

المرء مع من احب (آدمی اس شخص کے ساتھ ہے جس سے وہ محبت کرتا ہے)

تم ان سے محبت رکھو انشاء اللہ تعالیٰ انہیں کے درجہ پر پہنچ جاؤ گے۔ اسی لئے فرماتے ہیں حضور نبی کریم ﷺ یا عائشة قربی المساکین و جالسھم (نزدیک ہو تو مساکین کے اور ان کے پاس بیٹھ) لفظ قربی (نزدیک ہو تو) میں تو ان کو آنے دینے کے لئے فرمایا اور لفظ جالسھم بیٹھ تو ان کے پاس میں اس سے بڑھ کر یہ بتلا دیا کہ اگر وہ خود نہ آویں تو جا کر بیٹھو۔ دیکھئے کتنی بڑی عزت ہے مساکین کی یہ ہی مسکنت ہے۔ جس سے خود حضور ﷺ کو ارشاد ہوا کہ اصبر نفسک الخ (جمائے رکھئے اپنے نفس کو) یہ بیان تھا۔ ترجمہ آیت کا۔ اور آیت کا ترجمہ سے آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ مقصود میرا کیا بیان کرنا ہے مگر میں تصریحاً بھی کہہ دیتا ہوں سو مدلول لغوی آیت کا تو یہ ہے جو کہ میں نے بیان کیا مگر اس کی ایک غایت ہے اس غایت سے میرا مقصود اچھی طرح سمجھ میں آجاوے گا۔ میں نے سوچا تھا کہ کوئی صریح آیت سمجھ میں آجاوے مگر جلدی میں سمجھ میں نہیں آئی۔ لیکن خیر اب سمجھئے کہ غایت اس اصبر سے کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ رعایت نفع صحابہ کی کیونکہ دو حال سے خالی نہیں کہ حضور ﷺ سے مساکین کو نفع پہنچتا ہے یا نہیں اگر نہیں پہنچتا تو پھر اس حکم سے کیا فائدہ ہوتا ہے اور اگر کوئی کہے کہ شاید حضور ﷺ کو نفع پہنچتا ہو اجر تبلیغ کا تو یہ بالکل غلط ہے کہ صرف اس کو مدار حکم کہا جاوے۔ اس میں صحابی کی کیا تخصیص ہے۔ یہ تو تبلیغ الی الکفار۔ (کفار کی تبلیغ) میں بھی مشترک ہے پس معلوم ہوا کہ ان مساکین کو آپ سے نفع پہنچنا بڑی غایت ہے۔ اس حکم کی یعنی اگر یہ آپ کے پاس بیٹھیں گے تو ان کو نفع ہوگا۔

مقبولان الٰہی کی صحبت سے نفع:

اس سے ثابت ہوا کہ مقبولان الٰہی کے پاس بیٹھنے سے نفع ہوتا ہے۔ یہ چھوٹا سا جملہ مگر میں اس کی تفصیل کروں گا اور یہ ہی میرا مقصود ہے بیان سے اور یہ مسئلہ سب کے نزدیک مسلم بھی ہے اور قرآن شریف میں منصوص بھی ہے اتقوا اللہ وکونوا مع الصادقین (اللہ تعالیٰ سے ڈرو اور سچوں کے ساتھ رہو)

اس آیت میں تو یہ مصرح ہی ہے۔ جو آیت میں نے تلاوت کی ہے اس میں گو مصرح نہیں لیکن حسب تقریر مذکور لازم آگیا۔ پھر یہ کہ اس کا مسلم ہونا ہی کافی ہے۔

صحبت صالحین سے غفلت اور لاپروائی:

لیکن باوجود مسلم ہونے کے افسوس آپ کے دلوں میں درجہ ضرورت میں یہ کبھی نہیں آیا اور یہ ہی ضرورت داعی ہوئی اس کے بیان کی یہ عام خیال ہے کہ نیک صحبت نافع ہوتی ہے لیکن اس کا ضروری ہونا سو عقیدہ کے درجہ میں بھی اس سے غفلت ہے اور عمل کے اعتبار سے بھی۔ تفصیل اس کی یہ ہے کہ تمام لوگ اپنے لئے اپنی اولاد کے لئے دنیا کی فلاح کی کوشش کرتے ہیں۔ ان میں جو دین کا مذاق غالب رکھتے ہیں وہ دین کے لئے مولوی بناتے ہیں جو دنیادار ہیں وہ معاش کیلئے تیار کرتے ہیں۔ غرض ایک نے دین کی فلاح کی کوشش کی اور ایک نے دنیا کی فلاح کی کوشش کی۔ لیکن اس فہرست مساعی میں کہیں یہ فکر نہیں جس کا نام نیک صحبت ہے یعنی بالاستقلال اس کا اہتمام کسی نے بھی نہیں کیا۔ جیسے اور کاموں کو ضروری سمجھتے ہیں اس کو کسی نے بھی ضروری نہیں سمجھا مثلاً ہفتہ بھر میں ایک دن یا مہینہ بھر میں ایک دن یا سال بھر میں ایک مہینہ کسی نے اس لئے دیا ہو کہ اس میں صحبت نیک سے مستفید ہوں تو ہمارا یہ عمل اسکی شہادت دے رہا ہے کہ ہم نے اس کو کسی درجہ میں بھی ضروری نہیں سمجھا۔ دیکھئے سارے کاموں کے لئے وقت مقرر ہیں کھانے کے لئے آرام کے لئے بھی سیر کے لئے بھی مگر صحبت نیک کے ذریعہ سے محض تہذیب اخلاق کے لئے بھی کسی نے وقت مقرر کیا ہے؟ اس کے جواب میں محض صفر ہے یہ ہے وہ مضمون جس کی طرف توجہ کی ضرورت ہے اس لئے کہ اس کی طرف سے غفلت عام اور ضرورت اس کی بیحد کہ دنیا کا یا دین کا کوئی کمال بغیر صحبت کے نہیں ہو سکتا۔ ہاں نام کو جو چاہے ہو جاؤ باقی واقع میں وہ حال ہی ایسا ہی ہے کہ۔

خواجہ پندارد کہ دارد حاصلے حاصل خواجہ بجز پندار نیست

(خواجہ کا گمان ہے کہ اس کو کچھ حاصل ہے خواجہ کو بجز غرور کے کچھ حاصل نہیں)

اس وقت لوگ مطالعہ کتب کمال سمجھتے ہیں۔

حصول کمال کا طریق:

میں بقسم کہتا ہوں کہ کوئی کمال بدوں ماہر سے حاصل کئے نہیں آسکتا اور ماہر سے حاصل کرنا موقوف ہے صحبت پر۔ اور دنیاوی کمالات کو جانے دیجئے اس کا مجھے تجربہ نہیں نہ مجھے اس کے متعلق گفتگو کرنے کی ضرورت

نہ شبم نہ شب پرستم کہ حدیث خواب گویم چو غلام آفتابم ہمہ ز آفتاب گویم

(میں نہ شب ہوں نہ شب پرست کہ خواب کی تعبیر بیان کروں محبوب حقیقی کا غلام ہوں محبوب ہی کی باتوں کو مجھ سے سنو)

گو مولویوں پر بھی یہ اعتراض ہے کہ دنیا کی اصلاح کا کوئی طریقہ نہیں بتلاتے مگر میں اس کا جواب دیا کرتا ہوں کہ یہ اعتراض ایسا ہے کہ جیسے حکیم محمود خان کے پاس کوئی مدقوق جاوے اور وہ نبض دیکھ کر ایک نسخہ لکھ دیں جب وہ نسخہ لے کر باہر آیا تو دروازہ پر ایک چمار ملا کہنے لگا کہ حکیم صاحب نے کیا بتلایا۔ مریض نے نسخہ دکھلا دیا دیکھ کر کہنے لگا کہ تمہاری جوتی ٹوٹی ہوئی ہے اس کے متعلق بھی کچھ بتلایا۔ مریض نے کہا کوئی نہیں کہنے لگا کہ حکیم محمود خان بھی دنیا کی ضرورت سے بالکل ہی غافل ہیں۔

صاحبو! اس مشیر کو کیا جواب دیجئے گا بجز اس کے کہ یہ حکیم صاحب کا منصب ہے اور یہ تیرا کام ہے۔ اسی طرح ہم دق روحانی کا نسخہ بتلاتے ہیں اور دنیاوی مقاصد کو جوتی سینے کے درجہ میں سمجھتے ہیں۔ تو پھر ہمارے خلاف منصب کیوں الزام دیا جاتا ہے۔ صاحبو! غضب ہے کہ سنار کے پاس کھرپا لے جاؤ کہ اس کو بنادے یا قاضی شہر سے چارپائی بنواؤ۔ ہاں اگر حکیم محمود خان جوتی بنوانے سے منع کریں وہ تو مجرم ہیں۔ لیکن اگر جوتا اس طرح سے سلوایا جاوے کہ کھال میں کو ستالی نکلنے لگے تو حکیم محمود خان پر فرض ہے کہ منع کریں اور کہیں کہ اس زخم سے تمہارا سارا بدن سڑ جاوے گا۔

ترقی دنیا سے شریعت کب منع کرتی ہے:

بس اس طرح اگر مولوی جائز طریقوں سے دنیا میں کمانے کو منع کریں تو بیشک مولویوں پر الزام ہے لیکن اگر دین میں ستالی نکالنے لگے گی تو وہ ضرور منع کریں گے اور یہ منع کرنا واقع میں ترقی سے روکنا نہیں ہے۔ صاحبو! اگر ایک شخص جیب میں اشرفیاں بھرے اور جب جگہ رہ جاوے تو اوپر سے کوڑیاں بھرنے لگے اور کوڑیوں کو ٹھونس ٹھونس کر بھرنے کے بوجھ سے جیب پھٹنے لگے کہ اشرفیاں نکلنے لگیں اور یہ حالت دیکھ کر کوئی شخص اس کو اس طرح کوڑیاں بھرنے سے منع کرے تو اس کو مانع ترقی کہا جاوے گا۔ ہرگز نہیں وہ کوڑیاں کس کام کی جو اشرفیاں کھو کر حاصل کی گئیں ہوں۔ بس جب آپ کا دین کہ اشرفیوں سے زیادہ قیمتی ہے۔ برباد ہو رہا ہے تو دنیا کی چند کوڑیاں جمع کر کے آپ کو کیا فلاح ہوگی تو اس حالت میں مولوی ضرور منع کریں گے اور اگر یہ امر آپ کی سمجھ میں آجاوے گا تو آپ بھی کہنے لگیں گے۔

مبادا دل آں فرومایہ شاد　　　　کہ از بہر دنیا دہد دیں بباد

(وہ کمینہ خوش دل نہ رہے جس نے دنیا کی وجہ سے دین کو خراب کیا)

ہم کو گو یہ بھی جائز ہے کہ ہم آپ کو آپ کے دنیاوی نقصانات سے بھی بچادیں لیکن ہم اس کو اپنا منصب نہیں سمجھتے اس لئے دوسرے مشاغل دینیہ کے غلبہ سے قصداً ایسا نہیں کرنا چاہتے کیونکہ

ما ہرچہ خواندہ ایم فراموش کردہ ایم　　　　الا حدیث یار کہ تکرار می کنیم

(جو کچھ ہم نے پڑھا سب کو فراموش کر دیا بجز محبوب کی باتوں کے کہ ان ہی کا تکرار کرتے ہیں)

دیکھئے انگریزوں کا فتویٰ ہے کہ ہر کام کے لئے ایک جماعت رہنی چاہئے تو اس فتوی کے مطابق مولویوں کو صرف دین کے کام کے لئے رکھو۔ مگر آج کل عجب اندھیر ہے کہ سارے کام ایک ہی جماعت کے ذمے سمجھے جاتے ہیں اور سارے کاموں کے الزام مولویوں ہی پر ہیں۔ اور اگر مولوی کچھ کرتے بھی ہیں اور روپیہ کی نسبت ان حضرات سے کہتے ہیں کہ روپیہ ہمارے پاس نہیں وہ جمع کیجئے تو جواب ملتا ہے کہ تم ہی چندہ بھی کر لو۔

اکبر اور ایک بھانڈ کی حکایت:

مجھے ایسے لوگوں کی حالت پر اکبر کے زمانہ کا ایک قصہ یاد آیا کرتا ہے کہ اکبر نے کسی خوشی میں اپنے بھانڈ کو ایک ہاتھی دے دیا تھا وہ کھلاوے کہاں سے آخر اس اس نے ایک ڈھول اس کے گلے میں ڈال کر چھوڑ دیا۔ اکبر شاہ نے اتفاقاً اس ہیئت میں دیکھا۔ پوچھا۔ اس نے کہا حضور جب مجھ سے کھلایا نہ گیا میں نے ڈھول گلے میں ڈال کر چھوڑ دیا کہ بھائی مانگ اور کھا۔ تو گویا مولوی اکبر کے بھانڈ کے ہاتھی ہیں۔ کیوں صاحب مولویوں کو کیا ضرورت پڑی ہے کہ روپیہ مانگیں ہمارا کام ہاتھ اور زبان کا ہے۔ باقی روپیہ دینا یا جمع کرنا یہ آپ کا کام ہے۔ بیان اس کا تھا کہ دنیاوی اصلاحات میں دخل دینا مولویوں کا کام نہیں بلکہ ان کا حسن تو یہ ہے کہ اس سے یہ واقف بھی نہ ہوں۔ بچہ کا کمال یہ ہے کہ وہ بالکل بھولا ہو۔

مولویوں کے دنیادار ہونے کی خرابی:

دوسرے ایک بڑی خرابی ان کے دنیا سے باخبر ہونے میں یہ بھی ہے کہ اگر ان کو دنیا کا کام آوے تو نفس ان کے بھی ساتھ ہے نتیجہ یہ ہوگا کہ پھر چند روز میں شکر فروش اور چاول فروش ہوں گے۔ دیکھو اگر ڈرائیور کو سیکنڈ کی سواری ملے تو وہ کبھی انجن میں نہ بیٹھے گا تو مولوی دنیا سے ناواقف

ہی رہنے چاہئیں۔ اور صاحبو! غضب ہے کہ ایک تو ہم تکلیف کے انجن میں بیٹھ کر آپ کی راحت رسانی کے لئے اپنا بدن اور کپڑے سیاہ کریں اور پھر یہ اعتراض ہم پر ہوگا کہ تم گارڈ کیوں نہیں بنتے۔ اس لئے میں دنیا کی اصلاح کا ذکر ہی نہیں کرتا گو وہ بھی موقوف صحبت ہی پر ہے مگر میں صرف دینی اصلاح کا ذکر کرتا ہوں کہ۔

دین کی اصلاح محض کتب بینی سے نہیں ہوتی:

دین کی اصلاح محض کتابیں دیکھ کر نہیں ہوسکتی۔ یہ صحبت ہی سے ہوسکتی ہے۔ مطالعہ کتب سے اس کوشش کرنا ایسا ہے جیسے طب کی کتابیں دیکھ کر کوئی شخص بیوی کو مسہل دینے لگے اور حکیم محمود سے نہ پوچھے محض اس لئے کہ قرابادین اعظم ہمارے پاس ہے۔ جس کسی سے بھی ایسا کہئے تو وہ یہی کہے گا کہ صاحب ہر فن کے کچھ دقائق ہوتے ہیں جن کو صاحب فن ہی سمجھ سکتا ہے میں بدوں حکیم کے مسہل دینے کی جرات نہیں کرتا۔ پس اسی طرح اس فن کو دین میں بھی کچھ غوامض ہیں لہذا کتابوں پر اکتفا کرنا سخت غلطی ہے ہرگز کتابوں پر اکتفا نہ کیجئے بلکہ صحبت اختیار کیجئے چونکہ وقت کم رہ گیا ہے اس لئے مختصر کرکے ختم کرتا ہوں (سامعین نے التجا کی کہ مختصر نہ کیا جاوے اس کے بعد پھر فرمایا)

بدوں صحبت کوئی شئے حاصل نہیں ہوتی:

غرض صحبت نیک کی سخت ضرورت ہے مگر اس کی طرف لوگوں کو مطلق توجہ نہیں۔ حالانکہ بدوں صحبت معمولی کام کا بھی سلیقہ نہیں ہوتا۔ دیکھئے رسالہ خوان نعمت کو دیکھ کر کبھی گلگلے نہیں پکا سکتا۔ تو جب حرف دنیویہ بھی بدون صحبت کے حاصل نہیں ہوسکتے تو فنون شرعیہ تو کیسے حاصل ہوسکتے ہیں مجھے یاد ہے کہ میرے بچپن میں ایک وکیل صاحب میرے مہمان ہوئے میں نے ان سے ترجمہ قانون لے کر دیکھا اور اپنے نزدیک اسکو سمجھا پھر میں نے وکیل صاحب سے پوچھا کہ آیا اس کے معنی یہی ہیں جو میں نے سمجھے ہیں کہنے لگے کہ نہیں بلکہ اس کے معنی یہ ہیں۔ اور ان کے بیان کرنے کے بعد وہی معنی صحیح معلوم ہوئے جو انہوں نے بتلائے تھے۔ تو دیکھئے اردو مادری زبان ہے مگر چونکہ اس فن سے واقفیت نہ تھی اس لئے صحیح معنی سمجھ میں نہ آئے تو اگر کسی دوسری زبان کی کتاب ہو یا اس سے ترجمہ کر کے آئی ہو تو چونکہ غیر زبان کے دقائق پر تو بدوں مہارت اطلاع علی وجہ الکمال نہیں ہوتی۔ اور ترجمہ میں وہ خصوصیات محفوظ نہیں رہتیں جو اصل زبان کے الفاظ میں تھیں۔ اس لئے محض کتاب دیکھ کر کبھی کوئی شخص اصل بات کی تہ کو نہیں پہنچ سکتا۔ دیکھو اگر ذوق کا ایک شعر لے کر فارسی میں اس کا

ترجمہ کردو تو ہرگز وہ لطف نہ آوے گا۔ بس یہی حالت قرآن وحدیث کی ہے تو اول زبان سیکھو پھر ماہر فن کے متعلق اہل فن سے اس کے احکام سیکھو تب وہ فن حاصل ہوگا۔ ورنہ قرآن بدوں مفسر کے اور حدیث بدوں محدث کے ہرگز حل نہیں ہوسکتی اور علماء کو اسکا اندازہ ہوگا کہ باوجود اس کے وہ دن رات اس میں رہتے ہیں مگر پھر بھی ان کو گاہے پوچھنے کی ضرورت پڑتی ہے۔ میں نے بعض اوقات اپنے اساتذہ کے سامنے ان کے مطلب بیان فرمانے پر اس کے خلاف اس مقام کی تقریر کی اور انہوں نے اس کو قبول کیا۔ تو جب شاغلین کی یہ حالت ہے تو جن لوگوں کا یہ مشغلہ ہی نہیں وہ محض اپنے فہم پر کیسے مطمئن ہوسکتے ہیں۔ بعض دفعہ ایک مسئلہ کے ساتھ دوسری قیود جو اس مقام پر مذکور نہیں ملحوظ ہوتی ہے جس میں نہایت ماہر کی ضرورت ہوتی ہے اسی لئے میں نے ایک طالب علم شافعی المذہب کی درخواست پر اس کو فقہ شافعی پڑھانے سے انکار کردیا۔ کیونکہ میں جانتا تھا کہ کبھی ایک مسئلہ میں ایک قید معتبر ہوتی ہے۔ لیکن وہ اس خاص مذکور نہیں ہوتی بلکہ دوسری جگہ مذکور ہوتی ہے۔ تو ایسے مقام پر بوجہ عدم استحضار وعدم مہارت مجھے فروگذاشت ہوتی۔

طلاق کا ایک اہم مسئلہ:

میں مثال کے طور پر عرض کرتا ہوں کہ لفظ اختیاری (اختیار کرتو) کنایات میں ہے اس کو باب الکنایات میں دیکھ کر بعض لوگوں کو ہی لغزش ہوئی کہ وہ یہ سمجھے کہ اگر کوئی اپنی بیوی کو بہ نیت طلاق یہ لفظ کہہ دے تو طلاق ہوجاوے گی۔ حالانکہ یہ مسئلہ ایک تو بات تفویض طلاق سے متعلق ہے اور دوسرے باب کنایات سے تو باب کنایات میں تو یہ لکھا ہے کہ کنایہ ہے اور باب تفویض میں یہ لکھا ہے کہ وقوع کی شرط یہ ہے کہ عورت اخترت نفسی (میں نے اپنے نفس کو اختیار کیا) بھی کہے اور اگر عورت کچھ نہ کہے تو مرد کے صرف اختیاری کہنے سے طلاق واقع نہیں ہوتی اسی لئے میں نے ان شافعی المذہب سے انکار کردیا۔ اور مولوی طیب صاحب عرب شافعی کا نام بتلادیا تھا کیونکہ دیانت کی بات یہی تھی اس قسم کی سینکڑوں مثالیں ہیں کہ جب تک کامل شیخ اس کے غوامض پر مطلع نہ کرے اس وقت تک وہ حل نہیں ہوسکتیں اس لئے صحبت کی حاجت ہوئی۔ سو ایک ضرورت تو صحبت کی اصلاح علمی کے لئے ہے۔

دین کی اصلاح عمل سے ہے:

اور دوسری اصلاح دین کی عمل ہے جس کے لئے ضرورت ہے ترتیب کی اور وہ بھی موقوف

ہے صحبت پر اور عمل کا موقوف ہونا تربیت پر اور محض علم کا اس کے لیے کافی نہ ہونا اس سے ظاہر ہے کہ عمل میں علماء بھی کوتاہیاں کرتے ہیں۔ چنانچہ ہم جیسوں کی یہ حالت ہے کہ ؎

واعظاں کیں جلوہ بر محراب و ممبر میکنند — چوں بخلوت میروند آں کار دیگر میکنند

مشکلے دارم ز دانشمند مجلس باز پرس — توبہ فرمایاں چرا خود توبہ کمتر میکنند

(واعظ لوگ محراب و منبر پر جلوہ فرما ہوتے ہیں جب خلوت میں جاتے ہیں دوسرا کام کرتے ہیں۔ ایک اشکال مجھ کو پیش آیا ہے دانشمندِ مجلس سے دریافت کر توبہ کا حکم کرنے والے خود توبہ نہیں کرتے ۱۲)

آخر کیا وجہ ہے کہ غیبت کی برائی جانتے ہیں مگر مبتلا ہیں۔ جانتے ہیں کہ کینہ رکھنا برا ہے مگر سینکڑوں اہل علم اس میں مبتلا ہیں۔ سو وجہ یہی ہے کہ تربیت نہیں ہے اور اس کی وجہ سے عمل کمزور ہے تو عمل کے لئے فقط علم اور ارادہ کافی نہیں تربیت کی بھی حاجت ہے لوگوں نے یہ سمجھا ہے کہ عمل ارادی چیز ہے تو اس کے لئے ارادہ کافی ہو گیا ہوگا مگر اس میں غلطی یہ ہوئی کہ خود ارادہ کے لئے بھی قوت کی ضرورت ہے اس پر نظر نہیں کی گئی یا یوں کہئے کہ ارادہ جب ہی کافی ہے کہ موانع موثر نہ ہوں اور بدوں تربیت موانع ہوتے ہیں۔

منازعات نفس مجاہدہ سے باطل نہیں ہوتے:

مثلاً منازعات نفس بھی موانع ہیں کہ آپ سردی میں اٹھ کر نماز پڑھنا چاہتے ہیں لیکن نفس آپ کو روکتا ہے تو اس کے لیے ضرورت ہے تربیت کی اس سے منازعات ضعیف الاثر ہو جاتے ہیں گو بالکل ان کے مواد کا استیصال نہیں ہوتا۔ بعض لوگوں کو اس میں یہ دھوکہ ہو جاتا ہے کہ مجاہدات سے منازعات بالکل باطل ہو جاتے ہیں لیکن یہ غلط ہے ہاں ضعیف ہو جاتے ہیں ؎

نفس اژدہاست او کے مردہ است — از غم بے آلتی افسردہ است

(نفس اژدہا ہے وہ نہیں مرا ہاں غم بے آلتی سے افسردہ ہے)

مولانا نے یہ حکایت لکھی ہے کہ ایک اژدہا سردی میں ٹھٹھرا پڑا تھا اس کو ایک مار گر نے مردہ سمجھ کر رسوں میں جکڑ لیا اور گھسیٹ کر شہر میں لایا لوگ جمع ہو گئے اور شیخی بگھار رہا تھا میں نے اس طرح اس کو گرفتار کیا ہے اور اس طرح اس کو مارا ہے لوگ بھی تعجب کر رہے تھے اتنے میں دھوپ جو نکلی وہ اس کی حرارت سے جنبش کرنے لگا معلوم ہوا کہ زندہ ہے مخلوق بھاگی اور ساری شیخی اس کی کرکری ہو گئی اسی کو ذکر کر کے مولانا فرماتے ہیں ؎

نفس اژدہاست او کے مردہ است   از غم بے آلتی افسردہ است

یعنی نفس تو ایک اژدہا ہے وہ مرا نہیں ہاں غم بے آلتی سے افسردہ ہو رہا ہے تو افسردگی کے اسباب کو نہ چھوڑنا چاہئے اور وہ مجاہدت واشغال اور تدبیر خاصہ ہیں اس لئے تعلیم اصلاح کے ساتھ تدابیر کی تعلیم بھی ضروری کرنا چاہئے۔ اکثر ہمارے مصلحین اوامر ونواہی اور وعدہ وعیدہ کو ہمیشہ ذکر کرتے ہیں مگر اس کے ساتھ تدابیر نہیں بتلاتے حالانکہ اس کی سخت ضرورت ہے کیونکہ اس میں سخت دشواری پیش آتی ہے ہم چاہتے ہیں کہ جھوٹ نہ بولیں مگر نفس کہتا ہے کہ اب فلاں مصلحت ہے بول ہی لینا چاہئے اور ہم نفس سے مجبور ہو جاتے ہیں دیکھو اگر بدن میں صفرا بہت بڑھ جاوے تو نرے مسکنات (تسکین دینے والی دوائیں) سے تسکین نہیں ہوتی بلکہ مزیل (زائل کرنے والی ادویہ) کی ضرورت ہوگی تو محض نصیحت بمنزلہ مسکن ہے اور تدبیر بمنزلہ مزیل۔ غرض ان منازعات کے لئے تربیت کی حاجت ہوئی۔

علم وعمل کے لئے نیک صحبت کی ضرورت:

حاصل تقریر یہ ہوا کہ دو چیزوں کی ضرورت ثابت ہوئی۔ ایک علم دوسرا عمل جو موقوف ہے تربیت پر۔ اول کے لئے خاص قسم کے شیوخ کی ضرورت ہے اور دوسرے کے لئے خاص قسم کے شیوخ کی ضرورت ہے۔ پس علم وعمل دونوں موقوف ہوئے صحبت پر مگر ہم لوگ اس سے غافل ہیں چونکہ میں نے کہا تھا جس کی ضرورت ہو اور اس سے غفلت ہو اس کے بتلانے کی سخت ضرورت ہوتی ہے اسی لئے میں اس کو بتلانے کو عرض کر رہا ہوں کہ صحبت وہ چیز ہے کہ علم اور عمل کا کمال دونوں اس پر موقوف اور علم وعمل دونوں ضروری اور موقوف علیہ ضروری پس کس قدر ٹھیری۔

علم وعمل کی کمی سے دنیوی خرابی بھی ہوتی ہے:

اب یہ بات کہ علم اور عمل دونوں ضروری ہیں سو اس کا مختصر بیان یہ ہے کہ جو خرابی دنیوی یا اخروی واقع ہوتی ہے یا اخلال علم سے ہوتی ہے یا اخلال عمل سے اخروی خرابی کا ترتب تو ظاہر ہے اور اس کے واسطے نصوص وعید دلیل کافی ہیں اور دنیوی خرابی کا ترتب اس طرح ہے کہ جس کا جی چاہے دیکھ لے کہ حضور ﷺ کی تعلیم پر عمل کر کے ہر پریشانی سے نجات ہوتی ہے اور اسی طرح مخالفت کرنے سے پریشانی کا ہجوم ہوتا ہے۔ اور میں یہ نہیں کہتا کہ عمل کرنے سے ہر تعب سے نجات ہوتی ہے مگر پریشانی سے ضرور نجات ہوتی ہے۔ اور اصل کلفت یہی ہے اور اگر پریشانی نہ

ہوتو خود تعب ومشقت میں بالذات کو کلف نہیں۔ اسی پر حکایت یاد آئی کہ مولوی غلام مصطفیٰ جو میرے ایک دوست ہیں وہ ایک رئیس کے لڑکوں کو پڑھاتے تھے اور نماز بھی پانچوں وقت پڑھواتے تو ان لڑکوں کی ماں کوستی تھی کہ اس مولوی نے میرے بچوں کو زکام میں مبتلا کر دیا صبح کو وضو کرواتا ہے۔ سو صاحب ایسی مشقت تو دین میں ہوتی ہے۔

اسلام میں حرج نہیں:

مولانا فضل الرحمن صاحب علیہ الرحمۃ سے ایک شخص نے آکر پوچھا کہ ایک عورت کا شوہر گم ہوگیا ہے۔ مولوی صاحبؒ نے فرمایا کہ مرد کی نوے برس کی عمر تک انتظار کرو۔ کہنے لگا کہ جناب اس میں تو بڑا حرج ہے اور دین میں حرج نہیں۔ مولوی صاحب نے فرمایا کہ بھائی اگر یہ حرج ہے تو جہاد میں بھی حرج ہے۔ سو حرج کے یہ معنی نہیں۔ حرج کہتے ہیں پریشانی اور الجھن کو سو اسلام میں یہ نہیں۔ ہاں تعب ومشقت ہے تو کیا دنیا کے کاموں میں تعب اور مشقت نہیں ہے۔

عامل شریعت کو پریشانی نہیں ہوتی:

واللہ جو شخص شریعت پر عمل کرے گا تمام پریشانیوں سے نجات میں رہے گا۔ اس پر شاید کوئی یہ کہے کہ ہم بہت دینداروں کو دیکھتے ہیں کہ وہ اکثر تکلیف میں رہتے ہیں مثلاً ان کی آمدنی کم ہوتی اور خرچ تنگی سے ہوتا ہے تو جواب یہ ہے کہ یہ تکلیف جسم پر ہے روح پر نہیں اور پریشانی ہوتی روح کی تکلیف سے پس اس کی مثال دلدادگان شریعت کے اعتبار سے ایسی ہے جیسے کسی عاشق سے کوئی مدت کا بچھڑا ہوا محبوب ملے اور دور ہی سے دیکھ کر یہ محب اس کو سلام کرے اور اس کے گلے سے لگا لینے کا متمنی ہو اور اس کی عین تمنا کے وقت وہ محبوب دوڑ کر اس کو گلے سے لگا لے اور اس قدر زور سے دبا دے کہ اس کی ہڈیاں بھی ٹوٹنے لگیں۔ اب میں اہل وجدان سے پوچھتا ہوں کہ اس دبانے سے عاشق کو کچھ تکلیف ہوئی یا نہیں۔ یقیناً یہ تکلیف ہوگی لیکن یہ ایسی تکلیف ہے کہ ہزاروں راحتیں اس تکلیف پر قربان ہیں۔ اگر عین اسی تکلیف کی حالت میں محبوب کہے کہ اگر تجھ کو کچھ تکلیف ہو تو چھوڑ دوں اور جو تیرا رقیب سامنے موجود ہے اس کو اسی طرح دبالوں تو وہ کیا جواب دے گا۔ ظاہر ہے یہ جواب دے گا کہ

نشود نصیب دشمن کہ شود ہلاک تیغت   سر دوستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی

(دشمن کا ایسا نصیب نہ ہو کہ تمہاری تلوار سے ہلاک ہو۔ دوستوں کا سر سلامت رہے کہ آپ اس پر خنجر آزمائی کریں)

اور یہ کہے گا کہ

اسیرت نخواہد رہائی زبند　　　　شکارت نجوید خلاص از کمند

(اس کا قیدی قید سے رہائی نہیں چاہتا اس کا شکار جال سے رہائی نہیں ڈھونڈتا ۱۲)

غرض اگر عشق ومحبت ہے تو اس تکلیف کی اس کو ذرا پرواہ نہ ہوگی بلکہ اس میں ایک گونہ لذت ہوگی۔ یہ تجربہ کی بات ہے آپ اہل اللہ کی حالت کو مشاہدہ کر لیجئے کہ ان کو اس قلت مال و تنگی خرچ سے ذرا روحانی تکلیف نہیں ہوتی بلکہ جس طرح آپ کو ان کی ناداری پر رحم آتا ہے ان کو آپ کی مالداری پر رحم آتا ہے۔ حضرت شبلی صاحب کسی متنعم کو دیکھتے تو فرماتے الحمد للہ الذی عافانی مما ابتلاک بہ وفضلنی علیٰ کثیر ممن خلق تفضیلا ط (خدا تعالیٰ کا شکر ہے کہ اس نے مجھ کو اس چیز سے عافیت میں رکھا جس میں تجھ کو مبتلا کیا ہے۔ مجھ کو اپنی مخلوق میں بہتوں پر فضیلت دی) تو آپ اہل اللہ پر ان کی ظاہری تکلیف کو دیکھ کر رحم کرتے ہیں مگر ان کو اپنے اوپر رحم نہیں آتا اس واسطے کہ وہ اس کو پریشانی ہی نہیں سمجھتے اور واقع میں یہ پریشانی نہیں ہے۔ میں پھر دعویٰ کرتا ہوں کہ متبع سنت کو کبھی پریشانی نہیں ہوتی۔ اس کی ہر وقت یہ حالت ہوتی ہے

کوئے نومیدی مرو کامیدہاست　　　　سوئے تاریکی مرو خورشیدہاست

(ناامیدی کی راہ نہ جاؤ بہت سی امیدیں ہیں تاریکی کی طرف نہ چلو بہت سے آفتاب ہیں یعنی اللہ تعالیٰ سے ناامید نہ ہو بلکہ امیدیں رکھو)

اور امید وہ چیز ہے کہ جن لوگوں نے بی۔ اے پاس کیا ہے ان سے پوچھئے کہ امتحان کی تیاری میں کیا کیا مشقتیں اٹھائی ہیں محض امید کامیابی پر کسی نے خوب کہا ہے

اگرچہ دور افتادم بایں امید خورسندم　　　　کہ شاید دست من بار دگر جاناں من گیرد

(اگرچہ میں محبوب سے دور پڑا ہوں اس امید میں خوش ہوں کہ شاید میرا محبوب میرا دوبارہ ہاتھ پکڑ لے)

خاص کر جو لوگ ایک دو مرتبہ فیل بھی ہو گئے ہیں ان پر تو یہ شعر خوب چسپاں ہے ان کی تو یہ حالت ہوتی ہے کہ نہ روٹی کی پرواہ نہ آرام کا خیال ہر وقت کتاب ہے اور وہ ہیں تو تعجب کی بات ہے کہ دس روپیہ کی ہوس میں روٹی اور آرام چھوڑنے والا تو عالی ہمت سمجھا جاوے اور کوئی اس کو مصیبت زدہ نہ سمجھے اور خدا تعالیٰ کا طالب اگر تنعم چھوڑ دے تو وہ پریشانی میں مبتلا سمجھا جاوے غرض وہ دعویٰ ثابت رہا کہ ان لوگوں کو پریشانی نہیں ہوتی (یہاں تک کرنے کے بعد نماز عصر کے لئے

سب مجمع اٹھا۔ بعد نماز عصر پھر بیان شروع ہوا تو فرمایا کہ)

متبع شریعت کو پریشانی نہ ہونے کا راز:

میں نے تقریر کو اس مسئلہ پر چھوڑا تھا کہ حضور ﷺ کی تعلیم پر عمل کرنے والا ہر قسم کی پریشانی سے محفوظ رہتا ہے اور اس پر جو شبہ ہوا تھا اس کو بھی زائل کر دیا تھا۔ اب اگر اس کی وجہ بھی سمجھ لی جاوے تو بہتر ہے۔ سو اسکی ایک وجہ تو عقلی ہے اور ایک وجہ عشقی ہے عقلی وجہ تو یہ ہے کہ اس تعلیم میں ہر مفسدہ کی اصلاح ہے اور اس کو اہل انصاف نے گو وہ دوسری قوم کے ہوں تسلیم کیا ہے اور اگر کسی نے تعصب سے کام لے کر نہیں مانا ہے تو دوسروں نے اس پر رد کیا ہے۔ دوسری وجہ ایک عشقی ہے کہ وہ دیوانوں کے سمجھنے کی ہے (اور اگرچہ واقع میں یہ درجہ بھی عقلی ہے مگر چونکہ اس کو عقلاء نے کم سنا ہے اس لئے اس کو عقلی نہیں کہا) اور وہ یہ ہے کہ عقلی قاعدہ ہے کہ جو شخص کسی صاحب اقتدار کا مطیع ہوتا ہے وہ اس کو پریشانی سے بچاتا ہے تو خدا تعالیٰ سے زیادہ کون صاحب اقتدار ہوگا۔ پس حضور ﷺ کی تعلیم پر عمل کرنے سے جو چونکہ خدا تعالیٰ کی اطاعت کرتے ہیں وہ ان کو ہر قسم کو پریشانی سے بچاویں گے۔ ہاں اگر کوئی ایسی پریشانی ہوتی کہ وہ خدا تعالیٰ کے اختیار سے خارج ہوتی تو دوسری بات تھی مگر ساری دنیا کا مسلم مسئلہ ہے کہ خدا تعالیٰ کے اختیار سے کوئی چیز خارج نہیں البتہ اگر کوئی امر بظاہر پریشانی کا ہو لیکن واقع میں پریشانی نہ ہو تو اس سے حفاظت کا دعویٰ نہیں جیسے بچے کی حفاظت ماں باپ کرتے ہیں لیکن اگر کسی عضو میں مادہ فاسد جمع ہو جاتا ہے تو اس کے اخراج کے لئے ماں باپ نشتر بھی دلواتے ہیں بچہ سمجھتا ہے کہ ماں باپ میری بالکل حفاظت نہیں کرتے اور روتا ہے مگر بچہ اور مادر مشفق کی رائے میں فرق یہ ہے کہ

طفل مے لرزو زنیش احتجام　　　مادر مشفق ازاں غم شاد کام

(بچہ نشتر لگانے سے لرزتا ہے مگر مشفق ماں اس سے مطمئن اور خوش ہوتی ہے۔)

تو یہ تکلیف واقع میں راحت ہے اور ایسی پریشانی تو کسی مدعا کی طلب میں کوئی بچ نہیں سکتا اور نہ بچنے کی کوشش کرتا ہے وہ عشقی وجہ یہ ہے جو واقع میں عقلی بھی ہے اور میں محض عقلی وجہ پر اکتفا نہیں کرتا بلکہ قرآن کریم سے بھی اس کو ثابت کرتا ہوں فرماتے ہیں: ومن یتق اللہ یجعل لہ مخرجا ویرزقہ من حیث لا یحتسب. (جو شخص اللہ سے ڈرے اللہ تعالیٰ اس کے واسطے کوئی راہ کر دیں گے اور اس کو ایسی جگہ سے روزی دیں گے کہ اس کا گمان بھی نہ ہوگا)

یہ وعدہ ہے خدا تعالیٰ کا غرض یہ دعویٰ اور عقل ہر دو سے ثابت مؤید ہے۔ حاصل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ و رسول اللہ ﷺ کی تعلیم پر عمل کرنے والا کسی پریشانی میں مبتلا نہیں ہوتا۔

نافرمانی کا اثر:

اور جیسا اتباع میں یہ اثر ہے نافرمانی میں بھی یہ اثر ہے کہ نافرمان ہر دم پریشانی میں مبتلا رہتا ہے اور گو یہ اس کو راحت سمجھتے ہیں مگر واقع میں وہ پریشانی ہے۔

پریشانی کی حقیقت:

اس لئے ضرور ہوا کہ میں اول پریشانی کی حقیقت بتلا دوں۔ سو سمجھئے کہ پریشانی کس کو کہتے ہیں پریشانی کہتے ہیں تشویش قلب کو نہ کہ مشقت ظاہری کو پس آپ دیکھ لیجئے کہ جو لوگ نافرمانی میں مبتلا ہیں ان کا قلب ہر وقت مکدر اور مظلم رہتا ہے اور جس کا نام جمعیت ہے وہ ان کو ہرگز میسر نہیں ہوتی اور جس قدر بھی تعلقات دنیا زیادہ ہوتے چلے جاتے ہیں پریشانی بڑھتی چلی جاتی ہے اور اگر کسی کو اس کی بھی حس نہ رہے تو وہ امتحان کرے۔

جمعیت کی حقیقت:

اور وہ امتحان یہ ہے کہ یہ شخص ایک ہفتہ بھر کے لئے فارغ ہو کر خلوص کے ساتھ ذکر اللہ کرے جب ایک ہفتہ گزر جاوے تو دیکھئے کہ قلب میں کوئی نئی کیفیت محسوس ہوتی ہے یا نہیں انشاء اللہ تعالیٰ ضرور محسوس ہوگی۔ اب اس کیفیت کو محفوظ رکھے اور خلوت کو چھوڑ دے اس کے بعد غفلت کے آثار میں تو خود ہی مبتلا ہو جاوے گا۔ پھر اس کے ایک ہفتہ بعد اس پہلی محفوظ کیفیت اور اس کے ابتلاء کے بعد کی کیفیت کو موازنہ کر کے دیکھے تو مقابلہ ہوگا کہ واقعی میں اس وقت پریشانی میں ہوں اور حالت کے سامنے ظلمت اور پریشانی نظر آوے گی اور حالت محفوظ جمعیت اور نورانیت معلوم ہوگی یہ ہے اس کا امتحان اس سے انشاء اللہ تعالیٰ معلوم ہو جاوے گا کہ اہل دنیا سب پریشانی میں مبتلا ہیں اور بدوں امتحان اکثر کو اس کی حس نہ ہوگی کیونکہ جس نے کبھی جمعیت کو نہیں دیکھا وہ پریشانی کو کیا سمجھے وہ تو پریشانی ہی کو جمعیت سمجھے گا مگر اس کو جمعیت سمجھنا ایسا ہے جیسے ایک سرحدی دیہاتی نے اپنی ذلت کو عزت سمجھا تھا مشہور ہے ایک صاحب ہندوستان آئے حلوائی کی دوکان پر پہنچے تو دیکھ کر جی للچایا دام وام پاس نہ تھے آپ نے بغیر پوچھے اس سے بہت سا اٹھا لیا اور کھا گئے۔

حلوائی نے نالش کردی قاضی شہر نے یہ تعزیر تجویز کی کہ ان کو گدھے پر سوار کر کے لڑکوں کو اس کے پیچھے پیچھے کرو کہ ڈھول بجاتے چلیں اور تمام شہر میں اسی حالت سے گشت کراؤ۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ جب وطن واپس گئے تو اہل وطن نے پوچھا۔ آغا ہندوستان رفتہ بودی ہندوستان راچہ طور یافتی (آغا ہندوستان گئے تھے ہندوستان کیسا پایا) آپ جواب دیتے ہیں آغا ہندوستان خوب ملک است انجا حلوا خوردن مفت است۔ سواری خرمفت است۔ فوج طفلاں مفت است۔ ڈم ڈم مفت است (آغا ہندوستان اچھا ملک ہے حلوہ کھانا مفت ہے گدھے کی سواری مفت ہے بچوں کی فوج مفت اور ڈم ڈم مفت ہے) تو جیسا ان صاحب کو اس کیفیت میں لطف آیا تھا ویسا ہی اس وقت تنعم پرستوں کو ہے کہ آج یہ حشم وخدم عزت اور سامان جمعیت معلوم ہوتا ہے ایک دن حقیقت کھلے گی کہ گدھا ران کے نیچے ہے لیکن سمجھ رہے ہیں کہ گھوڑے پر سوار ہیں کیونکہ گھوڑے پر سوار ہونا نصیب نہیں ہوا اگر کبھی گھوڑے پر سوار ہوں تو معلوم ہو کہ پہلے گدھے پر سوار تھے یا گرد وغبار میں گدھے گھوڑے میں امتیاز نہیں ہوا اسی کو کہتے ہیں

فسوف تریٰ اذا نکشف الغبار   افرس تحت رجلک ام حمار

(عنقریب دیکھے گا تو جب غبار کھلے گا کہ تیرے قدم کے نیچے گھوڑا ہے یا گدھا)

تو جب یہ غبار غفلت کھلے گا اس وقت معلوم ہوگا کہ ران کے نیچے کیا چیز تھی۔ بہر حال مخالفت میں بھی کبھی جمعیت نہیں ہوتی۔ تو اس تمام تقریر سے معلوم ہوا ہوگا کہ عمل کتنی ضروری چیز ہے اور بے عمل کتنی پریشانی میں ہیں پس عمل کی ضرورت تو اس سے ظاہر ہوگئی اور علم موقوف علیہ ہے عمل کا سووہ بھی اسی سے ضروری ٹھیرا۔

دو چیزوں کی ضرورت:

غرض دو چیزوں کی ضرورت متحقق ہوئی علم کی اور عمل کی اور علم کیلئے تعلیم کی ضرورت ہے اور عمل کے لئے تربیت کی ضرورت ہے اور ان دونوں کے لئے صحبت کی ضرورت ہے۔ پس صحبت اس درجہ کی ضروری ٹھیری۔

نیک صحبت بغیر اصطلاحی علم کے بقدر ضرورت کافی ہے:

بلکہ میں ترقی کر کے کہتا ہوں کہ اگر کسی کو کتابی علم نہ ہو اور محض صحبت ہو تو بقدر ضرورت کفایت ہو جاتی ہے ہاں اصطلاحی مولوی نہیں ہوگا۔ کیونکہ یہ کمال علمی تو بدون درس وتدریس کے

نہیں ہوسکتا مگر ہاں بقدر ضرورت حاصل ہوسکتا ہے بلکہ اگر حافظ اور تدوین کامل ہو تو علم بھی صرف صحبت سے بدون درس تدریس کے حاصل ہوسکتا ہے چنانچہ اکثر صحابہ کرام کا علم زیادہ تر خالی صحبت سے بدون کتب و درس ہی کے تھا بعد کو چونکہ حالت بدل گئی اس لئے اس کی حفاظت کی غرض سے مدون کرنے کی ضرورت ہوئی کہ اگر مدون نہ ہوگا تو لوگ محفوظ نہ رکھیں گے یا ان کے دعویٰ حفظ یا صحت نقل پر اعتماد نہ ہوگا تو تدوین اور تدریس کی ضرورت لغیرہ ہے لعینہ نہیں ہے تو تعلیم والا تو صحبت سے مستغنی نہیں اور صحبت والا تعلیم کتابی سے مستغنی ہوسکتا ہے۔ یہ تو گفتگو تھی تعلیم کے موقوف ہونے میں صحبت پر۔

تربیت بھی صحبت پر موقوف ہے:

اب دوسرا جز تربیت جس کی ضرورت تعلیم سے بھی زیادہ ہے سو وہ بدون صحبت کے کسی درجہ میں بھی حاصل نہیں ہوسکتی حتیٰ کہ غیر اہل ملت نے بھی اس کی ضرورت سمجھی چنانچہ کالجوں میں جو بورڈنگ بنائے جاتے ہیں اور شہر کے بچوں کو بھی ان میں رکھا جاتا ہے محض اس لئے اساتذہ کے خواص طبیعت ان میں پیدا ہو جاویں اور یہ میں نے اس لئے نقل کیا کہ آج کل کے مذاق والے لوگ بھی مطمئن ہو جاویں ورنہ ہم کو غیر ملی لوگوں کے طرز عمل کے نقل کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہم تو اس کو ایسا یقینی سمجھتے ہیں کہ جس میں ذرا بھی شک نہیں کیونکہ ہم کو تو روز مشاہدہ ہوتا ہے بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ ذی علم لوگ میرے پاس اصلاح کے لئے آتے ہیں اور ان کے اخلاق اچھے نہیں ہوتے اور وہ چاہتے ہیں کہ کچھ ذکر و مشاغل پوچھ کر چلے جاویں لیکن میں بجائے ذکر و شغل سکھلانے کے ان کو وہاں رہنے کا مشورہ دیتا ہوں اور وہ رہتے ہیں۔ چند روز تک اس مجمع میں رہنے سے کسی نہ کسی کی برکت سے ان کی حالت درست ہو جاتی ہے۔ اگرچہ وہ برکت کسی چھوٹے ہی کی ہو۔ اور اسی لئے بڑوں کو بھی ضرورت ہے۔ چھوٹوں کی کیونکہ ان کی برکت سے بڑوں کی اصلاح ہو جاتی ہے۔ بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ لوگوں سے کہا جاتا ہے کہ تم چھ ماہ یا سال بھر تک ہمارے پاس رہو اور یہ بات ان کی سمجھ میں نہیں آتی مگر پھر جب رہتے ہیں اور پہلی حالت میں تغیر شروع ہوتا ہے اور بات بات پر ان کو روکا ٹوکا جاتا ہے تو ان کی سمجھ میں آتا ہے کہ واقعی اس کی ضرورت تھی تو چونکہ ہم کو ایسے واقعے ہمیشہ پیش آتے ہیں اس لئے ہم کو تو اہل تمدن کے قول کے نقل کرنے کی ضرورت نہ تھی مگر چونکہ آج کل لوگوں کو بدون اس کے تسلی نہیں ہوتی اس لئے ان کی

حکایت بھی نقل کر دی پس ہم کو دونوں جماعتوں کی ضرورت ہے ایک تو وہ جماعت جس سے تعلیم حاصل کریں دوسری وہ جماعت جس سے تربیت ہو۔

ہر طبقہ کے لئے علم وعمل کی تحصیل کا دستور العمل:

اب اس کے متعلق دستور العمل بتلاتا رہا کہ سو اس دستور العمل میں تفاوت ہوگا۔ کیونکہ دو قسم کے لوگ ہیں۔

ناخواندوں کا دستور العمل:

ایک تو وہ جو کہ پڑھے لکھے نہیں ہیں تو ان کے لئے تو اور دستور العمل ہوگا اور وہ یہ ہے کہ اگر ان کو فراغ ہو تو اول درس کتابی کے ذریعہ سے علوم کی تحصیل کرائی جاوے۔ اگر پورا عالم بھی نہ بنے تو کم از کم دو چار برس تک اسی کام میں لگا رہے اور ان چار برسوں میں کوئی دوسرا کام نہ ہو (یہ میری رائے ہے) شغل علم میں یہ حالت رہے کہ چو میرد مبتلا میرد چو خیزد مبتلا خیزد۔ (جب مرتا ہے مبتلا مرتا ہے جب اٹھتا ہے مبتلا اٹھتا ہے)

اب یہ آپ کو اختیار ہے چاہے جتنی مدت تجویز کریں مگر کم از کم ایک سال ضرور ہو اور ایک سال کے بعد اگر علوم معاشیہ کی بھی حاجت ہو تو تعلیم دین و دنیا مخلوط رہے اور ان میں جو لوگ تکمیل کر سکیں ان کی تکمیل بھی کرائی جاوے کہ اس کی بھی سخت ضرورت ہے جس کو لوگ بیکاروں کا کام سمجھتے ہیں۔ میرے پاس کلانور کے ایک شخص آئے میرے بھتیجے کے متعلق پوچھنے لگے وہ کیا کرتا ہے؟ میں نے کہا عربی پڑھتا ہے۔ کہنے لگے اس کے بعد انگریزی کا بھی ارادہ ہے میں نے کہا نہیں کہنے لگے تو اس کو ترقی نہ کرائی جاوے گی کہ انگریزی پڑھ کر بڑے بڑے عہدے حاصل کرے۔ میں نے کہا کہ اگر سب اسی میں مشغول ہوں تو پھر دین کا خادم کون بنے گا آخر اس کی بھی تو ضرورت ہے کہنے لگے کہ اس کے لئے مدرسہ دیوبند سے ہر سال بہت لوگ نکلتے ہیں میں نے کہا سبحان اللہ کیا انصاف اور خیر خواہی ہے اگر مولوی ہونا ترقی کی بات ہے تو میرے بھتیجے کے لئے کیوں نہ تجویز ہوا اور اگر تنزل اور ذلت کی بات ہے تو دیوبند کے طالب علموں کے لئے کیوں تجویز ہو کیا وہ قوم کی اولاد نہیں غرض جو لوگ فارغ ہو سکیں ان کو پورا مولوی بنایا جاوے اور اس کے امراء کے بچے زیادہ مستحق ہیں کیونکہ غرباء معاش سے مستغنی نہیں ہو سکتے بس یا تو وہ دوسرے کام میں لگ کر علم کو ضائع کریں گے اور بعضے علم کو ذریعہ کسب بناویں گے جس کے بعد نہ ان کے وعظ میں اثر ہوگا نہ ان کے فتوے معتبر

سمجھے جاویں گے اور امراء مستغنی ہیں اس لئے ان کی اصلاحات کا اثر زیادہ ہوگا اس لئے امراء پر لازم ہے کہ اپنے بچوں میں سے ایک دو کو ضرور تکمیل علوم دینیہ کے لئے منتخب کریں مگر انتخاب کا وہ قاعدہ نہ ہو جو اب تک ہوتا چلا آرہا ہے یعنی جو سب سے زیادہ غبی اور کودن ہو اسی کو عربی کے لئے تجویز کرلیا۔ اور پھر خود ہی مولویوں پر اعتراض کیا جاتا ہے کہ یہ بے وقوف ہوتے ہیں۔ صاحبو! مولوی تو بے قوف نہیں ہوتے لیکن بے وقوف مولوی بنا دیے جاتے ہیں۔ اب تم انتخاب اس طرح کرو کہ جو ذہین اور ذکی ہو اس کو مولویت کے لئے تجویز کرو پھر دیکھو کہ مولوی کیسے عقلمند اور ہوشیار ہوتے ہیں مگر لوگوں کی تو حالت عام طور سے یہ ہوگئی ہے کہ جو چیز کسی کام کی نہ ہو وہ اللہ میاں کے نام پر چڑھائی جاتی ہے۔ اللہ میاں کو جانے لوگوں نے کیا سمجھ رکھا ہے کہ جو چیز کسی کے کام کی نہ ہو اللہ میاں کے نام پر اسی لئے کودن و غبی اللہ تعالیٰ کے دین کے لئے انتخاب کیا جاتا ہے تو اس انتخاب سے معاف کیجئے کیونکہ اس انتخاب میں پڑھنے والے کا تو نفع ہے لیکن قوم کا کوئی نفع نہیں۔ قوم کو ایسے لوگوں سے نفع ہوسکتا ہے کہ جو سیر چشم اور ذہین ہوں۔ یہ دستور العمل تو ان ناخواندہ لوگوں کے لئے ہوا جو کہ خواندہ ہوسکتے ہیں اور جو ناخواندہ لوگ بوجہ فراغ نہ ہونے کے باقاعدہ نہ پڑھ سکیں وہ کبھی کبھی علماء کے پاس جایا کریں اور ان سے علم دین کی باتیں پوچھا کریں اور آج کل لوگ علماء سے ملتے ہیں لیکن بہت ہی بری طرح یعنی ان کو اپنے مذاق کے تابع کرتے ہیں کہ اخبار میں یوں لکھا ہے اور وطن میں یہ خبر شائع ہوئی ہے۔ صاحبو! ان کو تو وطن اور وکیل کی ضرورت نہیں تم اپنے وطن کی خبر لو اور اپنے وکیل بنو۔ ان کے پاس جا کر اپنے افعال اور امراض سے ان کو مطلع کرو اور اس کی اصلاح پوچھو۔ یہ تعلیم کی صورت ہے غیر فارغین کے لئے جب اس مختلف طریق سے علوم حاصل ہو جاویں پھر صحبت صالحہ کی تدبیر کرو۔ خود بھی صلحاء کے پاس جاؤ اور اپنے بچوں کو بھی علماء کے پاس لے جاؤ اور ان کو وہ باتیں سناؤ دیکھو اب بچے چھٹی میں آتے ہیں لیکن محض فٹ بال اور کرکٹ میں سارا وقت صرف ہوتا ہے کم سے کم ایک گھنٹہ روزانہ اس کے لئے ضرور دو کہ وہ کسی عالم کے پاس جا کر بیٹھا کریں۔ یہ سب تفصیل ہوئی ناخواندوں کے دستور العمل سے متعلق۔

خواندہ حضرات کا دستور العمل:

اب [illegible] سے وہ لوگ ہیں کہ وہ بقدر کافی لکھے پڑھے ہیں اور علوم ضرورہ میں معتد بہ استعداد رکھتے ہیں کہ ان کو اصلاحی مولوی کہہ سکتے ہیں اور وہ اس واسطے اپنے لئے ضرورت تعلیم کی

یا تربیت کی بھی نہیں سمجھتے ۔ میں ان کے لئے یہ کہتا ہوں کہ گو وہ خود فاضل ہونے کے سبب علوم بدرجۂ اعتماد علماء کے معتقد نہ ہوں مگر علوم میں علماء سے مراسلت ضرور رکھیں ۔ اور میں یہ نہیں کہتا کہ فلاں عالم سے پوچھو بلکہ یہ کہتا ہوں کہ سب سے پوچھو اور بہتر تو یہ ہے کہ مسائل علمیہ میں ہر ہفتہ چار مولویوں کے پاس خط بھیج دیا کرو اور ان کے جوابوں کا مقابلہ کر کے دیکھا کرو ہم کسی خاص مولوی کا مقید نہیں کرتے اور مقابلہ کے وقت بدون رائے قائم کئے ہوئے دونوں کے جواب کو انصاف سے دیکھو اور اگر خدشہ رہے تو بدون اظہار نام ایک کے دلائل کو دوسرے کے سامنے پیش کرو اسی طرح اگر آپ کیا کریں گے تو ان شاء اللہ تعالیٰ تمام مسائل میں حق واضح ہو جاوے گا اور اگر بفرض محال کسی مسئلہ کی حقیقت واقعیہ مخفی بھی رہ گئی تب بھی آپ پر قیامت میں مواخذہ نہ ہوگا ورنہ سخت اندیشہ ہے اور جن کو مناسبت علوم سے اس درجہ کی نہیں اور وہ موازنہ اور مقابلہ نہیں کر سکتے ان کے لئے یہ طریق ہے کہ وہ کسی ایک کو اختیار کر لیں جیسے کسی شخص کو طب سے مناسبت نہ ہو تو وہ اختلاف اطباء کے وقت کیا کرے گا اور اس کے لئے کیا مناسب ہے آیا دونوں کے نسخوں کو دیکھ کر ترجیح دینا یا اجمالی دلائل سے کسی ایک کو انتخاب کر لینا

دلارامے کہ داری دل درو بند　　　دگر چشم از ہمہ عالم فرو بند

(جس دل آرام یعنی محبوب سے تم نے دل لگا رکھا ہے اس کے لئے تمام دنیا سے آنکھیں بند کر لو ۱۲)

اور یہیں سے یہ بھی حل ہو گیا ہوگا کہ اگر مولویوں میں آپس میں اختلاف ہو تو کیا کریں اور کس کے قول پر عمل کریں تو جواب یہی ہے کہ اطباء میں بھی تو آپس میں اختلاف ہوتا ہے پھر وہاں کیا کرتے ہو یہی کرتے ہو کہ جو سب میں بڑا ہو اسی سے رجوع کرتے ہو بڑا ہونے کی علامت یہ ہے کہ اس نے کسی ماہر سے حاصل کیا ہو مدت سے کام کر رہا ہو اس کے ہاتھ سے اکثر لوگ شفایاب ہوتے ہوں تو جب علماء میں اختلاف ہو تو یہی دیکھو کہ کس کے شاگرد ہیں کتنے دنوں سے دین کی خدمت کرتے ہیں لوگوں کو ان سے کیسا فائدہ پہنچ رہا ہے ۔ اگر ایک کا استاد دین میں بڑا ماہر تھا اور یہ مدت سے دین کی خدمت بھی کر رہا ہے جو علامت ہو گئی مہارت کی ۔ اس کے اصحاب دین کا پہلو بھی زیادہ لئے ہوئے ہیں جو بجائے دست شفائے طبیب کے ہے اور دوسرے میں یہ بھی بات نہیں تو پہلے کو لے لو ۔ اور دوسرے کو چھوڑ دو علماء میں انتخاب کا طریقہ ہے مگر یہ طریقہ ان کے لئے ہے جو قوت فیصلہ نہیں رکھتے باقی جو لوگ قوت فیصلہ رکھتے ہیں ان کو چاہئے کہ مفصل

دونوں جگہ تحقیق کریں اور پھر موازنہ کریں جیسا کہ اوپر مذکور ہوا یہ تو تعلیم کی بابت تھا۔

شیخ کامل کی علامات:

اب رہ گئی تربیت اس میں خواندہ ناخواندہ سب کا ایک ہی دستور العمل ہے وہ یہ کہ اس شخص کے لئے ایسے شخص کو انتخاب کریں جس نے اپنے اخلاق درست کر لئے ہوں۔ اور اس کا اندازہ مشاہدہ علامات سے ہو سکتا ہے کہ متعدد مشائخ کو جا کر دیکھیں اور یہ کوئی مشکل بات نہیں۔ دیکھئے دنیا کے ایک سودے کے لئے شہروں میں مارے مارے پھرتے ہیں تو اگر بزرگوں کی تلاش میں بھی دو چار جگہ ہو آویں تو کیا مشکل ہے اور وہ علامات یہ ہیں کہ دیکھیں کون بزرگ ایسا ہے جو علم دین بقدر ضرورت رکھتا ہو اور علم پر عمل کرتا ہو اپنے متعلقین پر شفقت کے ساتھ احتساب کرتا ہو اور اس کی صحبت میں لوگوں کو دنیا سے دلبستگی نہ رہتی ہو اسکے پاس رہنے والے غالب دیندار ہوں جو شخص ایسا ملے کہ اس کے پاس آمد و رفت رکھے اور جب موقع ملے چند روز تک اس کے پاس رہے اس کے اخلاق درست ہو جائیں گے کیونکہ جب پاس رہے گا تو دیکھے گا کہ اس نے چار موقع پر غصہ کو ضبط کیا ہے تو ایک جگہ خود بھی ضرور ضبط کرے گا۔ اور اسی طرح عادت ہو جاوے گی۔ اور اگر پاس رہنا ممکن نہ ہو تو ایسے شخص سے مراسلت ہی رکھو اپنے امراض لکھ کر بھیجو کہ مجھے حرص ہے طمع ہے بے استقلالی ہے پھر وہاں سے جو کچھ لکھ کر آوے اسپر عمل کرو۔ وہ حضرات تہذیب اخلاق کے لیے وظیفہ نہ بتلاویں گے بلکہ تدابیر بتلادیں گے اور گو وہ کتابوں میں بھی ہیں لیکن وہ مبتدی کو مفید نہیں ہوتیں اس لئے کہ کتابوں میں کلیات ہیں باقی اپنے حالات جزئیہ کا منطبق کرنا ان کلیات پر اس کے لئے فہم کافی نہیں تو یہ تو تربیت کا طریق ہے خواہ مجالست سے ہو یا مراسلت سے ہو اور یہ طریقہ جیسا کہ آپ کے لئے ہے آپ کے بچوں کے بھی ہے اگرچہ وہ انگریزی وغیرہ ہی میں مشغول ہوں اس حالت میں ایسا ہونا چاہئے کہ چھٹی میں کم سے کم ایک چوتھائی چھٹی کا ان بزرگوں کے پاس گزاریں۔ خربوزہ کو دیکھ کر خربوزہ رنگ پکڑتا ہے۔ اگر سال بھر میں ایک ماہ بھی آپ کسی ایسے شیخ کی صحبت میں رہ لیں گے تو ان کو نہ سائنس مضر ہو سکتا ہے نہ انگریزی۔ یہاں تک مردوں اور بچوں کی تربیت کا دستور العمل مذکور ہوا۔

عورتوں کا دستور العمل:

اب رہ گئیں عورتیں تو عورتوں کے لئے ایک تو یہ صورت ہے کہ اگر خاندان میں کوئی بزرگ

عورت ہو تو ان کے پاس جا کر بیٹھیں اور اگر نہ ہو تو ان کو بزرگوں کے ملفوظات سناؤ اور زندہ بزرگوں کے حالات سناؤ اور ان کو ایسی کتابیں دو تاکہ وہ ان کو پڑھا کریں۔ علامہ غزالی علیہ الرحمۃ کی کتابیں سناؤ۔ میں نے اس کا تجربہ کیا ہے بہت نافع ہوتی ہیں یہ دستور العمل ہوا تعلیم و تربیت کا جن میں ایک کا تعلق علماء سے ہے دوسرے کا مشائخ سے۔

علماء و مشائخ میں عوام کی عیب جوئی کا جواب:

اب ان دونوں جماعتوں کے متعلق لوگ ایک غلطی کرتے ہیں وہ غلطی یہ ہے کہ ایک عیب تو علماء میں نکالا جاتا ہے کہ باعمل نہیں اور اس لئے ان سے علم بھی اخذ نہیں کرتے اور اسی طرح ایک عیب مشائخ میں نکالا جاتا ہے کہ عالم محقق نہیں اور اس لئے ان سے اپنی تربیت کا طریق نہیں حاصل کرتے۔ آپ چاہتے ہیں کہ آپ کو کوئی جامع شخص ملے تو ایسے جامع تو اب کم ملیں گے۔ صاحبو! اگر ابو حنیفہ علیہ الرحمۃ کی برابر جامع نہ ملے تو کیا حرج اور اگر دین کی تحصیل میں ایسا ہی کمال شرط ہے تو پھر تحصیل دنیا میں بھی ایسا ہی ہونا چاہئے۔ پس نوکری بھی نہ کیا کرو کیونکہ سلطنت نہ ملی تو نوکری کیا ہوگی اور اس کے جواب میں کہو کہ وہ نہیں یہی سہی تو یہاں بھی میں یہی کہوں گا کہ ابو حنیفہ نہیں تو آج کل کے مولوی ہی سہی۔ اسی طرح مشائخ میں جنید بغدادیؒ کی تلاش ہوتی ہے وہاں بھی یہی جواب ہے نیز اگر جنید کو تلاش کرتے ہو تو تم بھی ان ہی کے مستفیدین جیسی طلب بھی تو پیدا کرو۔

صاحبو! یہ غنیمت سمجھو کہ تمہاری طلب کے موافق تو بزرگ مل گئے۔ غرض علماء میں تو یہ عیب نکالا جاتا ہے کہ علماء میں عمل نہیں ہوتا اور بعض کے اعتبار سے یہ سچ بھی ہے مگر اول تو سب علماء کو بے عمل سمجھنا غلطی ہے، بہت علماء باعمل بھی ہیں اور میں ان کا نام بھی بتلا دیتا مگر جب لوگ پوچھتے ہی نہیں تو میں کیوں بتلا کر بے قدری کروں اور اگر باعمل لوگوں میں بھی عیوب نکالے جائیں کہ فلاں عالم میں یہ عیب ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ ہیچ نفس بشر خالی از خطا نبود (کسی بشر کا نفس خطا سے خالی نہیں ہے) دوسرے اگر بے عمل بھی ہوں تو دیکھو اگر حکیم محمود خان بد پرہیز ہوں کیا ان سے نسخہ نہ لکھواؤ گے [illegible] تعلیم میں ان کے عمل کو کیا دخل ہے ہاں تربیت اگر ان سے نہ کراؤ تو گنجائش ہے مگر تعلیم علم کیلئے تو وہ کافی ہیں مثلاً اگر آپ ان سے رویۃ الہیہ یا جبر و قدر کا مسئلہ پوچھتے تو اس میں ان کے عمل کو کیا دخل۔ اور اسی قبیل کا شبہ علماء کے متعلق بھی ہے کہ علماء میں اختلاف ہے ہم کس کی مانیں تو میں کہہ چکا ہوں کہ قواعد سے [illegible] ترجیح [illegible] کر اس کو مانو جیسے اگر مختلف وکلاء

کے پاس جاؤ اور وہ مقدمہ میں مختلف رائیں دیں تو آخیر ایک کو ترجیح دو گے جب ہر امر میں یہی قاعدہ ہے تو دین میں ہی سارے شبہات کیوں کئے جاتے ہیں۔ اور ان قواعد ترجیح کا اوپر بیان ہو چکا ہے۔ غرض علماء چاہے بدعمل ہوں مگر ان سے علم حاصل کرو۔ اسی طرح مشائخ میں یہ عیب نکالا جاتا ہے کہ پورے مولوی نہیں اور اس لئے شیوخ ایسے ڈھونڈتے ہیں جو پورے عالم بھی ہوں یعنی ان کی درسی کتابیں کل ختم ہوں۔

صاحبو! جس طرح تعلیم علوم میں پورے باعمل ہونے کی ضرورت نہیں اسی طرح تربیت میں پورے ہونے کی ضرورت نہیں البتہ بقدر ضرورت علم ہونا ضروری ہے ایسا نہ ہو جیسے ایک فقیر کی نسبت لکھا ہے کہ اس نے مجاہدہ کرنے کے لئے ایک نتھنے میں گودڑی ٹھونس رکھی تھی اور ایک آنکھ پر موم کی ٹکیا رکھ لی تھی کہ جب آنکھ سے کام چلتا ہے تو دوسری کی کیا ضرورت اور ایک نتھنے سے پھولوں کی خوشبو سونگھتے ہیں تو دوسرے سے غلیظ سونگھ کر اس کی مکافات ہونی چاہئے گویا اللہ میاں کو بھی آپ نے رائے دی تھی کہ دو آنکھیں فضول بنائی ہیں۔ اتفاق سے کوئی صحبت یافتہ علماء کا اس کے پاس جا پہنچا اور اس کو اطلاع دی کہ تمہارا تو وضو نماز سب غارت ہے آخر وہ بہت رویا اور اپنی اصلاح کی۔ اس لئے علم بقدر ضرورت تو ہونا ضروری ہے مگر کمال علم کی ضرورت نہیں پس علماء کے علم کو دیکھو عمل کو مت دیکھو اور مشائخ میں عمل کو دیکھو اور کمال علم کی تلاش کرو۔ البتہ اگر اتفاق سے کوئی ایسا مل جاوے کہ وہ عالم بھی ہو اور شیخ بھی سبحان اللہ اس کی تو وہ حالت ہے

بہار عالم حسنش دل و جان تازہ میدارد برنگ اصحٰب صورت را بہ بو ارباب معنی را

(اس کی عالم حسن کی بہار ظاہر پرستوں کے دل و جان کو رنگ سے اور حقیقت پرستوں کے دل و جان کو بو سے تازہ رکھتی ہے)

تو پھر اسی ایک ہی سے تعلق رکھو اور اگر ایسا نہ ملے تو دو سے تعلق رکھو اور دو کچھ زیادہ نہیں دنیا کے لئے ہزاروں سے تعلق رکھتے ہو تو اگر دین کے لیے دو سے تعلق لو تو کیا تعجب ہے اس تعلق دینی سے جو اصل مقصود ہے یعنی حق تعالیٰ وہ تو ایسا ہے کہ اگر اس کے لئے ہزار سے بھی تعلق رکھا جاوے اور ان کی ناز برداری کی جاوے تو کم ہے

کشند از برائے دلے بارہا خورند از برائے گلے خارہا

طلبگار باید صبور و حمول کہ نشنیدہ ام کیمیا گر ملول

(ایک دل کے لئے بہت سی تکلیفیں اٹھاتے ہیں۔ ایک پھول کے لئے بہت سے کانٹے

کھاتے ہیں طالب چاہئے صبر کرنے والا اور مشقت برداشت کرنے والا میں نے کسی کیمیا گر کو ملول نہیں دیکھا)

اوراسی میں بات بھی آگئی کہ اگر ایک سے ناکامی ہوئی تو دوسرے سے رجوع کرو جیسے کوئی مریض کہ معالجہ میں اس کی یہ حالت ہوتی ہے

دست از طلب ندارم تا کام من برآید　　　یاتن رسد بجاناں یا جاں زتن برآید

(طلب سے باز نہ رہوں گا جب تک میرا مقصد پورا نہ ہو جائے یا تو تن محبوب حقیقی کے پاس پہنچ جائے یا جان تن سے نکل جاوے ۱۲)

اسی کو کہتے ہیں

طلب گار باید صبور و حمول　　　کہ نشنیدہ ام کیمیا گر ملول

(طلب گار صبور و حمول چاہئے کہ ہم نے کیمیا گر کو ملول نہیں دیکھا)

عمر بھر اسی دھن میں رہو پھر ممکن نہیں کہ محروم رہو

عاشق کہ شد کہ یار بحالش نظر نہ کرد　　　اے خواجہ درد نیست وگرنہ طبیب ہست

(ایسا کوئی نہیں کہ عاشق ہوا ہو محبوب نے اس کے حال پر نظر نہ کی ہوا ے صاحب درد ہی نہیں ورنہ طبیب ہے)

اوراسی دھن کو باقی رکھنے کے لئے فرماتے ہیں

اندریں راہ می تراش و می خراش　　　تا دم آخر دمی فارغ مباش

تا دم آخری دمی آخر بود　　　کہ عنایت باتو صاحب سر بود

(اس طریق وصول الی اللہ میں ہمیشہ ادھیڑ بن میں لگے رہو اور آخر وقت تک ایک لحظہ بھی فارغ مت رہو۔ آخر وقت تو کوئی گھڑی آخر ایسی ضرور ہو گی جس میں عنایت ربانی تمہاری ہمراز و رفیق بن جاوے گی)

یعنی کوئی وقت ایسا ضرور ہو گا کہ مقصود تک رسائی ہو گی۔ اب میں ختم کرتا ہوں اور ہر چند کہ میں نے کہا تھا کہ میں ان علماء باعمل کے نام نہ بتلاؤں گا مگر یہی رائے ہوئی کہ بتلادوں لیکن اس لئے نہیں کہ خواہ مخواہ ان کے معتقد ہو جاؤ۔ میرے کہنے سے تو اس وقت معتقد ہو کہ میرے معتقد ہو سو میں کہتا ہوں کہ آپ ہرگز میرے معتقد نہ ہوں میں خود قابل اعتقاد نہیں صرف مسائل بتلانے والا ہوں اور یہ کہنا میرا تواضعاً نہیں نہ اس میں مجھے تواضع کرنے کی ضرورت ہے جو چیز اپنے پاس ہے

اس کو ظاہر کرتا ہوں۔ میں بحمد اللہ علم ضروری جانتا ہوں اس کے بتلانے کے لیے تیار ہوں۔ گو وہ کامل نہیں ہے چنانچہ بہت سی باتیں مجھے معلوم بھی نہیں اور اگر مجھ سے کوئی ایسی بات پوچھی جاوے کہ اس کے متعلق میں یہ کہہ دوں گا اور کہہ دیتا ہوں کہ میں نہیں جانتا۔ پس علم ضروری کا انکار نہیں اور قابل اعتقاد ہونے کا دعویٰ نہیں اس لئے میں یہ نہیں کہتا کہ میرے کہنے سے ان بزرگوں کے معتقد ہو جاؤ۔ خود جانچ دیکھو سو اس غرض سے نام نہیں بتلاتا بلکہ محض اطلاع مقصود ہے سو وہ بزرگ یہ ہیں۔

چند مشائخ کاملین:

ایک مولانا عبدالرحیم صاحب رائے پوری جو اسی جلسہ میں تشریف فرما ہیں۔ یہ تو تربیت کے لئے کافی ہیں (۲) دوسرے بزرگ حضرت مولانا محمود حسن صاحب کہ وہ افادہ علم اور تربیت دونوں کے لئے کافی ہیں۔ (۳) تیسرے بزرگ حضرت مولانا خلیل احمد صاحب کہ وہ بھی تعلیم تربیت دونوں کے لئے کافی ہیں۔ اور نام اس وقت میں نے نہیں لئے۔ میں نے ایک تعبیہات وصیت لکھی ہے اس میں چند بزرگوں کے نام لکھ دیئے ہیں آپ خود ان کا امتحان کر لیں۔ لیکن امتحان ایک دو دفعہ کے ملنے سے نہیں ہوتا۔ (۴) حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی کو اکثر وگ خشک مزاج بتلاتے تھے کیونکہ یا تو کبھی ملے نہیں اور یا اگر ایک دو دفعہ ملے تو اتفاق سے ایسے وقت ملے کہ مولانا کسی دوسرے شغل یا احتساب میں مشغول ہوئے۔ بس اس ایک جلسہ میں دیکھ کر عمر بھر کیلئے ایک غلط حکم کر دیا اس کی ایسی مثال ہے کہ کوئی شخص سنے کہ فلاں جج صاحب بڑے خوش خلق ہیں اور یہ سن کر ان سے ملنے کو عدالت میں جاوے اور اتفاق سے ایسے وقت پہنچے کہ صاحب جج دو آدمیوں کو حبس دوام کا حکم سنا رہے ہوں اور دو کو پھانسی کا حکم سنا رہے ہوں تو یہ شخص یقیناً اس جج کو نہایت درجہ خونخوار سمجھے گا لیکن عقلمند آدمی کہے گا کہ بھائی تم نے عدالت میں دیکھا کہ پھر اتفاق سے اس وقت سنگین مقدمات پیش تھے ذرا ان کے بنگلہ پر جا کر تو دیکھو اسی طرح بزرگوں کے پاس ایک وقت جا کر دیکھا اور کہہ دیا کہ نہایت خشک ہیں۔ صاحبو! کم از کم ایک ایک ہفتہ تک رہ کر تو دیکھو۔ اور اگر پھر بھی سوائے اپنے کوئی پسند نہ آوے تو ہم اس کا علاج نہیں کر سکتے شاید اس فہرست سے کسی کو یہ شبہ ہو کہ اپنے ہی سارے بزرگوں کا نام دے دیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ ملی بھگت ہے تو اول تو خدا تعالیٰ جانتا ہے کہ ملی بھگت ہے یا کیا۔ دوسرے میں نے تو بیعت کرنا چھوڑ دیا ہے پھر ملی بھگت کا کیا احتمال رہا۔ صرف جو مجھ کو معلوم تھا بتلا دیا۔ ہاں یہ شبہ تو اب بھی رہا کہ بزرگوں کی تعریف کرنا درحقیقت اپنی تعریف ہے کہ ہم بھی بزرگ ہیں کہ بزرگوں کو پہچانتے ہیں

مادح خورشید مداح خود است ۔۔۔ کہ دو چشمم روشن و نامرمد است

(آفتاب کی تعریف کرنے والا خود اپنی تعریف کرنے والا ہے اس لئے کہ دونوں آنکھیں اس سے روشن ہیں)

سو اس کا جواب یہ ہے کہ خیر یہی سہی آپ یوں ہی سمجھیں اس سے ہم کیونکر بچیں۔ دوسرے

آپ کو کیا خبر ہے کہ میں نے خود پہچان کر ہی کہا ہے تا کہ وہ شبہ ہو ممکن ہے کسی بزرگ سے سن کر ہی کہا ہو اور اس کی بزرگی انتم شھداء اللہ فی الارض کے قاعدے سے محقق ہوئی ہو بہر حال آپ ان سب کو دیکھئے اور سب کا امتحان کیجئے ؎

ما نصیحت بجائے خود کردیم   روزگارے دریں بسر بردیم

گر نیاید بگوش رغبت کس   بر رسولاں بلاغ باشد و بس

(ہم نصیحت بجائے خود کی ہے اور ایک زمانہ اس میں گزارا ہے اگر کسی کو سننے کی رغبت نہ ہو تو رسول پر بس پہنچا دینا ہے کوئی عمل کرے یا نہ کرے)

پس اس صحبت سے نافع ہونے کی بنا پر فرماتے ہیں کہ اپنے صحابہؓ کو محروم نہ کیجئے اور اپنے نفس کو ان کے ساتھ جمائیے۔ اب میں آیت کا خالی ترجمہ کر کے ختم کیے دیتا ہوں۔

آیت متلوکا ترجمہ وتفسیر:

ترجمہ یہ ہے کہ اے محمد ﷺ اپنے کو ایسے لوگوں کے ساتھ جما کر بٹھلائیے جو اپنے پروردگار کو صبح و شام پکارتے ہیں۔ اور آپ کی آنکھیں ان سے ہٹنے نہ پاویں۔ (یعنی آنکھیں بھی ادھر ہی متوجہ رہیں) اس سے بھی میں ایک دوسرا مسئلہ استنباط کرتا ہوں وہ یہ ہے کہ بزرگوں کی توجہ سے بھی نفع ہوتا ہے تو گویا اول جملہ میں تعلیم کا بھی اشارہ ہوا کہ پاس بیٹھنے سے احکام بھی حاصل ہوں گے اور دوسرے میں تربیت کا آگے فرماتے ہیں ترید زینة الحیوة الدنیا۔ (دنیوی زندگی کی رونق کے خیال سے) اس کے بعض نے مستقل جملہ کہا ہے۔ یعنی کیا آپ دنیا کی زینت چاہتے ہیں مگر میں نے اس کو جملہ حالیہ سمجھا ہے اور لا تعد میں منفی کو اس کا عامل اور عیناک کو بوجہ اقامت مین مقام ذات ذوالحال اور مقید کی نفی یہاں قید اور ذی قید دونوں کے ارتفاع سے ہے یعنی جو عدوان بارادہ زینت حیوۃ دنیا ہوتا وہ متروک ہے۔ اس طرح سے کہ عدوان ہے نہ ارادہ زینت پس اس سے وقوع زینت کا لازم نہیں آتا آگے دوسری نہی ہے لا تطع من اغفلنا قلبه عن ذکرنا واتبع ھوٰه وکان امره فرطا۔ یعنی ان کا کہنا نہ مانو جن کو ہم نے ذکر سے غافل کر دیا ہے اور اس نے اپنی ہوائے نفسانی کا اتباع کیا اور اس کا کام حد سے نکلا ہوا ہے۔ یہاں سے ایک تیسری بات بھی معلوم ہوئی کہ مشورہ بھی ایسے شخص کا قبول کرے جسکی یہ حالت نہ ہو۔

اغفلنا قلبه الخ (ہم نے انکے دل کو غافل کر دیا ہے) کیونکہ بے دین کے مشورہ میں بھی برکت نہیں ہوتی۔ چنانچہ رؤساء کفار کے اس مشورہ تخصیص مجلس کے قبول سے حضور ﷺ کو ممانعت فرما دی۔ خلاصہ آیت کا یہ ہے کہ اس میں تعلیم اور تربیت دونوں کا بذریعہ صحبت نافع ہونا جتلایا ہے اور شیوخ کا بھی علاج کر دیا ہے کہ آپ بھی بے پروائی نہ کریں سبحان اللہ کیا عجیب جامع جملہ ہے۔ اب میں ختم کر چکا۔

خدا تعالیٰ سے دعا کیجئے وہ فہم سلیم اور توفیق عمل کی بخشیں۔ آمین ثم آمین